محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

جہانِ دیدہ

جہانِ دیدہ

محمد تقی عثمانی

مکتبۂ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : محمد مشتاق قاسمی
طبع جدید : شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ - جولائی ۲۰۱۰ء
مطبع : احمد برادرز پرنٹرز
ناشر : مکتبۂ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : (92-21) 35031565, 35031566
ای میل : info@quranicpublishers.com
ویب سائٹ : www.quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

- مکتبۂ معارف القرآن کراچی
فون: 35031565 - 35031566
- ادارۃ المعارف کراچی
فون: 35049733 - 35032020

کس کا خیال کونسی منزلِ نظر میں ہے؟
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے!

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وکفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

پیش لفظ

اپنی ذات کی طرف دیکھوں تو اپنا سفرنامہ لکھنے کا خیال بھی ایک خبط معلوم ہوتا ہے۔ میرے والد ماجد (رحمۃ اللہ علیہ) کے بقول کوئی مکھی مچھر ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑ کر چلا جائے تو اس کا سفرنامہ کون لکھے؟ اور کیوں لکھے؟ لیکن جب میں نے ۱۹۶۳ء میں برادرِ محترم جناب محمد ولی رازی صاحب کے ساتھ عمرے کا سفر کیا تو سفرنامہ لکھنے کا شوق اس لیے پیدا ہوا کہ اس کے بہانے حجاز کے مقاماتِ مقدسہ اور ان سے وابستہ تاریخ کے دلکش واقعات لکھنے کا موقع مل جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے وہ سفرنامہ بڑے ذوق و شوق اور تفصیل سے لکھنا شروع کیا، اور یہ واقعہ ہے کہ ع

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

لیکن اس سفرنامے کی تکمیل اور اشاعت مقدر میں نہ تھی۔ اسی سفر سے واپسی میں ایک روز بحری جہاز کے عرشے سے اس کا مسودہ ایسا گم ہوا کہ ہزار تلاش اور اعلانات کے باوجود مل نہیں سکا، اور اس کے بعد ایسی ہمت ٹوٹی کہ میں اسے دوبارہ نہ لکھ سکا، اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں حجاز کا مفصل سفرنامہ شامل نہیں ہے۔

اس واقعے کے بعد مدتوں حجاز کے علاوہ کسی جگہ کا نہ کوئی قابلِ ذکر سفر پیش آیا، نہ سفرنامہ لکھنے کا کوئی داعیہ پیدا ہوا لیکن ماہنامہ "البلاغ" کی ادارت کے دوران جو سفر پیش آتے رہے، ان کے بارے میں اپنے ہلکے پھلکے تأثرات میں "البلاغ" میں لکھتا رہا۔ بالآخر ایک ایسا دور آیا کہ سفر جزوِ زندگی بن گیا اور پے در پے ملکی اور غیر ملکی سفروں کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ

یہاں تک کہہ دیا کہ اب تمہیں "غیر رہائشی" (Non-resident Pakistani) پاکستانی قرار دے دینا چاہیئے۔

ان سفروں کا آغاز عالمِ اسلام کے ان خطوں سے ہوا جن سے تاریخِ اسلام کی بڑی قیمتی یادیں وابستہ تھیں، اور جنہیں دیکھنے کا شوق اس وقت سے دل میں پرورش پا رہا تھا جب سے تاریخِ اسلام کی ابجد پڑھنی شروع کی تھی۔ لہٰذا ایک بار پھر ان علاقوں کے سفر کی سرگزشت لکھنے کا داعیہ اس خیال سے پیدا ہوا کہ اس بہانے تاریخ کے ان گم گشتہ اوراق کو سامنے لانے اور بہت سی مایۂ ناز شخصیتوں کا تذکرہ کرنے کی حلاوت نصیب ہوگی۔ چنانچہ میں نے عراق، مصر، الجزائر، اردن، شام اور ترکی وغیرہ کے سفرنامے اسی جذبے کے ماتحت لکھے، اور قسط وار "البلاغ" میں شائع ہوتے رہے۔

اگرچہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر یہ سفرنامے بھاگ دوڑ ہی کی حالت میں لکھ گئے، اور دلجمعی کے ساتھ لکھنے کا موقع کم ہی ملا، لیکن چونکہ وہ سفرنامے کم، اور تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے مجموعے زیادہ تھے، اس لیے قارئین نے انہیں بہت دلچسپی سے پڑھا، اور میرے پاس ایسے خطوط کا ایک انبار لگ گیا جن میں ان سفرناموں کو مستقل کتابی شکل میں شائع کرنے کی تجویز بڑی تاکید کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

یہ کتاب ـــــ "جہانِ دیدہ" ـــــ اپنے کرم فرماؤں کی اسی فرمائش کی تعمیل ہے، اور اس میں میرے اب تک کے لکھے ہوئے اہم سفرنامے یکجا ہو گئے ہیں۔ ان سفرناموں کو تاریخی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا، بلکہ پہلے عالمِ اسلام کے سفرنامے دیئے گئے ہیں اور ان کے بعد غیر مسلم ممالک کے۔

عزیز گرامی مولانا محمود اشرف عثمانی سلمہٗ اور برادر زادہ عزیز سعود اشرف عثمانی سلمہٗ نے لاہور میں اپنی نگرانی میں اس کتاب کی کتابت میں جو دلچسپی لی، اس کا ذکر نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔ پھر کتابت تیار ہونے پر میرے بیٹے عزیزم عمران اشرف سلمہٗ کا اصرار ہوا کہ اس کے ساتھ اشاریہ بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے عزیزم محمد یحییٰ سلمہٗ کے ساتھ مل کر بڑی خوش اسلوبی سے اس کا اشاریہ مرتب کیا جو کتاب کے ساتھ شامل ہے۔ خدا کرے کہ یہ مجموعہ قارئین کے لیے دلچسپی، معلومات اور فائدے کا باعث ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی
۱۵۔ محرم ۱۴۱۰ھ

دارالعلوم کراچی ۱۴

رختِ سفر

ایک مسافر جب کسی طویل سفر پر روانہ ہوتا ہے، خواہ وہ سفر کتنے شوق اور کتنی امنگوں کا کیوں نہ ہو، تو اس کے دل میں ملے جُلے جذبات کا ایک عجیب عالم ہوتا ہے، وطن اور گھر والوں کی جدائی، اُن کی خیر و عافیت کی فکر، اپنے سفر کے مراحل کا خیال، منزل کی دُوری کا احساس، نئے ماحول اور نئے ملک کے بارے میں تخمینے اور اندیشے، واپس خیریت و سہولت کے ساتھ گھر پہنچنے اور گھر والوں کو بعافیت پانے کی آرزو، غرض نہ جانے کتنے خیالات و احساسات ہوتے ہیں جن کے تلاطم میں ۔ن گھر سے روانہ ہوتا ہے۔

خیالات و احساسات کے اس ہجوم میں مجھے ہمیشہ جس چیز نے بڑی تسکین بخشی، دل چاہتا ہے کہ سفرنامے شروع کرنے سے پہلے قارئین کو اس کا تحفہ پیش کر دیا جائے، اور وہ ہیں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی وہ پاکیزہ اور پُراثر دُعائیں جو آپؐ سفر پر روانہ ہوتے وقت فرماتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مُسافر کی ضروریات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جو ان اثر بھرے الفاظ میں سمٹ نہ آیا ہو، ایک مُسافر کی بشری نفسیات سے آپؐ سے زیادہ کون واقف ہوسکتا تھا، چنانچہ آپؐ نے ان کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس کا احاطہ ان دُعاؤں میں ۔ کر لیا ہو۔ دُعائیں یہ ہیں۔

بِسْمِ اللهِ وَاعْتَصَمْتُ بِاللهِ وَتَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ
وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ
وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ
وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ۔

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا هٰذَا السَّفَرَ وَاطْوِعَنَّا بُعْدَهٗ،

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ فِیْ سَفَرِیْ هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی۔

ان دُعاؤں کی اصل تاثیر اور ان میں چھپے ہوئے معانی کا صحیح ادراک تو انہی عربی الفاظ میں ہو سکتا ہے جو زبانِ رسالت مآبؐ سے ادا ہوئے، اور کون ہے جو ان معانی اور کیفیات کو کسی اور زبان میں منتقل کر سکے۔ تاہم مرکزی مفہوم سمجھنے کے لیے ان کا ترجمہ یہ ہے:

اللہ کے نام سے، مَیں اللہ کا سہارا لیتا ہوں، مَیں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

اے اللہ! تو ہی میرے سفر کا ساتھی ہے، اور تُو ہی میری غیر موجودگی میں میرے گھر والوں، میرے مال اور اولاد کا محافظ ہے۔

اے اللہ! مَیں تیری پناہ مانگتا ہوں سفر کی مشقت سے، ایسے منظر سے جو غم انگیز ہو، اور اس بات سے کہ جب میں اپنے گھر والوں اور مال و اولاد کے پاس واپس آؤں تو بُری حالت میں آؤں۔

یا اللہ! ہمارے لیے سفر کو آسان بنا دیجئے، اور اس کی مسافت کو ہمارے لیے لپیٹ دیجئے۔

اے اللہ! مَیں تجھ سے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ کی توفیق مانگتا ہوں، اور ایسے عمل کی جس سے تو راضی ہو۔

جب سواری پر سوار ہوتے تو فرماتے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔

پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اس سواری کو رام کر دیا، جبکہ ہم میں اس کی طاقت نہ تھی، اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اور جب کسی نئی بستی یا نئے شہر میں قیام کی غرض سے داخل ہوتے تو یہ دعا فرماتے کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَیْرِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ وَخَیْرِ اَهْلِهَا وَخَیْرِ مَا فِیْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ اَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِیْهَا۔

اے اللہ! میں آپ سے اس بستی کی، اس کے رہنے والوں کی اور اس میں جو کچھ ہے اس کی بھلائی کا طلب گار ہوں، اور اس بستی، اس کے باشندوں اور اس میں جو کچھ ہے اس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

قلب و نگاہ اگر مادّے کے پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں تو بات دُوسری ہے، ورنہ ایک مُسافر کے لیے اس سے بہتر رختِ سفر کیا ہو سکتا ہے؟

فہرست

وادیٔ دجلہ و فرات

جنوبی افریقہ، سعودی عرب اور عراق

ربیع الاول سنہ ۱۴۰۵ھ نومبر سنہ ۱۹۸۴ء

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

(۱)

وادیٔ دجلہ و فرات

میرا صفر کا پورا مہینہ، اور اس کے بعد ربیع الاول کے کچھ ایام بیرونِ ملک سفر میں صرف ہوئے۔ پانچ ہفتوں کے اس سفر میں مجھے کینیا، جنوبی افریقہ، سعودی عرب اور عراق چار ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دورے کی بہت سی باتیں یقیناً قارئین کے لیے باعثِ دلچسپی ہوں گی۔ اس لیے اس کے مختصر حالات و تاثرات پیشِ خدمت ہیں۔

آج سے تقریباً دو سال قبل مرزا غلام احمد قادیانی کے لاہوری متبعین نے کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) کی سپریم کورٹ میں مسلمانوں کے خلاف یہ درخواست دائر کی تھی کہ یہاں کے مسلمان ہمیں اپنی مسجدوں میں نماز پڑھنے اور اپنے قبرستانوں میں دفن ہونے سے روکتے ہیں، اور ہمیں غیر مسلم قرار دیتے ہیں حالانکہ ہم مسلمان ہیں، اس لیے اس سے ہماری ہتک عزت ہوتی ہے، اس سلسلے میں ہم ایک باضابطہ مقدمہ سپریم کورٹ میں دائر کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب تک اس مقدمہ کا تصفیہ ہو، مسلمانوں کو عارضی حکمِ امتناعی جاری کیا جائے کہ وہ اس دوران ہمیں کافر کہنے اور مسجدوں اور قبرستانوں کو ہمارے لیے ممنوع قرار دینے سے باز رہیں، اُس وقت وہاں کی سپریم کورٹ نے اس قسم کا عبوری حکمِ امتناعی جاری بھی کر دیا تھا۔

جب اس حکمِ امتناعی کی توثیق کا مرحلہ آیا تو وہاں کے مسلمانوں کی فرمائش پر پاکستان سے ایک وفد مسلمانوں کی مدد کے لیے گیا تھا جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مرحلے پر عدالت نے اپنا حکمِ امتناعی واپس لے کر مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

جس کی مفصل روداد میں دو سال قبل البلاغ کے محرم و صفر ۱۴۰۳ھ کے شمارے میں لکھ چکا ہوں۔

اس کے بعد مرزائی صاحبان نے سپریم کورٹ میں اصل مقدمہ دائر کر دیا۔ وہاں کے عدالتی طریقِ کار کے مطابق دعویٰ، جواب دعویٰ اور جانبین کی طرف سے ان کی تحریری وضاحتوں میں تقریباً دو سال لگ گئے، اور بالآخر مقدمے کی سماعت کے لیے یکم نومبر کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

اس مقدمے کے مختلف مراحل کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان میں ایک کمیٹی بنی ہوئی تھی۔ اس مرحلے پر کیپ ٹاؤن کے مسلمانوں نے اس کمیٹی سے دوبارہ فرمائش کی کہ وہ مقدمے سے کچھ پہلے وہاں پہنچ کر ان کی مدد کرے، اور ایسے ماہر گواہوں کا بھی انتظام کرے جو بوقتِ ضرورت مسلمانوں کی طرف سے گواہی دے سکیں۔ چنانچہ یہاں سے رابطۃ العالم الاسلامی کے زیرِ اہتمام اور جناب مولانا ظفر احمد انصاری کے زیرِ قیادت ایک گیارہ رکنی وفد تشکیل دیا گیا جس میں قائدِ وفد اور احقر کے علاوہ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) محمد افضل چیمہ صاحب، جناب ریاض الحسن گیلانی ڈپٹی اٹارنی جنرل پاکستان، جناب مولانا محمد یوسف لدھیانوی، جناب علامہ خالد محمود، جناب مولانا عبدالرحیم اشعر، جناب حاجی غیاث محمد صاحب سابق اٹارنی جنرل پاکستان، جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب، جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری اور جناب پروفیسر محمود احمد غازی صاحب شامل تھے۔

۲۵ اکتوبر کو شام پانچ بجے ہم پی آئی اے کے طیارے کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے، اور ابوظبی میں ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد رات کے گیارہ بجے نیروبی پہنچے، رات نیروبی میں گذار کر صبح ۷ بجے برٹش ایئرویز کے طیارے سے دوبارہ روانہ ہوئے اور مقامی وقت کے مطابق گیارہ بجے دوپہر جوہانسبرگ پہنچے۔ جوہانسبرگ میں جمعیۃ علماء ٹرانسوال کے سربراہ مولانا ابراہیم میاں اور ان کے رفقاء اور دوسرے احباب نے استقبال کیا۔ نماز جمعہ کا وقت قریب تھا، اس لیے پہلے جمعہ کی ادائیگی ضروری تھی، چنانچہ میزبانوں کی تجویز کے مطابق اعضاءِ وفد مختلف مساجد میں تقسیم ہو گئے۔ احقر نے ورک اسٹریٹ کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھائی، اور انگریزی میں مختصر خطاب بھی ہوا۔

جمعہ کے بعد وفد کے تمام ارکان مولانا ابراہیم میاں کے مدرسے اسلامی مرکز "دارالفلاح اسلامک انسٹی ٹیوٹ" پہنچے، اور رات وہیں گذاری۔ اس دوران انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانے سے استفادہ ہوتا رہا۔ مولانا نے اس دور دراز مقام پر علمی کتابوں پر بڑا اچھا ذخیرہ یہاں جمع کر لیا ہے، جو غالباً جنوبی آفریقہ میں دینی کتب کا سب سے بہترین ذخیرہ ہے۔

۲۷ اکتوبر کی صبح دس بجے جوہانسبرگ سے روانہ ہوئے، اور دو گھنٹے کی پرواز کے بعد بارہ بجے کیپ ٹاؤن کے ہوائی اڈے پہنچ گئے۔ اگرچہ جنوبی آفریقہ میں گرمیوں کی آمد تھی، لیکن موسم بڑا خوشگوار اور ہمارے لحاظ سے کسی قدر سرد تھا۔ ہوائی اڈے پر کیپ ٹاؤن کی مسلم تنظیموں کے نمائندے اور عام مسلمان بڑی تعداد میں استقبال کے لیے موجود تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی روایتی مہمان نوازی کا غیر معمولی نقش دلوں پر قائم کیا۔

شروع میں مقدمے کی تاریخ یکم نومبر مقرر تھی، لیکن مدعی کی طرف سے چار روز کی مزید مہلت طلب کی گئی جو عدالت نے دے دی۔ لہٰذا مقدمہ ۴ نومبر کو شروع ہوا۔ مقدمے کے پہلے دن سماعت کے لیے کیپ ٹاؤن شہر سے باہر ایک مضافاتی بستی کی عدالت کو منتخب کیا گیا تھا جو شہر سے تقریباً تیس میل دُور ہو گی۔ لیکن مقدمے سے عام مسلمانوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح سویرے سے وہاں پہنچنے شروع ہو گئے تھے، اور جب مقدمہ شروع ہوا تو نہ صرف ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، بلکہ راہداریوں میں بھی تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی، اور ملحقہ برآمدے میں بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ابتداء میں مسلمانوں کے فاضل وکیل اسماعیل محمد صاحب نے عدالت سے درخواست کی کہ اصل مقدمے کی کارروائی سے قبل وہ اس نکتے پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اس مقدمے کی سماعت اس عدالت کے لیے مناسب نہیں ہے۔ جج نے اس نکتے پر بحث کرنے کا جواز فاضل وکیل سے طلب کیا تو انہوں نے اس سلسلے میں اپنے دلائل پیش کیے۔ بعد میں جج نے مدعی کے وکیل مسٹر فارلم سے پوچھا کہ اس بارے میں ان کا کیا موقف ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر مسٹر اسماعیل محمد اس موضوع پر بحث کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ان کی بحث گواہوں کے بغیر محض بحث ہونی چاہیے۔ اس پر جج نے

کہا کہ میں اس بات کا فیصلہ کل سناؤں گا کہ ان ابتدائی قانونی نکات پر بحث سنی جائے یا نہیں؟ اور اس پر اُس دن عدالت برخاست ہوگئی۔

اگلے روز جج صاحب نے یہ فیصلہ دیا کہ مسٹر اسماعیل محمد کو ابتدائی قانونی نکات پر بحث کی اجازت دی جاتی ہے، البتہ وہ اپنے نکات کے ثبوت میں صرف بحث کریں گے، کوئی گواہی پیش نہیں کریں گے۔ چنانچہ پھر شام تک مسٹر اسماعیل محمد اپنے نکات پر بحث کرتے رہے۔ ان کی تقریر ماشاء اللہ اتنی مدلل، عمیق حوالوں سے بھرپور اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اتنی مسحور کن تھی کہ سارا دن گزر گیا، اور وقت کا اندازہ بھی نہ ہوسکا۔ مقدمے کی اتنی بھرپور تیاری اور اُسے پیش کرنے کا ایسا دلکش اور مرتب انداز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

۹ نومبر کو فریق مخالف کے ایڈوکیٹ مسٹر فارلم نے مسٹر اسماعیل محمد کے دلائل کا جواب دینا شروع کیا، انہوں نے اپنی تقریر میں متعدد قانونی نکات اٹھائے، اور اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے کافی مفصل بحث کی جو شام تین بجے تک جاری رہی۔ اس کے بعد مسٹر اسماعیل محمد نے تقریباً ایک گھنٹہ جوابی تقریر کی، اور مسٹر فارلم کے اعتراضات کا نکتہ بہ نکتہ دلچسپ جواب دیا۔

آخر میں جج صاحب نے کہا کہ وہ ان ابتدائی قانونی نکات پر اپنا فیصلہ محفوظ کرتے ہیں، اور اس پر عدالت برخاست ہوگئی۔

اب صورت حال یہ ہے کہ ان ابتدائی نکات پر عدالت کا فیصلہ بظاہر جنوری ۱۹۸۵ء تک سنایا جائے گا۔ اگر عدالت نے مسٹر اسماعیل محمد کے نکات سے اتفاق کیا اور یہ قرار دیا کہ عدالت کے لیے اس مسئلے کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں ہے تو مرزائی صاحبان کی درخواست ناقابل سماعت ہوکر خارج ہو جائے گی۔ اور اگر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ مقدمہ قابل سماعت ہے تو پھر مقدمہ تفصیلاً چلے گا جس میں دونوں طرف سے طویل گواہیوں کی نوبت آئے گی۔

مقدمے اور اس کی مزید تیاری کی مزید تفصیلات اگر زندگی رہی اور سب خیر رہا تو انشاء اللہ مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد عرض کی جائیں گی لیکن کیپ ٹاؤن کے پندرہ روزہ قیام میں جس قابل ذکر اور سبق آموز بات کا نقش دل پر قائم ہوا وہ اس علاقے کے مسلمانوں

کا پُرجوش دینی جذبہ ہے۔ کیپ ٹاؤن کو جنوب میں دُنیا کا آخری سرا سمجھنا چاہیئے۔ اس دُور افتادہ علاقے میں جو صدیوں سے مغربی اقوام کے زیرِ تسلط ہے، اور جہاں قدم قدم پر بے دینی، عیش و عشرت اور عریانی و فحاشی کی حرکات شب و روز کارفرما ہیں، یہ مسلمان اپنی دینی روایات کو بڑی حد تک تھامے بیٹھے ہیں، اقلیت ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائی ہوئی ہے، اور جب کبھی کسی دینی مسئلے پر آنچ آتی ہے تو ان کا جذبۂ بیتاب قابلِ دید ہوتا ہے۔

اس مقدمے کے موقع پر بھی ملک کے تینوں صوبوں ٹرانسوال، نٹال اور کیپ سے مسلمانوں کے نمائندے کیپ ٹاؤن میں جمع ہو گئے تھے، اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا قابلِ رشک جذبہ کھلی آنکھوں محسوس ہوتا تھا۔

ان حضرات نے خالص دینی جذبے کے تحت جس طرح پاکستانی وفد کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کئے، اور جس محبت اور گرم جوشی کا معاملہ کیا وہ ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ناقابلِ فراموش یادگار ہے۔

کیپ ٹاؤن دُنیا کے حسین ترین مقامات میں سے ایک ہے، یہاں سمندروں، پہاڑوں، جھیلوں اور سرسبز میدانوں، ہر طرح کا فطری حُسن موجود ہے۔ اور اسی شہر کے جنوب میں تقریباً ... ۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر وہ مشہور تاریخی ٹیلہ ہے جسے اردو میں راس امید عربی میں رأس الرجاء الصالح اور انگریزی میں کیپ آف گڈ ہوپ کہا جاتا ہے، اور جو اس سمت میں آباد دُنیا کا آخری کنارہ ہے۔ یہیں سے واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تھا، اور اسی مقام پر دُنیا کے دو بڑے سمندروں بحر اوقیانوس اور بحر ہند کا وہ سنگم ہے، جو مرج البحرین یلتقیان کا دلآویز منظر پیش کرتا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہاں آنا ہوا تھا، لیکن اس وقت ابر آلود موسم کی وجہ سے دونوں سمندروں کا امتیاز واضح نہ تھا۔ اس مرتبہ موسم صاف تھا، اس لیے وہ امتیازی لکیر میلوں دُور تک نظر آ رہی تھی جسے قرآن حکیم نے بینهما برزخ لا یبغیان سے تعبیر فرمایا ہے اور جسے دیکھ کر انسان بیساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ : فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

سعودی عرب :

کیپ ٹاؤن کے مقدمے سے فراغت کے بعد ایک دن جوہانسبرگ اور آزادویل میں قیام رہا، جہاں قدیم احباب سے ملاقات ہوئی۔ اور ۱۱ نومبر کی شام کو واپس نیروبی کے لیے روانہ ہوئے۔ رات بارہ بجے نیروبی پہنچے۔ دو گھنٹے وہیں دی آئی پی لاؤنج میں گذارے۔ دو بجے شب سعودی ایئر لائنز کے ذریعے جدہ روانگی ہوئی۔ اور صبح ۷ بجے کے قریب جدہ ایئرپورٹ پر جہاز اُترا۔ یہاں رابطۃ العالم الاسلامی کے پروٹوکول آفیسر وفد کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ چنانچہ چند گھنٹے جدہ ٹھہرنے کے بعد مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ اور زمانہ ظہر سے کافی پہلے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ ظہر سے پہلے ہی عمرہ شروع کر دیا، اور ظہر کے بعد اس کی تکمیل ہوئی۔

احقر کو ڈیڑھ سال بعد یہاں حاضری کا موقع ملا تھا، اور ایک بار پھر اس بات کا احساس ہوا کہ یہاں کے احوال دیدنی ہیں، شنیدنی نہیں۔ موسم نہایت خوشگوار تھا، اور ہجوم بھی کم تھا، اللہ تعالیٰ نے بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ حاضری نصیب فرمائی۔ اپنے ناگفتہ بہ حالات کے پیشِ نظر ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی یہ خیال ہمہ وقت دامنگیر رہا کہ ؎

کہاں میں؟ اور کہاں یہ نکہتِ گل؟
نسیمِ صبح! تیری مہربانی

اللہ تعالیٰ نے اس مقام کو جو رفعتیں بخشی ہیں، اور اُسے اپنے جن انوار و تجلیات کا مہبط بنایا ہے ان کی عظمت شان کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم جیسوں کو یہاں پر مارنے کی بھی اجازت نہ ہوتی، لیکن یہ انہی کی عطا اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے کہ بار بار حاضری کا موقع عنایت فرمایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حاضری کو خالص لوجہہ الکریم بنا دے، اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نواز دے۔ آمین ثم آمین۔

ایک دن مکہ مکرمہ کے قیام کے بعد اگلے روز مدینہ طیبہ روانگی ہوئی۔ اب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لیے جو جدید سڑک اسی سال تعمیر ہوئی ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے سفرِ ہجرت کے راستوں سے گذرتی ہے، اور قبا کی طرف سے مدینہ طیّبہ میں داخل ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کا نام "طریق الہجرہ" ہے۔ اس سڑک کی وجہ سے مسافت بھی کم ہو گئی ہے، اور دو رویہ کشادہ ہائی وے ہونے کی بنا پر سفر بھی تیز رفتار ہو گیا ہے، اور اگر بیچ میں وقفے زیادہ نہ ہوں تو تقریباً چار گھنٹے میں انسان مدینہ طیّبہ پہنچ سکتا ہے۔

ہم مدینہ طیّبہ پہنچے تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی، سامان گاڑیوں میں چھوڑ کر ہی نماز میں شامل ہوئے۔ مسجدِ نبوی کا پُرنور ماحول، اور اس میں شیخ حذیفی کی سادہ مگر انتہائی دلکش تلاوت، ایسا محسوس ہُوا کہ کائنات کا ہر ذرّہ قرآن کریم کی نورانیت میں غرق اور اس کی تلاوت کے سرور سے سرشار ہے۔

وفد کے دوسرے رفقاء اگلے روز واپس مکّہ مکرّمہ اور وہاں سے پاکستان چلے گئے، مجھے چونکہ ۱۸ نومبر کو اسلامی فقہ اکیڈمی کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی، اس لیے مجھے چند روز مزید مدینہ طیّبہ میں مقیم رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور یہ ایام حضرت والد صاحبؒ کے الفاظ میں اس کیفیت کے ساتھ بسر ہوئے کہ ؎

پھر پیشِ نظر گنبدِ خضرا ہے، حرم ہے	پھر نامِ خدا، روضۂ جنّت میں قدم ہے
پھر منّتِ دربان کا اعزاز ملا ہے	یہ اُن کا کرم، اُن کا کرم، اُن کا کرم ہے

پانچ دن بعد اس احساسِ ندامت کے ساتھ مدینہ طیّبہ سے رخصت ہُوا کہ یہ گرانقدر لمحات جو محض رحمتِ خداوندی سے نصیب ہوئے تھے۔ اُن کی صحیح قدر و قیمت پہچان کر ان کو صحیح مصرف میں صرف نہ کر سکا۔ اُن کی طرف سے رحمت کی بارشوں میں تو کوئی کمی نہ تھی، لیکن میں ان بارشوں کی جذب کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا کرے؟ لیکن اُنہی کی رحمت سے اُمید ہے کہ جب انہوں نے اس منبعِ فیض پر حاضری کی توفیق بخشی تو ـــــ ہم نااہلیوں کے علی الرغم ـــ انشاء اللہ محروم نہ فرمائیں گے۔

اِسلامی فقہ اکیڈمی:

"تنظیم اسلامی کانفرنس مسلمان ملکوں کی وہ واحد تنظیم ہے جو چند سال سے عالمِ اسلام

ے ایک مشترک پلیٹ فارم کا کام کر رہی ہے۔ اس تنظیم کے تحت مختلف ملکوں میں مسلم سربراہ کانفرنسیں اور مسلم وزرائے خارجہ کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، اور مسلمان ملکوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں جو انتشار و افتراق کی موجودہ فضا میں بسا غنیمت ہے۔ پھر اس تنظیم نے ــــ جس کا ہیڈ کوارٹر جدّہ میں ہے ــــ متعدد ایسے ادارے قائم کئے ہیں جن کے تحت مسلمان ممالک مختلف شعبہ ہائے زندگی میں باہمی تعاون و اشتراک سے کام کر رہے ہیں۔ اور بحمد اللہ سائنس، معیشت، تجارت اور اطلاعات کے شعبوں میں یہ باہمی تعاون رفتہ رفتہ فروغ پا رہا ہے۔

آج سے تین سال پہلے جب طائف میں مسلم سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تو شاہ خالد مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "تنظیم اسلامی کانفرنس" کو ایک ایسی "مجمع الفقہ الاسلامی" (اسلامی فقہ کمیٹی) قائم کرنی چاہیئے جس میں عالم اسلام کے علماء باہمی صلاح مشورے اور مشترک غور و تحقیق سے اُن فقہی مسائل کی تحقیق کریں جو عالمگیر نوعیت رکھتے ہیں۔ نیز فقہ کے قدیم ذخیرے کو جدید لباس میں شائع کریں، اور اس سے استفادے کو آسان بنائیں۔

اس تجویز کے مطابق "تنظیم اسلامی کانفرنس" نے اکیڈمی کا قیام منظور کر لیا، اور اس کا دستور مرتب کرنے کے لیے ایک عالمی کنونشن منعقد کیا جس میں اس کے دستور کا مسودہ تیار کیا گیا، جو کئی مرحلوں سے گذر کر پچھلے سال منظور ہو گیا۔

اس دستور کی رُو سے اس اکیڈمی کی رکنیت کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ رُکن اسلامی فقہ پر عبور رکھتا ہو، اور عربی زبان میں اظہار مافی الضمیر پر ٹھیک ٹھیک قادر ہو۔ اسی دستور میں یہ بھی طے کر دیا گیا کہ اس معیار کے حامل افراد میں سے ایک ایک رکن تمام اسلامی ملکوں سے لیا جائے گا۔ اور تمام ملکوں سے نامزدگیاں آجانے کے بعد اکیڈمی کا پہلا اجلاس منعقد ہو گا جس میں اس کا طریق کار باہمی مشورے سے طے کیا جائے گا، اور اس مرحلے پر مختلف اسلامی ملکوں اور اُن ملکوں سے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، مزید ارکان کا انتخاب کیا جا سکے گا۔

چنانچہ "مجمع الفقہ الاسلامی" کا پہلا اجلاس ۲۰ نومبر کو طے کیا گیا۔ پاکستان سے احقر

کو بطور رکن نامزد کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں مدینہ طیبہ سے ۱۹ نومبر کو واپس مکہ مکرمہ حاضر ہو گیا۔

۲۰ نومبر کی صبح کو "مجمع الفقہ الاسلامی" کا پہلا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت شاہ فہد کی نیابت میں امیر ماجد بن عبدالعزیز امیر منطقہ مکہ مکرمہ نے کی تنظیم اسلامی کانفرنس کے سیکریٹری جنرل جناب حبیب شطی رابطہ العالم اسلامی کے جنرل سیکریٹری شیخ عبداللہ النصیف اور مجمع الفقہ الاسلامی کے نامزد سیکریٹری جنرل شیخ حبیب بلخوجہ (جو تیونس کے ممتاز علماء میں سے ہیں) بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ افتتاحی اجلاس ان سب حضرات کی رسمی تقریروں پر ختم ہو گیا۔

اس کے بعد مجمع الفقہ الاسلامی کے صدر، تین نائب صدر اور ہیئۃ المکتب (مجلس عاملہ) کا انتخاب ہونا تھا، چنانچہ شام کے اجلاس میں حسب ذیل انتخاب عمل میں آیا:۔

صدر : شیخ بکر ابو زید - وکیل وزارۃ العدل (سعودی عرب)

نائب صدر: (۱) ڈاکٹر عبدالسلام عبادی۔ (اردن)

(۲) ڈاکٹر عبداللہ ابراہیم ۔ (ملائشیا)

(۳) الحاج سید عبدالرحمٰن باہ (گینیا)

دستور کی رُو سے ہیئۃ المکتب (BEUAREAU) چھ ارکان پر مشتمل ہونی تھی، چنانچہ اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل کے علاوہ (جو بلحاظ عہدہ) ہیئۃ المکتب کے رکن ہیں، مندرجہ ذیل چھ افراد پر مشتمل ہیئۃ المکتب کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) ڈاکٹر صالح طوغ، عمید کلیۃ الشریعۃ، مرمرا یونیورسٹی۔ (ترکی)

(۲) محمد تقی عثمانی (پاکستان)

(۳) استاذ سید روان بھائی، مدیر المعہد الاسلامی، ڈاکار۔ (سینیگال)

(۴) سیدی محمد یوسف جیری۔ سفیر مالی برائے ریاست ہائے خلیج (مالی)

(۵) استاذ عجیل جاسم النشمی، عمید کلیۃ الشریعۃ کویت (کویت)

(۶) استاذ عبدالرحمٰن شیبان۔ وزیر الشئون الدینیہ، الجزائر۔ (الجزائر)

موجودہ اجلاس کا اصل مقصد "مجمع الفقہ الاسلامی" کا دائرۂ عمل اور طریق کار طے کرنا

تھا، تاکہ آئندہ اس کے مطابق کام شروع کیا جا سکے۔ چنانچہ دستور کے مطابق "مجمع" کے تینوں شعبوں کے لیے تین کمیٹیاں قائم کر دی گئیں: شعبۂ التخطیط، شعبۂ الدراسات والبحوث اور شعبۂ الافتاء۔ راقم الحروف تیسری کمیٹی میں شامل ہوا جس کی نشستیں دوسرے تمام دن جاری رہیں۔ احقر نے اس شعبے کے دائرۂ عمل اور طریق کار سے متعلق مندرجۂ ذیل تجاویز پیش کیں:۔

(۱) "مجمع" کی جانب سے کوئی فتویٰ جاری کرنے سے قبل عالمِ اسلام کے افتاء کے اُن مراکز سے جو "مجمع" کے رکن نہیں ہیں، متعلقہ مسئلے میں مفصل استفتاء کیا جائے، اور عالمِ اسلام کے جید علماء کے فتاویٰ اور دلائل سامنے آنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

(۲) جن مسائل کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی زندگی سے ہے، اُن کے بارے میں کوئی حتمی فتویٰ جاری کرنے سے قبل متعلقہ علوم و فنون کے ماہرین سے صحیح صورتِ واقعہ سمجھنے میں مدد لی جائے۔

(۳) مذاہبِ اربعہ کی فتویٰ کی وہ کتب جو اب تک مخطوطات کی شکل میں ہیں، یا کبھی شائع ہو کر نایاب ہو چکی ہیں "مجمع" کی طرف سے اُن کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

(۴) فقہ و فتویٰ کی جو کتب شائع شدہ ہیں، اُن کو ترقیم و ترتیب کے جدید اسلوب کے مطابق شائع کیا جائے۔

(۵) تمام اہم فقہی کتابوں کی مفصل فہرستیں اور اشاریے تیار کرنے کا اہتمام کیا جائے جس کے ذریعے ان کتب سے استفادہ اور ان سے مسائل کا استخراج آسان ہو جائے۔

یہ تمام تجاویز باتفاقِ رائے منظور ہوئیں اور ان کو "مجمع" کے دستور العمل میں شامل کر لیا گیا۔

بعد میں تینوں کمیٹیوں کا مشترک اجلاس ہوا جس میں ہر کمیٹی کی تجاویز پر مشترک غور ہوا، تکرار کو حذف کیا گیا، اور پھر تینوں شعبوں کا ایک جامع دستور العمل تیار ہوا۔ اس

دستور العمل کا خلاصہ یہ ہے کہ "مجمع الفقہ الإسلامی" مندرجۂ ذیل کام کرے گی۔

(۱) جن فقہی مسائل کا تعلق پورے عالمِ اسلام سے ہے اُن پر تحقیقی تصانیف اور مقالات کی تیاری۔

(۲) فقہ کا ایک جامع موسوعہ (انسائیکلو پیڈیا) تیار کرنا جس میں تمام فقہی مذاہب کی تفصیل اُن کے اصل مستند مآخذ سے بیان کی گئی ہو، اور جو نا تمام موسوعات ابتک تیار ہوئے ہیں' ان کی تکمیل۔

(۳) جو فقہی کتب اب تک تشنۂ طباعت ہیں یا نایاب ہیں' ان کو تحقیق کے ساتھ شائع کرنے کا انتظام۔

(۴) قدیم فقہی کتب کو ترقیم و ترتیب اور تصحیح کے جدید اسلوب کے ساتھ شائع کرنے کا انتظام۔

(۵) فقہ کے مستند مآخذ کی مفصل فہرستیں اور اشاریے تیار کرنا جن کے ذریعہ فقہی مسائل کی مراجعت آسان ہو جائے۔

(۶) عالمگیر نوعیت کے فقہی سوالات پر اجتماعی طور سے غور و فکر کر کے اُن کا جواب مفصل فقہی مسائل کے ساتھ تیار کر کے اس کی اشاعت۔

(۷) ایک جامع مجموعۂ قوانین اسلام کی تیاری، جو ان تمام اسلامی ممالک کا قانون بن سکے جو اپنے یہاں اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

اس غرض کے لیے جو تین شعبے قائم کیے گئے ہیں' ہر سہ ماہی پر یکے بعد دیگرے ان کے اجلاسات منعقد ہُوا کریں گے۔ ان اجلاسات میں ہر آئندہ سہ ماہی کے لیے کام طے کر کے اُسے مناسب افراد پر تقسیم کیا جاتا گا۔ اور جو کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں گے۔ وہ بالآخر "مجمع الفقہ الإسلامی" کی مجلسِ عام میں پیش ہوں گے جس کا اجلاس سال میں کم از کم ایک مرتبہ اور بوقتِ ضرورت زیادہ مرتبہ بھی منعقد ہو سکے گا۔ ھیئۃ المکتب کا اجلاس سال میں کم از کم دو مرتبہ ہو گا۔ اور وہ تینوں شعبوں اور مجلسِ عام کے کاموں کے لیے بنیاد مہیا کریگا۔ کمیٹیوں کی جامع رپورٹ کی ترتیب کے بعد مجلسِ عام کی نشستیں دوبارہ شروع ہوئیں۔

جن میں اس رپورٹ کو منظور کیا گیا نیز "مجمع" کے ابتدائی تاسیسی اُمور اور بجٹ وغیرہ پر بحث
ہوئی جس کے بعد "مجمع" کا یہ پہلا اجلاس جس کا مقصد دستور العمل طے کرنا تھا، برخاست ہو گیا۔

"مجمع الفقہ الاسلامی" نے جو اغراض و مقاصد اپنے پیشِ نظر رکھے ہیں ان کی
تکمیل بلاشبہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اگرچہ عالمِ اسلام کے مختلف علاقوں میں
بہت سے افراد اور ادارے اپنے وسائل کے دائرے میں یہ کام انفرادی طور پر
انجام دے رہے ہیں، لیکن وہ اکثر و بیشتر وسائل کی قلت کے شکار ہیں۔ اگر یہ عالمی
ادارہ ان تمام کاوشوں کو منظم کر سکے، اور انہیں مطلوبہ وسائل فراہم کر کے اس کام کو
ایک جامع منصوبے کے تحت لے آئے تو بلاشبہ اس سے نہایت مفید نتائج برآمد ہو سکتے
ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ ہمارے دور کے قُوی صلاحیتوں اور
ممکنات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انفرادی طور پر ان کی تکمیل بہت دشوار ہے، اُس کے
لیے وافر اسی بڑے ادارے کے صحیح ثمرات کا حصول درحقیقت اسی وقت ممکن ہے
جب اس کو ایسے مخلص، قابل اور جذبۂ خدمت کے حامل افراد میسر آئیں جو سنجیدگی اور
خلوص کے ساتھ اس کے مقاصد کو پورا کرنے کی لگن رکھتے ہوں، اُن کے پیشِ نظر نام و نمود
اور دکھلاوے کے بجائے اللہ کے دین کی خدمت اور اس کی رضا کا حصول ہو، جو
رسمی کارروائیوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے بجائے واقعۃً کچھ کام کرنا چاہتے ہوں،
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلامی فقہ کی خدمت اُسی طرح کرنا چاہتے ہوں جو فقہ
کے اصول اور مزاج کا تقاضا ہے، اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے لیے فقہ کو
زینہ بنانے سے کوسوں دُور ہوں، جو مسلمانوں کی واقعی ضرورت اور زمانے کے جھوٹے
پروپیگنڈے میں امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور جن کے پیشِ نظر واقعۃً اللہ اور اس
کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع ہو، اور وہ اس مقدس نام کو غیروں کی ذہنی
غلامی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے استعمال نہ کریں۔
(جس کے اثرات غالباً مستقبل قریب میں کافی دُور رس ہوں گے) ایسے ہی مخلص افراد مہیا

دمادے، ان کو علمی اور عملی ہر اعتبار سے یہ عظیم کام انجام دینے کی واقعی صلاحیت عطا فرمائے، اور انہیں توفیق بخشے کہ وہ اس ادارے کو اپنے مالک و خالق کی رضا کے مطابق چلا سکیں۔ آمین

عراق :

عراق کے ساتھ ہم مسلمانوں کو جو قلبی تعلق اور لگاؤ ہمیشہ رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں، مدینہ طیبہ کے بعد عالم اسلام کا پہلا دارالحکومت عراق ہی میں قائم ہوا۔ دینی علوم کی جو مرکزیت حرمین شریفین کے بعد اس خطے کو حاصل ہوئی، وہ عالم اسلام کے کسی اور خطے کو نصیب نہیں ہو سکی۔ پھر بغداد صدیوں تک پورے عالم اسلام کا سیاسی، علمی اور ثقافتی مرکز بنا رہا، اور اس نے ہر شعبۂ زندگی میں جو بے مثال شخصیتیں پیدا کیں وہ ہماری تاریخ کا سنہری باب ہیں۔

ان تمام وجوہ سے عراق دیکھنے کی خواہش تو مدت سے تھی، لیکن عراق کی وزارتِ اوقاف نے پچھلے دنوں اسلامی علوم کی وہ نادر و نایاب کتابیں شائع کی ہیں جو اب تک مخطوطات کی شکل میں تھیں، اور پہلے کبھی طبع نہیں ہوئی تھیں۔ مثلاً "المعجم الکبیر للطبرانی" کا صرف حوالہ ہی دوسری کتابوں میں ملتا تھا، اصل کتاب دستیاب نہ تھی۔ عراق کی وزارتِ اوقاف اسے پہلی بار شائع کر رہی ہے اور بیچ کی چند جلدوں کو چھوڑ کر (جن کا مخطوطہ اسے دستیاب نہ ہو سکا) اب تک اس کی چھبیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اسی طرح کی سو سے زائد کتابوں کا ذخیرہ وزارتِ اوقاف نے شائع کر دیا ہے۔ ان کتابوں کے حصول کا شوق عراق کے سفر کا فوری داعیہ بن گیا۔ اور مدینہ طیبہ میں ہمارے محب محترم جناب قاری بشیر احمد صاحب بھی اس سفر میں رفاقت کے لیے تیار ہو گئے۔

خیال یہ تھا کہ یہ سفر خالص نجی نوعیت کا ہو گا۔ لیکن اتفاق سے مکہ مکرمہ کی "مجمع الفقہ الاسلامی" میں عراق کے نمائندے ڈاکٹر محمد شریف صاحب (مستشار وزیر الاوقاف) کو میرے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اصرار کیا کہ ہم عراق کے اس سفر میں وزارت مذہبی امور

کے مہمان نہیں۔ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر میں نے اس بات کو دوسری باتوں میں ٹلا دیا۔ لیکن بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ ٹیلیکس کے ذریعے وزارت کو میری آمد کے بارے میں مطلع کر چکے ہیں۔ اب ان کی میزبانی قبول کرنی ہی پڑے گی۔

چنانچہ ۲۵ نومبر کی شام کو مغرب کے وقت ہم جدّہ ایئرپورٹ سے عراقی ایئرویز کے طیارے میں سوار ہوئے۔ عراق جس افسوسناک جنگ میں مبتلا ہے، اس کی وجہ سے اپنی سیٹ تک پہنچنے سے قبل کئی جگہ تلاشی دینی پڑی۔ ہاتھ کا بریف کیس بھی اندرونی سامان میں بھجوا دیا گیا۔ جنگ کی حالت میں اس کے جہازوں کی پروازوں کا جاری رہنا ہی غنیمت ہے، اس لیے یہ غیر معمولی احتیاطی اقدامات قابلِ تعجب نہ تھے۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم بغداد ایئرپورٹ پر اُترے تو وہاں کی وزارت مذہبی امور کے سیکریٹری، ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ اور بعض دوسرے حضرات استقبال کے لیے موجود تھے۔ بغداد کا نیا ایئرپورٹ جو "مطار صدام" کہلاتا ہے، اپنی وسعت، حسن اور تعمیر کی دلکشی اور رعنائی میں بعض مغربی ممالک کے ہوائی اڈوں کو مات کر رہا ہے۔ استقبال کے لیے آنے والے افسران نے ہوائی اڈے کے مراحل منٹوں میں طے کرا دیئے اور بتایا کہ انہوں نے پہلے ہی سے ہمارے لیے رہائش، گاڑی اور ایک رہنما کا انتظام کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک کے نجی سفر میں اس قسم کے انتظامات یوں بھی ایک بڑی نعمت تھے، پھر ان میزبانوں نے جس محبت و گرمجوشی کا مظاہرہ کیا، اُس کے پیشِ نظر اس میزبانی کو ٹھکرانا مروت کے بھی خلاف تھا، اس لیے ان انتظامات کو غیبی نعمت سمجھ کر قبول کر لیا، اور بعد میں اندازہ ہوا کہ ان انتظامات کے بغیر اتنے مختصر وقت میں وہ کام ممکن نہ تھے جو اب ہو گئے۔

[illegible] میزبانوں نے بغداد کے مشہور [illegible] ہوٹل "فندق الرشید" میں قیام کا انتظام کیا۔ یہ ہوٹل دراصل غیر جانبدار ملکوں کی سربراہ کانفرنس کے لیے بنا تھا، لیکن جب یہ کانفرنس بغداد میں منعقد نہ ہو سکی تو اسے نجی ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کی تعمیر، رقبہ اور متعلقات عام فائیو اسٹار ہوٹلوں سے زیادہ وسیع

کشادہ اور آرام دہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ملحق لان تو ایک مستقل پارک ہے جو شاید ایک مربع کیلو میٹر میں پھیلا ہوا ہو۔

ہوٹل کی دسویں منزل پر قیام ہوا۔ یہاں سے بغداد کا نصف علاقہ نظروں کے سامنے تھا، اور حدِ نظر تک بکھری ہوئی روشنیوں نے زمین پر تاروں بھرے آسمان کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ بستر پہ لیٹا تو ذہن بغداد کی تاریخ کے اوراق اُلٹنے لگا۔ اس سرزمین نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی کیا کیا داستانیں دیکھی ہیں؟ یہاں علم و فضل کے کیسے کیسے پہاڑ نمودار ہوئے ہیں؟ علم و ادب کی کیسی کیسی محفلیں سجی ہیں؟ ورع و تقویٰ کی کیا کیا مثالیں نقش ہوئی ہیں؟ اور آج بھی اس خاک میں ہماری جگمگاتی ہوئی تاریخ کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب روپوش ہیں؟ اللہ اکبر!

جب مسلمانوں نے عراق فتح کیا تو بغداد کوئی قابلِ ذکر شہر نہ تھا، کسریٰ کے زمانے میں دجلہ کے مغربی کنارے پر یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، کہتے ہیں کہ کسریٰ نے ایک بُت پرست غلام کو یہ علاقہ بطور جاگیر دیا تھا، وہ جس بُت کی پرستش کرتا تھا، اُس کا نام "بغ" تھا، اس لیے اُس نے کہا کہ "بغ داد" (یعنی یہ علاقہ مجھے بغ نے دیا ہے) اسی لیے بہت سے علماء اس شہر کو بغداد کہنا پسند نہ کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ اور بصرہ جیسے شہر بسائے گئے، لیکن یہ علاقہ حسبِ سابق رہا۔ بنو عباس کے زمانے میں خلیفہ منصور نے کوفہ اور حیرہ کے درمیان ایک شہر "ہاشمیہ" کے نام سے بسایا، لیکن راوندیوں کی بغاوت کی وجہ سے اُسے اپنا مستقر نہ بنا سکا۔ کوفہ کی بغاوتیں تو مشہور رہی تھیں، اس لیے وہاں اسے دارالحکومت بنانا پسند نہ تھا۔ بالآخر اُس نے کوفہ سے موصل تک کا دورہ کرنے کے بعد دجلہ کے کنارے اس جگہ کو پسند کیا، اور کہا کہ "اس جگہ کے ایک طرف دجلہ ہے، یہاں سے ہمارے اور چین کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہوگی، اور دوسری طرف فرات ہے، جہاں سے شام اور رقہ کے ساتھ رابطہ رہے گا۔" (مقدمۃ المعارف لابن قتیبۃ)

چنانچہ منصور کے لشکر نے دجلہ کے مغربی کنارے پہ پڑاؤ ڈالا، اور ۱۴۶ھ میں اس

نے علم سے بغداد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ منصور ہی نے اس شہر کا نام مدینۃ السلام رکھا۔ کیونکہ "بغداد" کے نام میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، شرک کا شائبہ تھا۔ اور یہ بھی عجائب میں سے ہے کہ یہ "مدینۃ السلام" صدیوں خلفاء اسلام کا دارالحکومت رہا، لیکن اُن میں سے کسی کا اس شہر میں انتقال نہیں ہوا۔ صرف ہارون رشید کے بیٹے امین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بغداد میں قتل ہوا۔ لیکن خطیب بغدادیؒ نقل کرتے ہیں کہ درحقیقت وہ بھی بغداد میں قتل نہیں ہوا، بلکہ دریائے دجلہ میں تفریحاً کشتی رانی کرتے ہوئے شہر سے دُور نکل گیا تھا، وہیں گرفتار ہوا، اور وہیں قتل کیا گیا۔ (تاریخ بغداد للخطیب ص ۶۹، ج ۱)

رفتہ رفتہ بغداد مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور علم و فن کا وہ گہوارہ بنا کہ دُنیا میں اُس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ حُسن و جمال، ترتیب و تنسیق اور تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے یہ شہر اتنا دلکش تھا کہ امام شافعی جیسے متقی فقیہ اور بزرگ نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد یونس بن عبداللہ علی سے پوچھا کہ کیا تم نے بغداد دیکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "نہیں"! تو امام شافعیؒ نے فرمایا: "پھر تو تم نے دُنیا ہی نہیں دیکھی۔"

(الخطیب ص ۴۶ ج ۱)

اس وقت بغداد دریائے دجلہ کے دونوں طرف آباد ہے۔ ابتدا میں خلیفہ منصور نے یہ شہر دجلہ کے مشرقی کنارے پر بسایا تھا۔ بعد میں اس کے بیٹے خلیفہ مہدی نے مغربی کنارے کو اپنی چھاؤنی بنایا، اور رفتہ رفتہ وہ حصہ بھی شہر میں شامل ہوگیا، اور مشرقی حصہ کرخ اور مغربی حصہ رصافہ کے نام سے موسوم ہوا۔ ان دونوں حصوں کے یہی نام آج تک چلے آتے ہیں۔ ہماری تاریخ کے بہت سے نامور علماء "کرخی" اور "رصافی" انہی حصوں کی طرف منسوب ہیں۔

---

(۲)

اگلی صبح اتوار تھا، ناشتے کے بعد میزبانوں کے نمائندے عبدالرزاق صاحب (پروٹوکول آفیسر) ہوٹل پہنچ گئے۔ ہم نے سب سے پہلے حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت عبدالقادر گیلانیؒ اور بزرگوں کے مزارات پر حاضری کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے سہولت کے لحاظ سے حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ کے مزار پر پہلے حاضری کا پروگرام بنایا۔

دن کی روشنی میں بغداد کی سڑکیں اور عمارتیں پہلی بار نظر آئیں تو یہ بیسویں صدی کا ایک جدید شہر تھا، عمارتیں خوبصورت، سڑکیں صاف ستھری اور کشادہ جابجا چوراہوں پر بنے ہوئے پُلوں اور زیرِ زمین راستوں نے ایک طرف ٹریفک کا مسئلہ بخوبی حل کر دیا ہے، اور دوسری طرف راستوں کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صدر صدام حسین کے زمانے میں بغداد کو جو تمدنی ترقی ہوئی ہے، اُس نے شہر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ خطیبؒ نے تاریخِ بغداد میں لکھا ہے کہ منصور نے جب یہ شہر بسایا تو اس کا طول بھی دو میل تھا، اور عرض بھی، اور یہ دُنیا کا پہلا شہر تھا جو دائرے کی شکل میں بسایا گیا۔ اور آج حال یہ ہے کہ اس کا ایک ایک محلّہ بھی میلوں میں پھیلا ہُوا ہے۔

جدید شہر کے مختلف علاقے یکے بعد دیگرے گذرتے چلے گئے، یہاں تک کہ کار شہر کے قدیم حصے میں داخل ہوگئی، اور گلی کوچوں سے عہدِ گذشتہ کی بُوباس آنے لگی تھوڑی دیر میں گاڑی ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے رک گئی۔ یہاں ایک عالیشان مسجد کی دیوار نظر آئی، برابر میں ایک گلی تھی، اور مسجد کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ دروازہ قدیم شاہی عمارتوں کی طرح بڑا پُرشکوہ تھا۔ یہ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ کی مسجد اور ان کا مدرسہ تھا، جس کے ایک حصّہ میں حضرت شیخؒ خود بھی آسُودہ ہیں۔

یہ مسجد یہاں حضرت شیخؒ کے زمانے ہی سے قائم ہے، اور اسی کی دیوارِ قبلہ کے پیچھے حضرت شیخؒ کا مزارِ مبارک ہے۔ وہاں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ دراصل ایران کے شمال کے مغربی صوبے

گیلان میں پیدا ہوئے تھے، جسے دیلم بھی کہا جاتا ہے، لیکن اٹھارہ سال کی عمر تقریباً ۴۹۸ھ
میں بغداد تشریف لائے اور پھر اسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ اسے کہنے والے تو شاید
اتفاق کہیں، لیکن یہ یقیناً قدرت کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ تھا کہ یہی وہ سال ہے جس میں حضرت
امام غزالیؒ نے بغداد کو خیرباد کہا۔ گویا یہ شہر ایک مُصلح سے محروم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت
شیخ رحؒ کی شکل میں فوراً ہی اسے دوسرا عظیم الشان مُصلح عطا فرمادیا۔

یہ محلہ حضرتؒ کا جہاں مزار ہے، قدیم زمانے میں بغداد کی فصیل کے قریب واقع تھا
اور اسے "باب الآزج" کہتے تھے۔ حضرت شیخ گیلانی قدس سرہ کے استاذ و شیخ حضرت قاضی
ابوسعد مخرمیؒ [illegible] ایک چھوٹا سا مدرسہ بنایا تھا جو ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ
عبدالقادر جیلانیؒ کے سپرد کر دیا گیا۔ حضرتؒ نے اسی مدرسے کو اپنے افادات کا مرکز بنایا۔
اور یہیں درس و تدریس، تصنیف و افتاء اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ جاری فرمایا۔
یہاں تک کہ یہ ایک عظیم الشان مدرسہ بن گیا۔ (المنتظم لابن الجوزی ص ۲۱۹ ج ۱۰)
اس مدرسے کی شکل میں حضرتؒ کا یہ فیض آج تک جاری ہے۔

حضرتؒ کے زمانے میں یہ مدرسہ مرجع خاص و عام تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ یہاں آپؒ
بہ نفسِ نفیس درس دیتے تھے۔ روزانہ ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور
ایک خلافیات کا بذاتِ خود پڑھایا کرتے تھے، صبح اور شام کے اوقات میں تفسیر، حدیث،
فقہ اور نحو وغیرہ کے اسباق ہوتے تھے، اور ظہر کے بعد حضرتؒ خود مختلف [illegible] توں میں تلاوت
فرمایا کرتے تھے اس کے علاوہ فتاویٰ کا بھی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آپ عموماً شافعی اور
حنبلی مذہب کے مطابق فتاویٰ دیا کرتے تھے۔ (الطبقات الکبریٰ للشعرانی ص ۱۰۹ ج ۱)

امام شعرانیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے یہ قسم کھالی کہ وہ کوئی
ایسی عبادت کرے گا کہ روئے زمین کا کوئی شخص اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو،
اور اگر یہ قسم پوری نہ کر سکا تو اس کی بیوی کو تین طلاق۔ یہ سوال بغداد کے بہت سے
علماء کے پاس گیا۔ عام طور سے علماء یہ سوال سن کر اسی نتیجے پر پہنچے کہ بظاہر اس شخص
کے پاس طلاق سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ ایسی عبادت کونسی ہو سکتی ہے جس کے

رے میں یقین ہو جائے کہ رُوئے زمین کا کوئی شخص وہ عبادت نہیں کر رہا ہے۔ آخر میں سوال
ضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہ کی خدمت میں بھیجا تو آپ نے برجستہ جواب دیا کہ
س شخص کے لیے حرم مکہ میں مطاف خالی کرا دیا جائے اور وہ اس حالت میں طواف
رے کہ کوئی اور شخص اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔

حضرتؒ کے بیشمار ارشادات و ملفوظات اتباعِ شریعت و سنت اور بدعات
سے اجتناب کی تعلیم و تلقین پر شاہدِ عدل ہیں۔ آپ کے مواعظ سے متاثر ہو کر تقریباً ہر
جلس میں بیسیوں افراد تائب ہوتے تھے۔ امام شعرانیؒ ہی نے حضرتؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا
ہے کہ: "ایک مرتبہ میرے سامنے ایسا عظیم الشان نور ظاہر ہوا جس سے سارا اُفق بھر گیا۔ پھر
س میں سے مجھے ایک صورت دکھائی دی، اور آواز آئی کہ اے عبدالقادر! میں تمہارا
رب ہوں، میں نے آج سے تمہارے لیے تمام حرام کام حلال کر دیئے ہیں۔ میں نے فوراً
کہا: مردود دُور ہو جا۔ بس یہ کہتے ہی وہ نور اندھیرے سے بدل گیا، اور وہ صورت دھواں
بن کر ختم ہو گئی۔ پھر آواز آئی کہ "اے عبدالقادر! تم میری چال سے اپنے علم کی بدولت بچ
گئے۔ ورنہ میں نے اس جیسی چالوں سے ستّر اہلِ طریق کو گمراہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں
میں نے کہا کہ یہ سب (میرے علم کی بدولت نہیں بلکہ) محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم
کی بدولت ہوا۔" (الطبقات الکبریٰ للشعرانی ص ۱۰۶ ج ۱)

مشائخ نے فرمایا کہ شیطان کا دوسرا حملہ زیادہ مکارانہ اور زیادہ سنگین تھا کیونکہ
پہلے وار سے بخوبی بچ جانے کے بعد اُس نے حضرتؒ کو ان کے علم کا حوالہ دے کر پندارِ علم
میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس نازک حملے سے بھی محفوظ رکھا۔

اس قسم کے واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرّہ
کو طریقت کے ساتھ ساتھ شریعت کا اور علومِ باطنہ کے ساتھ ساتھ علومِ ظاہرہ کا کس قدر
اہتمام تھا۔ چنانچہ آپ آخر وقت تک علومِ دینیہ کی تدریس اور افتاء وغیرہ میں بذاتِ خود
مشغول رہے ؎

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

لیکن دوسرے بہت سے اولیاء کرامؒ کے مزارات کی طرح شریعت و طریقت کے اس امامِ عالی مقام کے مزار پر بھی جاہلانہ عقیدت کے مظاہرے بدعات کی شکل میں نظر آئے جس ذاتِ والا صفات کی ساری زندگی اتباعِ شریعت کی تعلیم میں صرف ہوئی، اس کے مزارِ مبارک پر یہ خلافِ شرع امور خود اُن کے لیے کتنے تکلیف دہ ہوں گے! اس احساس سے دل پژمردہ رہا۔

مزارِ مبارک سے باہر نکل کر قریب ہی وہ مدرسہ آج تک قائم ہے جس کی بنیاد خود حضرت شیخؒ نے ڈالی تھی۔ اگلے دن بعد مغرب اسی مدرسے میں ایک مقدس بزرگ شیخ محمد عبد الکریم المدرس (حفظ اللہ) کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ وہ حضرت شیخ امجد الزہاوی رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے ہیں، اور انہوں نے عصری جامعات کے "ڈگری زدہ" طریقے کے بجائے قدیم طریقے پر ماہر اساتذہ و شیوخ سے علوم دینیہ کی تکمیل فرمائی ہے۔ "ماجستیر" اور "دکتوراہ" کے اس دور میں ایسے علماء کی قدر و قیمت پہچاننے والے بہت کم ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ علمِ دین کی جو خوشبو اور شریعت و سنت کی جو مہک ان بوریہ نشینوں کے پاس محسوس ہوتی ہے، وہ عموماً یونیورسٹیوں کی عالیشان عمارتوں اور ان کے پُر تکلف ماحول میں نظر نہیں آتی۔ اس لیے جہاں کہیں جانا ہوتا ہے، ایسے علماء کی تلاش رہتی ہے۔

شیخ موصوف مدرسے کے پہلو میں ایک سادہ سے فلیٹ میں مقیم ہیں۔ قدیم عربی طرز کی نشست، آس پاس کتابوں کے ڈھیر، دروازہ ہر آنے والے کے لیے کھلا ہوا، چہرہ ہمہ وقت گلاب کی طرح متبسم، باتوں میں بلا کی معصومیت، برجستگی اور بے تکلفی، تصنع اور دکھاوے سے کوسوں دُور، پہلی ہی نظر میں زیارت سے دل باغ باغ ہو گیا۔

ڈاکٹر محمد شریف صاحب (مستشار وزارۃ الاوقاف) نے شیخ کو پہلے سے فون پر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی تھی، اور شیخ یہ سن کر بہت مسرور تھے کہ ناچیز کو ابھی پرانے طرز کے دینی مدارس اور ان کے علماء سے خادمانہ نسبت حاصل ہے چنانچہ ابتدائی سلام و کلام کے بعد ان کا پہلا سوال ہمارے مدارس کے نصاب و نظام سے متعلق تھا۔ اور جب میں اپنی درسی کتب میں سے کافیہ، شرح جامی، شرح تہذیب، نور الانوار اور توضیح

جیسی کتب کا نام لیا تو وہ تقریباً چیخ پڑے، اور وصیت فرمائی کہ اس قسم کی ٹھوس استعداد پیدا کرنے والے نظام تعلیم کو آپ کبھی نہ چھوڑیے، کیونکہ ہم اس نظام کو چھوڑنے کے نتائجِ بد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی دوسری وصیت یہ کی کہ عراق جس جنگ میں مبتلا ہے اس سے رہائی کے لیے دعاؤں میں ہمیں فراموش نہ کریں اور علماء پاکستان سے بھی اس کے لیے دعا کروائیں۔

شیخ اصلاً کُردی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے کُردی اور عربی دونوں زبانوں میں بیسیوں کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات کُردی زبان میں ہیں جنہوں نے کُرد علاقوں میں دینی تعلیمات کی نشر و اشاعت کا فریضہ بطریقِ احسن انجام دیا ہے۔ کُردی زبان نہ سمجھنے کی بنا پر ان کتب سے استفادہ ہمارے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے شیخ نے اپنی عربی کتابوں کا ایک سیٹ عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک کتاب "علماؤنا فی العراق" عراق کے کُردی علماء کا تذکرہ ہے جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب علمِ عقائد پر ہے۔

شیخ سے رخصت ہو کر ہم مدرسے کے کتب خانے میں پہنچے یہ کتب خانہ بھی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ ہی کا قائم فرمودہ ہے، اور تقریباً چالیس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کتب خانے کے صرف مخطوطات کا تعارف پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ علم کے اس سدا بہار گلشن سے استفادے کے لیے تو مہینے درکار تھے، لیکن مختصر وقت میں بہت سے نادر مخطوطات کی زیارت نصیب ہوئی۔ بہت سی نئی کتابوں کا پتہ چلا۔ لیکن ان تمام مخطوطات میں ایک مخطوطہ دیکھ کر دل پر جو کچھ گذری، اسے حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ میں تفسیر کی ایک کتاب کا مخطوطہ دیکھ رہا تھا کہ ناظم کتب خانہ نے اچانک ایک اور قلمی نسخہ میرے سامنے کر دیا، اور اس طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیا۔ میں نے نظر اٹھائی تو یہ امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ کی "مفردات القرآن" کا ایک قلمی نسخہ تھا جس کے حروف جگہ جگہ سے اُڑے ہوئے تھے، جیسے کبھی ان پر پانی گر گیا ہو۔ ابھی میں اس نسخے کی کوئی خصوصیت دریافت نہ کر سکا تھا کہ ناظم کتب خانہ نے اس کے ٹائٹل پر لکھی ہوئی ایک

عبارت کی طرف اشارہ کیا، اور کہا: "اسے پڑھیے"۔ میں نے پڑھا تو عبارت یہ تھی:۔

"لقد انتشلت هذا الكتاب من نهر دجلة بعد أن رماه التتر وذلك سنة ٦٥٦هـ۔ وانا الفقير إليه تعالى عبد الله بن محمد ابن عبد القادر المكي۔"

میں نے ۶۵۶ھ میں یہ کتاب دریائے دجلہ میں پڑی ہوئی پائی تھی، جبکہ اسے تاتاریوں نے وہاں ڈال دیا تھا، میں نے یہ کتاب وہیں سے اٹھالی تھی۔

فقیر عبداللہ بن محمد بن عبدالقادر مکی۔

اس عبارت نے ذہن میں ساڑھے سات سو سال پہلے کے دلگداز واقعات کی ایک فلم چلادی۔ تاریخ میں پڑھا تھا کہ تاتاریوں نے بغداد پر قبضے کے بعد مسلمانوں کی کتابوں سے دریائے دجلہ پر پل تعمیر کیا تھا، اور کتابوں کی روشنائی سے دجلہ کا رنگ تک متغیر ہوگیا تھا۔ علم وحکمت کے کیسے کیسے خزانے اس وحشت و بربریت کی نذر ہوئے؟ ان کی تفصیل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ قلمی نسخہ اس تاریخی واقعہ کی اصلیت کی آج بھی شہادت دے رہا ہے۔

---

(۳)

اولیائے کرام کے مزارات پر:

حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ کے مزار مبارک کے بعد اسی شام کو بغداد کے ایک قدیم قبرستان میں حاضری ہوئی جو "مقبرہ باب الدیر" کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں ایک چھوٹے سے احاطے میں حضرت معروف کرخیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت سری سقطی رحمہم اللہ تعالیٰ کے مزارات ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ تینوں مزارات پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت معروف کرخیؒ:

حضرت معروف بن فیروز کرخی رحمۃ اللہ علیہ دوسری صدی ہجری کے مشہور اولیاء کرام میں سے ہیں، حضرت علی بن موسی الرضاؒ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور ان کے ملفوظات و افادات صوفیاء کرامؒ کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے ہیں۔

آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن آپ کے بھائی عیسیٰ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی زمانے سے ان کو عقیدۂ توحید کے لیے چن لیا تھا، میں اور وہ ایک عیسائی اُستاد کے پاس پڑھا کرتے تھے، اُستاد ہمیں "باپ، بیٹا" کا عقیدہ سکھاتا، لیکن حضرت معروف کرخیؒ جواب میں "احد، احد" فرماتے۔ اس پر استاد انہیں مارتے تھے۔ ایک مرتبہ استاد نے انہیں اتنا مارا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور لاپتہ ہوگئے۔ ان کی والدہ رو رو کر کہتی تھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے معروف کو میرے پاس لوٹا دیا تو وہ جو دین چاہے گا اسے اختیار کرنے سے نہیں روکوں گی۔ کئی سال بعد آپ واپس آئے تو ماں نے پوچھا بیٹا! تم کس دین پر ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ اسلام پر، اس پر والدہ بھی مسلمان ہوگئیں، اور ہمارا پورا گھر مشرف باسلام ہوگیا۔

(صفۃ الصفوۃ لابن الجوزیؒ ص ۱۸۰ ج ۲)

آپ اُن اولیائے کرامؒ میں سے ہیں جن پر کثرتِ نوافل سے زیادہ ذکر وفکر کا غلبہ تھا۔ ان کے ایک معاصر راوی ابوبکر بن ابی طالبؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت معروف کرخیؒ کے پاس ان کی مسجد میں گیا۔ جب انہوں نے اذان شروع کی تو میں نے دیکھا کہ حضرت معروف کرخی قدس سرہٗ پر اضطراب کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اور جب مؤذن نے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہا تو ان کی ریش مبارک اور ابرو تک کے بال کھڑے ہوگئے اور وہ بے قابو ہو کر اس درجہ جھکنے لگے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ اذان پوری بھی کرسکیں گے یا نہیں۔

(حلیۃ الاولیاء۔ لابی نعیمؒ ج ۸، ص ۳۶۱)

ایک مرتبہ ایک حجام حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ کا خط بنا رہا تھا، حضرتؒ اس

وقت بھی تسبیح میں مصروف تھے۔ حجام نے کہا کہ "آپ تسبیح پڑھتے رہیں گے تو مونچھیں نہ بن سکیں گی۔" حضرتؒ نے فرمایا: "تم تو اپنا کام کر رہے ہو، میں اپنا کام نہ کروں؟"
(ایضاً ص ٣٦٢)

آپ کا معمول تھا کہ جو کوئی دعوت دیتا، سنّت کے مطابق اس کی دعوت قبول فرما لیتے۔ ایک مرتبہ ایک ولیمہ میں گئے تو وہاں انواع و اقسام کے پُر تکلف کھانے چُنے ہوئے تھے۔ وہاں ایک اور صوفی بزرگ موجود تھے، انہوں نے یہ پُر تکلف کھانے دیکھے تو حضرت معروف کرخیؒ سے فرمایا "آپ دیکھ رہے ہیں، یہ کیا ہے؟" ان کا مقصد یہ تھا کہ اتنے پُر تکلف کھانے مناسب نہیں، حضرتؒ نے فرمایا کہ "میں نے یہ کھانے بنانے کو نہیں کہا تھا۔" پھر جوں جوں مزید کھانے آتے رہے، وہ صاحب اپنی سابقہ شکایت دُہراتے رہے۔ آخر میں حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا:

"انا عبد مدبر آکل ما یطعمنی و انزل حیث ینزلنی۔"

"میں تو غلام ہوں، میرا آقا جو کچھ کھلاتا ہے، کھاتا ہوں، اور جہاں لے جاتا ہے، چلا جاتا ہوں۔" (ایضاً ص ٣٦٤)

ایک مرتبہ آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ ایک سقا آواز لگا رہا ہے "جو شخص پانی پیئے، اللہ اس پر رحم کرے۔" حضرت معروف کرخیؒ نے اس کی آواز سنی تو آگے بڑھ کر اس سے پانی مانگا، اور پی لیا۔ کسی نے پوچھا "آپ تو روزے سے تھے؟" فرمایا کہ "ہاں! لیکن میں نے سوچا کہ شاید اس اللہ کے بندے کی دعا مجھے لگ جائے۔" (اور روزہ نفل تھا، بعد میں قضا کر لی ہوگا) (ایضاً ص ٣٦٥)

ایک مرتبہ آپ دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے سے ایک کشتی گذری جس میں کچھ بے فکر نوجوان گاتے بجاتے جا رہے تھے، کسی نے حضرت معروف کرخیؒ سے کہا کہ "دیکھئے یہ لوگ دریا میں بھی اللہ کی نافرمانی سے باز نہیں آتے۔ ان کے لیے بددُعا کر دیجئے۔" اس پر حضرت معروف کرخیؒ نے ہاتھ اُٹھائے، اور دُعا فرمائی کہ:

"یا الٰہی، اے میرے آقا! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جس طرح آپ

نے ان نوجوانوں کو دُنیا میں مسرتیں بخشی ہیں، ان کو جنت میں بھی مسرتیں عطا فرمایئے۔"

حاضرین نے کہا کہ ہم نے تو آپ سے بددُعا کے لیے کہا تھا۔ فرمایا کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آخرت میں مسرتیں عطا فرمائیں تو ان کے دُنیوی اعمال سے ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اس میں تمہارا تو کوئی نقصان نہیں۔" (صفۃ الصفوۃ ص ۱۸۱ ج ۲)

حضرت معروف کرخیؒ کی وفات ۲۰۰ھ میں ہوئی، اور یہ بات اہلِ بغداد میں مشہور تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے مزار پر کی ہوئی دُعا قبول فرماتے ہیں۔ خاص طور پر قحط کے زمانے میں بارش کی دُعا (الطبقات الکبریٰ للشعرانیؒ ص ۶۱ ج ۱) ابو عبداللہ بن المحاملیؒ فرماتے ہیں کہ "میں معروف کرخیؒ کی قبر کے بارے میں ستر سال سے جانتا ہوں کہ جو کوئی غمزدہ وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرماتے ہیں۔" (تاریخ بغداد للخطیبؒ ص ۱۲۳ ج ۱)

حضرت سری سقطیؒ:

حضرت سری بن مغلس سقطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۵۷ھ) حضرت معروف کرخیؒ کے خلیفۂ خاص ہیں۔ اپنے زمانے میں تصوف اور تقویٰ کے امام تھے۔ علامہ شعرانیؒ نے لکھا ہے کہ بغداد میں علم توحید پر سب سے پہلے انہوں نے ہی کلام کیا۔ (طبقات ص ۳۰، ۶ ج ۱) امام ابو نعیمؒ نے ان کا یہ زرّیں ملفوظ روایت کیا ہے کہ:

من ادعی باطن علم ینقض ظاہر حکم فھو غالط

جو کوئی شخص کسی ایسے علم باطن کا دعویٰ کرے جو کسی ظاہری حکمِ شرعی کے خلاف ہو تو وہ خطاکار ہے۔

(حلیۃ الاولیاء ص ۱۲۱ ج ۱۰)

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا خصوصی اہتمام تھا کہ دین کے کسی کام میں طلبِ دُنیا کا شائبہ نہ آنے پائے۔ چنانچہ وہ اپنے معتقدین سے کوئی ھدیہ قبول

نہیں فرماتے تھے۔ حدیہ ہے کہ ایک مرتبہ انہیں کھانسی کی شکایت ہوئی تو ان کے معتقدین میں سے کسی نے کھانسی کی ایک گولی اپنے بیٹے کے ہاتھ ان کے پاس بھیج دی۔ بیٹے نے گولی پیش کی تو حضرتؒ نے پوچھا: اس کی کیا قیمت ہے؟ بیٹے نے جواب دیا کہ میرے والد نے مجھے قیمت نہیں بتائی۔ حضرتؒ نے فرمایا: "اپنے والد کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ ہم پچاس سال سے لوگوں کو یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ اپنے دین کو دنیا خوری کا ذریعہ نہ بناؤ، آج ہم خود اپنے دین کے عوض دنیا خوری کیسے کریں؟"

(حلیہ ص ۱۱۷، ج ۱۰)

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو اچھی حالت بخشی ہے وہ سب حضرت معروف کرخیؒ کی برکت سے ہے۔ ایک دن میں نماز عید پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ حضرت معروف کرخیؒ ایک پراگندہ بال بچے کو لیے کہیں جا رہے ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ فرمایا کہ میں نے راستے میں دیکھا کہ کچھ بچے کھیل رہے ہیں اور یہ بچہ ان سے الگ اداس کھڑا ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ "تم کیوں نہیں کھیلتے؟" اس نے جواب دیا کہ "میں یتیم ہوں"۔ حضرت سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت معروف کرخیؒ سے پوچھا کہ "آپ اس بچے کو ساتھ لے جا کر کیا کریں گے؟" انہوں نے فرمایا کہ "کہیں سے کچھ گٹھلیاں جمع کر کے اسے دے دوں گا جس سے یہ اخروٹ خرید کر خوش ہوگا۔" اس پر میں نے عرض کیا کہ "یہ بچہ مجھے دے دیجئے، میں اس کی دیکھ بھال کروں گا۔" انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ "واقعی کر دوگے؟" میں نے وعدہ کیا تو فرمایا: "لیجاؤ، اللہ تمہارا دل غنی کرے۔"

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت معروف کرخیؒ کی اس دعا کی بدولت میرے دل کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ دنیا مجھے حقیر سے حقیر شے کے مقابلے میں بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ (حلیہ ص ۱۲۳، ج ۱۰)

یہ بھی حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو کچھ لوگ عیادت کے لیے آئے۔ احادیث کی رو سے عیادت کا مسنون طریقہ یہ ہے

کہ جو لوگ بیمار شخص سے بے تکلف نہ ہوں، ان کو مختصر طور پر بیمار پرسی کرنے کے بعد بیمار کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھنا چاہئے تاکہ اسے تکلیف نہ ہو، لیکن حضرت سقطیؒ کی بیمار پرسی کرنے والے دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے، تکلف والے افراد کے دیر تک بیٹھنے سے بیمار کو طبعی طور پر تکلیف ہوتی ہی ہے، حضرتؓ کو بھی ہوئی جب کافی دیر گذر گئی تو آنے والوں نے کہا کہ "دعا فرما دیجئے" اس پر حضرت سقطیؒ نے ہاتھ اٹھائے، اور فرمایا: "یا اللہ! ہمیں عیادت کے آداب سکھا دیجئے" (ایضاً ص ۱۲۲)

حضرت جُنید بغدادیؒ :

سید الطائفہ حضرت جنید بن محمد بغدادیؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں، آپ حضرت سری سقطیؒ کے بھانجے بھی تھے، اور ان کے خلیفہ بھی۔ آپ کے آباء و اجداد نہاوند کے باشندے تھے۔ لیکن آپ کی ولادت اور نشو و نما عراق میں ہوئی۔ آپ صوفیاء کرام کے سرخیل ہونے کے ساتھ ساتھ علوم ظاہرہ کے بھی زبردست عالم تھے، اور فقہ میں عموماً حضرت امام ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فتویٰ دیتے تھے جو امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔

(طبقات الشعرانی ص ۷۲، ج ۱)

امام ابو نعیم اصفہانیؒ نے آپؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے کہ "جو شخص حافظِ قرآن نہ ہو، اس نے کتابتِ احادیث کا مشغلہ نہ رکھا ہو، اور علمِ فقہ حاصل نہ کیا ہو، وہ اقتداء کے لائق نہیں۔" (حلیۃ الاولیاء ص ۲۵۵، ج ۱۰)

آپ کے بیشمار ملفوظات اولیاء کرامؒ نے محفوظ کر کے ہم تک پہنچائے ہیں، جن میں علم و حکمت اور فراستِ ایمانی کے خزانے پنہاں ہیں۔ امام ابو نعیم اصفہانیؒ نے اپنی مشہور کتاب حلیۃ الاولیاء کی دسویں جلد میں آپ کے ملفوظات تیس صفحات میں بیان فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند بطور مثال پیشِ خدمت ہیں:۔

(۱) فرمایا کہ :۔

من ظنّ أنه یصل ببذل المجهود فمتعنّ و من ظنّ أنه

يصل بغير بذل المجهود فمتمنّ۔

جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ اپنی کوشش سے اللہ تک پہنچ جائے گا، وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈال رہا ہے، اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر محنت اور کوشش کے پہنچ جائے گا، وہ خواہ مخواہ آرزوئیں باندھ رہا ہے۔

(صفحہ ۲۶۷)

مطلب یہ ہے کہ بے عملی کے ساتھ آرزوئیں لگانا بھی غلط ہے، اور محنت و کوشش کر کے اس پر ناز اور اعتماد کرنا بھی غلط، صحیح راستہ یہ ہے کہ کوشش میں لگا رہے اور اللہ تعالےٰ سے اس کے فضل و رحمت کا طلب گار رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و رحمت ہی سے وصول ہوتا ہے۔

(۲) فرمایا کہ:

لا تيأس من نفسك و أنت تشفق من ذنبك، وتندم عليه بعد فعلك۔ (ص ۲۶۷)

جب تک تم اپنے گناہوں سے خائف ہو، اور اگر کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر ندامت محسوس کرتے ہو، اس وقت تک اپنے آپ سے مایوس نہ ہو۔

(۳) آپ کے شیخ حضرت سرّی سقطی رحؒ نے آپ سے پوچھا کہ شکر کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا:

ألا يستعان بشيئ من نعمه على معاصيه۔

شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کو اس کی معصیتوں میں استعمال نہ کیا جائے۔

حضرت سرّی سقطی رحؒ نے اس جواب کو بیحد پسند فرمایا۔ (ص ۱۱۹ و ۲۶۸ ج ۱۰)

(۴) فرمایا کہ

الإنسان لا يعاب بما في طبعه، إنما يعاب إذا فعل بما في

طبیعہ - (ص ۲۶۹)

جب تک کوئی بُری بات انسان کی طبیعت (دل) میں رہے' اس وقت تک وہ کوئی عیب نہیں، ہاں جب وہ طبیعت کی اس بات پر عمل کرلے تو یہ عیب کی بات ہے۔

یہ بعینہ وہ بات ہے جو حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ و ملفوظات میں ملتی ہے کہ جب تک رذائل کے مقتضا پر عمل نہ کیا جائے، اُس وقت تک وہ رذائل مُضر نہیں ہوتے۔

(۵) ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ "مجھے دُنیا میں پیش آنے والا کوئی واقعہ ناگوار نہیں ہوتا، اس لیے کہ میں نے یہ اصول دل میں طے کر رکھا ہے کہ یہ دُنیا رنج و غم اور بلا اور فتنہ کا گھر ہے، لہٰذا اس کو تو میرے پاس بُرائی ہی لے کر آنا چاہیئے لہٰذا اگر کبھی وہ کوئی پسندیدہ بات لے کر آئے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' ورنہ اصل وہی پہلی بات ہے۔" (ص ۲۷۰)

(۶) ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ "دنیا" (جس سے پرہیز کی تاکید کی جاتی ہے) کیا ہے؟ فرمایا،

مادنا من القلب، و شغل عن اللہ

جو دل کے قریب آجائے، اور اللہ تعالیٰ سے غافل کردے۔ (ص ۲۷۴)

(۷) ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ "متی تصیر النفس داءھا دواءھا؟" ایسا کب ہوتا ہے کہ نفس کے امراض خود اس نفس کا علاج بن جائیں؟ آپ نے برجستہ جواب دیا،

اذا خالفت ھواءھا صار داءھا دواءھا

جب تم نفس کی مخالفت کرو تو اس کی بیماری ہی اس کا علاج بن جاتی ہے۔ (ص ۲۷۴)

یہ تو چند مثالیں ہیں' ورنہ آپ کے تمام ملفوظات اسی قسم کی حکمتوں سے لبریز ہیں۔

ابوبکر عطارؒ کہتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ کی وفات کے وقت میں ان کے پاس حاضر تھا، وہ اس وقت بیٹھے نماز پڑھ رہے تھے، اور سجدے کے وقت اپنے پاؤں کو دُہرا کر لیتے تھے، یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کے پاؤں سے رُوح نکل گئی۔ اور اس کو حرکت دینا ممکن نہ رہا۔ لیکن آپ پھر بھی عبادت میں مشغول رہے، کسی نے کہا کہ "آپ لیٹ جاتے تو اچھا تھا" فرمایا کہ "یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان کا وقت ہے، اللہ اکبر" اور پھر اسی حالت میں آپؒ کی وفات ہوگئی۔ سنِ وفات ۲۹۷ھ ہے۔

ان تینوں بزرگوں کے مزارات ایک ہی احاطے میں واقع ہیں، اور اس کے آس پاس دُور تک قبروں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان حضرات کے مزارات تو معلوم ہوگئے، لیکن اس قدیم قبرستان میں نہ جانے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور جہد و عمل کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب روپوش ہوں گے، بغداد صدیوں تک عالمِ اسلام کا دار الحکومت علماء و اولیاء اور مجاہدین و شہداء کا مرکز رہا ہے۔ اس کے قبرستانوں کا چپہ چپہ عالمِ اسلام کی برگزیدہ شخصیات کے انوار سے منور ہے، لیکن پندرھویں صدی کے ایک انجان مسافر کے لیے ان شخصیات کی تلاش اور پہچان ناممکن تھی، حضرت والد صاحبؒ کا شعر یاد آگیا ؎

ڈھونڈیں ہم اب نقوش سبک رفتگاں کہاں؟
اب گردِ کارواں بھی نہیں کارواں کہاں؟

چنانچہ اجمالی طور پر قبرستان کے تمام مکینوں پر فاتحہ پڑھ کر آگے روانہ ہوئے بغیر چارہ نہ تھا۔

کاظمیہ میں:

ان بزرگوں کے مزارات پر حاضری کے بعد ہم حضرت موسیٰ الکاظم رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔ جو بغداد کے مغربی حصے رصافہ میں واقع ہے۔ اس مزار کی وجہ سے اس پورے علاقے کا نام "کاظمیہ" ہے۔

حضرت موسیٰ الکاظم رحمۃ اللہ علیہ حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے

ہیں، ورع و تقویٰ اور علم و فضل میں خانوادۂ نبوت کے اوصاف کے امین اور اپنے زمانے میں مسلمانوں کے مرجع اور امام تھے۔ علم حدیث میں بھی آپ مقام بلند کے حامل تھے۔ امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے آپ کی احادیث روایت کی ہیں۔ (الخلاصۃ للخزرجی ص ۳۹۰)

آپ مدینہ طیبہ میں مقیم تھے، خلیفۂ وقت مہدی کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ شاید یہ اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کریں گے، اس لیے اُس نے آپ کو قید کر دیا۔ لیکن اسی قید کے دوران اسے خواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت ہوئی۔ دیکھا کہ حضرت علیؓ مہدی کو خطاب کر کے یہ آیت تلاوت فرما رہے ہیں :۔

فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض وتقطعوا ارحامکم۔ (سورۃ محمدؐ : ۲۲)

تو کیا تم سے یہی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم زمین میں فساد مچاؤ، اور رشتے داریاں کاٹ ڈالو۔

مہدی کی آنکھ کھلی تو رات ابھی باقی تھی، لیکن صبح تک انتظار کرنے کا حوصلہ نہ ہوا، اپنے وزیر کو اسی وقت بلوایا، اور حکم دیا کہ حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کو اسی وقت یہاں لے آؤ، حضرتؒ تشریف لائے تو مہدی نے اعزاز و اکرام کے ساتھ ان سے معانقہ کیا، اپنے پاس بٹھایا، اور خواب بیان کر کے کہا کہ: "کیا آپ مجھے یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ اگر میں آپ کو رہا کر دوں تو آپ میرے یا میری اولاد کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے؟" حضرتؒ نے جواب دیا: "خدا کی قسم! نہ میں نے کبھی ایسا کیا ہے، اور نہ یہ میری فطرت ہے" یہ سن کر مہدی نے آپ کو تین ہزار دینار ہدیہ پیش کیا، اور رہا کر دیا۔ مہدی کے وزیر ربیع کا کہنا ہے کہ میں نے راتوں رات ہی اس حکم کی تنفیذ کی، اور چونکہ خطرہ تھا کہ کہیں کوئی اور رکاوٹ پیش نہ آ جائے، اس لیے پو پھٹنے سے پہلے ہی ان کو مدینہ طیبہ کے راستے پر روانہ کر دیا۔ (صفۃ الصفوہ لابن الجوزیؒ ص ۱۰۴ ج ۲)

لیکن بعد میں جب ہارون رشید خلیفہ بنا تو اس کو بھی شاید اسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو گئی، چنانچہ جب وہ حج کے لیے حجاز گیا تو وہاں سے حضرت موسیٰ الکاظم رحمۃ اللہ علیہ

کو ساتھ لے کر آیا۔ اور بغداد میں آپ کو دوبارہ قید کر دیا، اور اسی قید کی حالت میں آپ کی وفات ہوئی۔ اس دوسری قید کے دوران آپ نے ہارون رشید کو جو ایک مختصر خط لکھا ہے وہ اپنی بلاغت اور تاثیر کا شاہکار ہے، اور اس کو جتنی بار پڑھا جائے، اس میں حکمت و موعظت کی ایک کائنات سمٹی ہوئی نظر آتی ہے، فرمایا:۔

إنه لن ينقضي عني يوم من البلاء إلّا انقضى عنك معه يوم من الرخاء، حتى نفضي جميعا إلى يوم ليس له انقضاء، يخسر فيه المبطلون۔ (صفة الصفوة ص ۱۰۵ ج ۲)

اس دریا بکوزہ فقرے کی اصل تاثیر تو عربی زبان ہی میں ہے، لیکن اُردو میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

"میری اس آزمائش کا جو دن بھی کٹتا ہے، وہ تمہاری عیش و عشرت کا ایک دن اپنے ساتھ کاٹ کر لے جاتا ہے، یہاں تک کہ ہم دونوں ایک ایسے دن تک پہنچ جائیں گے جو کبھی کٹ نہیں سکے گا۔ اُس دن خسارہ اُن لوگوں کا ہوگا جو باطل پر ہیں۔"

حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے، کثرتِ عبادت کی بنا پر ان کا لقب "العبد الصالح" مشہور تھا، جود و سخا میں بھی یکتا تھے، جب کسی شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ آپ کی غیبت کرتا ہے تو اس کے پاس کوئی مالی ہدیہ بھیج دیتے۔ ہارون رشید کی قید ہی میں ۵ رجب ۱۸۳ھ کو وفات ہوئی۔

(الطبقات الکبریٰ للشعرانی، ص ۳۳ ج ۱)

اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد بھی اُن کے مزار کو یہ مقام بخشا کہ بزرگوں کے تجربے کے مطابق وہاں جو دُعا کی جائے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں۔ ابو علی خلّال کہتے ہیں کہ "مجھے جب بھی کوئی پریشانی پیش آئی تو میں حضرت موسیٰ بن جعفرؒ کے مزار پر گیا، اور ان کے توسّل سے دُعا کی، اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ میرے مقصد کو آسان فرما دیا۔" (تاریخ بغداد للخطیب ص ۱۲۰ ج ۱)

یہاں تک تو بات صحیح تھی، لیکن حدود کی فہم نہ رکھنے والے نادان معتقدین نے اس

مقدس بزرگ کے مزار کو نہ جانے کیا بنادیا ہے، وہاں ہر وقت بدعات اور بدعقیدگی کا وہ طوفان برپا رہتا ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو سُنّت کے مطابق قبر کی زیارت کرنا چاہتا ہو، وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ اہلِ تشیع کے نزدیک حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ بارہ اماموں میں سے ایک ہیں، اس لیے ان کے مزار پر جو عمارت تعمیر کی گئی ہے، وہ فنِ تعمیر کا بھی ایک نمونہ ہے، اس کے میناروں اور دروازوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے جو دُور سے چمکتا نظر آتا ہے، اور اس مزار پر ہر وقت ایک میلے کا سماں رہتا ہے۔ کوئی عمارت کا حُسن دیکھنے آرہا ہے، کوئی اُسے (معاذ اللہ) کعبہ بنائے ہوئے ہے، اور مزار کی جالیاں چوم چوم کر اس کا طواف کر رہا ہے۔ کوئی صاحبِ مزار کو بذاتِ خود حاجت رَوا سمجھ کر انہی سے اپنی مرادیں مانگ رہا ہے۔ مزار کے آس پاس دُور تک زائرین کے قیام کے لیے ہر طرح کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں کچھ لوگ مزار کی زیارت کرانے کے لیے باقاعدہ مزدور بنے ہوئے ہیں، کچھ لوگ پھولوں کی تجارت کر رہے ہیں کہ آنے والے ان سے پھول خرید کر مزار پر نچھاور کریں، کچھ لوگ نقد روپے اور سکے لالا کر مزار کی جالیوں میں ڈال رہے ہیں، اور اسی کو اپنے لیے باعثِ نجات سمجھے بیٹھے ہیں ـــــ جہالت اور بداعتقادی کے اس سیلاب میں یہ سوچنے کی فرصت کسے ہے کہ خود صاحبِ مزار ان تمام لغویات سے بری ہیں۔ اگر اپنی وفات کے بعد اُن کا اختیار چلتا تو ان کا مزار سنّت کے مطابق ایک سادہ کچی قبر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ نہ قبر پختہ ہوتی، نہ اس پر یہ جھلمل کرتا ہُوا محل بنتا، نہ کسی کی یہ مجال ہوتی کہ وہاں کسی بدعت یا شرک کا ادنیٰ شائبہ رکھنے والے کسی فعل کا ارتکاب کر سکے۔

بدعات و رسوم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ان کی کوئی خاص شکل عموماً عالمگیر نہیں ہوتی، بلکہ ہر علاقے میں اس کی کوئی الگ صورت نظر آتی ہے۔ چونکہ ان رسوم و بدعات کی کوئی بنیاد قرآن و سنّت میں نہیں ہوتی، اس لیے ہر علاقے کے لوگ اپنی اپنی طبیعت کے مُطابق کچھ رسمیں گھڑ لیتے ہیں جن کی دوسرے علاقے میں بعض اوقات خبر بھی نہیں ہوتی، اور وہاں لوگ کچھ اور طرح کی رسوم کے پابند ہوجاتے ہیں۔ مزارات پر کی جانے والی بدعات میں

میں بھی یہ بات نظر آتی ہے، بعض رسمیں تو عراق کے مزارات میں وہی نظر آئیں جو ہم پاکستان ہندوستان میں دیکھتے آئے ہیں، اور بعض ایسی نئی نئی رسوم بھی نظر آئیں جو ہمارے ملکوں میں رائج نہیں ہیں۔

ایک بے بس مسافر ان بزرگوں کے مزارات کے ساتھ ہونے والی ان زیادتیوں پر کڑھنے اور اُن مذہبی رہنماؤں کے حق میں دُعائے ہدایت کے سوا اور کیا کر سکتا ہے جنہوں نے بھولے بھالے اَن پڑھ عوام کو ان بزرگوں کی حقیقی تعلیمات سے روشناس کرانے کے بجائے ان لغو بدعات و رسوم میں اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔

---

(۴)

امام ابُو یُوسفؒ کے مزار پر:

حضرت موسیٰ الکاظمؒ کے مزار ہی کے احاطے میں جنوبی جانب ایک مسجد "جامع ابی یوسفؒ" کے نام سے بنی ہوئی ہے۔ اسی مسجد کے ایک حصے میں حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہاں حاضری ہوئی۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اُمت کے ان عظیم محسنوں میں سے ہیں جن کے احسانات سے اس امت کی گردن ہمیشہ جھکی رہے گی۔ خاص طور پر فقہ حنفی کے پیروؤں کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے نہ صرف بحیثیت فقیہ اپنے شیخ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے علوم کو امت کی طرف منتقل کیا، بلکہ قاضی القضاۃ کی حیثیت سے اس فقہ کو محض نظریاتی حیثیت سے نکال کر جیتی جاگتی زندگی میں عملاً نافذ فرمایا۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے والد ابراہیم ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے، ان کی والدہ نے فکرِ معاش کی وجہ سے انہیں ایک دھوبی کے حوالے کر دیا، لیکن انہیں پڑھنے کا شوق تھا، یہ جا کر امام ابو حنیفہؒ کے درس میں بیٹھنے لگے۔ والدہ کو علم ہوا تو انہوں نے منع کیا اور

اس بنا پر وہ کئی روز امام ابو حنیفہؒ کے درس میں نہ جا سکے۔ ذہین اور شوقین طالب علم کی طرف استاذ کی توجہ طبعی بات ہے۔ جب کئی دن کے بعد وہ درس میں پہنچے تو امام صاحبؒ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے درس کے بعد انہیں بلایا، ایک تھیلی حوالے کی جس میں سو درہم تھے۔ اور فرمایا کہ "اس سے کام چلاؤ، اور جب ختم ہو جائیں تو مجھے بتانا" حضرت امام ابو یوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی مجھے امام صاحب کو یہ بتانے کی نوبت نہیں آئی کہ تھیلی ختم ہو چکی ہے، ہمیشہ جب پیسے ختم ہو جاتے، امام صاحبؒ خود ہی مزید پیسے عطا فرما دیتے، جیسے انہیں ختم ہونے کا الہام ہو جاتا ہو۔

ان کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہوں گی کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ کوئی مستقل ذریعۂ معاش ہونا چاہیئے۔ اس لیے ایک مرتبہ انہوں نے امام ابو حنیفہؒ سے کہا کہ یہ یتیم بچہ ہے میں چاہتی ہوں کہ کوئی کام سیکھ کر کمانے کے لائق ہو جائے، اس لیے آپ اسے اپنے درس میں شریک ہونے سے روکئے۔ لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ نے جواب دیا کہ "یہ تو پستے کے گھی میں فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے" والدہ نے اُسے مذاق سمجھا اور چلی گئیں۔

لیکن امام ابو یوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی علم کی بدولت وہ قدر و منزلت عطا فرمائی کہ میں قضاء کے منصب تک پہنچا، اور اس دوران بکثرت خلیفۂ وقت ہارون رشید کے دستر خوان پر کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ایک روز میں ہارون رشید کے پاس بیٹھا تھا کہ اس نے ایک پیالہ مجھے پیش کیا، اور بتایا کہ "یہ بڑی خاص چیز ہے جو ہمارے لیے بھی کبھی کبھی بنتی ہے" میں نے پوچھا: "امیر المومنین! یہ کیا ہے؟" کہنے لگے کہ: "یہ پستے کے روغن میں بنا ہوا فالودہ ہے" یہ سُن کر مجھے حیرت کی وجہ سے ہنسی آگئی۔ ہارون رشید نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اُسے سارا قصہ سنایا، وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا، اور کہنے لگا کہ "اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہؒ پر رحم فرمائے، وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو چشمِ سر سے نظر نہیں آسکتا۔" (تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۴۵، ج ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت امام ابو حنیفہؒ کی صحبت کی برکت سے علم و فقہ میں وہ مقام بخشا جو بہت کم کسی کو نصیب ہوتا ہے، فقہ کے علاوہ علمِ حدیث میں

بھی ان کا مقام مسلّم ہے: یہاں تک کہ جن حضرات نے غلط فہمیوں کی بنا پر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ پر علمِ حدیث میں جرح کی ہے، وہ بھی امام ابو یوسفؒ کو حدیث میں ثقہ مانتے ہیں۔ (دیکھیے کتاب الثقات، لابن حبانؒ) بلکہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے علمِ حدیث حاصل کرنا چاہا تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسفؒ کے پاس گیا، اس کے بعد دوسرے مشائخ سے علم حاصل کیا۔ (تاریخ بغداد، ص ۲۵۵ ج ۱۴)

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد تقریباً سترہ سال آپ قاضی کے منصب پر فائز رہے، اور اسلام میں "قاضی القضاۃ" کا لقب سب سے پہلے آپ ہی کے لیے استعمال ہُوا۔ لیکن حضرت یحییٰ بن معینؒ سے مروی ہے کہ منصبِ قضاء کی زبردست مصروفیات کے باوجود آپ یہ عہدہ سنبھالنے کے بعد دن اور رات میں ملا کر دو سو رکعتیں یومیہ پڑھا کرتے تھے۔ (مرآۃ الجنان للیافعیؒ ص ۳۸۲، ج ۱)

حضرت امام ابو یوسفؒ کو سب سے پہلے خلیفہ موسیٰ بن المہدیؔ نے قاضی بنایا تھا۔ اتفاق سے اسی کا ایک عام شہری سے ایک باغ کے سلسلے میں کچھ تنازعہ پیش آگیا، اور مقدمہ قاضی ابو یوسفؒ کے پاس آیا۔ خلیفہ موسیٰ کی طرف سے اس کی ملکیت پر گواہ پیش ہو گئے۔ اور گواہوں کی گواہی کی بنا پر بظاہر فیصلہ خلیفہ ہی کے حق میں ہونا تھا، لیکن امام ابو یوسفؒ کو کچھ شبہ ہو گیا کہ شاید حقیقت اس کے خلاف ہے جو گواہوں کی گواہی سے ظاہر ہو رہی ہے، اس لیے انہوں نے موسیٰ بن المہدی کو عدالت میں طلب کر کے ان سے کہا کہ "امیر المومنین! آپ کے فریقِ مخالف کا مطالبہ ہے کہ آپ سے یہ قسم لی جائے کہ آپ کے گواہوں نے سچّی گواہی دی ہے۔"

عام قاعدے کی رُو سے مدعی اگر اپنے دعوے پر قابلِ اعتماد گواہ پیش کر دے، تو مدعی کو قسم کھانے پر مجبور نہیں کیا جاتا، اس لیے موسیٰ نے پوچھا

"کیا آپ کی رائے میں اس طرح مدعی سے قسم لینا درست ہے؟"

امام ابو یوسفؒ نے جواب دیا، "قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا مسلک یہی تھا کہ وہ مدعی سے قسم لینے کو جائز سمجھتے تھے۔"

خلیفہ کو کسی مادی تنازعے میں قسم کھانا گوارا نہ تھا۔ اس لیے خلیفہ نے کہا: "میں باغ سے مدعا علیہ کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔"

چنانچہ باغ مدعا علیہ کو دلوا دیا گیا۔ (تاریخ بغداد ص ۲۴۹ ج ۱۴)

سترہ سال قضاء کی نازک ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد جب وفات کا وقت آیا تو امام ابو یوسفؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "الحمدللہ" میں نے جان بوجھ کر کسی مقدمے میں ناحق فیصلہ نہیں کیا۔ ہمیشہ کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی کوشش کی۔ اور جس مسئلے میں کبھی کوئی مشکل پیش آئی، اس میں امام ابو حنیفہؒ کے قول پر اعتماد کیا، کیونکہ میرے علم کے مطابق وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے بہترین شارح تھے۔"

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے کچھ حالات اسی مضمون میں بیان ہو چکے ہیں) امام ابو یوسفؒ کے ہمعصر تھے، ایک دن انہوں نے اپنے متوسلین میں سے کسی سے کہا کہ: "امام ابو یوسفؒ آجکل بیمار ہیں، اگر ان کا انتقال ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا۔" (مقصد یہ تھا کہ ان کی نماز جنازہ میں شرکت کریں)۔

وہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسفؒ کی حالت معلوم کرنے کے لیے ان کے گھر پہنچا تو وہاں سے جنازہ باہر نکل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اتنا وقت نہیں ہے کہ حضرت معروف کرخیؒ کو اطلاع کی جائے، اور وہ جنازے میں شریک ہو سکیں، اس لیے میں خود ان کی نمازِ جنازہ میں شامل ہو گیا، اور بعد میں حضرت معروف کرخیؒ کو سارا واقعہ بتایا۔ حضرتِ معروف کرخیؒ بار بار انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھتے رہے، اور جنازے میں شرکت نہ کر سکنے پر بہت افسوس کا اظہار کرنے لگے۔

جو عالم سترہ سال تک قضاء کے سرکاری منصب پر فائز رہا ہو، اُس کے بارے میں معاصرین کو اگر بدگمانیاں پیدا نہ ہوں تو کم از کم اُن کی بزرگی اور ورع و تقویٰ کا ایسا احساس باقی نہیں رہتا کہ حضرت معروف کرخیؒ جیسے صوفی بزرگ ان کے جنازے میں شریک نہ ہونے پر رنجیدہ ہوں۔ شاید اس لیے اُن صاحب نے حضرتِ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "ان کے جنازے میں شرکت نہ کرنے پر آپ کو اتنا افسوس کیوں ہے؟

حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا: "میں نے (غالباً خواب میں) دیکھا ہے کہ جیسے میں جنت میں گیا ہوں، وہاں ایک محل بن کر تیار ہوا ہے، اس کے دروازوں پر پردے لٹکائے گئے ہیں؟ میں نے پوچھا کہ: یہ محل کس کا ہے؟ مجھے جواب ملا کہ یہ قاضی ابو یوسفؒ کا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان کو یہ مرتبہ کس عمل کی بدولت ملا؟ جواب دیا گیا کہ: وہ لوگوں کو بھلائی کی تعلیم بھی دیتے تھے، اور خود بھی اس کے حریص تھے، اور لوگوں نے انہیں تکلیفیں بھی بہت پہنچائیں۔" (تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۶۱، ج ۱۴)

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر:

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے نکلے تو سورج ڈھلنے کے قریب تھا، اور اب دل میں شدید اشتیاق حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کا تھا جو یہاں سے کافی دور واقع ہے، لیکن ہمارے ڈرائیور نے جو صرف ڈرائیونگ نہیں بلکہ مہمان نوازی کے فرائض بھی بڑے خلوص و محبت کے ساتھ انجام دے رہا تھا، مغرب کے وقت جامع الامام الاعظمؒ میں پہنچا دیا۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک کی وجہ سے یہ پورا علاقہ "اعظمیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اب تو یہ شہر کا خاصا بارونق علاقہ ہے، لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ کے عہدِ مبارک میں یہ ایک قبرستان تھا، اور چونکہ خلیفہ کی کنیز "خیزران" یہاں دفن ہوئی تھی، اس لئے "مقبرۃ الخیزران" کے نام سے مشہور تھا۔ خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مشہور راوی محمد بن اسحاقؒ بھی اسی قبرستان میں مدفون ہیں، لیکن اب دوسری قبریں تو بے نشان ہو چکی ہیں، اور ان کی جگہ آبادی نے لے لی ہے، البتہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ابھی باقی ہے، اور اس کے قریب ایک شاندار مسجد "جامع الامام ابی حنیفہؒ" کے نام سے تعمیر کر دی گئی ہے۔

ہم مسجد کے دروازے پر پہنچے تو اذانِ مغرب کی دلکش صدا گونج رہی تھی۔ مزار پر حاضری سے پہلے مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر شوق و ذوق کے جذبات دل میں لیے

مزار پر حاضری ہوئی، تو ایسا محسوس ہوا کہ سرد رد سکون اور نورانیت نے مجسّم ہو کر اس مبارک مزار کے گرد ایک ہالہ بنا لیا ہے۔ سامنے وہ محبوب شخصیت آسودہ تھی جس کے ساتھ بچپن ہی سے تعلقِ خاطر کی کیفیت یہ رہی ہے کہ ان کا اسمِ گرامی آتے ہی دل میں عقیدت و محبت کی پھواریں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اُس دَور میں کُوفہ میں پیدا ہوئے جب یہ شہر علم و فضل کا مرکز بنا ہُوا تھا۔ اس کے چپّہ چپّہ پر بڑے بڑے محدثین اور فقہاء کے حلقہ ہائے درس آراستہ تھے، اور علمِ حدیث کا کوئی بھی طالب کُوفہ کے علماء سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت امام صاحبؒ کے والدِ ماجد کا نام ثابت تھا، اور ان کا انتقال امام صاحبؒ کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے بعد میں حضرتِ جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح کر لیا تھا، اور آپ ان کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھے۔

(حدائق الحنفیہ ص ۴۳ بحوالہ مفتاح السعادہ)

شروع میں حضرت امام صاحبؒ تجارت میں زیادہ مشغول رہے، لیکن ساتھ ساتھ علمِ عقائد و کلام سے بھی شغف تھا۔ حضرت عامر بن شراحیل شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ میں ذہانت و فطانت کے آثار دیکھے تو تحصیلِ علم میں انہماک کی نصیحت کی۔ یہ نصیحت کارگر ہوئی، اور آپ نے تجارت کے مشغلے کے بجائے تحصیلِ علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا (مناقب الامام الاعظم للمکی ص ۵۹ ج ۱) اور اپنے عہد کے بیشتر جلیل القدر مشائخ سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ بعض حضرات نے امام صاحبؒ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار تک بتائی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے علم و دین کی جو عظیم خدمت لی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اور اسی کا ثمرہ ہے کہ آج آدھی سے زائد مسلم دنیا نے قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر میں انہی کو اپنا امام اور مقتدا مانا ہُوا ہے۔

شروع میں حضرت امام صاحبؒ کُوفہ میں ہی مقیم رہے۔ لیکن کوفہ کے امیر ابن ہبیرہ نے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر آپ کو نہ صرف قید کیا، بلکہ اذیتیں بھی دیں۔ بالآخر جب آپ قید سے رہا ہوئے تو اس کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے مکّہ مکرمہ کا رُخ کیا، اور کئی سال وہاں مقیم

رہے، بعد میں جب عراق کے حالات سازگار ہوئے تو دوبارہ عراق تشریف لائے، اُس وقت عباسی خلافت کا آغاز ہو رہا تھا۔ شروع میں آپ نے اس اُمید پر عباسی خلافت کا خیر مقدم کیا کہ وہ دینی اعتبار سے بنو امیہ سے بہتر ثابت ہوں گے۔ لیکن جب یہ اُمید بر نہ آئی تو عباسی خلفاء سے بھی آپ کا اختلاف شروع ہو گیا۔ خلیفہ منصور اپنے عہد حکومت میں یہ چاہتا تھا کہ امام صاحبؒ کوئی سرکاری منصب قبول فرمالیں، تاکہ لوگوں کو ان کی حمایت کا تاثر دیا جاسکے، لیکن حضرت امام صاحبؒ اس لیے کوئی منصب قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس میں بعض خلافِ شرع امور میں سرکاری احکام کی تعمیل کرنی پڑے گی، بالآخر جب اصرار زیادہ بڑھا تو آپ نے بغداد کے معماروں کی نگرانی اور اینٹیں شمار کرنے کی ذمہ داری قبول فرمالی۔ بعد میں منصور کی طرف سے عہدۂ قضا قبول کرنے پر اصرار کیا گیا، لیکن حضرت امام صاحبؒ اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، جس کی پاداش میں منصور نے آپ کو قید بھی کیا، اور ایک سو دس کوڑے بھی لگوائے۔ پھر بعض روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قید کی حالت میں آپ کی وفات ہوئی، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ رہائی تو ہو چکی تھی، لیکن حکومت کی طرف سے فتویٰ دینا اور گھر سے باہر لوگوں سے میل جول رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی حالت میں وقتِ موعود آپہنچا۔ اور آپ دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اس طرح بغداد کے اس حصے کو آپ کی آرامگاہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ جگہ جہاں امام اعظمؒ کا مزار ہے، ایک قبرستان تھا جو "مقبرۃ الخیزران" کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن حضرت امام صاحبؒ کی تدفین کے بعد "اعظمیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے معتقدین نے یہاں ایک مسجد تعمیر کر لی، اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، یہی مسجد وسیع ہوتے ہوتے ایک شاندار جامع مسجد بن گئی، اور اس کی ایک مستقل تاریخ ہے جس پر مسجد کے موجودہ امام صاحب نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہمیشہ مرجع خاص و عام رہا۔ بلکہ خطیب بغدادیؒ اپنی سند سے امام شافعیؒ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:

إني لأتبرك بأبي حنيفة، وأجيئ إلى قبره في كل يوم۔ يعني زائرا۔ فإذا عرضت لي حاجة صليت ركعتين، وجئت إلى قبره وسألت الله تعالیٰ الحاجة عنده، فما تبعد عني حتى تقضى۔ (تاریخ بغداد ص ۱۲۳، ج ۱)

"مَیں امام ابو حنیفہؒ سے برکت حاصل کرنے کے لیے روزانہ ان کی قبر پر جاتا ہوں، اور جب کبھی مجھے کوئی ضرورت لاحق ہوتی ہے مَیں دو رکعتیں پڑھ کر ان کی قبر پر حاضر ہوتا ہوں، اور وہاں اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کا سوال کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ میری حاجت جلد پوری فرما دیتے ہیں۔"

اور یہ بات تو بہت مشہور ہے ہی، کہ ایک مرتبہ امام شافعیؒ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو وہاں اپنے مسلک کے خلاف نماز فجر میں قنوت نہیں پڑھا، کیونکہ امام ابو حنیفہؒ اس کے قائل نہیں تھے۔

حضرت امام صاحبؒ کے مزار پر بیٹھ کر ایسا سرور و سکون محسوس ہُوا جیسے کوئی بچہ ماں کی آغوش میں پہنچ کر سکون محسوس کرتا ہے۔ دل چاہتا تھا کہ یہ کیفیت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے۔ لیکن کافی دیر ہو چکی تھی۔ اُٹھے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بادلِ ناخواستہ یہاں سے رُخصت ہوئے۔

کتب خانوں میں :

رات ہو چکی تھی، اس لیے حضرت امام صاحبؒ کے مزار پر حاضری کے بعد خواہش یہ تھی کہ یہاں کے تجارتی کتب خانوں سے ایسی کتابیں خریدی جائیں جو پاکستان میں دستیاب نہیں ہیں۔ چنانچہ وہاں سے بغداد کے سب سے بارونق اور مرکزی علاقے "باب الشرقی" پہنچے، عرصۂ دراز سے ذہن پر تاثر یہ تھا کہ دُنیا بھر میں عربی کتابوں کا سب سے بڑا اسٹاکسٹ بغداد کا مکتبۃ المثنیٰ ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے ہم نے اس کی کتابوں کی فہرست منگوائی تھی تو وہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھی، اس لیے اپنے رہنما عبدالرزاق صاحب سے ہم

نے وہیں جانے کی خواہش ظاہر کی، خیال یہ تھا کہ تنہا اس ایک مکتبہ ہی سے اتنی کتابیں مل جائیں گی کہ کہیں اور جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

لیکن جب پتہ پوچھتے پوچھتے "مکتبہ المثنیٰ" پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں کتابوں سے زیادہ اسٹیشنری کا سامان برائے فروخت رکھا تھا، میں سمجھا کہ ہم غلط جگہ آگئے ہیں، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ اب مکتبۃ المثنیٰ کی وہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ غالباً اصل مالک کا انتقال ہو گیا، اور وارثوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اسے اچھی طرح سنبھال سکے، اس لیے وہ ختم ہوتے ہوتے درسی کتابوں، ناولوں، افسانوں اور اسٹیشنری کی دکان بن کر رہ گیا۔ انقلابات زمانہ کا یہ منظر اس درجہ عبرت خیز تھا کہ کافی دیر تک دل اس سے متاثر رہا۔ انسان دنیا کی کس چیز پر بھروسہ کر سکتا ہے؟ ماعندکم ینفد و ما عند اللہ باق۔

تاہم آس پاس کچھ اور کتب خانے موجود تھے، وہاں سے کچھ کتابیں خریدیں، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ایک عراقی دینار کی سرکاری قیمت چار ڈالر ہے، گویا تقریباً پینسٹھ پاکستانی روپے، تو مزید خریداری کا حوصلہ نہ رہا۔ وہ تو غنیمت یہ ہوا کہ احقر کے رفیق سفر جناب قاری بشیر احمد صاحب سعودی عرب کے کھلے بازار سے کچھ عراقی دینار تقریباً ایک ڈالر فی دینار کے حساب سے خرید لائے تھے، اس لیے جتنی کتابیں خریدیں، اُن میں زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اور بعض بڑے کام کی کتابیں مل گئیں۔ لیکن مزید خریداری بڑی مہنگی پڑنے والی تھی، دوسرے کتب خانوں میں پھرنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوا کہ غالباً جنگ کی وجہ سے کتابوں کا کوئی بہت بڑا ذخیرہ اب بغداد میں موجود نہیں ہے۔ اسلئے جتنی کتابیں لے چکے تھے، انہی پر قناعت کر کے ہوٹل واپس آگئے۔

وزارتِ اوقاف میں:

اگلی صبح دس بجے میزبانوں نے وزارتِ اوقاف کے دفتر میں مدعو کیا تھا، وہاں عراقی وزیر اوقاف عبداللہ فاضل صاحب سے ملاقات ہوئی جو بڑے خلیق، ہنس مکھ ملنسار

اور علم دوست آدمی ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان آئے تو دار العلوم بھی آئے تھے اور بفضلہ تعالیٰ یہاں کے اندازِ درس و تدریس اور حسنِ انتظام سے بڑے متأثر ہو کر گئے تھے، انھوں نے بڑی محبت اور گرمجوشی کا معاملہ کیا۔

عراق کی وزارتِ اوقاف اس لحاظ سے عالم اسلام کی تمام وزارتوں میں ممتاز ہے کہ اس نے نایاب اور نادر علمی و دینی کتابوں کو بڑے حسن اہتمام سے شائع کر کے ان کا ایک بڑا ذخیرہ تیار کر دیا ہے، وہ اب تک سو سے زائد ایسی نادر و نایاب کتابیں شائع کر چکی ہے جو اس سے پہلے مخطوطات کی شکل میں تھیں اور عام علمی دنیا ان سے استفادہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان کتابوں میں "المعجم الکبیر للطبرانی"، امام خصاف کی "ادب القاضی" پر حضرت صدر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شرح، امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج کی شرح "الرتاج" امام سُغدیؒ کی "النتف فی الفتاوی" علامہ قاسم بن قطلوبغا رحمۃ اللہ علیہ کی "موجبات الاحکام" وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اگر عراق کو جنگ کا سامنا نہ ہوتا تو اب تک یہ سلسلہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوتا۔

ان میں سے بہت سی کتابیں شائع ہو کر نایاب ہو چکی ہیں۔ ان میں جو کتب موجود تھیں، تین کارٹنوں پر مشتمل ان کا ایک سیٹ بھی وزیر موصوف نے ناچیز کو ھدیۃً دیا، جو احقر کے لیے انتہائی گرانقدر تحفہ تھا، اور سچ پوچھیے تو سفرِ عراق کے مقاصد میں سے احقر کا ایک اہم مقصد بھی تھا۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

مدائن میں :

وزارتِ اوقاف سے فارغ ہو کر ہم نے مدائن کا رُخ کیا، جو بغداد سے تقریباً پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بغداد سے نکل کر مدائن کی سڑک پر روانہ ہوئے تو دونوں طرف پھیلے ہوئے نخلستانوں کا سلسلہ نظر افروز ہوتا رہا، لیکن ملک چونکہ حالت جنگ میں ہے اور یہاں سے ایران کی سرحد کچھ زیادہ دُور نہیں، اس لیے جا بجا مورچے اور دمدمے بنے نظر آئے جن میں مسلح فوجی توپیں سنبھالے کھڑے تھے۔ عراق میں داخل ہونے کے بعد پہلی بار محسوس

ہُوا کہ یہ ملک حالتِ جنگ میں ہے، ورنہ بغداد کی چہل پہل رات کے وقت روشنیوں کے ہجوم اور معمول کے مطابق رواں دواں زندگی کو دیکھ کر اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس ملک میں کوئی جنگ ہو رہی ہے۔

لیکن ان جنگی مورچوں، دمدموں اور ان میں نظر آنے والے سپاہیوں اور ان کے اسلحہ کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوئی۔ حقیقت میں دشمن کون تھا؟ اور لڑائی کس سے شروع ہو گئی؟ عراق ہو یا ایران دونوں مسلم ملک ہونے کے دعویدار رہیں۔ دُنیا بھر کی سامراجی طاقتیں دونوں کی دشمن ہیں، یہ دونوں ملک متحد ہو کر ان دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرتے تو یہ اسلحہ، یہ سپاہی، یہ جنگی سازو سامان اُمت کے تحفظ، اس کی سلامتی اور عزت و آزادی کیلئے استعمال ہوتا، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ یہ دونوں ملک آپس میں لڑ بھڑ کر کمزور سے کمزور تر ہو رہے ہیں۔ دونوں طرف سے روزانہ کروڑوں روپیہ ایک بے مقصد جنگ میں پھُنک رہا ہے، دونوں ملکوں کے بیسیوں خاندان روزانہ اپنے رکھوالوں سے محروم ہو رہے ہیں، اور اسلام دشمن طاقتیں مزے کے ساتھ تماشا دیکھ رہی ہیں۔ اب تو ان ملکوں میں کوئی خاندان بمشکل ایسا ملے گا جس کا کوئی نہ کوئی عزیز اس بے مصرف لڑائی کی بھینٹ نہ چڑھ چکا ہو۔

جنگ کی ابتدا کس نے کی؟ اس بارے میں دونوں ملکوں کے بیانات مختلف ہیں لیکن اگر ابتداء کی سنگین غلطی عراق ہی سے سرزد ہوئی ہو، تب بھی اب کچھ عرصے سے عراق نے غیر مشروط جنگ بندی کی پیشکش کی ہوئی ہے، جسے قبول کر کے مسائل کو مفاہمت کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے، مگر ایران کی موجودہ حکومت کسی قیمت پر جنگ بند کرنے کے لیے تیار نہیں، خدا جانے ان کے سامنے کونسی منزل ہے؟ اور اس تباہ کن لڑائی کو جاری رکھنے سے کیا مقصد ان کے پیشِ نظر ہے؟

ابھی میں انہی خیالات میں محو تھا کہ مدائن کی آبادی شروع ہو گئی۔

---

(۵)

تھوڑی دیر میں دیکھتے ہی دیکھتے کار مدائن شہر میں داخل ہوگئی۔ اب تو یہ ایک چھوٹا شہر بلکہ قصبہ ہے، لیکن ساسانی حکومت کے دَور میں یہ ایران کا پایۂ تخت تھا، اور کسریٰ اسی شہر میں رہا کرتا تھا۔ اُس دَور میں دریائے دجلہ اس شہر کے بیچ سے گذرتا تھا، اور دجلہ کے مغربی حصّے کو بہرہ شیر اور مشرقی حصّے کو مدائن کہا جاتا تھا، اب دریا اس شہر سے ذرا دُور ہٹ گیا ہے، اور شہر اس کے مشرقی حصّے ہی میں آباد ہے۔

ایرانی بادشاہوں نے مدائن کو اس کی بہترین آب و ہوا اور عمدہ محل وقوع کی بنا پر اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا، اور اس میں ایک ایسا مستحکم قلعہ تعمیر کیا تھا جسے اپنی مضبوطی کی بنا پر ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن عرب کے وہ صحرا نشین جن کے ہاتھوں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیمیا اثر صحبت نے قیصر و کسریٰ کے استبداد سے انسانیت کی نجات مقرر کر دی تھی، بظاہر بے سروسامانی کے عالم میں اپنے بوسیدہ لباس اور بے آب تلواروں کے ساتھ یہاں پہنچے۔ شروع میں کسریٰ نے ان کو غیر اہم مدِمقابل سمجھ کر نظر انداز کیا، لیکن قادسیہ کے بلا خیز معرکے نے کسریٰ کی کمر توڑ دی تو وہ مدائن میں محصور ہو کر رہ گیا، وہ سمجھتا تھا کہ اس کا ناقابلِ تسخیر قلعہ اور اس کے سامنے بہتا ہوا دریائے دجلہ اسے مسلمانوں کی دست بُرد سے بچا سکے گا، لیکن اللہ کے جو بندے اس روئے زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے نکلے تھے، کوئی دریا اور کوئی پہاڑ اُن کی یلغار کا راستہ نہ روک سکا، اور بالآخر مدائن کا یہ شہر جو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا، اُس پر سے کسریٰ کی سطوت و جلال کا پرچم ایسا اُترا کہ پھر کبھی یہاں نہ لہرا سکا، اُس دن کے بعد سے آج تک یہ شہر مسلمانوں ہی کے تصرف میں چلا آتا ہے۔

مدائن میں داخل ہو کر سب سے پہلے ایک جامع مسجد آتی ہے، اس جامع مسجد کے احاطے میں تین صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم) مدفون ہیں، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت خذیفہ

بن یمانؓ اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ۔ ان تینوں کے مزارات پر حاضر ہو کر سلام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت سلمان فارسیؓ اصلاً ایران ہی کے باشندے اور ایک آتش پرست خاندان کے فرد تھے، لیکن حق کی تلاش نے انہیں آتش پرستی سے متنفر کر دیا تو اپنے آتش پرست باپ کے علی الرغم عیسائی مذہب قبول کر کے شام چلے گئے، اور شام اور عراق کے مختلف عیسائی علماء کی صحبت اختیار کی، بالآخر عموریہ کے ایک نصرانی عالم کے پاس پہنچے، اور ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ جب اس عالم کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ اب تک میں فلاں فلاں علماء کے پاس رہا ہوں، اب کہاں جاؤں؟ اس نصرانی عالم نے کہا کہ میں تمہیں کسی ایسے عالم کا پتہ بتانے سے قاصر ہوں جو بالکل صحیح راستے پر ہو، البتہ اب ایک نبیؐ کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے جو دینِ ابراہیمی پر ہوگا۔ عرب کی سرزمین میں مبعوث ہوگا، اور ایک سرزمین کی طرف ہجرت کرے گا، جو نخلستانوں سے معمور ہوگی، اگر تمہارے لیے اس نبیؐ کے پاس پہنچنا ممکن ہو تو ضرور پہنچ جانا۔ اس نبی کی تین علامتیں ہوں گی: ایک یہ کہ وہ صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے، دوسری یہ کہ وہ ہدیہ قبول کر لیں گے، اور تیسری یہ کہ ان کے شانوں کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی۔

نصرانی عالم کی وفات کے بعد حضرت سلمانؓ ایک قافلے کے ساتھ عرب کی طرف روانہ ہوئے لیکن قافلے کے ظالم ہمراہیوں نے راستے میں آپ کو ایک یہودی کے ہاتھ غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ وہ یہودی مدینہ طیبہ کا رہنے والا تھا، آپ کو مدینہ طیبہ لے آیا۔ اس سرزمین کے نخلستان دیکھ کر انہیں یقین سا ہو گیا کہ یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے میں نصرانی عالم نے بتایا تھا۔ اس یہودی کے پاس غلام بن کر کام کرتے ہوئے مدت گذر گئی۔ ایک دن یہ ایک درخت پر چڑھے ہوئے کام کر رہے تھے، اور ان کا یہودی آقا درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں اس یہودی کا ایک چچا زاد بھائی آیا، اور اس سے کہنے لگا کہ "خدا بنی قیلہ (انصار) کو ہلاک کرے کہ قباء میں ایک شخص کے گرد جمع ہیں جو مکہ سے آیا ہے، اور اسے نبی اور پیغمبر قرار دے رہے ہیں۔"

حضرت سلمانؓ خود فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ جملہ میرے کان میں پڑا تو میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہوگئی، اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں اپنے آقا کے اوپر گر پڑوں گا۔ دل کو تھام کر درخت سے نیچے اُترے، اور یہودی سے پورا واقعہ معلوم کرنا چاہا، لیکن جواب میں یہودی آقا نے ایک طمانچہ رسید کیا، اور اسی وقت حضورؐ کی خدمت میں پہنچنے کی آرزو دل ہی میں رہ گئی — لیکن شام کو کام سے فراغت کے بعد اپنی تھوڑی سی پونجی لے کر قبا پہنچے، اور جا کر وہ پونجی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی اور عرض کیا کہ آپ حضرات حاجت مند ہیں، اس لیے میں آپ کے اور آپ کے رفقاء کے لیے کچھ صدقہ پیش کرنا چاہتا ہوں، آپؐ نے اپنے لیے صدقہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور صحابہؓ کو لینے کی اجازت دی۔ حضرت سلمانؓ کے سامنے پہلی علامت ظاہر ہو چکی تھی۔ جب آپ قبا سے مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو حضرت سلمانؓ دوبارہ حاضرِ خدمت ہوئے اور صدقہ کے بجائے کچھ ہدیہ پیش کیا، آپؐ نے اسے قبول فرما لیا — یہ حضرت سلمانؓ کے لیے دوسری علامت تھی۔

دو چار روز کے بعد حضرت سلمانؓ پھر حاضرِ خدمت ہوئے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے کے ساتھ بقیع تشریف لائے تھے، صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت آپؐ کے ساتھ تھی، اور آپؐ درمیان میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے سلام کیا، اور تیسری علامت یعنی مہرِ نبوت دیکھنے کے لیے سامنے سے اُٹھ کر پیچھے آ بیٹھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پیچھے آنے کا مقصد سمجھ گئے، اور پشت مبارک سے چادر ہٹا دی۔ انہوں نے مہرِ نبوّت کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ تلاشِ حق کے طویل اور پُر مشقت سفر کی منزلِ مقصود سامنے تھی۔ جس ذاتِ اقدسؐ کے انتظار میں غریب الوطنی سے لے کر غلامی تک نہ جانے کتنی صعوبتیں جھیلی تھیں، آج وہ فردوسِ نظر بن چکی تھی، سالہا سال کی جدوجہد کا پھل اپنا تک سرورِ قرار کی شکل میں نظروں کے سامنے آیا، تو دل میں اُمڈتے ہوئے وہ طوفان جو نہ جانے کب سے سینے میں روپوش تھے، آنسوؤں کے دھارے کی شکل میں نگاہوں سے پھوٹ نکلے، آگے بڑھ کر مہرِ نبوّت کو بوسہ دیا، اور برسوں سے رُکے ہوئے عقیدت و اخلاص کے

آنسوؤں کی سوغات اُس کی نذر کر دی۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان کے رونے کا احساس ہُوا اپنے سامنے بُلایا، ان سے ماجرا دریافت کیا، انہوں نے اپنی ساری سرگزشت سنائی، اور آپ کے دستِ مُبارک پر مشرّف باسلام ہوئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو غریب الوطنی اور اسلام کی راہ میں مشقتیں جھیلنے کا حوصلہ عطا فرمایا، اُس پر حضرت سلمانؓ نہ صرف وطن اور خاندان کی، بلکہ دُنیا و مافیہا کی ساری راحتیں قربان کر سکتے تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

سلمان منّا آھل البیت

سلمان ہمارے اہلِ بیت میں سے ہیں۔

ایک طرف عزّت و تکریم کا یہ مقام تھا کہ سرورِ کائناتؐ نے اُنہیں اپنے اہلِ خاندان میں سے قرار دیا، اور دوسری طرف یہودی کی غلامی اب بھی باقی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں مشورہ دیا کہ اس یہودی سے کتابت کا معاملہ کرو، یعنی یہ کہ اُسے کچھ رقم دے کر آزادی حاصل کر لو، یہودی نے آزادی کی جو شرائط عائد کیں وہ تقریباً ناقابلِ عمل تھیں، کہا کہ چالیس اوقیہ سونا ادا کرو، اور کھجور کے تین سو درخت لگادو، جب ان درختوں پر پھل آجائے گا تو تم آزاد ہو گے۔ تین سو کھجور کے درختوں پر پھل آنے کے لیے ایک عمر درکار تھی، لیکن رحمۃٌ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابۂ کرامؓ کو ترغیب دی کہ وہ کھجور کے پودوں سے حضرت سلمانؓ کی امداد کریں۔ چنانچہ صحابۂ کرامؓ کے تعاون سے کھجور کے تین سو پودے جمع ہو گئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا کہ ان پودوں کے لیے گڑھے تیار کرو۔ جب گڑھے تیار ہو گئے تو آپؐ بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے، اور تمام درخت خود اپنے دستِ مبارک سے لگائے، اور برکت کی دُعا فرمائی۔ پودے اس مقدس ہاتھ سے لگے تھے جس نے دلوں کی ویران کھیتیاں سیراب کی تھیں، اور جس نے چند ہی سالوں میں حق کے تناور درخت اُگائے تھے، اس مبارک ہاتھ کا یہ معجزہ ظاہر ہُوا کہ ان تمام کھجور کے درختوں پر ایک ہی سال میں پھل آگیا، اور حضرت سلمانؓ کی آزادی کی سب سے مشکل شرط پوری ہو گئی۔

اب، چالیس اوقیہ سونے کی شرط باقی تھی، ایک مرتبہ آپؐ کے پاس کہیں سے سونا آیا تو آپؐ نے حضرت سلمان رضؓ کے حوالے فرما دیا کہ اس کے ذریعے آزادی حاصل کریں۔ بظاہر سونا چالیس اوقیہ سے بہت کم تھا، لیکن جب حضرت سلمانؓ نے وزن کیا تو پُورا چالیس اوقیہ نکلا، اور اس طرح رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت انہیں غلامی سے رہائی نصیب ہوئی۔ غلامی کی وجہ سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہٗ غزوہ بدر اور غزوۂ احد میں شریک نہیں ہو سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا پہلا غزوہ غزوۂ احزاب تھا، اور اس غزوے میں آپ ہی کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ مسلسل جہاد میں حصّہ لیتے رہے، خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب ایرانؔ پر لشکر کشی ہوئی تو اس میں آپ نے ایک نمایاں سالار کی حیثیت سے حصّہ لیا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں عرب مسلمان آپ کی کمان میں جہاد کرتے تھے۔ اور جامع ترمذی میں روایت ہے کہ جب ایرانؔ کے کسی قلعے پر حملہ کرنا ہوتا تو پہلے حضرت سلمان فارسیؓ انہیں دعوتِ اسلام دیتے، اور یہ بتاتے کہ میں ایرانی ہونے کے باوجود اسلام کی بدولت عربوں کا امیر بنا ہُوا ہوں۔

ایرانؔ فتح ہونے کے بعد آپ نے مدائنؔ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا، کچھ عرصے وہاں کے گورنر بھی رہے، لیکن اپنی امارت کے زمانے میں بھی اتنے سادہ رہتے کہ دیکھ کر کوئی شخص انہیں امیرِ مدائنؔ نہ سمجھ سکتا تھا۔

ایک مرتبہ شامؔ کا ایک تاجر کچھ سامان لے کر مدائنؔ آیا تو حضرت سلمانؓ ایک عام آدمی کی طرح سڑکوں پر پھر رہے تھے۔ شامؔ کا وہ تاجر انہیں مزدور سمجھا، اور ان سے کہا کہ یہ گٹھڑی اُٹھا لو۔ حضرت سلمانؓ نے کسی تأمل اور توقف کے بغیر گٹھڑی اُٹھالی، کچھ دیر بعد مدائنؔ کے باشندوں نے انہیں بوجھ اُٹھائے دیکھا تو اس شامی تاجر سے کہا کہ "یہ امیرِ مدائنؔ ہیں" اس پر وہ تاجر بہت حیران بھی ہُوا اور شرمندہ بھی، اور حضرت سلمانؓ سے معذرت کے ساتھ درخواست کی کہ وہ بوجھ اتار دیں، لیکن حضرت سلمانؓ راضی نہ ہوئے، اور فرمایا کہ "میں نے ایک نیکی کی نیّت کر لی ہے، اب جب تک وہ پوری نہ ہو، یہ سامان نہیں اُتاروں

گا، چنانچہ وہ سامان منزل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ (طبقات ابن سعد ص ۸۸، ج ۴)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مدائن ہی میں ہوئی، اور یہیں آپ کو دفن کیا گیا، آپ کی قبرِ مبارک پر آج بھی یہ حدیث کندہ ہے کہ:

"سلمان منا اهل البيت"

---

(۶)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ:

حضرت سلمان فارسیؓ کے مزار کے قریب ہی دو مزارات اور ہیں: ان میں ایک حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا ہے، اور دوسرے صاحبِ مزار کا نام حضرت عبد اللہ بن جابرؓ لکھا ہوا ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور جلیل القدر صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں۔ یہ قبیلۂ بنو عبس سے تعلق رکھتے تھے، اور اپنے وطن ہی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ اسلام لے آئے تھے، جن کا اصل نام "حسل" تھا اور لقب "یمان"۔ اسلام لانے کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے یہ ٹھیک وہ وقت تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کی تیاری فرما رہے تھے اور آپ کے مقابلے کے لیے ابوجہل کا لشکر مکہ مکرمہ سے روانہ ہو چکا تھا۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد کی راستے میں ابوجہل کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے دونوں کو گرفتار کر لیا، اور کہا کہ تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ "ہم تو مدینہ جا رہے ہیں"۔ اس پر ابوجہل کے لشکر والوں نے ان سے کہا کہ "ہم تمہیں اس وقت تک آزاد نہیں کریں گے جب تک تم ہمارے ساتھ یہ

معاہدہ نہ کرو کہ صرف مدینہ جاؤ گے، لیکن ہمارے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ نہیں دو گے۔"
مجبوراً ان حضرات نے معاہدہ کر لیا، اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں پہنچ کر آپ سے سارا واقعہ ذکر کیا۔

اُس وقت حق و باطل کا سب سے پہلا معرکہ درپیش تھا۔ مقابلہ ان کفارِ قریش
سے تھا جو اسلحہ میں غرق ہو کر آئے تھے، اور جن کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں تین گنے سے
بھی زائد تھی۔ اور مسلمانوں کے لیے ایک ایک آدمی بڑا قیمتی تھا۔ لیکن سرکارِ دوعالم صلی اللہ
علیہ وسلم نے سنگین حالات میں بھی معاہدے کی خلاف ورزی کو گوارا نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ:

نفی بعهدهم، ونستعین الله علیهم

"ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے، اور کفار کے خلاف اللہ تعالیٰ
سے مدد مانگیں گے۔"

(صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الوفاء بالعہد (نمبر ۱۷۸۷) و مسند احمد ج ۵ ص ۳۹۵ و
مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۷۹)

اس بنا پر آپ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ امانت اور وفا کی ایسی تابناک مثالیں کسی
اور قوم کی تاریخ میں کہاں مل سکتی ہیں۔؟

غزوۂ احد میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ شریک ہوئے، لیکن ایک افسوسناک
غلط فہمی کی بنا پر ان کے والد ماجد حضرت یمان رضی اللہ عنہ خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید
ہو گئے۔ چونکہ یہ حادثہ غلط فہمی میں پیش آیا تھا، اس لیے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائیوں کو
خوں بہا بھی معاف فرما دیا۔ (صحیح بخاری وغیرہ)

غزوۂ احزاب میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کی آخری رات میں آپ کو کفار کے لشکر کی
خبر گیری کے لیے بھیجا تھا، اور انہوں نے انتہائی جرأت و شجاعت اور حکمت و تدبر کے
ساتھ یہ خطرناک مہم انجام دی، یہاں تک کہ کفار کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مردم شماری بھی آپ ہی کے سپرد

فرمائی تھی۔ جسے آپ نے بطریقِ احسن انجام دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی۔
(صحیح مسلم، کتاب الایمان نمبر ۱۴۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو آنے والے فتنوں کے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا تھا، اور بہت سے منافقین کی نشان دہی بھی فرما رکھی تھی۔ اسی لیے آپ کو "صاحبُ السّر" (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز دار) کہا جاتا تھا۔ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ کو قسم دے کر پوچھا کہ "میرا نام تو منافقین کی فہرست میں شامل نہیں"۔ حضرت حذیفہؓ نے انکار فرمایا۔ (کنز العمال ص ۳۴۴، ج ۱۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ مسلسل مصروفِ جہاد رہے، دینور کا علاقہ آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے فتح ہوا۔ عراق اور ایران کی فتوحات میں آپ نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ کسریٰ کے دربار میں آپ ہی نے وہ ولولہ انگیز تقریر فرمائی جس نے کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ برپا کر دیا۔

ایران کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے آپ کو مدائن کا عامل (گورنر) مقرر فرما دیا تھا۔ آپ کسریٰ کے دارالحکومت کے گورنر بن کر پہنچے تو اس شان سے کہ ایک دراز گوش پر سوار تھے، جس کے پالان کے ساتھ تھوڑا سا زادِ راہ رکھا ہوا تھا۔ اہلِ مدائن نے آپ کا استقبال کیا، اور پیشکش کی کہ ہم آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے جواب دیا:

طعاما آکله، وعلف حماری هذا من تبن

"بس میرے لیے یہ کافی ہے کہ مجھے اپنے کھانے کے لیے کھانا مل جائے.
اور میرے اس دراز گوش کا چارہ۔"

عرصہ دراز تک حضرت حذیفہؓ اسی سادگی کے ساتھ مدائن کے گورنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، ایک مرتبہ یہاں سے مدینہ طیبہ گئے تو حضرت عمرؓ پہلے سے راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے، مقصد یہ تھا کہ اگر مدائن سے کچھ مال و دولت لے کر آتے ہوں تو پتہ چل جائے، لیکن دیکھا کہ وہ جس حال میں گئے تھے، اسی حال میں واپس آگئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔

(سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۳۶۶ ج ۲)

حضرت حذیفہ بن یمان رضؓ آخر میں مدائن ہی میں مقیم رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چالیس دن بعد آپ نے مدائن ہی میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

حضرت عبداللہ بن جابر رضؓ:

انہی کے برابر میں دوسرے مزار پر صاحب مزار کا نام "عبداللہ بن جابرؓ" لکھا ہوا ہے۔ آپ کے بارے میں احقر کو پوری تحقیق نہ ہو سکی کہ کون بزرگ ہیں، جہاں تک حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق ہے، وہ مشہور انصاری صحابی ہیں لیکن اُن کا قیام مدینہ طیبہ ہی میں رہا، اور وہیں اُن کی وفات ہوئی۔ (الاصابہ ص ۲۱۴ ج ۱)

عبداللہ بن جابرؓ نام کے دو صحابہ کرامؓ کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، ایک عبداللہ بن جابر الانصاری البیاضیؓ ہیں اور دوسرے عبداللہ بن جابر العبدیؓ۔ لیکن دونوں بزرگوں کے نہ حالات دستیاب ہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ انہوں نے کہاں وفات پائی، (ملاحظہ ہو الاصابہ ص ۲۷۷ ج ۲) لہٰذا ایک احتمال تو یہ ہے کہ صاحب مزار ان میں سے کوئی بزرگ ہوں۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ آپ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ کے صاحبزادے ہوں، اور مدائن میں آکر مقیم ہو گئے ہوں، لیکن معمولی جستجو سے احقر کو حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ کے صاحبزادوں کا کوئی تذکرہ نہیں مل سکا جس سے اس احتمال کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے۔

بہر کیف! اس علاقے میں مشہور یہی ہے کہ یہ صحابہ میں سے ہیں۔

ایک عجیب ایمان افروز واقعہ:

حضرت حذیفہ بن یمان رضؓ اور حضرت عبداللہ بن جابر رضؓ کے مزارات کے ساتھ اسی صدی میں ایک عجیب و غریب اور ایمان افروز واقعہ رونما ہوا جو آجکل بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ واقعہ میں نے پہلی بار جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مدظلہم سے سنا تھا۔ پھر بغداد میں وزارت اوقاف کے ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ جناب خیر اللہ حدیثی صاحب نے

بھی اجمالاً اس کا ذکر کیا۔

یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے، اس وقت عراق میں بادشاہت تھی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضؓ اور حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہما کی قبریں اُس وقت یہاں (جامع مسجد سلمان رضؓ کے احاطے میں) نہیں تھیں، بلکہ یہاں سے کافی فاصلے پر دریائے دجلہ اور مسجد سلمان کے درمیان کسی جگہ واقع تھیں۔

۱۹۲۹ء میں بادشاہِ وقت نے خواب میں دیکھا کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضؓ اور حضرت عبداللہ بن جابر رضؓ اس سے فرما رہے ہیں کہ ہماری قبروں میں پانی آرہا ہے، اس کا مناسب انتظام کرو۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دریائے دجلہ اور قبروں کے درمیان کسی جگہ گہری کھدائی کر کے دیکھا جائے کہ دجلہ کا پانی اندرونی طور پر قبروں کی طرف رِس رہا ہے یا نہیں۔ کھدائی کی گئی، لیکن پانی رِسنے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس بات کو ایک خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

لیکن اس کے بعد پھر دوبارہ یا اس سے زیادہ مرتبہ وہی خواب دکھائی دیا۔ جس سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی، اور اس نے علماء کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ اُس وقت عراق کے کسی عالم نے بھی بیان کیا کہ انہوں نے بھی بعینہٖ یہی خواب دیکھا ہے۔ اُس وقت مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ دونوں بزرگوں کی قبرِ مبارک کو کھول کر دیکھا جائے، اور اگر پانی وغیرہ آرہا ہو تو ان کے جسموں کو منتقل کیا جائے۔ اُس وقت کے علماء نے بھی اس رائے سے اتفاق کر لیا۔

چونکہ قرونِ اولیٰ کے دو عظیم بزرگوں اور صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبروں کو کھولنے کا یہ واقعہ تاریخ میں پہلا واقعہ تھا، اس لیے حکومتِ عراق نے اس کا بڑا زبردست اہتمام کیا، اس کے لیے ایک تاریخ مقرر کی، تاکہ لوگ اس عمل میں شریک ہو سکیں۔ اتفاق سے وہ تاریخ ایامِ حج کے قریب تھی، جب اس ارادے کی اطلاع حجاز پہنچی تو وہاں حج پر آئے ہوئے لوگوں نے حکومتِ عراق سے درخواست کی کہ اس تاریخ کو قدرے مؤخر کر دیا جائے، تاکہ حج سے فارغ ہو کر جو لوگ عراق آنا چاہیں وہ آسکیں، چنانچہ حکومتِ عراق

نے حج کے بعد کی ایک تاریخ مقرر کردی۔

کہا جاتا ہے کہ مقررہ تاریخ پر نہ صرف اندرونِ عراق، بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی خلقت کا اس قدر انبوہ جمع ہوا کہ حکومت نے سب کو یہ عمل دکھلانے کے لیے بڑی بڑی اسکرینیں دُور تک فِٹ کیں، تاکہ جو لوگ براہِ راست قبروں کے پاس یہ عمل نہ دیکھ سکیں وہ ان اسکرینوں پر اس کا عکس دیکھ لیں۔

اس طرح یہ مُبارک قبریں کھولی گئیں۔ اور ہزارہا افراد کے سمندر نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تقریباً تیرہ صدیاں گذرنے کے باوجود دونوں بزرگوں کی نعش ہائے مبارک صحیح وسالم اور تر و تازہ تھیں۔ بلکہ ایک غیر مُسلم ماہر امراضِ چشم وہاں موجود تھا۔ اس نے نعشِ مبارک کو دیکھ کر بتایا کہ ان کی آنکھوں میں ابھی تک وہ چمک موجود ہے جو کسی مُردے کی آنکھوں میں انتقال کے کچھ دیر بعد بھی موجود نہیں رہ سکتی، چنانچہ وہ شخص یہ منظر دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

نعشِ مبارک کو منتقل کرنے کے لیے پہلے سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قریب جگہ تیار کر لی گئی تھی، وہاں تک لے جانے کے لیے نعشِ مبارک کو جنازے پر رکھا گیا، اس میں لمبے لمبے بانس باندھے گئے، اور ہزارہا افراد کو کندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی، اور اس طرح اب ان دونوں بزرگوں کی قبریں موجودہ جگہ پر بنی ہوئی ہیں۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مدظلہم کا بیان ہے کہ ۱۹۲۹ء کا یہ واقعہ مجھے یاد ہے، اس زمانے میں اخبارات کے اندر اس کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ اور اُس وقت ہندوستان سے ایک ادبی گھرانے کا ایک جوڑا عراق گیا ہوا تھا۔ اُن دونوں میاں بیوی نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا، اور غالباً بیوی نے اپنے اس سفر کی رُوداد ایک سفرنامے میں تحریر کی جو کتابی شکل میں شائع ہوا، اور اس کی ایک کاپی حضرت مولانا مدظلہم کے پاس محفوظ ہے۔

اس سفرنامے میں یہ بھی مذکور ہے کہ اُس وقت کسی غیر ملکی فرم کے ذریعے اس پورے عمل کی عکس بندی بھی کی گئی تھی۔ اور بہت سے غیر مسلم بھی یہ واقعہ خاص طور پر دیکھنے آئے تھے، وہ اس اثر انگیز منظر سے نہ صرف بہت متاثر ہوئے، بلکہ بہت سے لوگوں نے اس منظر

کو دیکھ کر اسلام قبول کیا

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور اپنے دین کی حقانیت کے ایسے معجزے کبھی کبھی دکھلاتے ہیں۔

۔ نریہم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انّہ الحق۔

ہم ان کو آفاق میں بھی اور خود ان کے وجود میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ یہی (دین) حق ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ عبداللہ بن جابرؓ حضرت جابرؓ ہی کے صاحبزادے ہیں تو یہ عجیب و غریب اتفاق ہے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ان کے دادا کے ساتھ بھی بعینہٖ اسی طرح کا واقعہ پیش آچکا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کے والد عبداللہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد کے سب سے پہلے شہید تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت عمرو بن جموحؓ کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن فرمایا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ شہداء کے لیے کفن بھی میسر نہ تھے، اس لیے حضرت عبداللہؓ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا جس میں چہرہ تو چھپ گیا لیکن پاؤں کھلے رہے جن پر گھاس ڈالی گئی۔ اتفاق سے یہ قبر نشیب میں واقع تھی۔ چالیس سال بعد حضرت معاویہؓ کے زمانے میں یہاں سیلاب آگیا اور وہاں سے ایک نہر بھی نکالنی تھی۔ اس موقع پر قبر کو حضرت جابرؓ کی موجودگی میں کھولا گیا تو دونوں بزرگوں کے اجسام بالکل صحیح و سالم اور تر و تازہ تھے۔ بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ ان کے چہرے پر جو زخم تھا، اُن کا ہاتھ اسی زخم پر رکھا ہوا تھا۔ لوگوں نے ہاتھ وہاں سے ہٹایا تو تازہ خون بہنے لگا۔ پھر ہاتھ دوبارہ وہاں رکھا تو خون بند ہو گیا۔

(طبقات ابنِ سعد ص ۵۶۲ و ۵۶۳ ج ۳)

کسریٰ کا محل:

ان صحابۂ کرامؓ کے مزارات کی زیارت کے بعد ہم آگے بڑھے تو مدائن شہر کے تقریباً

اختتام پر کسریٰ کے محل کی ایک دیوار اب تک باقی ہے اور عبرت کا مرقع بنی ہوئی ہے، یہ کسی زمانے میں دُنیا کی عظیم ترین مادی طاقت کسریٰ کا وہی محل تھا جس کے کنگرے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت پر گر گئے تھے، اور جس کی شان و شوکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خندق کھودتے وقت کدال سے اُڑتی ہوئی چنگاریوں میں دکھا کر یہ خوشخبری دی گئی تھی کہ یہ محل مسلمانوں کے قبضے میں آنے والا ہے۔ جس وقت یہ خوشخبری دی جا رہی تھی، اُس وقت خود مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ عرب کے قبائل کے متحدہ محاذ کے حملے کی وجہ سے خود مدینہ طیبہ میں کلیجے مُنہ کو آرہے تھے۔ دونوں جہانوں کا سردار خود اپنے مقدس ہاتھوں سے خندق کی کھدائی میں عملاً شریک تھا۔ اور بھوک کی شدت سے صحابہ کرامؓ نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے، اور خود رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، کون تصور کر سکتا ہے کہ یہ بے سروسامان اور نہتے افراد دُنیا کی عظیم ترین طاقت کسریٰ کا غرور خاک میں ملا کر رہیں گے۔

لیکن دُنیا نے دیکھا کہ اس واقعے کو پندرہ سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ انہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اپنے رب کا نام لے کر اُٹھے، اور اس عظیم طاقت سے ٹکرا گئے جس کے جاہ و جلال سے کبھی روم کے محلات بھی لرزا کرتے تھے۔ کسریٰ کے محل کی یہ ایک دیوار چودہ صدیوں سے زائد کے تھپیڑے سہنے کے باوجود آج بھی شان و شکوہ کی تصویر ہے، اور اس کے نیچے کھڑے ہو کر آج بھی کوئی شخص سطوت کا تأثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے متعدد برج ابھی تک سلامت ہیں، بیچ میں ایک بلند قامت محرابی دروازہ ہے۔ جس کے بعد ایک وسیع و عریض ہال کے آثار نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ کسریٰ کا دربار رہا ہوگا یا محل کا کوئی اور اہم حصہ۔

ایک روایت کے مطابق اس ایوان کے دروازے پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، فتح مدائن کے وقت اس کو آگ لگا دی گئی تھی، بعد میں اس پردے سے دس لاکھ مثقال سونا برآمد ہوا، جس کی قیمت ایک کروڑ درہم تھی۔ (تاریخ بغداد، للخطیب ص ۱۳۱ ج ۱)

جب اس بوسیدگی اور فرسودگی کے عالم میں اس عمارت کے شکوہ کا یہ حال ہے تو جب

یہ محل اپنے عہدِ شباب پر ہوگا، اُس وقت اس کی شان و شوکت کا کیا عالم ہوگا، اس کی سر بفلک فصیل اُس دَور کے لحاظ سے یقیناً ناقابلِ تسخیر ہوگی۔ اُس زمانے میں دجلہ اسی فصیل کے نیچے بہتا تھا، اس لیے دریا عبور کرکے اس فصیل پر چڑھنا اور اُسے فتح کرنا جبکہ فصیل کے ہر قدم پہ کھڑے ہوئے پہرے دار ہر لمحے تیروں، نیزوں، اور کھولتے ہوئے تیل کی بارش کر رہے ہوں، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

لیکن نہ جانے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کونسا جذبہ اور ایمان کی کونسی طاقت لے کر آئے تھے کہ یہ پُرسطوت عمارتیں ان کی یلغار کو نہ روک سکیں، کج کلاہ ایران کی صدیوں پرانی تاریخ آن کی آن میں پیوندِ خاک ہوگئی، اور اس کا شہرہ آفاق دبدبہ مجاہدین کے غبارِ راہ میں گم ہو کر رہ گیا۔

مسلمانوں نے کسریٰ کے اس ایوان کو ایک عبرتناک یادگار کے طور پر باقی رکھا۔ خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ اسے منہدم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پر ان کے ایک ایرانی مشیر نے مشورہ دیا کہ آپ اگر اس ایوان کو باقی رکھیں گے تو اس سے ہر دیکھنے والے پر یہ تاثر قائم ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد شامل تھی، ورنہ عرب کے بے سرو سامان صحرا نشین اس جیسے ایوان کو ہرگز فتح نہ کر سکتے۔

منصور نے مشورہ سنا، لیکن دل میں یہ خیال ہوا کہ شاید یہ مشیر ایرانی ہونے کی بنا پر اپنے آباؤ اجداد کی یادگار قائم رکھنے کے لیے یہ مشورہ دے رہا ہے، چنانچہ خلیفہ نے مشورے کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن جب ایوان کو توڑنا شروع کیا تو تھوڑا ہی حصہ توڑنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے توڑنے پر اتنی زبردست لاگت آئے گی کہ اس کے ملبے سے اس کا بہت تھوڑا حصہ وصول ہوگا، اور اس طرح بہت سی قومی دولت ضائع ہو جائے گی۔ اس موقع پر منصور نے اسی مشیر کو پھر بلا کر مشورہ کیا۔ اُس نے کہا کہ "میں نے آپ کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ اسے نہ توڑیں۔ لیکن اب میں آپ کے لیے یہ بات عار سمجھتا ہوں کہ کہنے والے یہ کہیں کہ ایرانیوں نے ایسی عمارت بنائی تھی کہ آپ لوگ اسے منہدم کرنے پر بھی قادر نہ ہوئے۔ لہٰذا اب میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے ضرور توڑا جائے۔"

خلیفہ منصور پھر کشمکش و پیچ میں پڑ گئے، لیکن غور و فکر کے بعد آخر میں فیصلہ یہی کیا کہ کام بند کرادیا جائے، کیونکہ اس میں دولت کا بڑا ضیاع ہے۔ چنانچہ یہ ایوان اس وقت سے باقی چلا آتا ہے۔ (تاریخ بغداد للخطیب ص ۱۳۰ و ۱۳۱، ج ۱)

عربی کے مشہور شاعر بحتری نے اس ایوان کی منظر کشی میں ایک معرکۃ الآرا قصیدہ کہا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عربی زبان میں اس سے بہتر "قصیدۃ سینیۃ" نہیں کہا گیا، اور بحتری کے دو قصیدے ایسے ہیں، ایک ایوان کسریٰ کی منظر کشی میں، اور دوسرا متوکل کے بنائے ہوئے ایک تالاب کی تعریف میں، کہ اگر وہ ان دو قصیدوں کے سوا کچھ نہ کہتا تو بھی وہ اس کی شاعرانہ عظمت کے لیے کافی تھے۔ ایوانِ کسریٰ کے بارے میں اس کے قصیدے کے ابتدائی شعر یہ ہیں:۔

صنت نفسی عما یدنس نفسی ... وترفعت عن جدا کل جبس

وکأن الإیوان من عجب الصنـ ... ـعۃ جوب فی جنب أرعن جلس

طاقِ کسریٰ کے نیچے کھڑے ہوکر چودہ صدیوں کے بیشمار واقعات کی ایک فلم تھی جو دل و دماغ میں چلتی رہی۔ تصور کی نگاہ کو کبھی یہاں وہ کج کلاہ نظر آتے جن کے عہدِ حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، کبھی کبر و غرور کے وہ پُتلے دکھائی دیتے جنہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک چاک کرنے کی جسارت کی تھی، کبھی اس ایوان کے زرنگار کمروں میں حضرت حذیفہ بن یمان رض اور حضرت ربعی بن عامر رض کی گونجتی ہوئی تقریریں سنائی دیں، کبھی اس کی فصیل پر چڑھتے ہوئے وہ سرفروش مجاہدین نظر آئے جن کے ہاتھوں اس کبر و غرور کا استیصال مقدر تھا، کبھی یہاں حضرت سعد بن ابی وقاص رض، حضرت خالد بن عرفطہ رض اور ان کے رفقاء کو فتح کے شکر میں سجدہ ریز دیکھا۔ غرض نہ جانے ماضی کی کتنی دلآویز تصویریں تھیں جو چند لمحوں میں نظروں کے سامنے سے گذر گئیں۔ اور جب اس عالم تصور سے جیتی جاگتی زندگی کی طرف واپسی ہوئی تو حسین تصورات کا یہ سارا محل زمین پر آ رہا۔ میں ایک ایسی زمین پر کھڑا تھا جو فاتحینِ مدائن کے نام لیواؤں پر تنگ ہو رہی ہے جہاں انہی صحرا نشینوں کی ہم جیسی ناخلف اولاد وسائل و اسباب کی فراوانی کے باوجود

ایمان و یقین کی اس دولت سے محروم ہوتی جا رہی ہے جو روم و ایران کی تسخیر کا حوصلہ پیدا کرتی تھی، اور اس کے نتیجے میں وہ قیصر و کسریٰ کے ماڈرن جانشینوں سے آنکھیں چار کرنے کے بجائے ان کے دبدبے کے سامنے ہتھیار ڈالے کھڑی ہے، اور زندگی کے ہر کام میں ان کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہے۔

اس عظیم اور المناک تضاد کا تصور کر کے دل بھی کانپا، حیرت بھی ہوئی، لیکن پھر تمام شکوک و شبہات کا جواب ایک ہی شعر میں مل گیا ؎

حیرت نہ کر بدن کو مرے چُور دیکھ کر
اُن رفعتوں کو دیکھ جہاں سے گرا تھا میں

---

(۷)

مدائن ہی میں حکومت عراق نے ایک عجیب و غریب پنورا ما تعمیر کیا ہے جس میں جنگِ قادسیہ کا منظر اس طرح دکھایا گیا ہے کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے جیسے وہ ٹھیک میدانِ جنگ کے اوپر کھڑا تمام منظر اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے، یہ تقریباً سات منزلہ عمارت ہے جس کے زینوں پر چڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کسی کشادہ مینار پر چڑھ رہا ہے، سب سے آخری زینہ ایک گنبد نما ہال پر ختم ہوتا ہے، اور اس ہال میں پہنچتے ہی انسان یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی بلند قلعے کی بُرجی پر کھڑا ہے، اور اس کے سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا میدان ہے جس کے آخری سرے پر ایک قدیم طرز کا قلعہ بنا ہوا ہے، یہ قلعۂ قدیس ہے جہاں بیٹھ کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگِ قادسیہ کی قیادت فرمائی تھی۔ اور اس کے تینوں اطراف میں مسلمانوں اور کسریٰ کے لشکر برسرِ پیکار نظر آتے تھے۔

دراصل اس ہال کی دیواروں پر چھت تک ایسی سہ ابعادی (THREE DIAMENSIONAL) تصویریں بنائی ہیں جن کی زمین کا رنگ بالترتیب آسمان، فضا اور

زمین کے رنگ کے اتنا مطابق ہے کہ وہ فطری آسمان، فضا اور زمین معلوم ہوتے ہیں۔ اور پینٹنگ کے سہ العبادی ہونے کی بنا پر ان تمام اشیاء کے فاصلے حقیقی نظر آتے ہیں، افق تک پھیلے ہوئے اس میدان میں جنگ قادسیہ کے تمام اہم واقعات دکھائے گئے ہیں۔ ایرانیوں کے ہاتھیوں کا حملہ، مسلمانوں کی طرف سے ان کی سونڈیں کاٹنے کا منظر، جوابی طور پر مسلمانوں کی طرف سے برقع پوش اُونٹوں کا حملہ، چاروں طرف کے افق سے امڈتے ہوئے سو سو شہسواروں کے دستے جو حضرت قعقاعؓ کی نفسیاتی تدبیر کے مطابق ہر تھوڑی دیر بعد کسی اُفق سے نمودار ہوتے تھے۔ ایرانی فوج کی ابتری، جگہ جگہ تڑپتی ہوئی لاشیں، اور میدان میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے مختلف اسلحہ جنہیں دیکھ کر انیسؔ کا یہ بند یاد آتا ہے ؎

بے رُخ کمانیں تیروں سے، چِلّے کماں سے دُور — مرغانِ تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دُور
برچھی سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دُور — پیروں سے عقل دُور، تہوّر جواں سے دُور

تیغوں کی کچھ خبر تھی، نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

غرض یہ پورا ما فن کا ایک عجوبہ ہے، لیکن کاش! اس کے بنانے والے اس بات کا خیال رکھ سکتے کہ جنگِ قادسیہ کے بیشتر شرکاء صحابۂ کرامؓ تھے، اور ان کی فرضی تصویریں بنانا شریعت کے خلاف تو ہے ہی، ان حضرات کی شان میں سوءِ ادب بھی ہے۔ استغفر اللہ العظیم۔

ایوانِ کسریٰ کے قریب ہی ایک میدان میں عراق کے محکمۂ سیاحت نے ایک قدیم طرز کا وسیع دعریض خیمہ بنایا ہوا ہے، یہ ٹھیک اُس طرز کا خیمہ ہے جیسا قدیم زمانے میں لشکر کے سردار وغیرہ کہیں پڑاؤ ڈالتے وقت لگایا کرتے تھے۔ اس خیمہ کے اندر قدیم عربی تہذیب کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم صدیوں پہلے کے دَور میں پہنچ گئے ہیں، قدیم طرز کے قالین اور دریاں، ان پر لگے ہوئے پرانے گدے اور تکیے، پانی کی چھاگل، مٹی اور لکڑی کے برتن، پتھروں سے بنے ہوئے چولھے اور اندر بیٹھے ہوئے عربوں کے جسم پر وہی بدویانہ لباس۔ غرض ہر چیز پرانی عرب تہذیب کی آئینہ دار۔

ہم خیمے میں داخل ہوئے تو یہاں بیٹھے ہوئے بدوی نما عربوں نے روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے تپاک سے خیر مقدم کیا، اور بڑے اصرار کے ساتھ عراقی قہوہ پیش کیا جس کی تلخی کی یاد اب تک ذہن سے محو نہیں ہوئی، قہوے کا دستور سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں بھی ہے، اس کی تلخی کا عادی بنتے بنتے بھی کام و دہن کو خاصا وقت لگا، لیکن یہ سیاہ فام عراقی قہوہ اس سے کہیں آگے ہے، اور اندازہ یہ ہوا کہ اس کا عادی بنتا ہم جیسوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

مدائن کے قابلِ دید مقامات سے فراغت ہوئی تو نمازِ ظہر جامع مسجد سلمان فارسیؓ میں ادا کرنے کے بعد دجلہ کے کنارے ایک خوبصورت ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ ہوٹل کے دالان کے ساتھ ہی دجلہ پوری آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ یہ وہی دجلہ تھا جسے مدائن کے ایرانی حکمرانوں نے مسلمانوں کی یلغار کے آگے اپنا سب سے مضبوط حصار قرار دیا تھا، اُن کا خیال تھا کہ مجاہدینِ اسلام کے گھوڑے جو عرب اور عراق کے لق و دق صحرا عبور کر کے آئے ہیں، اس پُرشور دریا پر پہنچ کر بے بس ہو جائیں گے، اور کسریٰ کے دارالحکومت تک ان کی پہنچ نہ ہو سکے گی۔

لیکن مجاہدینِ اسلام کے وہ قافلے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے تسخیرِ کائنات کا معجزاتی حوصلہ لے کر آئے تھے، دجلہ نے اُن کے لیے اپنی آغوشِ محبت کھول دی، اُنہوں نے گھوڑے دریا کی موجوں کے حوالے کر دیئے۔ اور پورا لشکر صحیح و سلامت پار اُتر گیا۔

کوفہ کا سفر:

اگلے دن صبح نو بجے کے قریب ہم کار کے ذریعے بغداد سے کوفہ روانہ ہوئے۔ کوفہ بغداد سے تقریباً ڈیڑھ سو کیلو میٹر جنوب میں واقع ہے۔ اور وہاں جانے کے لیے بغداد سے صاف ستھری اور خاصی کشادہ سڑک موجود ہے۔ راستہ اکثر دونوں طرف سر سبز نخلستانوں سے معمور ہے، کھجور عراق کی خاص زرعی پیداوار ہے اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کھجور یہیں پیدا ہوتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی بستیاں

اور قصبے راستے میں آتے رہتے ہیں، ان میں اہم ترین شہر حلّہ ہے، جو عراق کے تاریخی شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

حلّہ کے آس پاس ہی دُنیا کا قدیم ترین تاریخی شہر بابل آباد تھا۔ بابل کلدانی تہذیب کا عظیم مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد آباد کیا تھا، اور یہاں سے ان کی اور ان کے رفقاء کی نسل پھیلی۔ انہوں نے دجلہ اور فرات کے آس پاس بہت سے شہر آباد کئے۔ یہاں تک کہ دجلہ کے کنارے وہ کسکر تک اور فرات کے کنارے کوفہ سے بھی آگے تک پہنچ گئے، اور یہ سارا علاقہ سواد کے نام سے مشہور ہوا۔
(معجم البلدان للحموی ص ۳۰۹۔ ج ۲)

انہی کی اولاد میں کلدانیوں نے جنم لیا جو ان کے سپاہی سمجھے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ بادشاہ بن گئے۔ کلدانیوں سے پہلے بابل کا نام خبتارث تھا۔ کلدانیوں نے اس کا نام بابل رکھا، بابل ان کی زبان میں مشتری ستارے کو کہتے تھے، اسی کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ اپنے عروج کے دور میں بابل بارہ فرسخ میں پھیلا ہوا تھا، اور اپنے زمانے کے فنِ تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا تھا۔ اس شہر کے بارے میں بہت سی طلسماتی داستانیں بھی مشہور ہیں، اور جادوگروں کی کثرت کی بنا پر یہ "مدینۃ السحر" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ (معجم ما استعجم للبکری ص ۲۱۹۔ ج ۱)

قرآن کریم نے بھی سورۂ بقرہ میں بابل کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ یہاں ہاروت و ماروت دو فرشتے بھیجے گئے تھے، اور انہیں ایک خاص علم سکھا کر اہل بابل کی آزمائش کے لیے مبعوث کیا گیا تھا، یہاں ایک اندھا کنواں "جبّ دانیال علیہ السلام" کے نام سے مشہور تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہی ہاروت و ماروت کا کنواں تھا۔
(آثار البلاد و اخبار العباد للقزوینی، ص ۳۰۴)

بابل کے کھنڈر اب تک اس علاقے میں پائے جاتے ہیں، اور کوفہ جانے والی سڑک سے بھی ان کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔

پھر اسی علاقے میں ۴۹۵ھ میں سیف الدولہ صدقہ بن منصور نے حلّہ شہر آباد کیا، اور

یہ اس کے زمانے میں عراق کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا، (حموی ص ۴۹۴ ج ۷)
اور اس کی طرف بہت سے علماء بھی منسوب ہیں۔ اب یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور لبۃ
ضلع کا صدر مقام ہے۔

کوفہ یہاں سے جنوب مشرق میں واقع ہے، اور حلّہ سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر
بعد کوفہ کے آثار شروع ہو گئے۔

کوفہ قرونِ اولیٰ کی تاریخ اسلام کا بڑا عظیم الشان مرکز رہا ہے۔ پہلی اور دوسری صدی
میں یہ شہر مرکز کے خلاف سیاسی تحریکوں کا منبع رہا، اور اس نے تاریخ کے نہ جانے کتنے
انقلابات دیکھے، اس کے ساتھ ہی حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے
صحابۂ کرامؓ کی بنا پر علم و فضل کا بھی بڑا عظیم الشان مرکز بنا رہا، جہاں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ
حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، حضرت وکیع بن الجراحؒ، اور نہ جانے علم و فضل کے کتنے پہاڑ نمودار
ہوئے، اس لیے مجھ سے طالب علم کے لیے کوفہ کے ساتھ خاص قلبی لگاؤ ایک فطری بات تھی،
چنانچہ عراق کے سفر میں جن مقامات کو بطورِ خاص دیکھنے کا شوق تھا، ان میں کوفہ سرِ فہرست تھا

کوفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فاتحِ عراق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے
ایک چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا، اور اس میں عرب کے مختلف قبیلوں نے اپنے اپنے
محلّے بنا لیے تھے۔ اس سے قبل یہ علاقہ سورستان کہلاتا تھا۔ شروع میں چونکہ یہ ایک
چھاؤنی تھی، اِس لیے یہاں کے باشندوں نے پختہ مکانات کے بجائے بانسوں اور کھجور
کے پتّوں سے عارضی مکان بنائے تھے، جب کہیں جہاد پر جانا ہوتا تو یہ مکان توڑ کر صدقہ
کر جاتے، اور جب واپس آتے تو دوبارہ بنا لیتے۔ جب حضرت مغیرہ بن شعبہؓ یہاں کے
گورنر ہوئے تو ان کے زمانے میں اینٹوں کے مکانات بنائے گئے۔

کوفہ سے پہلے حضرت عمرؓ نے بصرہ آباد فرمایا تھا، ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کی
مجلس میں دونوں شہروں کے درمیان موازنہ کا مسئلہ زیرِ بحث آیا، تو حجاج بن یوسف نے کہا
کہ امیرالمومنین! مجھے دونوں شہروں کا اچھی طرح علم ہے (حجاج دونوں شہروں کا گورنر رہ
چکا تھا) عبدالملک نے کہا کہ "پھر ٹھیک بتاؤ کہ دونوں شہروں میں کیا فرق ہے؟ اس پر

حجاج نے مشہور فقرہ کہا کہ :-

أما الكوفة فبكر عاطل لا حلي لها و لا زينة، وأما البصرة فعجوز شمطاء بخراء دفراء أوتيت من كل حلي وزينة۔

کوفہ تو ایک ایسی دوشیزہ ہے جس پر نہ کوئی زیور ہے، نہ سنگھار لیکن بصرہ ایک ایسی بڑھیا ہے جس کے بال کھچڑی ہیں، منہ اور بغلوں سے بُو آتی ہے، مگر ہر طرح کے زیور اور سنگھار سے آراستہ ہے۔

(آثار البلاد، للقزوینی ص ۲۵۰)

کوفہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہ شہر اطراف واکناف کے قبائل کا مرکز بن گیا، اور اس کی آبادی پھیلتی چلی گئی۔ یہاں مجاہدین اور نومسلم تو بڑی تعداد میں آباد تھے، لیکن شروع میں انہیں دین کی تعلیم دینے والی کوئی ایسی شخصیت نہ تھی، جو تعلیم ہی کو اپنا مقصد بنا کر ان کی تربیت کرے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہاں بھیج کر اہلِ کوفہ کو لکھا کہ "ان کے معاملے میں میں نے تمہیں اپنے پر ترجیح دی ہے۔" یعنی حضرت ابن مسعودؓ کی ضرورت تو مجھے تھی، لیکن تمہاری ضرورت کی بناء پر ایثار کرکے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس شہر کو علم وفضل سے جگمگا دیا، اُن کے شاگردوں نے ان سے علم حاصل کرکے یہاں اپنے حلقہ ہائے درس قائم کیے، اور حرمین شریفین کے بعد یہ علم حدیث وفقہ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لائے تو انہوں نے علم کا یہ چرچا دیکھ کر فرمایا کہ "اللہ ابن ام عبد (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) پر رحم فرمائے، انہوں نے اس شہر کو علم سے بھر دیا ہے۔"

حموی نے لکھا ہے کہ کوفہ اپنے عہدِ عروج میں (تقریباً ۶۲۴ھ میں) سولہ میل کے اندر پھیلا ہُوا تھا، اور اس میں ستر ہزار مکانات تھے (معجم البلدان ص ۴۹۲، ج ۱۶)۔ لیکن اب تمدنی حیثیت سے اس شہر کا کوئی خاص مقام نہیں، رقبہ اور آبادی دونوں کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم کوفہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کوفہ کی تاریخی مسجد پہنچے، جو دُنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ہے۔

جامع کوفہ :

یہ مسجد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے تقریباً ۱۹ھ میں بنائی تھی جس میں
چالیس ہزار آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش تھی۔ بعد میں زیاد بن ابی سفیان نے اس میں
اور اضافہ کیا جس سے مزید بیس ہزار آدمیوں کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ آج بھی انسان اس میں
داخل ہو کر اس کی غیر معمولی وسعت کا تاثر لیے بغیر نہیں رہتا، اس کے چاروں طرف فصیل نما
مستحکم دیوار ہے جس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں اور اس کے اندرونی جانب دسیوں
حجرے بنے ہوئے ہیں جن کے دروازے مسجد کے صحن میں کھلتے ہیں۔ یہ حجرے کسی زمانے میں
طالبانِ علم کا مستقر تھے اور ان میں مسافر طلبہ مقیم رہتے تھے۔

مسجد کے صحن کے بیچوں بیچ بہت سی چھوٹی چھوٹی محرابیں بنی ہوئی ہیں، ایک جگہ چوکو
احاطہ سا ہے۔ ہر جگہ کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان مقامات کے بارے میں طرح طرح کی
بے سروپا روایتیں مشہور ہیں۔ کسی جگہ لکھا ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی
ہے، کہیں لکھا ہے کہ یہاں نوح علیہ السلام نے نماز پڑھی ہے' وغیرہ وغیرہ۔

درحقیقت ان باتوں کا ماخذ ایک بے اصل روایت ہے، جو حمویؒ نے معجم البلدان
(ص ۴۹۲ ج ۱۶) اور قزوینیؒ نے آثار البلاد (ص ۲۵۰) میں نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ
کہ ایک شخص کوفہ سے بیت المقدس جانا چاہتا تھا، حضرت علیؓ نے اسے منع کیا، اور فرمایا ک
تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں، کوفہ کی جامع مسجد بڑی فضیلت والی ہے، یہاں دو رکعت
دوسری مسجدوں کے مقابلے میں دس گنا فضیلت رکھتی ہیں، اسی کے ایک گوشے میں حضرتِ
نوح علیہ السلام کے زمانے میں تنور پھوٹا تھا، جس سے طوفانِ نوحؑ برپا ہوا، اسی کے پانچو
ستون کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی، اور یہاں ایک ہزار انبیاء اور ای
ہزار اولیاء نماز پڑھتے رہے، اسی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا مدفون ہے اور اسی
وہ کدو کا درخت تھا جس سے حضرت یونس علیہ السلام کو شفا عطا ہوئی، ...... وغیرہ وغ
لیکن یہ بڑی واہی تباہی روایت ہے، حمویؒ اور قزوینیؒ دونوں نے اسے ایک شخ

حبۃ بن جُوَین العُرَنی سے روایت کیا ہے، حافظ ذہبیؒ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

مُن غلاۃ الشیعۃ، وھو الذی حدث اَنّ علیاً کان معہ بصفّین ثمانون بدریاً، وھذا محال۔

یہ شخص غالی شیعوں میں سے ہے، اسی نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں اسّی بدری صحابہ شامل تھے، حالانکہ یہ عقلاً محال ہے۔

(میزان الاعتدال للذہبیؒ ص ۴۵۰ ج ۱)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی تہذیب التہذیب (ص ۱۷۶ ج ۲) میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اور اکثر علماء رجال کی اس پر شدید جرح نقل کی ہے۔ البتہ شیعہ کتب رجال میں اس کا تذکرہ مدح و توصیف کے ساتھ آیا ہے۔ مامقانی نے بڑے شدّ و مد کے ساتھ اس کا دفاع کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا تعلق اُس قبیلۂ عُرَینہ سے ہے، جس کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر مرتد ہو گئے تھے، اور صدقہ کے اُونٹ بھگا کر لے گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو تنقیح المقال للمامقانی ص ۲۵۰ ج ۱)

یہ تو روایت کے اصل مأخذ حبۃ العرنی کا حال ہے، ان کے نیچے کون کون راوی ہیں؟ یہ حمویؒ اور قزوینیؒ نے بھی نہیں لکھا، لہٰذا یہ روایت کسی بھی طرح قابلِ اعتماد نہیں، نہ روایۃً نہ درایۃً۔

جامع کوفہ کی فضیلت کے یہ قصّے تو بے اصل ہیں، لیکن اس کی یہ تاریخی اہمیت ناقابلِ انکار ہے کہ وہ عہدِ صحابہؓ کی قدیم ترین مسجد ہے، جہاں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت علیؓ، حضرات حسنینؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ، حضرت عبداللہ بن الحارثؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور نہ جانے کتنے صحابۂ کرامؓ نے نمازیں پڑھی ہیں۔ عرب کے نہ جانے کتنے نامور خطیب خطبہ دیتے رہے ہیں، پھر یہ مسجد کیسے کیسے روزگار محدثین و فقہاء کا مرکز بنی رہی ہے، بلا مبالغہ ہزاروں اہلِ علم نے یہاں درس دیا ہے، کیسے کیسے عابد و زاہد اولیاء کرامؒ، کیسے کیسے مفسرین اور فقہاء و محدثینؒ، اور عربی اور عقلی علوم کے کیسے کیسے شناور یہاں دادِ علم و تحقیق دیتے رہے۔ اس مسجد کی فضا میں مجھ سے طالب علم

کو اُن کے انفاس قدسیہ، ان کے ذکر و تسبیح اور ان کے علمی افادات کی مہک محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ جامع کوفہ آج بھی اپنے اسی طول و عرض اور شان و شکوہ کے ساتھ موجود ہے، لیکن نگاہیں یہاں وہ حلقہ ہائے درس تلاش کرتی رہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، وکیع بن الجراحؒ، قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ جیسے جبالِ علم پیدا کئے۔ اور جنہوں نے اپنے علم و فضل سے دُنیا بھر کو سیراب کیا۔

آج اس مسجد میں کوئی شخص کوئی کتاب پڑھتا بھی نظر نہ آیا، بس جا بجا بے علم واعظ لوگوں کو بے سر و پا حکایتیں سُناتے پھر رہے تھے۔ کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ ان جاہلانہ حکایتوں کی حقیقت ہی لوگوں کو بتا سکے۔ میں اس وسیع و عریض صحن میں چشم تصور سے علم و فضل کی وہ سجی ہوئی مجلسیں دیکھتا رہا، جن کی خوشبو سے کبھی اس مسجد کے بام و در معطر رہتے تھے، اور دل میں یہ حسرت تھی کہ مجھ جیسا طالبِ علم یہاں پہنچا تو اتنی دیر میں کہ اب کوئی ان مجلسوں کو یاد کرنے والا بھی یہاں نظر نہیں آتا ہے

جمع تھے وہ گل زخوں کے ابھی لدھ کے
ایک ہو گیا گلا ب کا تختہ کھلا ہوا

صحن عبور کر کے مسجد کے مسقف حصے میں پہنچے۔ اس حصے کا عرض زیادہ نہیں ہے اس میں مشکل پانچ چھ صفیں آتی ہوں گی۔ اور یہیں وہ محراب ہے جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شہید کیا گیا۔ غالباً مسقف حصہ شروع ہی سے اتنا ہے۔

نماز کے بڑے اجتماعات کے موقع پر صحن اور برآمدوں ہی سے کام لیا جاتا ہوگا۔

الحمدللہ! اس تاریخی مسجد میں تحیۃ المسجد ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور یہاں سے دوبارہ صحن کی طرف نکلے تو دائیں ہاتھ کی طرف دو بڑے قبے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک قبہ حضرت مسلم بن عقیل کا مزار ہے، جو واقعۂ کربلا سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نائب کی حیثیت میں کوفہ میں مقیم تھے اور یہیں شہید کئے گئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ معروف ہے۔

بائیں طرف والا قبہ حضرت ہانی بن عروہؓ کا مزار ہے جو کوفہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سرگرم حامیوں میں سے تھے، اور انہوں نے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو اپنے گھر میں روپوش رکھا تھا۔

دارُالامارۃ:

دونوں مزارات پر حاضری کے بعد ہم جامع کوفہ سے باہر نکلے۔ مسجد کی مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گلی قبلے (جنوب) کی طرف گئی ہے۔ یہاں سے گذر کر جب مسجد کے جنوبی سرے پر پہنچے تو دیوارِ قبلہ کے ساتھ ساتھ ایک قلعہ نما عمارت کے کھنڈر نظر آئے۔ یہ کوفہ کا دارالامارۃ تھا۔ پہلی صدی ہجری میں سیاسی اُکھاڑ پچھاڑ کا اکھاڑہ۔ مختصر سے عرصے میں نہ جانے یہاں کتنے گورنر آئے، اور گئے، اور اہلِ کوفہ نے کسی کو ٹکنے نہ دیا۔

کوفہ چونکہ متنوع قبائل کا شہر تھا، اور یہاں ہر طرح کے لوگ آکر بس گئے تھے خاص طور پر سیاسی خلفشار کے بہت سے سرگروہ یہاں آباد تھے، اس لیے انہوں نے کسی گورنر کو زیادہ عرصہ چلنے ہی نہ دیا۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی پر جو عشرہ مبشرہ میں سے ہونے کے علاوہ عراق کے فاتح اور کوفہ کے بانی بھی تھے، یہ الزام لگا دیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔ ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بھی کوفہ کے انتشار پسندوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اگرچہ یہ لوگ اظہارِ عقیدت و محبت کرتے تھے، لیکن ان کو بھی سارے زمانۂ خلافت میں عملاً پریشان ہی رکھا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلانے والے بھی یہی لوگ تھے، اور پھر انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر سانحۂ کربلا کا سبب بھی یہی بنے۔

اس دارالامارۃ میں کتنے گورنر آئے اور مارے گئے۔ اس کا عبرتناک واقعہ عبدالملک بن عمیر لیثی نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان اس دارالامارۃ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، مَیں نے ان سے کہا کہ میں نے اس امارت میں سب سے پہلے حضرت حسینؓ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے ایک ڈھال پر رکھا ہوا دیکھا، پھر اسی قصر میں عبیداللہ بن زیاد کا کٹا ہوا سر مختار بن عبید ثقفی کے سامنے دیکھا، پھر اسی قصر میں مختار کا کٹا ہوا سر مصعب بن عمیر کے سامنے دیکھا، پھر اسی جگہ مصعب بن عمیر کا کٹا ہوا سر آپ کے سامنے

دیکھا ــــ عبدالملک پر یہ سُنکر خوف ساطاری ہوگیا، اور وہ یہاں سے منتقل ہو گئے۔
(تاریخ الخلفاء للسیوطی)

(۸)

حضرت علیؓ کا مکان:

کوفہ کے دارالامارۃ کے دائیں جانب ایک قدیم طرز کا پختہ مکان ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا مکان تھا۔ یہ بات یہاں اتنی معروف ہے کہ یہ جگہ زیارت گاہ خاص وعام بنی ہوئی ہے، لیکن اپنے محدود مطالعے میں احقر کو کوئی تاریخی دلیل ایسی نہیں مل سکی جس کی بنا پر یقین سے کہا جاسکے کہ یہ مکان واقعۃً حضرت علیؓ ہی کا تھا۔ کوفہ کے حالات میں احقر کو کہیں اس کا ذکر نہیں مل سکا لیکن اہل کوفہ میں یہ بات جس قدر مشہور ہے، کہ اس کے پیش نظر یہ کچھ بعید بھی نہیں ہے کہ یہ واقعۃً درست ہو۔

یہ ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کا دروازہ شمال کی طرف کھلتا ہے، اور دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک مختصر سا صحن ہے جس کی مشرقی دیوار کے دونوں کونوں میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی اقامت گاہ تھی، مکان کا اصل حصہ مغرب کی طرف ہے، یہاں ایک چھوٹی سی سُرنگ نما راہداری ہے، جو ایک چھوٹے سے دالان نما کمرے پر ختم ہوتی ہے۔ جس میں ایک کنواں بھی ہے۔ دالان کی جنوبی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو ایک بڑے کمرے میں کھلتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ کمرہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کے جنوب مغربی کونے میں ایک چھوٹا سا آتشدان بھی بنا ہوا ہے۔

مکان کی چھتیں خاصی نیچی ہیں، اور اندازِ تعمیر قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مکان شروع سے اپنے اصل نقشے پر چلا آتا ہے، یعنی اس کو بار بار تعمیر کیا جاتا رہا ہے، یہاں تک کہ اس کی

دیواریں اب سیمنٹ کی بنی ہوئی ہیں، لیکن نقشہ وہی رکھا گیا ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ مبارک میں تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نجف میں:

کوفہ کے بعد نجف کے لیے روانگی ہوئی۔ اب تو کوفہ اور نجف کے درمیان کئی کیلومیٹر کا فاصلہ ہے اور درمیان میں خاصا طویل جنگل پڑتا ہے جس میں کوئی آبادی نہیں ہے لیکن کوفہ کے عہدِ عروج میں کوفے کی آبادی نجف تک تقریباً مسلسل تھی اور جس جگہ کو اب نجف کہا جاتا ہے اسے قدیم دور میں "ظہر الکوفہ" یا "ظاہر الکوفہ" (کوفہ کا پچھواڑہ) کہا جاتا تھا۔ یہاں "بُش" اور "نجف" کے نام سے دو چشمے تھے جن سے آس پاس کے نخلستان سیراب ہوتے تھے اور چونکہ خطرہ یہ تھا کہ ان چشموں کا پانی قریبی قبرستان اور آبادی کو نقصان پہنچائے گا، اس لیے اس علاقے کی زمین کو اس طرح ڈھلوان بنایا گیا تھا کہ اس کی اونچائی کوفے کی سمت رہے تاکہ پانی کا بہاؤ ادھر کا رُخ نہ کرے۔ (مراصد الاطلاع للبغدادی ص ۱۳۶۰ ج ۳)

رفتہ رفتہ یہاں آبادی بڑھتی رہی اور کوفہ کی آبادی سمٹتے سمٹتے جامع کوفہ کے آس پاس رہ گئی اور اس طرح یہ پورا علاقہ اس چشمے کے نام پر "نجف" کہلانے لگا جو ایک مستقل شہر بن گیا۔

آجکل نجف میں شیعہ صاحبان کی ایک بڑی درس گاہ ہے اور ان کے مراجع میں سے ایک اہم مرجع آقائے خوئی کا قیام بھی یہیں ہے، بلکہ نجف شہر میں داخل ہونے کے بعد ہمارے رہنما نے ہمیں وہ مکان بھی دکھایا جس میں ایرانی انقلاب کے رہنما خمینی صاحب سالہا سال عراقی حکومت کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے۔

نجف کی مختلف سڑکوں سے گزر کر ہم اس شاندار سنہری عمارت کے پاس پہنچے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مدفون ہونا تاریخی اعتبار سے خاصا مشکوک ہے۔ اگرچہ اب یہ بات تواتر کے ساتھ مشہور ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ کا مزار یہی ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کے مقامِ تدفین کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف اور متضاد ہیں

کہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔

خطیب بغدادیؒ نے اپنی تاریخ میں اس سلسلے میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ احمد بن عبداللہ العجلیؒ کہتے ہیں کہ "حضرت علیؓ کو عبدالرحمٰن ابن ملجم نے کوفہ میں شہید کیا اور حضرت حسنؓ نے عبدالرحمٰن بن ملجم کو قتل کیا۔ حضرت علیؓ کو کوفہ میں دفن کیا گیا لیکن ان کی قبر کی جگہ معلوم نہیں۔"

ابن سعدؒ کا کہنا ہے کہ "حضرت علیؓ کو کوفہ میں جامع مسجد کے قریب قصر الامارۃ میں دفن کیا گیا۔" ابو زید بن طریفؒ کہتے ہیں کہ "جامع مسجد کی دیوار قبلہ کے ساتھ باب الوراقین کے سامنے ایک گھر ہے۔ حضرت علیؓ اس میں مدفون ہیں۔" یہ گھر یزید بن خالد نامی ایک صاحب کا تھا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی موقع پر اس گھر کو کھودنا پڑا تو اس میں سے حضرت علیؓ کی نعش تر و تازہ برآمد ہوئی۔

بعض روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ دفن تو کوفہ میں ہی کئے گئے تھے لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں آپ کی نعش مبارک کو مدینہ طیبہ لے گئے تھے اور وہاں حضرت فاطمہ کے مزار کے قریب جنۃ البقیع میں آپ کو دفن کیا گیا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو شہادت کے فوراً بعد ہی ایک تابوت میں رکھ کر ایک اونٹ پر سوار کرا دیا گیا تاکہ انہیں مدینہ طیبہ لے جائیں لیکن راستے میں قبیلہ طے کے علاقے میں پہنچ کر وہ اونٹ گم ہوگیا۔ قبیلہ طے کے لوگوں نے اس صندوق کو خزانہ سمجھ کر اٹھا لیا، لیکن جب اندر نعش دیکھی تو اسے وہیں اپنے علاقے میں دفن کر دیا۔

ابو جعفر حضرمیؒ جو مطین کے لقب سے مشہور ہیں، فرماتے ہیں کہ "آج النجف میں جس قبر کو لوگ حضرت علیؓ کی قبر سمجھ کر اس کی زیارت کرتے ہیں اگر وہ واقعتہً حضرت علیؓ کا مزار ہوتا تو میں دن رات وہیں رہا کرتا، لیکن درحقیقت وہ حضرت علیؓ کا مزار نہیں ہے، اور جن صاحب کا وہ مزار ہے اگر ان کا نام روافض کو معلوم ہو جائے تو وہ اس قبر کی زیارت کرنے کی بجائے اسے سنگسار کرنے کی کوشش کریں۔ یہ صاحبِ مزار دراصل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہیں۔"

ان تمام روایات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد الخطیب (ص ۱۳۶ تا ۱۳۸ ج ۱)

ظاہر ہے کہ ان متضاد روایات کے پیش نظر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار کے بارے میں کوئی بھی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔

کربلا کا سفر

نجف سے ہم کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں سے ایک خاصی کشادہ اور صاف ستھری سڑک کربلا جاتی ہے جس کے دونوں طرف حدِ نظر تک لق و دق صحرا اور ریگستان نظر آتے ہیں۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں اونٹوں کے قافلے محوِ سفر دکھائی دیتے جنہوں نے صدیوں پرانے قافلوں کی یاد تازہ کر دی۔ اب کربلا تو ایک بارونق شہر ہے اور وہاں پہنچ کر اس صحرائے کربلا کا تصور ناممکن ہے جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا الم ناک سانحہ پیش آیا لیکن نجف سے کربلا جاتے ہوئے راستے میں جو ریگ زار دکھائی دیتے ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سرزمین کیسی دشوار گزار اور مسافروں کے لیے کتنی صبر آزما رہی ہوگی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم کربلا شہر میں داخل ہوئے۔ یہ شہر خاصا بارونق اور شاید کوفہ اور نجف دونوں کے مقابلے میں زیادہ آباد ہے۔ جس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حادثۂ شہادت پیش آیا، اس وقت یہ ایک لق و دق صحرا تھا۔ اس پورے علاقے کو زمانۂ قدیم میں "طف" کہتے تھے اور یہ خاص صحرا جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے کربلا کے نام سے موسوم تھا، اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف اقوال مشہور ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ لفظ "کربلۃ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی پاؤں کے تلووں کی نرمی کے ہیں، یہ زمین چونکہ نرم تھی اس لیے اس کا نام "کربلا" رکھ دیا گیا۔ "کربلا" عربی زبان میں گندم صاف کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اس لیے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سرزمین میں چونکہ روڑے پتھر نہیں تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس زمین کو باقاعدہ صاف کیا گیا ہے اس لیے اسے "کربلا" کہتے ہیں۔

اس کے برعکس بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ لفظ "کرب و بلا" سے نکلا ہے۔

یہ ایک خاص قسم کی گھاس کا نام ہے جو اس صحرا میں بکثرت پائی جاتی ہے، اس لیے اس کا نام کربلا مشہور ہو گیا۔ (معجم البلدان للحموی رحؒ ص ۴۴۵ ج ۴) واللہ اعلم۔

کربلا پہنچ کر ہم سب سے پہلے اس عمارت پر حاضر ہوئے جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کے بارے میں بھی روایتیں بہت مختلف ہیں۔ عام طور سے مشہور یہ ہے کہ آپ کا جسم مبارک تو کربلا ہی میں مدفون ہے لیکن سر مبارک چونکہ یزید کے پاس دمشق لے جایا گیا تھا۔ اس لیے وہ یہاں مدفون نہیں۔ پھر سر مبارک کے مزار کے نام سے مختلف شہروں میں بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ اگر یہ روایت درست ہو کہ سر مبارک یزید کے پاس شام لے جایا گیا تھا تو اس کا دمشق میں مدفون ہونا تو کچھ سمجھ میں آتا ہے لیکن ایک عظیم الشان مزار قاہرہ میں جامع ازہر کے سامنے بھی بنا ہوا ہے اور یہ پورا محلہ "سیدنا الحسین رضؓ" کے نام سے مشہور ہے۔

بہر صورت سر مبارک کے بارے میں تو روایات بہت مختلف ہیں، لیکن جسم مبارک کے بارے میں قرائن قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کربلا میں مدفون ہوا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی کا تعین تاریخی اعتبار سے خاصا مشکوک ہے۔ امام ابو نعیم رحؒ (جو محدث اور مؤرخ ہیں) ان سے کسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کی جگہ دریافت کی تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔

(تاریخ بغداد للخطیب رحؒ ص ۱۴۴ ج ۱)

کربلا میں دوسرے مزارات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت عباس اور صاحبزادے علی اکبر رضؓ وغیرہ کے ہیں۔ یہاں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور سانحۂ کربلا کے دلگداز واقعات ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آتے رہے۔ اس وقت دریائے فرات یہیں قریب ہی بہتا ہوگا۔ اب یہاں سے کچھ دور چلا گیا ہے۔ خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان عالی مقام افراد نے مدینۂ طیبہ کو چھوڑ کر اس دشتِ کربلا میں جان دینے کو یقیناً کسی دنیا طلبی کی خاطر گوارا نہیں کیا تھا۔ ان کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے سوا کچھ اور نہ تھا ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بغداد میں آخری رات :

کربلا سے واپس بغداد پہنچے تو مغرب کا وقت قریب تھا۔ یہ بغداد میں ہمارے قیام کی آخری رات تھی۔ کچھ دیر ہوٹل میں آرام کے بعد رات کو ہم دجلہ کنارے جا نکلے۔ موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی اور دجلہ پوری آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اس تاریخی دریا میں ایک مچھلی مقامی زبان میں "بُنّی" کہلاتی ہے، جو بڑی لذیذ اور بُو سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ بغداد میں اسے پکانے کا بھی ایک منفرد طریقہ رائج ہے۔ اسے بیچ سے چیر کر ایک تنور پر تقریباً بیس پچیس منٹ سینکا جاتا ہے اور وہ اس مختصر وقت میں تیار ہو جاتی ہے۔ اسے "سمک مزکوف" کہتے ہیں۔ دجلہ کے کنارے "سمک مزکوف" تیار کرنے والوں کے ریسٹورنٹ دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس روز بغداد کے اس مخصوص کھانے کا لطف اُٹھایا۔ اس کے بعد میں اور محترم قاری بشیر احمد صاحب مدظلہم دیر تک دجلہ کے کنارے ٹہلتے رہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر بنی ہوئی شاندار عمارتوں کی روشنیاں پانی میں منعکس ہو کر عجیب و غریب رنگ پیدا کر رہی تھیں، یہ وہی دجلہ تھا جس کے کنارے کبھی عباسی خلفاء کے شاندار محلات ہوا کرتے تھے، یہی وہ دجلہ تھا جو تاتاری حملے کے دوران کبھی خونِ مسلم سے سُرخ ہوا اور کبھی کتابوں کی روشنائی سے سیاہ۔ اس نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی کتنی داستانیں دیکھی ہیں، تاریخ کے نہ جانے کتنے راز اپنی لہروں میں چھپائے یہ آج بھی اسی آب و تاب سے بہہ رہا ہے لیکن اس دریا کے کنارے مسلمانوں نے جو تابناک تہذیب دُنیا کو عطا کی تھی، اس کا تصور کرنے کے لیے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں اور دماغ پر زور ڈال کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

مصر اور الجزائر میں چند روز

ذیقعدہ سنہ ۱۴۰۵ھ جولائی سنہ ۱۹۸۵ء

سُنی نہ مِصر و فلسطیں میں وہ اذاں مَیں نے
دِیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

(۲)

مصر اور الجزائر میں چند روز

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

جمہوریہ الجزائر کی وزارت مذہبی امور پچھلے اکیس سال سے ہر سال عالم اسلام
کے علماء اور مفکرین کا ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کرتی ہے جس کا نام "ملتقی الفکر
الاسلامی" ہے۔ ہر سال اس اجتماع کا ایک مرکزی موضوع متعین کر دیا جاتا ہے، اور تمام
مقالہ نگار اس موضوع پر اپنے مقالات پیش کرتے ہیں۔ دو سال پہلے یہ اجتماع "اجتہاد"
کے موضوع پر منعقد ہوا تھا، اور اس میں راقم الحروف کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی
تھی، میں نے اپنا مقالہ تو اس اجتماع میں بھیج دیا تھا جو وہاں شائع ہو کر تقسیم ہوا۔ اور
بعد میں اسلام آباد کے مجلہ "الدراسات الاسلامیہ" نے بھی اسے نقل کیا۔ لیکن میں خود اپنی
مصروفیات کی وجہ سے الجزائر نہ جا سکا۔

امسال رمضان المبارک کے دوران پھر اس اجتماع کے لیے دعوت موصول ہوئی
رفتہ رفتہ مختلف تجربات کی روشنی میں اب بین الاقوامی کانفرنسوں سے دل اُکتانے
لگا ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر ان کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لیے
صرف کانفرنس کی شرکت کے لیے اب کسی سفر پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ البتہ چونکہ
اب تک مغربی اسلامی ملکوں میں سے کہیں جانا نہیں ہوا۔ اور اس پوری سرزمین سے
اسلام کے درخشاں دور کی بڑی عظیم یادیں وابستہ ہیں، اس لیے الجزائر دیکھنے اور وہاں
کے مسلمانوں سے ملنے کا شوق مدت سے تھا۔ اور اس مرتبہ اس اجتماع کی تاریخیں بھی ایسی

تھیں کر شرکت میں کوئی دوسری اہم مصروفیت مانع نہ تھی۔ اس لیے بنام خدا تعالیٰ اس سفر کا ارادہ کر لیا۔

پاکستان سے الجزائر کے لیے چونکہ کوئی براہِ راست فضائی سروس موجود نہیں ہے۔ اس لیے کسی دوسرے ملک کے واسطے سے جانا پڑا، اور ان پروازوں کا باہمی تعلق کچھ اس قسم کا تھا کہ میرے لیے اجتماع کے شروع میں پہنچنا ممکن نہ تھا۔ یہ اجتماع پیر ۸۔جولائی سے ۱۶۔جولائی تک جاری رہنا تھا، اور میں سہ شنبہ ۹۔جولائی کی شب میں ڈھائی بجے پی آئی اے کے طیارے سے قاہرہ کے لیے روانہ ہُوا۔ اور بیچ میں ایک گھنٹے کے لیے دبئی رُکتا ہُوا مصری وقت کے مطابق صبح ۶½ بجے قاہرہ کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔ یہاں ہوائی اڈے پر استقبال کے لیے کوئی موجود نہ تھا، جن حضرات کو میں نے اطلاع کی تھی غالباً ان کو اطلاع نہیں مل سکی لیکن پی آئی اے کے عملے بالخصوص قاہرہ کے اسٹیشن مینیجر فاروق حمید صاحب نے بڑی محبت اور اخلاق کا معاملہ کیا۔ اور بفضلہ تعالیٰ ہوائی اڈے کے تمام مراحل سے بآسانی گذار کر نہایت آرام سے ہوٹل پہنچا دیا مجھے الجزائر کے طیارے کے انتظار میں یہاں دو دن ایک رات ٹھہرنا تھا۔ آجکل مصر میں پاکستان کے سفیر ہمارے سابق وزیرِ اطلاعات جناب راجہ ظفر الحق صاحب ہیں۔ ہوٹل سے مَیں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے احقر کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا، اور تھوڑے آرام کے بعد ہوٹل میں گاڑی بھیج دی گئی جس کے ذریعے پاکستانی سفارت خانے جانا ہُوا۔

راجہ صاحب ماشاء اللہ بڑی محبوب اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی وزارت کے زمانے میں بھی بڑا کام لیا، اور جب وہ مصر میں سفیر بن کر پہنچے ہیں، انہوں نے یہاں کے علمی و دینی حلقوں کے دل بھی موہ لیے ہیں۔ ان سے دلچسپ ملاقات رہی، اور مصر کے حالات معلوم ہوتے۔

قاہرہ کے پچھلے سفر میں میں اہرامِ مصر نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ عام شہر سے ذرا فاصلے پر واقع ہیں، راجہ صاحب نے خود اپنی گاڑی فراہم کر کے اہرام تک جانا آسان کر دیا چنانچہ اس مرتبہ یہ تاریخی عبرت گاہ بھی اطمینان کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔

اہرامِ مصر

عہدِ قدیم میں دُنیا کے جو سات عجائب مشہور تھے اُن میں سے اہرامِ مصر ہی تنہا وہ عجوبہ ہے جو آج تک باقی چلا آتا ہے، ہزاروں سال قبل مسیح (علیہ السلام) بنی ہوئی یہ حیرت انگیز عمارتیں آج بھی انجینئرنگ کی تاریخ کا عجوبہ سمجھی جاتی ہیں، اور آج جب کہ انجینئرنگ اپنے بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہے "الھرم الاکبر" اس دَور میں بھی اپنے طول و عرض اور اونچائی کے لحاظ سے دُنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔

یہ عمارت کس نے اور کیوں بنائی تھی؟ اس کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مصر کے مشہور مؤرخ علامہ مقریزیؒ لکھتے ہیں :-

وقد اختلف النّاس فی وقت بناءھا، واسم بانیھا، والسبب فی بنائھا، و قالوا فی ذلك أقوالامتباینۃ اکثرھا غیرصحیح،

لوگوں کے درمیان اہرام کی تاریخِ تعمیر، اس کے بانی کے نام ـــــ اور تعمیر کے سبب کے بارے میں اختلاف ہے، اور اس سلسلے میں متضاد اقوال ہیں جن میں سے اکثر صحیح نہیں۔ (الخطط المقریزیۃ ص ۱۹۸ ج ۱)

لیکن قدیم عربی مآخذ میں اس سلسلے میں جو روایت زیادہ مشہور رہی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السّلام کے طوفان سے پہلے مصر کے ایک بادشاہ سوریَد نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر بعض کاہنوں اور نجومیوں نے یہ دی کہ دُنیا پر ایک عالمگیر مصیبت آنے والی ہے۔ سوریَد نے اس موقع پر اہرام کی تعمیر کا حکم دیا، اور اس کے اندر کچھ ایسی سُرنگیں بنائی تھیں جن سے دریائے نیل کا پانی داخل ہو کر کسی خاص جگہ تک جا سکے، نیز اس عمارت میں طرح طرح کے عجائب شامل کئے تھے، اور اس وقت اہلِ مصر سائنس اور حساب سے لے کر طب اور سحر تک جتنے علوم سے واقف تھے، ان کو اس عمارت کی دیواروں، چھتوں اور ستونوں پر لکھ کر محفوظ کیا تھا۔ بعد میں اسی عمارت کو بادشاہوں

کے مقبروں کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ (حسن المحاضرہ للسیوطیؒ ص ۳۳ تا ۳۵)

ایک روایت یہ ہے کہ اہرام کا بانی قوم عاد کا ایک بادشاہ شداد تھا، اور بعض روایتوں میں حضرت ادریس علیہ السلام کو ان کا بانی قرار دیا گیا ہے (الخطط المقریزیہ ص ۲۱۰ ج ۱)

ان عمارتوں کے بارے میں طرح طرح کی طلسماتی کہانیاں بھی مشہور رہی ہیں، جو علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔

لیکن عہدِ جدید میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے مختلف کھدائیوں اور دریافت شدہ تحریروں کی تحقیق کے بعد جو رائے قائم کی ہے، وہ یہ ہے کہ اہرام مصر دراصل عہدِ قدیم میں بادشاہوں کے مقبروں کے طور پر تعمیر کیے گئے تھے۔ اس دور میں بادشاہوں کے مقبرے اسی مخروطی شکل میں تعمیر کیے جاتے تھے، اور فراعنہ کے چوتھے سے لے کر سترھویں خاندان تک مقبروں کا یہی اسلوب مقبولِ عام رہا، چنانچہ مصر کے مختلف حصّوں میں بہت سے اہرام تعمیر کیے گئے۔ چنانچہ تقریباً اسّی اہرام کے آثار دریائے نیل کے مغربی علاقے اور مصر کے زیریں اور وسطی خطوں میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اہرام زیادہ تر معمولی سائز کے تھے اور انہیں مخروطی شکل دینے کے لیے سیڑھیوں کا سا انداز اختیار کیا گیا تھا، ان کو "الاہرام الصادقہ" (True Pyramids) کہا جاتا ہے۔ ان اہرام میں سے قدیم ترین مقبو شہر صقرہ سے چند میل جنوب میں واقع ہے، اور کہا جاتا ہے کہ شاہ اسنیفرد نے ۲۶۱۰ ق م میں تعمیر کیا تھا، جو فراعنہ کے چوتھے شاہی خاندان کا ایک بادشاہ تھا۔

(Encyclopaedia International, Lexican 1982 V.15P.194)

لیکن یہ اہرام اپنی قدامت کے باوجود فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے کوئی عجوبہ قرار نہیں دیئے گئے۔ بعد میں تین اہرام قاہرہ کے قریب جیزہ کے علاقے میں (جو اب قاہرہ ہی کا حصّہ بن گیا ہے) تعمیر کیے گئے۔ یہ اپنے سائز کے اعتبار سے بھی غیر معمولی تھے، اور ان کو مخروطی شکل دینے کے لیے سیڑھیوں کا سا انداز بھی اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ نیچے سے اُوپر تک سطح کو سپاٹ رکھتے ہوئے انہیں مخروطی شکل دی گئی۔ یہی تین اہرام دُنیا کے عجائب میں شمار ہوتے ہیں، اور آج بھی دُنیا بھر کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق یہ تین اہرام حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے فراعنہ کے چوتھے خاندان کے بادشاہ خوفو اور اس کے بیٹوں خفرے اور منکارہ نے تعمیر کئے تھے۔ ان میں سب سے بڑی عمارت "الھرم الاکبر" کہلاتی ہے اور وہ خوفو نے تعمیر کی تھی۔ زمین پر اس کا مجموعی رقبہ ۱۳ء۱ (تیرہ اعشاریہ ایک) ایکڑ ہے۔ اور صرف ایک سمت سے زمین پر اس کا طول ۷۵۶ فٹ ہے۔ تیار ہونے کے بعد اس کی اونچائی ۴ء۴۸۱ فٹ تھی، بعد میں کچھ بالائی حصہ کم ہو گیا تو اونچائی ۳۱ فٹ کم ہو گئی۔ اس کی تعمیر میں بیس لاکھ سے زیادہ پتھر کے بلاک استعمال ہوئے ہیں، جن میں سے کوئی پتھر ۲ ٹن سے کم نہیں ہے، بعض پتھر ۱۵ ٹن وزنی بھی ہیں، لیکن اوسطاً پتھروں کا وزن ڈھائی ٹن ہے، لیکن ان پتھروں کو ایسی فنکاری کے ساتھ جوڑا گیا ہے کہ ان کی درمیانی جھری باہر سے نظر ہی نہیں آتی، اور دور سے پوری عمارت ایک ہی دیو ہیکل مخروطی پتھر معلوم ہوتی ہے۔

ایک امریکی ماہر آثارِ قدیمہ ڈیسمنڈ اسٹیورٹ نے اہرام مصر پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اس میں وہ لکھتا ہے:۔

> "دنیا بھر میں پتھر کی یہ سب سے بڑی تعمیر تیرہ ایکڑ کے رقبے میں کھڑی ہے، جو بیس لاکھ سے زائد بلاکوں پر مشتمل ہے، اور یہ بلاک اوسطاً ڈھائی ٹن وزنی ہیں...... اس کی ہر سمت ۷۵۵ فٹ طویل ہے، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تمام کونے مکمل طور پر بالکل صحیح زاویہ بناتے ہیں، اور سامنے کے پتھر اتنے ٹھیک ٹھیک نصب کئے گئے ہیں کہ ان کے درمیانی جوڑ نظر نہیں آتے۔"

(Desmond Stewart, The Pyramid and Sprinx,

New York 1978, P. 166)

ہم "الھرم الاکبر" کے نیچے پہنچے تو اس کے تقریباً بیچوں بیچ زمین سے ذرا بلندی پر ایک غار نما دروازہ نظر آیا جو ایک سرنگ میں کھلتا ہے، یہ سرنگ اندر ہی اندر ہرم کی

چوٹی تک چڑھتی ہوئی گئی ہے۔ عربی تاریخوں کے مطابق یہ ہرم کا باقاعدہ دروازہ نہیں ہے، بلکہ خلیفہ مامون رشید نے اپنے عہدِ حکومت میں اہرامِ مصر کے اندرونی راز معلوم کرنے کے لیے ہرمِ اکبر کے بیچ سے کھدائی کا حکم دیا تھا، اور اس دور میں صرف اتنے حصّے کی کھدائی پر بڑی دولت صرف کی گئی تھی۔ اور اس کے لیے آگ اور سرکے سے لے کر منجنیقوں تک کو استعمال کیا گیا تھا، کھدائی سے معلوم ہُوا کہ دیوار کا اندرونی حجم بیس ہاتھ ہے، چنانچہ بیس ہاتھ کی کھدائی مکمل ہوئی تو اتفاق سے یہ وہی جگہ تھی جہاں سے سُرنگ اُوپر کی طرف جارہی تھی، وہاں زبرجد کی ایک سلیچی بھی رکھی ہوئی ملی جس میں ایک ہزار دینار رکھے تھے جن میں سے ہر ایک کا وزن ایک اوقیہ تھا۔ بعد میں جب مامون رشید نے کھدائی کے مجموعی خرچ کا حساب لگایا تو وہ اتنے ہی دینار کے برابر تھا۔ (الخطط المقریزیہ ص ۲۰۱ - ج ۱ و حسن المحاضرہ للسیوطی ص ۴ ۳ و ۳۵)

اس سُرنگ کی چڑھائی خاصی دُشوار گذار ہے، چڑھائی کی مشقت اور گرمی کی شدت سے لوگ اُوپر پہنچتے پہنچتے پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ اس سُرنگ کی انتہا ایک دسیع و عریض ہال پر ہوتی ہے۔ جس کی تمامتر دیواریں پتھر کی ہیں، اور اس کے شمال مغربی کونے میں پتھر کا ایک حوض بنا ہوا ہے، اس حوض میں بادشاہ کی لاش رکھی جاتی تھی، تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہرم کی دیواروں پر عجیب و غریب رسم الخط کی عبارتیں تحریر تھیں، جو مرورِ زمانہ سے مٹ گئی ہیں۔ نیز دیواروں کو طرح طرح کے نقوش اور لعل و جواہر سے مزیّن کیا گیا تھا، اب ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

ہرمِ اکبر کے بعد دوسرے نمبر پر "ہرم اوسط" ہے، نیچے کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ زیادہ بڑا معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتہً ہرمِ اکبر سے چھوٹا ہے، یہ تعمیر کے وقت ۴۷۱ فٹ بلند تھا، اور اب اس کی اُونچائی ۴۴۷ فٹ ہے۔ یہ خوفو کے بیٹے خضرے کا بنایا ہوا ہے جو شیفرن (Chephren) کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

تیسرا ہرم "ہرمِ اصغر" ہے، یہ تعمیر کے وقت ۲۱۸ فٹ بلند تھا، اور اب ۲۰۴ فٹ بلند ہے اور یہ خیفرے جانشین منکارہ کا تعمیر کردہ ہے، جو مائی سرینوس کے نام سے معروف

ہے۔ یہ تینوں اہرام چونکہ قاہرہ کی عام سطح زمین سے کافی بلند ہیں، اس لیے یہاں سے شہر قاہرہ کا منظر بھی بڑا خوشنما ہے، اور یہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ فقیہ عمارۃ الیمنیؒ نے اہرام مصر کے بارے میں کہا ہے ؎

خلیلی ما تحت السماء بنیۃ — مماثل فی اتقانہا ہرمی مصر

بناء یخاف الدہر منہ وکل ما — علی ظاہر الدنیا یخاف من الدہر

تنزہ طرفی فی بدیع بناءہا — ولم یتنزہ فی المراد بہا فکری

میرے خیال میں اہرام مصر جیسے عجوبے پر اس سے بہتر اور متوازن تبصرہ نہیں ہو سکتا[1]

ابوالہول :

اہرام جیزہ کے مشرقی جانب میں شہرۂ آفاق "ابوالہول" واقع ہے، یہ دراصل ہرم اوسط کے بانی خیفرے کا مجسمہ ہے جو اس نے خود اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ مقریزیؒ نے لکھا ہے کہ اس کا قدیم نام "بلہیب" تھا، عربوں نے اس کا نام "ابوالہول" رکھ دیا۔ مقریزیؒ کے زمانے میں اس مجسمے کا سر اور گردن سطح زمین پر نظر آتی تھی اور لوگوں کا قیاس یہ تھا کہ باقی جسم زمین میں مدفون ہے۔ چنانچہ بعد میں کسی وقت زمین کھودی گئی تو قیاس درست نکلا، اب اس کے چاروں طرف زمین کھدی ہوئی ہے اور پورا مجسمہ نظر آتا ہے، البتہ چہرے کے نمایاں نقوش مٹے ہوئے ہیں۔ اور مقریزیؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں ایک صوفی بزرگ شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ہمیشہ روزے سے رہتے تھے، انہوں نے نظر میں بہت سے منکرات کے ازالے کے لیے ایک اہم

---

[1] اشعار کا ترجمہ یہ ہے: "دوستو! آسمان کے نیچے کوئی عمارت ایسی نہیں جو اپنے استحکام میں مصر کے دو ہرموں کے مشابہ ہو۔ یہ ایسی عمارت ہے جس سے زمانہ بھی ڈرتا ہے۔ حالانکہ روئے زمین کی دوسری چیزیں زمانے سے ڈرتی ہیں۔ میری آنکھ اس عجیب وغریب عمارت کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہے لیکن یہ عمارت جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے، اس کے تصور سے میرا ذہن محظوظ نہیں ہوتا۔"

شروع کی اور اسی مہم کے دوران انہوں نے ابوالہول کے چہرے کو اس طرح بگاڑ دیا کہ چہرے کے نقوش نظر نہ آئیں۔ (الخطط ص ۲۱۰ ص ۱)

بہرکیف! یہ مجسمہ ۲۴۰ فٹ لمبا اور ۶۶ فٹ اونچا ہے، اس کی ناک قدِ آدم ہے۔ اور ہونٹ ۷ فٹ سے زائد لمبے ہیں[۵] چہرہ مردانہ ہے، لیکن دھڑ شیر جیسا ہے اور یہ پورا مجسمہ ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے۔

تاریخی روایات اس بات پر متفق ہیں کہ اہرام اور ابوالہول کے لیے پتھر اسوان کے علاقے سے لائے گئے تھے، جہاں آجکل اسوان بند تعمیر کیا گیا ہے۔

ابوالہول کے دائیں جانب ایک زیرِ زمین قلعہ نما عمارت کے کھنڈر ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرعونوں کے زمانے میں شہزادیوں کے کمرے تھے۔

جامع عمرو بن العاص رضؓ

اہرام سے فارغ ہو کر ہم وسط شہر میں جامع عمرو بن العاصؓ پہنچے جو نہ صرف مصر بلکہ پورے افریقہ کی قدیم ترین مسجد ہے، حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا تو یہاں سب سے پہلے ایک بڑی مسجد کی بنیاد ڈالنی چاہی، اُس وقت یہاں انگور وغیرہ کے باغات تھے، حضرت عمرو بن عاصؓ کے حکم پر زمین ہموار کی گئی، مسجد کا قبلہ متعین کرنے میں اسّی۸۰ صحابہ کرامؓ شامل تھے، جن میں حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت عبادہ ابن صامتؓ، حضرت ابو الدرداؓ اور حضرت ابو ذر غفاریؓ کے اسماء گرامی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

مسجد کے سب سے پہلے امام خود حضرت عمرو بن عاصؓ تھے اور مؤذن ایک دوسرے صحابی حضرت ابو مسلم یافعیؓ تھے۔

بعد میں حضرت مسلمہ بن مخلد انصاریؓ نے (جو حضرت معاویہؓ کی طرف سے مصر کے حاکم تھے) اس مسجد میں توسیع کی اور اس میں مینار بنایا، اور کہا جاتا ہے کہ مصر میں مسجد کے ساتھ مینار تعمیر کرنے کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ پھر ۷۹ھ میں عبدالعزیز بن مروان نے

---

[۵] The Pyramid and Sprinx, by Desmend Stewart P 44

یہ مسجد از سرِ نو تعمیر کی، اور ان کے بعد ولید بن عبد الملک کے حکم سے اسے منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا گیا، اس وقت اس پر نقش و نگار کا اضافہ ہوا، اور اس کے ستونوں پر سونے کا پانی چڑھایا گیا۔ (حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ ص ۶۳۔ ج ۱)

اس مسجد میں بڑے جلیل القدر بزرگانِ دین، علماء کرام اور اولیاء و اتقیاء نمازیں پڑھتے رہے ہیں، ابتدائے اسلام میں یہی مسجد مجلسِ قضاء کا کام بھی دیتی تھی، اور بعد میں یہاں بڑے عظیم الشان حلقہ ہائے درس بھی قائم ہوئے۔ علامہ ابنِ صائغ حنفی کا کہنا ہے کہ "میں نے ۷۴۹ھ سے پہلے اس مسجد میں چالیس سے زائد علمی حلقے شمار کئے ہیں"۔ نیز کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت یہاں اٹھارہ ہزار چراغ روشن ہوتے تھے، اور روزانہ گیارہ قنطار تیل خرچ ہوتا تھا۔ (حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ ص ۱۵۲ ج ۲)

اس مسجد کی پوری تاریخ علامہ سیوطیؒ نے حسن المحاضرۃ میں بیان فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ اسلام اور علماء و فضلاء کو اس مسجد کے ساتھ خاص شغف رہا ہے۔

یہ مسجد پچھلے دنوں بہت بوسیدہ ہو گئی تھی، اب اس کی از سرِ نو تعمیر کی گئی ہے اور اس میں بہت توسیع ہوئی ہے۔ آج بھی یہ قاہرہ کی ممتاز ترین مسجد ہے۔ احقر نے نمازِ عصر اسی مبارک مسجد میں ادا کی۔ نمازِ عصر کے بعد صفِ اوّل میں کافی لوگ تلاوت کرتے نظر آئے، کہیں اکا دکا طالب علم بھی دکھائی دیئے، لیکن محسوس یہ ہوا کہ ؏

میں تب پہنچا کہ جب اس بزم سے رخصت کا ساماں تھا

جامع عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے باہر نکلے تو واپس ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گئی۔ کئی راتوں سے نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اُس روز عشاء اور رات کے کھانے کے بعد جلد ہی نیند آ گئی۔

اگلے دن چار بجے شام تک قاہرہ میں مزید رکنا تھا، میں نے اس وقت کو کار آمد کرنے کے لیے قاہرہ کے مختلف کتب خانوں کی سیر کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ صبح نو بجے سے دن کے دو بجے تک مختلف کتب خانوں میں پھر کر دستیاب کتب کا جائزہ لیتا رہا۔

سفر الجزائر

شام کو پانچ بجے الجزائر جانے کے لیے ہوائی اڈے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز چار گھنٹے لیٹ ہے، یہ وقت ایئرپورٹ پر ہی گذارا اور رات کو ساڑھے گیارہ بجے الجزائر ایئرلائنز کے طیارے پر سوار ہوئے، چار گھنٹے کا راستہ تھا، لیکن وقت کے ایک گھنٹے کے فرق کی وجہ سے الجزائر کے وقت کے مطابق رات کو ڈیڑھ بجے جہاز الجزائر کے ہواری بومدین ایئرپورٹ پر اترا۔ یہاں وزارۃ الشئون الدینیہ کے افسران استقبال کے لیے موجود تھے، رات کو ڈھائی بجے فندق السفیر پہنچ کر سو گئے۔

الجزائر کے دارالحکومت کا نام بھی الجزائر ہی ہے، لیکن کانفرنس دارالحکومت سے تقریباً ۲۶۰ کیلومیٹر دور یہاں کے مشہور تاریخی شہر بجایہ میں منعقد ہو رہی تھی، اس لیے صبح ۸ بجے ہوٹل سے کار کے ذریعے بجایہ روانہ ہوئے۔ تیونس کے مشہور عالم شیخ محمد الشاذلی النیفر اور سعودی عرب کے ڈاکٹر محمد بھی اسی کار میں رفیق سفر بنے۔ الجزائر شہر سے نکلتے ہی دائیں طرف متوسط بلندی کے سرسبز و شاداب پہاڑ اور بائیں طرف بحر متوسط کے خوبصورت مناظر شروع ہو گئے۔ یہ سارا سفر افریقہ کے شمال مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شمالی افریقہ کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے، تصور کی نگاہیں ان حسین پہاڑوں اور سرسبز وادیوں میں ان خدامست مجاہدوں کے مقدس قافلے دیکھ رہی تھیں جنہوں نے عقبہ بن نافع کی سرکردگی میں ہزارہا میل کا پرخطر سفر طے کر کے یہاں اللہ کا کلمہ بلند کیا اور اس بربری علاقے کو نہ صرف اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام سے معمور کر دیا، بلکہ اس کی زبان تک بدل ڈالی۔

بجایہ میں

شہر بجایہ الجزائر کے دارالحکومت (الجزائر العاصمۃ) سے مغرب میں ۲۸۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مغرب اوسط کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جو بحر متوسط کے

کنارے اور جبل قواریہ کے دامن میں پھیلا ہوا ہے۔ جبل قواریہ سطح سمندر سے ۶۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے، اور اس کے ڈھلان ساحل سمندر تک چلے گئے ہیں، قدیم شہر بجایہ انہی ڈھلوانوں پہ آباد ہے، اور ساحل سمندر سے جبل قواریہ کو دیکھیں تو درمیان میں شہر کی عمارتیں ایک زینے کی طرح پہاڑ پر چڑھتی نظر آتی ہیں۔

ابن خلدونؒ نے (جو ایک عرصے تک اس شہر میں وزیر اور قاضی رہے ہیں) لکھا ہے کہ بجایہ ایک بربری قبیلے کا نام تھا جو زمانۂ قدیم سے یہاں رہتا تھا۔ اسی کے نام پہ بستی کا نام بجایہ مشہور ہو گیا۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط تک یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی جس کے آس پاس اس بربری قبیلے کے کچھ مکانات تھے، کوئی قابل ذکر شہر نہ تھا۔ تقریباً ۴۵۵ھ میں حمادی خاندان کے ناصر بن علناس نے مرکز سے بغاوت کر کے اسے ایک شہر کی حیثیت دی، اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ (معجم البلدان للحمویؒ، ص ۳۳۹، ج ۱)

منصور حمادی کے عہد حکومت (۴۸۱ھ تا ۴۹۸ھ) میں بجایہ ایک ترقی یافتہ شہر بن چکا تھا، منصور نے یہاں ایک شاندار محل تعمیر کیا، ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی، جس کا مینار ۶۰ فٹ بلند تھا، اور اس میں ۱۷ برآمدے تھے۔ اسی کے دور میں پانی کی سپلائی کے لیے جبل قواریہ سے شہر تک معلق پل تعمیر کیے گئے جن کے ذریعے پہاڑی چشموں کا پانی شہر تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ شہر مغرب اوسط کا ایک عظیم تجارتی مرکز بن گیا۔ یہاں کے پہاڑوں میں لوہے کی کانیں موجود تھیں، اس لیے یہاں سے لوہا دور دور تک برآمد ہوتا تھا۔ سمندر کے قرب اور پہاڑیوں اور سبزہ زاروں کی وجہ سے یہ شہر بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ موسم معتدل اور آب و ہوا صحت بخش تھی، اس لیے لوگ دور دور سے یہاں آکر آباد ہونے لگے۔ یہاں اسلامی علوم کی بڑی درسگاہیں بھی قائم ہیں اور بڑے بڑے علماء یہاں سے پیدا ہوتے۔

بجایہ بحر متوسط کے جس کنارے پر واقع ہے، اس کے بالمقابل دوسرے کنارے پہ اندلس پھیلا ہوا ہے، چنانچہ اندلس کے لوگ جب مشرقی ممالک کا سفر کرتے تو بجایہ ان کی

اہم منزل ہوئی۔ پھر جب اندلس میں طوائف الملوکی کا دَور آیا، تو سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور اسکے اثرات بد سے عاجز آکر بہت سے اہلِ علم نے اندلس سے ہجرت کی تو بجایہ کو اپنا مستقر بنایا۔ بعد میں جب مراکش کے یوسف بن تاشفین نے اندلس پر موحدین کی حکومت قائم کی تو اندلس کے بہت سے علماء و فضلاء کا رابطہ شمالی افریقہ کے ممالک سے بڑھ گیا، اِس دَور میں بھی بہت سے علماء اندلس سے آکر بجایہ میں مقیم ہوئے۔

اور آخر میں جب اندلس میں مسلمانوں کے پرچم بالکل ہی سرنگوں ہو گئے، تو غرناطہ کے سقوط کے بعد مراکش اور الجزائر ہی مسلمانوں کی پناہ گاہ بنے۔ اس دَور میں بھی بجایہ مہاجرینِ اندلس کا ایک اہم مرکز ثابت ہُوا۔

بجایہ میں ساتویں صدی ہجری میں جو مشہور علماء گذرے ہیں اُن کے تذکرے پر علامہ ابو العباس غُبرینیؒ (متوفی ۷۰۴ھ) نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے، "عنوان الدرایۃ فیمن عرف من العلماء فی المائۃ السابعۃ ببجایۃ" یہ کتاب استاذ رابح بونار کی تحقیق کے ساتھ ہی الجزائر ہی سے شائع ہو گئی ہے۔

بجایہ میں ہمارا قیام "فندق الحمادیین" میں ہُوا۔ یہ ہوٹل شہر بجایہ سے تقریباً پانچ میل دُور بحرِ متوسط کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ بجایہ کی چھوٹی سی بندرگاہ جس ساحل پر واقع ہے، وہاں سے یہ ساحل جنوب مغرب کی طرف ایک ہلالی نیم دائرہ بناتا ہوا چلا گیا ہے، اور پھر جنوب کی طرف مڑ کر سیدھا ہو گیا ہے۔ اس ساحل کے ساتھ ساتھ ایک ساحلی سڑک (MARINE DRIVE) حدِ نظر تک چلی گئی ہے۔ جس کے مغرب میں سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا سلسلہ ہے، اور مشرق میں بحرِ متوسط پوری آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ فندق الحمادیین اسی ساحلی سڑک پر واقع ہے، اس کے کمروں کی کھڑکیاں سمندر کے کنارے کھلتی ہیں، اور کمرے کی اندرونی فضا ہر وقت موجوں کے

دلآویز ترنم سے معمور رہتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے مشرقی دروازے سے، جو ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا ہے، بحیرۂ رُوم کا حسین منظر سامنے تھا، حدِ نظر تک بحیرۂ روم کی نیلگوں موجیں کروٹیں لیتی دکھائی دے رہی تھیں، خیال آیا کہ یہاں سے بالکل سامنے انہی موجوں کے اُس پار اندلس کا ساحل پھیلا ہُوا ہے، اور اس سمندر نے صدیوں اندلس کے مسلمانوں کو مشرقی ممالک سے ملانے کا فریضہ انجام دیا ہے، اور یہیں پر برسوں اُن فاتحین کی تگ و تاز جاری رہی ہے۔ جن کے نعرہ ہائے تکبیر کی گونج سے اس فضا کا ہر ذرہ معمور تھا، اس تصوّر سے اقبال مرحوم کے یہ اشعار یاد آگئے ؎

بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی — تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے — زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے

زمزموں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

کانفرنس

مندوبین کا قیام اس فندق الحمادیین میں تھا، لیکن کانفرنس یہاں سے تقریباً چھ میل دُور شہر بجایہ کے ٹاؤن ہال میں ہو رہی تھی۔ یہ کانفرنس الجزائر کی وزارتِ مذہبی امور کے زیرِ اہتمام ہر سال منعقد ہوتی ہے، اور اس کا مستقل نام "ملتقی الفکر الاسلامی" ہے۔ امسال اس کے لیے موضوع تھا "الاسلام والغزو الثقافی" یعنی اسلام اور ثقافتی جنگ"۔

اس موضوع کے مختلف گوشوں پر اظہارِ خیال کے لیے عالمِ اسلام سے معروف اہلِ علم اور اہلِ فکر کو دعوت دی گئی تھی۔ کانفرنس مسلسل آٹھ روز جاری رہی، سامعین میں یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ کو بطورِ خاص مدعو کیا گیا تھا، ہر مقالہ کے بعد طلبہ اس مقالے سے متعلق سوالات کرتے، اور مقالہ نگار ان کا جواب دیتا تھا۔ احقر نے اس کانفرنس کے لیے "ثقافتی جنگ بذریعہ نظامِ تعلیم" کے زیرِ عنوان ایک مقالہ لکھا تھا، لیکن جب میرے مقالے کا وقت آیا

تو میں نے بہ چند وجوہ مقالے کے بجائے فی البدیہہ تقریر مناسب سمجھی۔

اوّل تو مقالہ پورا پیش کرنے کا وقت نہیں تھا، ہر مقالہ نگار کو بمشکل دس دس منٹ دیئے جارہے تھے، اس لیے اس مختصر وقت میں اس اہم موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہ تھا، دُوسرے مقالے چھپ چھپ کر حاضرین میں تقسیم ہورہے تھے۔ اس لیے جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ طبع ہوکر سب کے پاس پہنچ ہی جاتی۔ تیسرے میں نے دیکھا کہ حاضرین پاکستان کے حالات جاننے کے بہت مشتاق تھے، اور مختلف نشستوں کے درمیان گفتگو سے احقر نے محسوس کیا کہ نہ صرف الجزائر کے لوگ، بلکہ دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی پاکستان کے قیام اور یہاں نفاذِ شریعت کی کوششوں سے بہت کم واقف ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بڑی حیرت اور اشتیاق کے ساتھ سنتے ہیں، اس کے علاوہ ہر نشست کے بعد طلبہ ملتے تو پاکستان کے حالات دریافت کرتے، اور بعض طلبہ نے تو صراحۃً فرمائش بھی کی کہ آپ کا خطاب پاکستان کے بارے میں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ الجزائر میں نفاذِ شریعت کے لیے ایک خاموش تحریک کام کررہی ہے، اور وہاں ابھی تک وہ مسائل موضوعِ بحث ہیں جن سے بفضلہ تعالیٰ ہم پاکستان میں فارغ ہوچکے ہیں، مثلاً یہ کہ کیا موجودہ معاشرے میں شراب بندی ممکن اور مناسب ہے؟ الجزائر پر ابھی تک فرانسیسی استعمار کے اثرات باقی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہاں حکومتی سطح پر اسلام کے نفاذ سے زیادہ اشتراکیت کے قیام پر توجہ دی گئی۔ اب رفتہ رفتہ حالات کچھ بہتر ہورہے ہیں۔ لیکن ماضی کے اثرات کا عالم یہ ہے کہ بڑے شہروں میں قدم قدم پر شراب خانے موجود ہیں جن میں کھلم کھلا شراب نوشی ہوتی ہے، ایسے ماحول میں اگر کہیں سے اس ام الخبائث کے خلاف آواز اُٹھتی ہے تو اسے ناقابلِ عمل سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح ابھی تک وہاں اس قسم کے مسائل بھی زیرِ بحث رہتے ہیں کہ کیا اس دَور میں حدودِ شرعیہ کا نفاذ ممکن یا مناسب ہے؟ کیا بینک کا سُود ربوٰ ہے یا نہیں؟۔ قابلِ شکر بات یہ ہے کہ نوجوانوں میں غیر معمولی دینی شعور بیدار ہورہا ہے، اور وہ بہت سی

رکاوٹوں کے باوجود لادینی رجحانات کا جم کر مقابلہ کر رہے ہیں، لہٰذا پاکستان میں نفاذِ شریعت کی طرف جو تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے، وہ ہماری نظر میں کم سہی، لیکن الجزائر کے حالات کے پیشِ نظر بہت قابلِ لحاظ ہیں، اور راقم نے محسوس کیا کہ اس ماحول میں پاکستان کے عملی تجربات کا تذکرہ انشاء اللہ زیادہ مفید اور ہمت افزائی کا موجب ہو گا۔ اور یہاں کے دینی حلقوں کے ہاتھ مضبوط کرے گا۔

چنانچہ احقر نے اپنے خطاب میں مختصراً ہندوستان میں انگریزی استعمار کی تاریخ، اس کے اثرات کے خلاف تحفظِ دین کے لیے علماء کرام کی جدوجہد، قیامِ پاکستان اور اس کے مقاصد کی تاریخ بیان کی، اس کے بعد یہاں نفاذِ شریعت کے داعیوں اور سیکولر نظام کے داعیوں کے درمیان جو کشمکش رہی، اس کے حالات بیان کیے، اور پھر ۱۹۷۷ء کے بعد سے ملک میں نفاذِ شریعت کے سلسلے میں جو کام ہوتے ہیں، ان کی تفصیل بتائی۔

ان تمام حالات کو سن کر حاضرین، بالخصوص طلبہ کا جوش و خروش قابلِ دید تھا، بات بات پر وہ اپنی تحسین و آفرین کا اظہار کرتے، یہاں تک کہ جب میں نے پاکستان میں شراب بندی اور پی آئی اے کی پروازوں میں شراب کی ممانعت کا ذکر کیا، اور یہ بتایا کہ اس ممانعت سے قبل ہمیں بعض حلقوں کی طرف سے اعداد و شمار پیش کر کے ڈرایا جا رہا تھا کہ اس قانون کے نتیجے میں ملکی آمدنی کتنی کم ہو جائے گی؟ اور ایئر لائنز کو کس قدر خسارہ ہو گا؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے یہ قدم اٹھا لیا گیا تو یہ سارے اوہام ہوا میں اڑ گئے اور بحمد اللہ ایئر لائنز کو خسارے کے بجائے پہلے سے زیادہ نفع ہوا، تو طلباء جوشِ مسرت میں اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے، اور دیر تک ہال تالیوں اور نعروں سے گونجتا رہا۔

تقریر کے بعد کانفرنس کے مندوبین اور طلبہ دونوں ہی بڑے اشتیاق کے ساتھ ملتے رہے، اور اب تک پاکستان کے حالات سے ناواقف ہونے پر اپنے افسوس کا بھی اظہار کرتے رہے۔ اگرچہ احقر نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے اس طویل مدت میں نفاذِ شریعت کی سمت میں جتنا سفر طے کیا ہے، وہ باقیماندہ سفر کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، لیکن ان حضرات کی نظر میں یہ

تھوڑا سا سفر بھی بہت حوصلہ افزا تھا۔ بہت سے لوگ دعائیں دیتے رہے کہ اللہ تعالےٰ پاکستان کو تمام دشمنوں سے محفوظ رکھے، اور نفاذِ شریعت کے راستے میں اُسے عالمِ اسلام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے آمین،

مَیں سوچ رہا تھا کہ اسلام کے نام پر ان تھوڑے سے اقدامات کے نتیجے میں عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی پاکستان سے محبت کا یہ عالم ہے تو اگر ہم واقعۃً پورے طور پر اپنے نظامِ زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیں تو پاکستان کے ساتھ ان مسلمانوں کی وابستگی کا کیا عالم ہوگا؟

اس اجتماع میں طلبہ کے علاوہ طالبات بھی آیا کرتی تھیں، جن کے لیے الگ الگ جگہ مقرر تھی، تمام طالبات خاصی حد تک حجاب کی رعایت کے ساتھ آئیں، ان کا پورا جسم ایک ڈھیلی عبا میں چھپا ہوا ہوتا، اور سر اور گلے پر اوڑھنی اوڑھے ہوئے ہوتیں۔ جو عموماً سروں سے باہر جھکی ہوتی تھیں، اور ان سے سر کا کوئی بال بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ چہروں پر نقاب نہیں ہوتا تھا۔ اس طریقے سے شرعی پردے کی مکمل پابندی تو نہیں ہوتی، لیکن الجزائر جن حالات سے گذرا ہے، ان میں جدید تعلیمی اداروں کی طالبات کا اتنا اہتمام کرلینا بھی بسا غنیمت تھا۔

احقر کی تقریر کے بعد ایک نشست میں ایک طالبہ نے ایک پرچہ میرے پاس بھجوایا۔ اس پرچہ میں اُس نے پاکستان کے ساتھ اپنی محبت اور اس کے حالات معلوم ہونے پر مسرت کا اظہار کیا تھا، اور افغانستان کے جہاد سے متعلق چند سوالات کئے تھے۔ طالبہ نے لکھا تھا کہ ہمارے بہت سے بہن بھائی اس جہاد میں عملاً شریک ہونا چاہتے ہیں، اس کا کیا راستہ ممکن ہے؟ نیز ہم میں سے بعض بہن بھائیوں نے مجاہدینِ افغانستان کے لیے کچھ رقم جمع کی ہے جسے بھیجنے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں، اس کا کوئی راستہ بتائیے۔ اس کے علاوہ مجاہدین کے ساتھ ہمدردی اور اخوت کے اظہار کا ہمارے پاس اور کوئی طریقہ تو نہیں تھا، اس لیے ہم نے ان کو دادِ شجاعت دینے کے لیے کچھ ترانے کہے، اور انہیں چھوٹے بچوں سے پڑھوا کر ان کے کیسٹ تیار کئے ہیں جو ہم اپنے مجاہد بھائیوں کو

بھیجنا چاہتے ہیں، تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ ان کے دینی بھائی بہن ہزارہا میل کے فاصلے پر رہ کر بھی ان کے لیے دُعا گو ہیں، ان کیسٹوں کو وہاں تک پہنچانے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ اور آخر میں یہ کہ ہم نے سُنا ہے کہ افغانستان کے محاذ پر جنگ کے دوران بہت سی کرامتیں بھی ظاہر ہو رہی ہیں، ان کرامتوں کے کچھ واقعات ہمیں سُنائیے۔

طلبہ کے اس معصوم جذبے سے طبیعت بہت متاثر ہوئی، اور ان سوالات کا جواب بھی میں نے انہیں تحریری طور پر دے دیا جس میں ان کی ہمت افزائی اور کچھ دینی نصائح بھی تھیں، تاہم میرا خیال تھا کہ شاید یہ نو عمر طلبہ کا وقتی جوش ہو۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ محض وقتی جذبہ نہیں تھا، ان طلبہ نے میرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق مجاہدین کی امداد و حمایت کا ہر ممکن طریقہ جاری رکھا۔

قدیم شہر بجایہ میں

کانفرنس کے پروگرام اس قدر مسلسل تھے کہ شہر بجایہ کے اندر جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا، مجھے چونکہ یہاں کے تاریخی مقامات دیکھنے کا شوق تھا، اس لیے ایک دن شام کی نشست کی حاضری کو مؤخر کر کے ایک الجزائری دوست کے ساتھ قدیم شہر کے اندر جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ شہر سمندر کے کنارے پر واقع ہے، اور اس کی عمارتیں سطح سمندر سے سطح کوہ تک بتدریج بلند ہوتی چلی گئی ہیں۔ بیشتر سڑکیں بھی ڈھلوان ہیں، اور بعض جگہ چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ چلنے والوں کے سہارے کے لیے سڑکوں کے کنارے پر پائپ لگے ہوئے ہیں۔

ہم سب سے پہلے بجایہ کے قدیم قلعے کے دروازے پر پہنچے جو "القصبۃ" کہلاتا ہے۔ اس کے صدر دروازے کے ساتھ ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر یہ عبارت تحریر ہے۔

القصبۃ، اسسها الموحدون 1145 - 1160ء[1] وھی قلعۃ حکومیۃ

---

[1] یہ ہندسے جنہیں آج ہم انگریزی ہندسے کہتے ہیں، دراصل قدیم عربی ہندسے ہیں، مغرب کے عرب ممالک بالخصوص الجزائر میں انہی ہندسوں کا رواج ہے، اور ان کو عربی ہندسوں کی حیثیت سے اپنایا گیا ہے

منيعة، وبداخلها مسجد يعتبر معهداً دراسياً عظيماً علّم فيه فطاحل العلماء، ومن بينهم عبد الرحمٰن ابن خلدون -

"قلعۂ قصبہ جسے موحدین کے شاہی خاندان نے ۱۱۴۵ء سے ۱۱۶۰ء عیسوی تک (ساتویں صدی ہجری میں) کے درمیانی عرصے میں تعمیر کیا- (۲)
قلعے کے اندر ایک مسجد ہے جو ایک عظیم درس گاہ رہ چکی ہے - جس میں بڑے بڑے علما نے درس دیا ہے جن میں علامہ ابن خلدونؒ بھی شامل ہیں.

قلعے کے اندر داخل ہوئے تو ایک شکستہ اور بوسیدہ عمارت نظر آئی جو قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ تھی، قلعہ کا بیشتر حصّہ کھنڈر ہو چکا ہے، صرف چند عمارتیں باقی ہیں، اور وہ بھی مائل بہ فنا نظر آتی ہیں، جو تھوڑے بہت آثار باقی ہیں، ان میں چند بالا خانے ہیں، ایک کشادہ دالان ہے جس میں حمام کے طرز کے کچھ کمرے بنے ہیں، اسی میں ایک کنواں بھی ہے اور قلعے کی فصیل ہے یہاں سے ساحل سمندر تک کا منظر سامنے ہے -

لیکن قلعہ کے بیچوں بیچ جو عمارت اپنی قدیم بنیادوں پر قائم ہے، وہ قلعے کی وہی مسجد ہے جس کی نشاندہی مذکورہ بالا کتبے میں کی گئی ہے۔ مسجد کا ہال کافی کشادہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ علامہ ابنِ خلدونؒ کے وقت سے اس عمارت میں کوئی ردوبدل نہیں کیا گیا، مسجد کے درمیانی ستون بھی اُسی دور کے ہیں، یہاں تک کہ اب یہ عمارت اس قدر مخدوش ہوگئی ہے کہ اسے زائروں اور سیاحوں کے لیے کھولا بھی نہیں جاتا۔ اتفاق سے آثار کے ایک افسر میرے الجزائری دوست سلیم کلالی صاحب کو مل گئے تھے، انھوں نے مسجد کو خاص طور پر کھلوایا۔

یہ عظیم الشان مسجد آج غیر آباد تھی، اس کے ستونوں نے اس کی چھت کا بوجھ بمشکل سنبھالا ہُوا تھا، لیکن اس کے درودیوار پر عہد ماضی کے دھندلے دھندلے آثار عہد رفتہ کی عظمتوں کی داستان سُنا رہے تھے- انھوں نے یہاں ابنِ خلدونؒ جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود دیکھا تھا، اور تاریخ اسلام کے اُس عظیم مفکر کی باتیں سُنی

تھیں جس کی نظیر کہیں صدیوں میں خال خال پیدا ہوتی ہے۔ ابنِ خلدونؒ بجایہ میں وزیر بھی رہے، قاضی بھی، خطیب بھی اور اُستاذ بھی۔

جامع مسجد اور بابُ البنود

"قصبہ" کے قلعے سے نکل کر ہم کافی چڑھائی چڑھنے کے بعد شہر کے بیچوں بیچ یہاں کی جامع مسجد میں پہنچے، یہ شہر کی قدیم جامع مسجد ہے جس میں بیشمار علمائے سلف نے نمازیں پڑھیں اور خطبے دیئے ہیں اور درس دیئے ہیں، جن میں شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ، علامہ عبدالحق اشبیلیؒ (صاحب "الاحکام")، علامہ ابن سید الناسؒ (شارح ترمذیؒ، وصاحبِ "عیون الاثر") (متوفی ۶۵۹ھ)، حافظ ابن الآبار القضاعیؒ (صاحبِ "مسند الشہاب" و "التکملہ للصلۃ") (متوفی ۶۵۸ھ)، علامہ ابوبکر ابن محرزؒ (متوفی ۶۵۵ھ) جیسے جلیل القدر علماء شامل تھے۔

یہ مسجد بحمد اللہ آج بھی آباد ہے، اس کے صحن کے دونوں طرف بنے ہوئے کمرے زمانۂ قدیم سے چلے آتے ہیں، یہ علماء کی درسگاہیں اور طلبہ کی اقامت گاہیں تھیں، اب بھی یہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تو ہے۔ لیکن سرکاری تحویل اور انتظام میں۔

مسجد کا ایک بغلی زینہ پہاڑ کی اُونچائی سے ایک زیریں سڑک پر اُترتا ہے، یہ سڑک شہر پناہ پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ یہاں قدیم زمانے سے شہر کی فصیل کا ایک دروازہ بنا ہوا ہے۔ جسے بابُ البنود کہتے ہیں۔ اوپر خوبصورت بُرج اب بھی باقی ہیں۔ اس دروازے کی بیرونی دیوار پر یہ عبارت تحریر ہے:۔

باب البنود الفوقة

كان يعتبر المدخل الرئيسي للمدينة، وبه بناء بجبل يحتضن مجلس السلطان الحمادي الذي كان يشرف منه على تنظيم الحفلات واستقبال القوافل.

یہ "باب البنود الفوقۃ" ہے، جو شہر کا صدر دروازہ سمجھا جاتا تھا، اس کے

اُوپر ایک خوبصورت عمارت ہے جس میں سلطان حمادی کی وہ نشست گاہ بھی ہے جس پر بیٹھ کر وہ اجتماعات کے انتظامات کی نگرانی اور آنے والے قافلوں کا استقبال کرتے تھے۔

علامہ عبدالحق اشبیلیؒ کے مزار پر

اتنا تو احقر کو معلوم تھا کہ بجایہ میں مشہور محدث علامہ عبدالحق اشبیلی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، علم حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے علامہ عبدالحق اشبیلیؒ محتاج تعارف نہیں، ان کی مشہور کتاب "الاحکام" کے حوالے شرحِ حدیث میں جا بجا ملتے ہیں، خاص طور پر حافظ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "نصب الرایہ" میں ان کے بہ کثرت حوالے دیتے ہیں۔ علامہ ابن القطانؒ کی مشہور کتاب "الوھم والایہام" انہی کی کتاب پر تنقید ہے۔ ان کی یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں ہے، لیکن پیر جھنڈو کے کتب خانے میں احقر نے اس کا قلمی نسخہ دیکھا ہے۔ بہرصورت وہ ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ ہیں اور بجایہ آنے کے بعد ان کے مزار پر حاضری کا اشتیاق تھا، لیکن کوئی مناسب رہنما نہیں مل رہا تھا۔

اس وقت بھی احقر کے رہنما سَلیم کلال صاحب خود بجایہ کے باشندے نہ ہونے کی بنا پر مزار سے واقف نہ تھے، بالآخر ہم پوچھتے پوچھتے وہاں تک پہنچ ہی گئے۔ باب البنود کسی وقت شہر کی آخری حد تھی، لیکن اب شہر اس سے کافی آگے پہنچ گیا ہے، چنانچہ باب البنود سے نکلنے کے بعد کافی آگے چل کر ایک گنجان سی سڑک پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس مسجد کے اندر علامہ عبدالحق کا مزار ہے۔ مزار کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا احاطہ بنا ہوا ہے۔ جس میں قبر کا اُبھرا ہوا نشان بھی موجود نہیں ہے۔ یہاں یہ عظیم محدث آرام فرما ہے۔

علامہ عبدالحق اشبیلیؒ ۵۱۰ھ میں اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ میں پیدا ہوئے تھے عمر کا ابتدائی حصہ اندلس میں گذارا، لیکن وہاں کے سیاسی انتشار کی بنا پر وہاں سے ہجرت کر کے بجایہ آگئے تھے، اور اسی کو وطن بنالیا۔ اسی لیے بعض اوقات انہیں "عبدالحق البجائی" بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ ذہبیؒ جیسے مردم شناس بزرگ ان کے بارے میں

ابنِ ابارؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں :۔

کان فقیھاً، حافظا عالما بالحدیث وعلله، عارفاً بالرجال، موصوفاً بالخیر والصلاح، والزھد والورع، ولزوم السنة والتقلل من الدنیا الخ

(سیر اعلام النبلاء ص ۱۹۹ ج ۲۱)

وہ فقیہ اور حافظِ حدیث تھے، حدیث اور اس کی علتوں کے عالم تھے، رجالِ حدیث کو پہچانتے تھے، زہد و تقویٰ، خیر و صلاح، اتباعِ سنت اور دُنیا سے بے رغبتی کے ساتھ متصف تھے۔

بجایہ میں قیام کے دوران وہ جامع مسجد کے خطیب بھی رہے، مدرس بھی، اور کچھ عرصہ کے لیے قاضی بھی، زندگی نظم وضبط کی پابند تھی، علامہ ابنِ عمیرہ ضبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہیں بیٹھ کر چاشت کے وقت تک طلبہ کو پڑھاتے، پھر چاشت کی آٹھ رکعتیں پڑھتے، اور گھر جا کر ظہر تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ ظہر کی نماز کے بعد عدالتی کام کرتے، اور اس وقت میں بعض اوقات پڑھاتے بھی تھے، عصر کے بعد لوگوں کی ضروریات پوری کرنے اور خدمتِ خلق کے لیے گھر سے نکل جاتے،

(البغیۃ الملتمس للضبیؒ ص ۳۷۸)

یہ تو دن کے معمولات تھے، اور رات کے بارے میں علامہ ابوالعباس غبرینیؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک تہائی رات پڑھنے میں گذارتے، ایک تہائی عبادت میں اور ایک تہائی سونے میں۔

(عنوان الدرایہ للغبرینیؒ ص ۴۲)

گھر والوں کے لیے بڑے شفیق اور مہربان بھی تھے، اور خوش طبع بھی، اکثر اپنی بیٹھک میں فقہاء کے ساتھ بیٹھے ہوتے، اندر سے کوئی کنیز آ کر گھر کے کسی کام کے لیے پیسے مانگتی تو چھوٹی سی چیز کے لیے بھی ضرورت سے بہت زیادہ پیسے دے دیتے۔ ایک مرتبہ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ جتنے پیسے آپ دے رہے ہیں، وہ ان کی مطلوب مقدار سے بہت

زائد ہیں، جواب میں آپ نے فرمایا:

لأجمع على أهل المنزل ثلاث شينات: شيخ، وإشبيلي وشحيح۔

(عنوان الدرایہ ص ۴۴)

میں اپنے گھر والوں پر تین شین (ش) جمع نہیں کرتا، میں شیخ اور اشبیلی تو ہوں، لہٰذا مجھ میں دو شین موجود ہیں، شحیح (یعنی بخیل) بننا نہیں چاہتا۔

افسوس ہے کہ ان کی تصانیف طبع نہیں ہوتیں، ورنہ کتاب "الاحکام" کے علاوہ ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے "الحاوی" کے نام سے ایک لغت اٹھارہ جلدوں میں لکھی تھی، اس کے علاوہ صحاح ستہ کا مجموعہ "الجامع الکبیر" کے نام سے لکھا تھا، اور احوال آخرت پر ایک کتاب "العاقبۃ" کے نام سے تحریر فرمائی تھی۔ نیز "کتاب التہجد"، "کتاب الرقاق" اور "اختصار الرشاطی" بھی ان کی تصانیف میں شمار کی گئی ہیں۔

اتنی بات تو علامہ عبدالحق اشبیلی رحمۃ اللہ علیہ کے تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے کہ ان کی وفات حاکم وقت کے ظلم و تشدد کے نتیجے میں ہوئی، لیکن اس واقعے کی کوئی تفصیل کسی نے بیان نہیں کی ــــ مگر ان کے مزار پر ایک عمر رسیدہ مجاور تھا، اس نے بتایا کہ ہمارے آباؤ اجداد سے یہ واقعہ مشہور چلا آتا ہے کہ علامہ عبدالحق اشبیلی رحمۃ اللہ علیہ کا بجایہ کے حاکم سے کسی مسئلے پر شدید اختلاف ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں اس نے انہیں سزائے موت دی، اور اُن کو اسی "باب البنود" پر سولی دی گئی جس کا ذکر پیچھے آیا ہے، پھر ان کی لاش اس دروازے کے بیرونی حصے میں تین روز تک لٹکتی رہی۔

اُس وقت "باب البنود" شہر کی آخری سد تھی، اور غروب آفتاب کے بعد یہ دروازہ بند کر دیا جاتا تھا، لیکن دروازہ بند کرنے سے پہلے چوکیدار یہ آواز لگایا کرتا تھا کہ "اگر شہر کا کوئی آدمی دروازے سے باہر ہے تو اندر آجائے دروازہ بند ہو رہا ہے۔"

مذکورہ مجاور کا کہنا تھا کہ جس روز علامہ عبدالحق کو سولی پر لٹکایا گیا، اُس روز شام کو چوکیدار نے حسب معمول یہ آواز لگائی تو جنگل کی طرف سے آواز آئی "ٹھہرو ابھی عبدالحق شہر سے باہر ہیں" ــــ چوکیدار نے اس کو واہمہ سمجھا، اور دوبارہ آواز لگائی، تو پھر جواباً وہی

آواز سنائی دی، اور یہ واقعہ تین مرتبہ ہوا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

اُسی مجاور نے یہ بھی بتایا کہ علامہ عبدالحقؒ کی وفات کے بعد، بجایہ کے بچے بچے کی زبان پر یہ جملہ تھا۔

الشیخ عبد الحق، قتل بغیر حق

وہ شیخ جو حق کا بندہ تھا، حق کے بغیر قتل ہوا۔

یہاں تک کہ اس علاقے میں یہ جملہ ضرب المثل بن گیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، شیخ کے مزار پر سلام عرض کرنے اور فاتحہ پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اللہ کے اس برگزیدہ بندے نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ حق، خدمت دین اور خدمتِ خلق میں صرف کیا، اور حق ہی کی خاطر مظلومیت کی لرزہ خیز موت کو سینے سے لگا کر زندۂ جاوید ہو گئے۔ وہ حاکم جس نے انہیں سُولی پر لٹکایا تھا، اُسے آج کوئی نہیں جانتا، مجھے اس دور کے تذکروں میں اس کا نام تک نہیں مل سکا، لیکن علامہ عبدالحقؒ کا نام زندۂ جاوید ہے، اور جب تک دُنیا میں حق کے نام لیوا باقی ہیں، اُن پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کئے جاتے رہیں گے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

وادئ صومام میں

بجایہ کے قیام کے دوران ایک جمعہ آیا تو کانفرنس کے منتظمین تمام مندوبین کو بجایہ سے تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر وادی صومام لے گئے۔ یہ سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھری ہوئی بڑی حسین وادی ہے، یہاں کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اس گاؤں کے ایک کچے مکان میں فرانسیسی استعمار کے زمانے میں الجزائر کے مختلف خطّوں کے مسلمان مجاہدین کا ایک کنونشن منعقد ہوا تھا جس میں تمام علاقوں کے لوگوں نے ایک متحد پلیٹ فارم بنا کر فرانس سے آزاد ہونے کی جدوجہد شروع کی تھی۔ حکومت الجزائر نے آزادی کے بعد اس مکان کو محفوظ رکھا ہے، اور اس کے آس پاس متعدد یادگاریں بنا دی ہیں۔

ہماری گاڑی خطرناک پہاڑی چڑھائی کو عبور کر کے اس گاؤں میں پہنچی، اور ہم اُتر کر پیدل چلے تو ایک طرف دیہاتی مکانات کی قطار تھی جن کے دروازوں پر دیہاتی عورتیں بیٹھی تھیں، جب ہمارا قافلہ ان مکانات کے قریب سے گذرا تو ان خواتین نے مسلسل چیخوں کے سے انداز میں منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالنی شروع کیں جو جنگل کے سناٹے میں دُور تک پھیلتی چلی گئیں۔ ان چیخوں میں خوف کے بجائے طربیت کا انداز نمایاں تھا۔ میں نے اس طرح کی آوازیں پہلی کبھی نہیں سُنی تھیں، اس لیے حیران تھا، میرے ساتھ تونس کے مفتی شیخ مختار السلامی تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ شمالی افریقہ کے علاقے میں یہ رواج ہے کہ خواتین خوشی کے مواقع پر، یا کسی مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے یہ آوازیں نکالتی ہیں، ان کو "زغاریدؔ" کہا جاتا ہے[1] اور یہ آوازیں خواتین ہی نکال سکتی ہیں یہ مردوں کے بس کا کام نہیں۔ ان آوازوں کی خصوصیت یہ ہے کہ بظاہر ان کے لیے اُردو میں "چیخ" کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کے انداز میں خوف یا رنج کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، بلکہ لہروں کے معمولی اتار چڑھاؤ سے اُن میں طربیت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے، شیخ سلامی نے بتایا کہ "زغاریدؔ" بہت سی عورتیں مل کر نکالتی ہیں، اس لیے ان کا مُنہ ہلکا سا کُھلتا ہے، لیکن دیکھنے والا عموماً یہ محسوس نہیں کرتا کہ یہ آواز اس مُنہ سے نکل رہی ہے، اور یہ اتنے تسلسل کے ساتھ نکالی جاتی ہیں کہ سانس ٹوٹنے نہیں پاتا۔

یہ "زغاریدؔ" کو سُننے کا میرا پہلا تجربہ تھا، بعد میں "الجزائر" شہر اور قاہرہ میں بھی دیکھا کہ شادی کی تقریبات میں گھروں سے بار بار یہ آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

---

[1] زغارید: زَغْرَدَۃٌ کی جمع ہے، یہ لفظ "زَغْدٌ" سے نکلا ہے، جو اُونٹ کی مسلسل بڑبڑاہٹ کو کہتے ہیں۔ (لسان العرب ۳ : ۱۹۴) لسان العرب میں "زغردۃ" کا ذکر نہیں ہے، لیکن آخر دور کی لغات میں یہ لفظ موجود ہے اور ان میں کہا گیا ہے کہ "خوشی کے مواقع پر عورتوں کے آواز نکالنے" کو کہا جاتا ہے۔ (اقرب الموارد ج ۱، صـ ۴۶۶ والمنجد ج ۱ ص ۳۰۰)

بہرکیف! ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو وہاں دیہاتی انداز کا ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس میں الجزائر کے آزادی کے رہنماؤں کا یہ تاریخی اجتماع منعقد ہُوا تھا۔ اس اجتماع سے پہلے اگرچہ فرانسیسی استعمار کے خلاف ملک کے مختلف حصّوں میں تحریکِ آزادی شروع ہو گئی تھی، لیکن ان کے درمیان نہ کوئی رابطہ تھا، اور نہ کسی مشترک منصوبہ بندی کا کوئی تصوّر تھا، چنانچہ فرانسیسی حکومت ان تحریکوں کو "تخریب کاری" اور "قتل و غارت گری" کا نام دیتی تھی۔ دوسری طرف اُس نے ان تحریکوں کے رہنماؤں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے تمام راستے مسدود کیے ہوئے تھے، ایسے حالات میں ان رہنماؤں کا باہم ملنا موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا۔ لیکن کچھ لوگوں نے جان پر کھیل کر اس دُور افتادہ پہاڑ کی چوٹی پر اس خفیہ اجتماع کا انتظام کیا۔ اُس اجتماع کے بعد یہ متفرق تحریکیں ایک مربوط اور متحد جہادِ آزادی کی شکل اختیار کر گئیں، اور غیر ملکی طاقتوں کو بھی حریت پسندوں کی اس منظم طاقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس مکان کے نیچے ایک پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹے سے جنگی طیارے کا تباہ شدہ ڈھانچہ پڑا ہُوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فرانسیسی فوج کا وہ طیارہ ہے جو آزادی کی جدّوجہد کے دوران حریت پسندوں نے پہلی بار گرایا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہے جس میں تحریکِ آزادی کی مختلف یادگاریں اور اُس دَور کے بہت سے اخبارات محفوظ ہیں۔

الجزائر واپسی

بجایہ میں ایک ہفتے کے قیام کے بعد تمام مندوبین کو ایک چارٹرڈ فوکر طیارے کے ذریعہ واپس الجزائر لے جایا گیا۔ صبح آٹھ بجے ہم طیارے میں سوار ہوئے، طیارہ چونکہ چھوٹا تھا، اس لیے ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ نیچی پرواز کر رہا تھا، اس کے ایک طرف الجزائر کے ساحلی سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے، اور دوسری طرف بحرِ متوسط ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شمالی افریقہ کی اسی ساحلی پٹی سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے عقبہ بن نافع رض کی

سرگرمی میں مجاہدینِ اسلام کے قافلے گزرے تھے۔

یہ مجاہدین گھوڑوں اور اونٹوں پر مصر، لیبیا اور تونس ہوتے ہوئے یہاں پہنچے تھے اور انھوں نے مراکش کی آخری حدود تک اسلام کا پرچم لہرا کر دم لیا۔ میرے ایک الجزائری دوست نے بتایا کہ میں ایک مرتبہ کار کے ذریعے قاہرہ تک گیا تھا، تقریباً پانچ ہزار کیلومیٹر کا یہ سفر میں نے مختلف شہروں میں آرام دہ ہوٹلوں کے اندر رُک رُک کر کیا۔ لیکن جب قاہرہ پہنچا ہوں تو تھکن کی وجہ سے لبِ دم آچکا تھا۔ اور یہ مجاہدین گھوڑوں اور اونٹوں پر بلکہ بعض مرتبہ پیدل بھی ان لق و دق صحراؤں اور درندوں سے بھرے ہوئے جنگلوں کو قطع کرتے ہوئے، اور قدم قدم پر دشمن کی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے، شمالی افریقہ کی فضاؤں میں ان خدا مست بزرگوں کے عزم اور حوصلے کی نہ جانے کتنی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ اللہ اکبر!

عقبہ بن نافعؓ اور ان کی فتوحات:

اس علاقے کی فتح کا اصل سہرا حضرت عقبہ بن نافعؓ کے سر ہے، جو صحابی تو نہ تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ایک سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ مصر کی فتوحات میں یہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ حکومت میں انھیں شمالی افریقہ کے باقی ماندہ حصے کی فتح کی مہم سونپ دی تھی، یہ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ساتھ مصر سے نکل کر دادِ شجاعت دیتے ہوئے تونس تک پہنچ گئے[1] اور یہاں قیروان کا مشہور شہر بسایا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جس جگہ آج قیروان آباد ہے، وہاں بہت گھنا جنگل تھا، جو درندوں سے بھرا ہوا تھا۔

حضرت عقبہ بن نافعؓ نے بربریوں کے شہروں میں رہنے کے بجائے مسلمانوں

---

[1] سیر اعلام النبلاء، ص ۵۳۳، ج ۳۔

کے لیے الگ شہر بسانے کے لیے یہ جگہ منتخب کی، تاکہ یہاں مسلمان مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی قوت بڑھا سکیں، ان کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ جنگل تو درندوں اور حشرات الارض سے بھرا ہُوا ہے۔ لیکن حضرت عقبہ رضؓ کے نزدیک شہر بسانے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے انہوں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا، اور لشکر میں جتنے صحابۂ کرامؓ تھے ان کو جمع کیا، یہ کل اٹھارہ صحابہؓ تھے، ان کے ساتھ مل کر حضرت عقبہؓ نے دُعا کی اور اس کے بعد یہ آواز لگائی :۔

أيتها السباع والحشرات، نحن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلّم ارحلوا عنّا، فإنّا نازلون، فمن وجدناه بعد قتلناه[1]

"اے درندو اور کیڑو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب ہیں، ہم یہاں بسنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم یہاں سے کُوچ کر جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو کوئی یہاں نظر آئے گا، ہم اُسے قتل کر دیں گے۔"

اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوا؟ امام ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں :۔

فلم يبق منها شيئ إلا خرج هاربا، حتى إن السباع تحمل أولادها.

"ان جانوروں میں سے کوئی نہیں بچا جو بھاگ نہ گیا ہو یہاں تک کہ درندے اپنے بچّوں کو اُٹھائے لے جا رہے تھے۔"

اور مشہور مورخ اور جغرافیہ دان علّامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ (متوفی ۶۸۲ھ) لکھتے ہیں :۔

فرأى الناس ذلك اليوم عجبا لم يروه قبل ذلك، وكان السبع يحمل أشباله، والذئب أجراءه، والحية أولادها، وهي خارجة سربا سربا، فحمل ذلك كثيرا من البربر على الإسلام[2]

---

[1] الکامل لابن الأثیر ص ۱۸۴، ج ۳، و تاریخ الطبری ص ۱۷۸، ج ۴۔ احوال ۵۰ھ

[2] آثار البلاد، للقزوینی ص ۲۴۲۔ القیروان

"اُس روز لوگوں نے ایسا عجیب نظارہ دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا کہ درندہ اپنے بچوں کو اُٹھائے لے جا رہا ہے، بھیڑیا اپنے بچوں کو اور سانپ اپنے بچوں کو، یہ سب ٹولیوں کی شکل میں نکلے جا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سے بربری مسلمان ہو گئے۔"

اس کے بعد عقبہ بن نافعؓ اور ان کے ساتھیوں نے جنگل کاٹ کر یہاں شہر قیروان آباد کیا، وہاں جامع مسجد بنائی، اور اسے شمالی افریقہ میں اپنا مستقر قرار دیا۔ حضرت معاویہؓ ہی کے دور میں عقبہ بن نافعؓ افریقہ کی امارت سے معزول ہو کر شام میں آباد ہو گئے تھے، آخر میں حضرت معاویہؓ نے انہیں دوبارہ وہاں بھیجنا چاہا، لیکن آپ کی وفات ہو گئی، بعد میں یزید نے اپنے عہدِ حکومت میں اُنہیں دوبارہ افریقہ کا گورنر بنایا، اِس موقع پر انہوں نے قیروان سے مغرب کی طرف اپنی پیشقدمی پھر سے شروع کی اور روانگی سے پہلے اپنے بیٹوں سے کہا:

إنّي قد بعت نفسي من الله عزّ وجلّ، فلا أزال أجاهد من كفر بالله۔

"میں اپنی جان اللہ تعالیٰ کو فروخت کر چکا ہوں، لہٰذا اب (مرتے دم تک) اللہ کا انکار کرنے والوں سے جہاد کرتا رہوں گا۔"

اس کے بعد انہیں وصیتیں فرمائیں اور روانہ ہو گئے[1] اسی زمانے میں انہوں نے الجزائر کے متعدد علاقے تلمسان وغیرہ فتح کئے، یہاں تک کہ مراکش میں داخل ہو کر اس کے بہت سے علاقوں میں اسلام کا پرچم لہرایا، اور بالآخر اسفی کے مقام پر، جو افریقہ کا انتہائی مغربی ساحل ہے، بحرِ ظلمات (اٹلانٹک) نظر آنے لگا۔ اِس عظیم سمندر پر پہنچ کر ہی حضرت عقبہؓ نے وہ تاریخی جملہ کہا کہ:

یا ربّ! لولا هذا البحر لمضيت في البلاد مجاهداً في سبيلك

---

[1] کامل ابن اثیر ص ۴۲، ج ۴۔ احوال ۶۲ھ

"پروردگار! اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں آپ کے راستے میں جہاد کرتا ہوا اپنا سفر جاری رکھتا"[1]

اور :-

اللّٰهم اشهد انّی قد بلغت المجهود، ولولا هٰذا البحر لمضیت فی البلاد اُقاتل من کفر بك، حتی لا یعبد احد دونك.

"یا اللہ، گواہ رہیئے کہ میں نے اپنی کوشش کی انتہا کردی ہے، اور اگر یہ سمندر بیچ میں نہ آگیا ہوتا تو جو لوگ آپ کی توحید کا انکار کرتے ہیں میں اُن سے لڑتا ہوا اور آگے بڑھتا یہاں تک کہ آپ کے سوا روئے زمین پر کسی کی عبادت نہ کی جاتی"[2]

اس کے بعد آپ نے اپنے گھوڑے کے اگلے پاؤں اٹلانٹک کی موجوں میں ڈالے، اپنے ساتھیوں کو بُلایا، اور ان سے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ، ساتھیوں نے ہاتھ اٹھا دیئے، تو عقبہ بن نافعؓ نے یہ اثر انگیز دُعا کی:

اللّٰهم إنّی لم اخرج بطرا، ولا اَشرا، وإنك تعلم انما نطلب السبب الذی طلبه عبدك ذوالقرنین، وهو اَن تعبد، ولا یشرك بك شیئ، اللّٰهم إنا مدافعون عن دین الاسلام، فکن لنا، ولا تکن علینا یا ذا الجلال والاکرام[3]

"یا اللہ، میں غرور و تکبر کے جذبے سے نہیں نکلا، اور تو جانتا ہے کہ ہم اسی "سبب" کی تلاش میں ہیں جس کی آپ کے بندے ذوالقرنین نے

---

[1] کامل ابن اثیر ص ۴۲، ج ۴

[2] مادۃ فتح المغرب ص ۱۰۵، ج ۱، بحوالہ ریاض النفوس ص ۲۵، ج ۱

[3] دائرۃ معارف القرن، فرید وجدی ص ۶۵۴، ج ۸، مقالہ "مراکش"

جستجو کی تھی، اور وہ یہ کہ بس دُنیا میں تیری عبادت ہو، اور تیرے ساتھ
کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اے اللہ! ہم دینِ اسلام کا دفاع کرنے
والے ہیں، تو ہمارا ہو جا، اور ہمارے خلاف نہ ہو، یاذا الجلال والاکرام"۔

اٹلانٹک کے کنارے سے حضرت عقبہ قیروان جانے کے لیے واپس ہوئے، راستہ میں ایک جگہ ایسی آئی جہاں پانی کا دُور دُور نشان نہ تھا، سارا لشکر پیاس سے بیتاب تھا، حضرت عقبہؓ نے دو رکعتیں پڑھ کر دُعا کی۔ دُعا سے فارغ ہوئے تھے کہ ان کے گھوڑے نے اپنے کھروں سے زمین کھودنی شروع کی، دیکھا تو ایک پتھر نظر آیا، اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلا ؎

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یہاں سے آگے بڑھ کر حضرت عقبہؓ نے یہ سوچ کر کہ راستہ بے خطر ہے، اپنے لشکر کے بیشتر حصّے کو جلد قیروان پہنچنے کے لیے آگے بھیج دیا، اور خود چند سو سواروں کے ساتھ راستے کے ایک قلعے تہوذا پر یلغار کے لیے روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ یہ مختصر نفری اس قلعے کو فتح کرنے کے لیے کافی ہوگی، لیکن قلعہ والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور اس پہ ستم یہ ہوا کہ حضرت عقبہؓ کے لشکر میں کسیلہ نامی ایک بربری شخص جو بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، حضرت عقبہؓ کا دُشمن تھا۔ وہ دُشمن سے مل گیا، اور لشکر کے راز دُشمن پر ظاہر کر دیئے۔ جس کے نتیجے میں مسلمان چاروں طرف سے گھر گئے۔ حضرت عقبہؓ نے اس موقع پر اپنے ایک ساتھی ابوالمہاجر کو، جو قید میں تھے، رہا کر کے ان سے کہا "تم دوسرے مسلمانوں سے جا ملو، اور ان کی قیادت کرو، کیونکہ میں شہادت کے لیے اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں سمجھتا"۔ لیکن ابوالمہاجر نے کہا کہ "مجھے بھی شہادت کی تمنا ہے"۔ اور یہ دونوں اپنے ساتھیوں سمیت دُشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

(کامل ابنِ اثیر، ص ۴۳، ج ۴)

چنانچہ عقبہ بن نافعؓ کا مزار الجزائر میں جنوب کی طرف کافی اندر واقع ہے۔

اور وہ جگہ آج بھی انہی کے نام پر "سیدی عقبہ" کہلاتی ہے۔

جتنی دیر جہاز پرواز کرتا رہا، میں ان تاریخی واقعات کے تصور میں گم رہا، یہاں تک کہ شہر الجزائر نظر آنے لگا، اور چند ہی لمحوں میں جہاز بومدین ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔

مجھے جہاز کے انتظار میں دو دن "الجزائر" شہر میں رُکنا پڑا۔ یہ دو روز شہر "الجزائر" کے مختلف مقامات کی سیاحت اور کتب خانوں کی سیر میں گذرے۔

"الجزائر" شہر بحرِ متوسط کے کنارے فرانسیسی طرز کا شہر ہے۔ جدید متمدن شہروں میں اسے بہت نمایاں حیثیت تو حاصل نہیں، لیکن کافی خوبصورت اور صاف ستھرا شہر، جو جدید تمدن کی سہولیات سے آراستہ بھی ہے، اور ساحل سمندر، چھوٹی پہاڑیوں اور کسی قدر سبزے کی وجہ سے قدرتی حسن سے بھی بہرہ یاب ہے۔ اسی شہر کے نام پر پورے ملک کو "الجزائر" کہا جاتا ہے۔ نام سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی جزائر کا مجموعہ ہوگا، لیکن درحقیقت اس کی وجہ تسمیہ بعض الجزائری دوستوں نے یہ بیان کی کہ یہاں ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں چند نہایت چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جو آبادی کے لیے بھی استعمال نہیں ہو سکتے، البتہ ان کو تفریح گاہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، ان جزیروں کی وجہ سے یہ شہر "الجزائر" کے نام سے مشہور ہوگیا، اور اسی کی بنا پر پورا ملک "الجزائر" کہلانے لگا۔

الجزائر کی مختصر تاریخ

حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں اس علاقے کی فتح کا حال تو پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس وقت یہ سارا علاقہ مراکش سمیت صوبہ تونس کا ایک حصہ تھا جس کا دارالحکومت قیروان سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں سب سے پہلے مراکش میں خودمختار حکومت قائم ہوئی۔ اور موجودہ الجزائر کے کچھ مغربی حصے بھی اس میں شامل ہوگئے۔ بعد میں یہ مغربی حصے اور

الجزائر کے باقی ماندہ علاقے بنو حفص کے خاندان کے زیرِ قیادت متحد ہو گئے اور انہوں نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پھر بنو حفص کی حکومت بھی متحد نہ رہ سکی۔ اور اس کے بھی متعدد ٹکڑے ہو گئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب یورپ کی عیسائی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف اپنی طاقت مجتمع کر رہی تھیں۔ انہوں نے پہلے اندلس کو اپنا نشانہ بنایا۔ اور اس پر اپنا قبضہ جما لیا۔ بعد میں افریقہ کے متعدد ساحلوں پر بھی ان کی تاک وتاز شروع ہو گئی۔ اور یہ سارا علاقہ اپنے عدمِ استحکام کے باعث یورپ کی اس تاک وتاز سے خطرے میں پڑ گیا۔

اُس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت ترکی کی خلافتِ عثمانیہ تھی۔ اور جہاں کہیں مسلمانوں کو مدد اور حمایت کی ضرورت پڑتی۔ وہی آگے بڑھ کر مدد کرتی تھی۔ اس غرض کیلئے اس کے بحری بیڑے سمندروں میں گشت بھی کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک بیڑے کے قائد خیر الدین باربروسا تھے۔ جن کی بحری مہمات مشہور و معروف ہیں زوالِ غرناطہ کے بعد انہوں نے اپنا بیڑا الجزائر کے ساحل پر لنگر انداز کیا ہوا تھا۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ سقوطِ غرناطہ کے نتیجے میں اندلس کے مسلمانوں پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ہیں اس میں ان کی مدد کی جا سکے۔ چنانچہ ان کے جہازوں نے ستم رسیدہ اندلسی مسلمانوں کو اندلس سے الجزائر منتقل کرنے میں بڑی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔

اس زمانے میں الجزائر کے مسلمان چونکہ اپنے عدمِ استحکام سے پریشان تھے۔ اندلس کا انجام ان کے سامنے تھا۔ اور ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ یورپ کی عیسائی طاقتیں انہیں بھی نوالہ تر سمجھ کر ان پر اپنا تسلط جما لیں۔ اس لیے الجزائر کے مسلمانوں نے خیر الدین باربروسا سے درخواست کی کہ الجزائر کو خلافتِ عثمانیہ اپنے زیرِ انتظام لے آئے۔ خلافتِ عثمانیہ نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ۹۲۵ھ میں اس علاقہ کا انتظام سنبھال لیا اور الجزائر باقاعدہ خلافتِ عثمانیہ کا حصّہ بن گیا۔

عرصۂ دراز تک الجزائر میں خلافتِ عثمانیہ کی حکومت پورے امن وامان اور عوام کی خوشحالی کے ساتھ قائم رہی۔ ترکی حکام کا برتاؤ بحیثیتِ مجموعی اسلامی تعلیمات کے مطابق رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس دینی فضا میں کمزوری آنی شروع ہوئی۔ بعض متعصب گورنروں نے

سرکاری ملازمتوں میں تعصب سے کام لینا شروع کیا۔ جس سے الجزائر کے باشندے بیزار ہوئے۔ یہ گورنر خود خلافتِ عثمانیہ کے احکام کی بھی پوری پابندی نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف عوام کے دینی طرزِ عمل میں بھی انحطاط آچکا تھا۔ اسی دورِ انحطاط میں خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے الجزائر کا آخری گورنر حسین پاشا مقرر ہوا۔ اور اس نے اپنی حماقت اور خودسری سے الجزائر کو فرانس کی غلامی میں دھکیل دیا۔ جس کا واقعہ بھی بڑا عبرت آموز ہے۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ الجزائر کے ایک یہودی تاجر بقری ابوجناح کے فرانسیسی تاجروں کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ انہی تجارتی معاملات کے دوران فرانسیسی تاجر اس الجزائری یہودی کے مقروض ہو گئے۔ اور جب ان سے واجب الادا رقوم کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ یہ عذر پیش کرتے کہ ہم خسارے کی وجہ سے ادائیگی سے معذور ہیں۔

بقری ابوجناح نے اس سلسلے میں الجزائر کے گورنر حسین پاشا سے مدد طلب کی۔ حسین پاشا نے فرانس کے سفیر کو بلا کر اصرار کیا کہ رقوم کی ادائیگی کا انتظام کیا جائے تا آخر گفت و شنید کے نتیجے میں فریقین کے درمیان صلح ہوئی اور طے پایا کہ فرانسیسی تجار بقری ابوجناح کو ایک خطیر رقم بطور صلح ادا کریں گے۔ مشہور یہ ہے کہ اس معاہدے کے دوران حسین پاشا کی نیت شروع سے خراب تھی۔ اور اس کو اس قضیئے سے دلچسپی اس لیے تھی کہ وہ یہ رقم یا اس کا بڑا حصہ خود رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس قسم کی بدعنوانیاں اس کا معمول بن چکی تھیں۔

جب معاہدہ کی رُو سے رقم کی ادائیگی کا وقت آیا تو فرانس کے کچھ اور تاجروں نے بقری ابوجناح پر یہ دعویٰ کر دیا کہ ہماری خطیر رقم اس کے ذمے واجب الادا ہے۔ اور انہوں نے اپنی حکومت کے ذریعے ایک حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ جس کے تحت بقری ابوجناح کے مقروض فرانسیسی تاجروں کو مذکورہ بالا معاہدے کے تحت رقم کی ادائیگی سے روک دیا۔ تاکہ یہ لوگ اپنی رقم فرانس ہی میں وصول کر سکیں۔

حسین پاشا کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے فرانسیسی سفیر کو بلا کر احتجاج کیا۔ اور کہا کہ رقم کی ادائیگی معاہدے کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اور اگر دوسرے تاجروں کی رقوم

بقری ابو جناح پر واجب ہیں تو وہ مذکورہ ادائیگی کے بعد اس سے وصول کریں۔ کیونکہ دونوں معاملات الگ الگ ہیں۔ لیکن سفیر اس پر راضی نہ ہُوا۔ وجہ یہ تھی کہ حسین پاشا کی بدعنوانیاں مشہور تھیں، اور جن تاجروں کی رقم بقری ابو جناح پر واجب تھیں ان کو اندیشہ یہ تھا کہ فرانس سے یہ رقم نکل جانے کے بعد بقری ابو جناح کے پاس نہیں پہنچے گی۔ بلکہ حسین پاشا اسے غصب کرلے گا۔ اور جب ہم بقری سے رقم طلب کریں گے تو اس کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہو گا۔

جب سفیر نے حسین پاشا کی بات ماننے سے انکار کیا تو حسین پاشا نے براہِ راست حکومتِ فرانس کو خط لکھا، حکومتِ فرانس نے وہ خط اپنے سفیر کے پاس بھیج کر اسے جواب دینے کا حکم دیا۔ اسی دوران وہ سفیر کسی اور معاملے کے سلسلے میں حسین پاشا کے پاس آیا تو پاشا نے اس سے کہا کہ مجھے ابھی تک اپنے خط کا جواب نہیں ملا، حالانکہ دیر بہت ہو چکی ہے۔ سفیر نے کہا کہ میری حکومت نے وہ خط مجھے جواب دینے کے لیے کہا ہے۔ حسین پاشا نے اس کی وجہ پوچھی تو سفیر نے کوئی ایسا جملہ کہہ دیا جس سے حسین پاشا کو تحقیر کی بُو آئی۔ اس وقت پاشا کے ہاتھ میں ایک پنکھا تھا، اُس نے وہ پنکھا فرانسیسی سفیر کے مُنہ پر دے مارا۔ اور اسے باہر نکلوا دیا۔

حکومتِ فرانس نے اپنے سفیر کی توہین پر شدید احتجاج کیا، اور مطالبہ کیا کہ حسین پاشا سفیر سے معذرت کرے، لیکن حسین پاشا نہ مانا۔ اس وقت فرانس کی حکومت اپنے بہت سے داخلی مسائل سے دوچار تھی، اور متعدد محاذوں پر اسے بھی جنگ درپیش تھی، اس لیے وہ کوئی نئی جنگ مول لینا نہیں چاہتی تھی، اس لیے بالآخر اس نے یہ تجویز پیش کی کہ حسین پاشا بذاتِ خود سفیر یا حکومتِ فرانس سے معذرت کے بجائے پیرس میں رہنے والے کسی بھی شخص کو اس کام کے لیے اپنا نمائندہ بنا دے کہ وہ حکومتِ فرانس سے اس کی جانب سے معذرت کرے۔

خلافتِ عثمانیہ کے مرکز کی طرف سے بھی حسین پاشا کو تاکید کی گئی کہ وہ اس تجویز کو قبول کر کے اس پر عمل کرلے۔ لیکن حسین پاشا اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اور اس نے یہ تجویز بھی نہ مانی۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ حکومتِ فرانس جنگ پر آمادہ ہوگئی۔ اور ایک طاقتور بحری بیڑے کے ذریعے اس نے الجزائر پر حملہ کر دیا حسین پاشا اس حملے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور حکومتِ فرانس پورے الجزائر پر قابض ہوگئی، اور حسین پاشا کو گرفتار کر کے پیرس بلا لیا گیا۔

بعض مؤرخین نے اس صورتِ حال کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حسین پاشا خود الجزائر کا باشندہ نہیں تھا۔ اس لیے اُسے وطن کا کوئی درد نہ تھا۔ اور اس نے ایسے اقدامات کئے جو بالآخر الجزائر کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ لیکن علامہ شیخ محمد بیرم تونسی رحمۃ اللہ علیہ جو آخری دَور میں شمالی افریقہ کے بڑے مسلم الثبوت عالم تھے۔ اور علوم دین کے علاوہ تاریخ سیاست اور جغرافیہ پر بھی ان کی نگاہ بڑی وسیع تھی۔ اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید کرتے ہُوئے فرماتے ہیں۔

اسلامی قومیت ایک ہی ہوتی ہے، اور مشاہدے سے بھی اس بات کی تردید ہوتی ہے (کہ باہر سے آنے والے مسلمان حکمرانوں کو وطن کا درد نہیں ہوتا) تاریخ سے یہ بات ثابت ہے اور مشاہدے میں آچکی ہے کہ باہر سے آنے والے کتنے مسلمان حکمرانوں نے اپنے زیرِ حکومت علاقے سے پوری وفاداری کی، اس میں حاصل ہونے والی نعمتوں پر شکر گزار رہے۔ اور اسے خوبصورت اور مستحکم بنانے میں امانت و دیانت کا پُورا خیال رکھا۔ اس کے برعکس بہت سے ابناءِ وطن نے بالکل اُلٹا معاملہ کیا، لہٰذا درحقیقت کسی علاقے سے مسلمانوں کی حکومت زائل ہونے کا سبب حکمرانوں کی قومیت نہیں ہوتی۔ بلکہ سبب یہ ہوتا ہے کہ اس علاقے کے اکابر کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ وہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور اسی فسق و فجور کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حکومت نااہلوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا قول ان کے بارے میں سچا ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس پر ایسے لوگوں کو مسلط فرما دیتے ہیں جو اسے تباہ کر کے چھوڑتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قوموں کے زوال و

انحطاط کی تاریخ سے ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ ملکوں کے حالات پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں وہ ان کے مصائب کو فساد کے اصل سبب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خواہ وہ سبب زمانے کے اعتبار سے کتنا پرانا ہو۔

کسی ملک کا وہ آخری حکمران جس کے ہاتھوں اس ملک کا زوال ہوتا ہے وہ درحقیقت ایک چھپے ہوئے مزمن مرض کی ظاہری علامت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اللہ اور اُس کے بندوں کے سامنے جواب دہ ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مرض کو روکنے اور اس کا علاج کرنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اسے کم کرنے کے بجائے اس کے بحران کو اور بڑھایا یہاں تک کہ وہ مرض امت کے لیے صاعقۂ آسمانی سے زیادہ شدید ہو گیا۔ اس لیے کہ بیمار جسم ان عوارض سے بھی متاثر ہو جاتا ہے جن سے صحت مند جسم متاثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا چونکہ وہ حکمران شر کی علامت ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی دُنیا و آخرت کی رسوائی کے لیے یہ بات کافی ہے۔

لہٰذا دراصل الجزائر کا مرض اسی دن شروع ہو گیا تھا۔ جب قسطنطنیہ میں (جو خلافتِ عثمانی کا پایۂ تخت تھا) اخلاقی زوال شروع ہُوا اور اس کے نتیجے میں حکومتی ادارے خراب ہوئے۔ حکام میں بگاڑ پیدا ہُوا، اور حسین پاشا جیسے حکام کی وبا سے صرف الجزائر نہیں، ملک کے بہت سے حصے متاثر ہوئے۔ اور وہاں ظلم و ستم بدنظمی اور بربادی پھیل گئی "

(صفوۃ الاعتبار[1] بمستودع الامصار والاقطار للشیخ محمد بیرم ص ۹ و ۱۰ ج ۳)

---

[1] صفوۃ الاعتبار شیخ محمد بیرم تونسیؒ کا سفرنامہ ہے جو پانچ اجزاء پر مشتمل ہے۔ اور اس میں افریقہ اور یورپ کے متعدد ممالک کے حالات انہوں نے تحریر فرماتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحے پر)

بہرکیف ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں فرانسیسی استعمار نے الجزائر پر اپنے پنجے گاڑ لیے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مزاحمت کی تحریکیں جاری رہیں، لیکن بالآخر فرانس نے سب پر قابو پا کر اپنی مستحکم حکومت قائم کر لی۔

الجزائر پر فرانس کا استعمار عالمِ اسلام کا بدترین استعمار ثابت ہوا۔ جس میں مسلمانوں کے لیے شخصی زندگی میں بھی دین پر عمل کرنا دوبھر بنا دیا گیا۔ بہت سی مسجدیں شہید کر دی گئیں۔ بہت سی مساجد کلیسا میں تبدیل کر دی گئیں۔ اسلامی علوم تو کجا، عربی زبان کی تعلیم پر بھی پابندی لگائی گئی۔ عربی کے بجائے فرانسیسی زبان کو ملک کی سرکاری زبان قرار دے کر لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس زبان کو نہ صرف سیکھیں، اپنے تمام معاملاتِ زندگی اسی زبان میں انجام دیں۔ لوگوں کو یہاں وسیع پیمانے پر آباد کیا گیا، یہاں تک کہ شہر الجزائر میں اکثریت عیسائیوں کی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ کی تمام اخلاقی بیماریاں درآمد کر کے یہاں پھیلائی گئیں۔ یہاں تک کہ بڑے شہروں میں مسلمان خواتین کے غیر مسلموں کے ساتھ نکاح کے بھی بہت سے واقعات ہونے۔

لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کفیل ہے۔ جبر و تشدد کی اس فضا میں بھی کچھ اللہ کے بندے دینی علوم کو سینے سے لگائے بیٹھے رہے۔ انہوں نے چھپ چھپ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اور بہت سے لوگوں کو دینی علوم میں کمال حاصل کرنے کے لیے تیونس کی جامع زیتونہ اور مصر کی جامع ازہر میں بھیجتے رہے۔

دوسری طرف ملک کے مختلف حصوں میں فرانسیسی استعمار کے خلاف جدوجہد کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ تقریباً سو سوا سو سال کے بعد یہ جدوجہد ایک

(بقیہ گذشتہ سے پیوستہ:) احقر نے جتنے سفرنامے دیکھے ہیں، ان میں یہ سفرنامہ بڑی انفرادی خصوصیات رکھتا ہے۔ اور اس میں تمام متعلقہ ممالک کے بارے میں اس قدر تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی معلومات جمع ہیں، جو کسی اور سفرنامے میں احقر نے نہیں دیکھیں۔ الجزائر کی جو مختصر تاریخ احقر نے اُوپر بیان کی ہے وہ بھی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

منظم تحریکِ آزادی کی شکل اختیار کرگئی۔ اور سالہا سال کی مسلح جدوجہد اور زبردست
جانی و مالی قربانیوں کے بعد ملک فرانسیسی سامراج کے تسلط سے آزاد ہوا۔

لیکن عالمِ اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی استعمار کے طویل زمانے میں
فرانسیسی سامراج ملک میں ایسے لوگوں کی پوری ایک نسل تیار کر چکا تھا۔ جو سیاسی طور پر
سامراج کے خواہ کتنے خلاف ہوں لیکن نظری اور عملی لحاظ سے پوری طرح یورپ کے
رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور اسی کے ذہن سے سوچنے کے عادی تھے۔ آزادی کی
تحریک میں جہاں ایک بہت بڑی تعداد اسلامی ذہن کے مخلص مجاہدین کی تھی۔ وہاں
ایک بڑا عنصر ایسا بھی تھا۔ جس کی نظر میں آزادی کا مقصد دین کی بالادستی کو واپس لا
نہیں بلکہ صرف وطنی بنیاد پر اپنی قوم کو بیرونی حملہ آوروں سے آزاد کرانا تھا۔ اللہ تعالیٰ
کے فضل و کرم سے اس تحریک نے اس حد تک تو کامیابی حاصل کرلی۔ لیکن آزادی
کے بعد جن لوگوں نے عنانِ اقتدار سنبھالی وہ زیادہ تر دوسرے عنصر سے تعلق رکھتے
تھے۔ چنانچہ انہوں نے ملک کو "اشتراکی جمہوریہ" قرار دینے کا اعلان کردیا۔ اور اشتراکی
پالیسیوں ہی کی پیروی شروع کردی جس کے نتیجے میں ان لوگوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں
جنہوں نے جان و مال کی قربانیاں اس لیے دی تھیں کہ یہاں اسلام کی بالادستی قائم ہو۔

شروع شروع میں دوسری اشتراکی حکومتوں کی طرح یہاں بھی دین کے سلسلے
میں قدرے سختی کی پالیسی اختیار کی گئی لیکن عوام کی اصل خواہش کو بہت دنوں تک
زیادہ دبایا نہیں جاسکا۔ اور رفتہ رفتہ اس معاملے میں نرمی اختیار کرنا پڑی۔ اب بحمدا
قدرے نرمی کی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے، دوسری طرف عوام بالخصوص نوجوانوں میں اسلام
کو ہر شعبۂ زندگی میں برسرِ کار لانے کے لیے ایک پُرجوش شعور پیدا ہو رہا ہے۔ اس شعور کو
سختی سے دبانا بھی حکومت کے لیے مشکل ہے۔ اور اسے وہ ایک سیاسی خطرہ بھی سمجھتی
ہے۔ اس لیے ایسی بین بین کی پالیسی پر گامزن ہے۔ جس میں عالمِ اسلام کا فی الجملہ نام بھی
لیا جاتا رہے۔ اور اس کی عملی زندگی کی تحریک کوئی خطرہ بھی نہ بن سکے۔ یہی پالیسی عالمِ اسلام
کی تقریباً تمام حکومتوں نے اختیار کی ہوئی ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔

مجموعی تاثرات

الجزائر میں میرا قیام تقریباً ایک ہفتہ رہا۔ اس مختصر مدت میں ملک کے دینی، معاشی اور معاشرتی حالات کا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن سرسری نگاہ میں چند تاثرات ضرور قائم ہوئے۔

(۱) ایسا لگتا ہے کہ حکومت نے سادہ طرزِ معیشت اور ملکی مصنوعات پر انحصار کے لیے کافی محنت کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ آرائش و زیبائش اور تکلفات کی طرف توجہ نہیں ہے۔ اس کے بجائے ملکی مصنوعات کی سرپرستی کی پالیسی اختیار کی جا رہی ہے۔ الجزائر کے ایک عظیم الشان تین منزلہ ڈیپارٹمنٹل سٹور میں جانا ہوا تو بیشتر اشیاء ملک کی بنی ہوئی نظر آئیں۔ خواتین کے کپڑوں کی دکانوں پر بھی ملک کا بنا ہوا سادہ کپڑا فروخت ہو رہا ہے جو تمام تر سوتی تھا، اور خواتین اسی کو ذوق و شوق کے ساتھ خرید رہی تھیں۔ بچوں کے کھلونوں کی ایک بڑی طویل و عریض دکان میں تمام تر کھلونے ملکی پلاسٹک کے بنے ہوئے بک رہے تھے۔ کوئی غیر ملکی کھلونا مجھے نظر نہیں آیا۔

پورے ملک میں پنکھے کا رواج بہت کم ہے۔ حالانکہ بعض جگہ گرمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ جن ہوٹلوں میں ہمارا قیام رہا۔ ان میں نہ پنکھا تھا، نہ ایئرکنڈیشنر۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ملک میں پنکھا بنانے کی کوئی فیکٹری نہیں ہے، اور غیر ممالک سے درآمد کرنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، ادھر گرمی اتنی ناقابلِ برداشت نہیں ہوتی کہ پنکھے کے بغیر چارہ نہ ہو۔

(۲) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیہات میں ترقیاتی کام کافی ہوا ہے، چنانچہ بجایہ کے راستے میں جو بیسیوں دیہات احقر نے دیکھے، ان کی اندرونی گلیوں میں بھی کوئی مکان کچا نظر نہیں آیا، تمام مکان پکے تھے، اور مکین بھرے پرے سے کھاتے پیتے نظر آتے تھے۔

(۳) نچلے درجے کے عوام اور زیرِ تعلیم نوجوانوں میں دینی رجحان بہت زیادہ ہے

لیکن بڑے شہروں میں قدم قدم پر شراب خانوں اور نائٹ کلبوں وغیرہ نے فضا بہت خراب کی ہوئی ہے۔ عورتیں تین قسم کی ہیں۔ ایک ٹھیٹھ قدیم انداز کی بُرقع پوش، جن کی صرف ایک آنکھ کھلی ہوتی ہے۔ یہ زیادہ تر عمر رسیدہ خواتین ہیں، اور ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ دوسری ایسی خواتین جن کے ہاتھ اور چہرے کے سوا سارا جسم ڈھیلے گاؤن میں ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر کالجوں کی طالبات ہیں۔ اور تیسرے بالکل مغربی انداز کے لباس اسکرٹ وغیرہ میں نیم برہنہ، اور ان کی تعداد بھی کم نہیں۔

سنا ہے کہ تعلیمی اداروں میں رفتہ رفتہ دوسری قسم کا لباس فروغ پا رہا ہے اور نوجوانوں میں اپنے قدیم دینی طرز زندگی کی طرف لوٹنے کا رجحان کافی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رجحان کو مزید قوت اور ترقی عطا فرمائیں، اور جو لوگ اس راہ میں جدوجہد کر رہے ہیں، ان کو اپنی تائید اور نصرت سے نوازیں۔ آمین ثم آمین

دوبارہ قاہرہ میں

دو روز الجزائر العاصمہ میں گذارنے کے بعد شوال ۱۴۰۶ھ کی صبح کو سات بجے الجیرین ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوئے۔ طیارہ چار گھنٹے شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں پر پرواز کرتا ہوا مصری وقت کے مطابق بارہ بجے کے قریب قاہرہ پہنچا، قاہرہ پہنچنے سے پہلے طیارے سے نہر سویز اور اہرام مصر صاف نظر آئے۔

پاکستانی سفارت خانے کے کچھ حضرات ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے پہنچ گئے تھے، اس لیے بحمد اللہ ہوائی اڈّے کے مراحل بہ آسانی طے ہو گئے، اُترنے کے بعد سب سے پہلی فکر یہ تھی کہ کسی طرح نماز جمعہ مل جائے، لیکن ہوائی اڈّے سے باہر نکلنے کے بعد معلوم ہوا کہ نماز ختم ہو چکی ہے، یہاں سعودی عرب وغیرہ کی طرح قاعدہ یہ ہے کہ نماز جمعہ زوال

کے فوراً بعد پڑھ لیتے ہیں، اور شہر بھر کی تمام مساجد میں تقریباً ایک ہی وقت جمعہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی ایک مسجد میں جمعہ نہ ملے تو پھر کہیں نہیں مل سکتا۔ لہٰذا ظہر پڑھے بغیر چارہ نہیں تھا۔

اس مرتبہ قیام رامیسس ہلٹن میں ہوا، یہ چھبیس منزلہ ہوٹل شہر کے وسط میں میدان التحریر کے قریب اور دریائے نیل کے کنارے واقع ہے۔ میرا قیام چوتھی منزل پر تھا، کمرے کا ایک دروازہ ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا تھا، اور اس برآمدے سے دریائے نیل کا منظر بالکل سامنے تھا، جہاں ہر وقت کشتی رانی کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور اس کے پیچھے برج القاہرہ کی اسّی منزلہ عمارت اور قاہرہ کی دیگر سربفلک عمارتیں دُور تک پھیلی نظر آتی تھیں۔

اگرچہ مصر میں پاکستان کے سفیر جناب راجہ ظفر الحق صاحب نے مجھے پیشکش کردی تھی کہ وہ قاہرہ میں راہنمائی کے لیے سفارت خانے کے کسی افسر کو میرے ساتھ کردیں گے، لیکن چونکہ احقر کے پیشِ نظر جو کام تھے، ان میں کسی صاحبِ ذوق مقامی عالم کی ضرورت تھی، دوسری طرف بحمد للہ مصر کے متعدد اہلِ علم سے تعارف تو تھا، لیکن اس کام کے لیے بے تکلفی کی بھی ضرورت تھی، جس کے بغیر کسی سے مدد کے لیے کہنا بھی دل کو گوارا نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر حسن عبداللطیف شافعی جو جامعہ القاہرہ کے کلیۂ دارالعلوم کے پروفیسر اور اسلام آباد کی جامعہ اسلامیہ کے نائب صدر رہیں، ان دنوں قاہرہ ہی میں تھے، الجزائر جاتے ہوئے جب میں قاہرہ میں ٹھہرا تو وہ شہر سے باہر تھے، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، لیکن میں نے اپنا واپسی کا پروگرام انہیں بتا دیا تھا، چنانچہ وہ احقر کی واپسی کے منتظر تھے، اور عصر کے قریب وہ ہوٹل تشریف لے آئے، اور اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں کہ وہ اس کے بعد میری قاہرہ سے روانگی تک مسلسل دل و جان سے میرے ساتھ ہی رہے، اور ان کی رفاقت میں قاہرہ کا قیام نہایت خوشگوار، مفید اور دلچسپ رہا۔

نمازِ عصر کے بعد ان کے ساتھ قاہرہ کے اہم تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے گیا۔

روضہ اور اس کی فتح کا واقعہ

سب سے پہلے ہم روضہ پہنچے جو قاہرہ کا بڑا تاریخی محلہ تھا، مصر کی فتح سے پہلے، بلکہ بعد بھی اخشیدیوں کے زمانے تک یہ جگہ "جزیرۃ مصر" کہلاتی تھی۔ کیونکہ یہ دریائے نیل کے درمیان واقع ہے۔ اس کے ایک طرف قاہرہ تھا، اور دوسری طرف جیزہ جس میں اہرامِ مصر واقع ہیں، جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو قبطی بادشاہ مقوقس نے قلعہ سے نکل کر اسی جزیرے کے قلعے میں پناہ لی تھی اور اس تک پہنچنے کے لیے دریائے نیل پر جو پل بنا ہوا تھا، وہ توڑ دیا تھا، تاکہ مسلمان دریا عبور کر کے جزیرہ تک نہ پہنچ سکیں، دوسری طرف اس نے قیصرِ روم سے مدد طلب کی تھی کہ وہ مسلمانوں کے عقب سے اُن پر حملہ کر دے۔

ان حالات میں مقوقس نے حضرت عمرو بن العاص رضؓ کے پاس اپنے ایلچیوں کے ذریعے خط بھیجا کہ تم ایک طرف دریائے نیل اور دوسری طرف رومی فوجوں کے درمیان گھر چکے ہو، تمہاری تعداد بھی کم ہے اور اب تمہاری حیثیت ہمارے ہاتھوں میں قیدیوں کی سی ہے، لہٰذا اگر خیریت چاہتے ہو تو صلح کی بات چیت کے لیے اپنے کچھ آدمی ہمارے پاس بھیج دو۔

جب حضرت عمرو بن عاص رضؓ کے پاس یہ ایلچی پہنچے تو انہوں نے فوراً کوئی جواب دینے کے بجائے انہیں دو دن دو رات اپنے پاس مہمان رکھا، مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے شب و روز کے معمولات اور اُن کے جذبات و خیالات سے اچھی طرح واقف ہو جائیں، دوسری طرف جب ایلچیوں کو دیر ہوئی تو مقوقس کو خطرہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ایلچیوں کو قتل کرنا جائز نہ سمجھتے ہوں، لیکن دو روز کے بعد ایلچی حضرت عمرو بن عاص رضؓ کا یہ پیغام لے کر پہنچ گئے کہ ہماری طرف انہیں تین باتوں کے علاوہ کوئی چوتھی بات قابلِ قبول نہ ہوگی۔ (یعنی اسلام، جزیہ یا جنگ) جو ہم پہلے بھی آپ کو بتا چکے ہیں۔

پیغام وصول کرنے کے بعد مقوقس نے ایلچیوں سے پوچھا کہ تم نے ان مسلمانوں کو کیسے پایا؟ اس کے جواب میں ایلچیوں نے کہا:۔

رأينا قوما الموت أحب إلى أحدهم من الحياة، والتواضع أحب إليهم من الرفعة. ليس لاحدهم في الدنيا رغبة ولا نهمة، و إنما جلوسهم التراب، وأكلهم على ركبهم وأميرهم كواحد منهم، ما يعرف رفيعهم من وضيعهم، ولا السيد من العبد، و إذ حضرت الصلاة لم يتخلف عنها منهم احد، يغسلون اطرافهم بالماء ويخشعون في صلاتهم.[1]

"ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی ہے جس کے ہر فرد کو موت زندگی سے زیادہ محبوب ہے، وہ لوگ تواضع اور انکسار کو ٹھاٹ باٹ سے زیادہ پسند کرتے ہیں، ان میں سے کسی کے دل میں ——— دنیا کی طرف رغبت یا اس کی حرص نہیں ہے، وہ زمین پر بیٹھتے ہیں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کھاتے ہیں، ان کا امیر اُن کے ایک عام آدمی کی طرح ہے، ان کے درمیان اُونچے اور نچلے درجے کے آدمی پہچانے نہیں جاتے، نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں آقا کون ہے اور غلام کون؟ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ان میں سے کوئی پیچھے نہیں رہتا۔ وہ اپنے اعضا کو پانی سے دھوتے ہیں اور نماز بڑے خشوع سے پڑھتے ہیں:"

کہتے ہیں کہ مقوقس نے یہ سُنکر کہہ دیا تھا کہ "ان لوگوں کے سامنے پہاڑ بھی آجائیں گے تو یہ اُنہیں ٹلا کر رہیں گے، ان سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔" بالآخر باہمی پیغامات کے تبادلے کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی قیادت میں

---

[1] النجوم الزاهرة، لابن تغري بردي ص ۱۱، ج ۱۔

دس افراد کی ایک سفارت مقوقس کے پاس بھیجی، مقوقس نے ان کو بھی روپے پیسے کا لالچ دینے کی کوشش کی، اور ان کی معاشی تنگ حالی کے حوالے سے یہ یقین دلانا چاہا کہ اس کی پیشکش کو قبول کر کے مسلمان خوشحال ہو جائیں گے لیکن اس کے جواب میں حضرت عبادہ بن صامتؓ نے جو عجیب و غریب تقریر فرمائی وہ صحابہ کرام کے ایمان و یقین، ان کے آہنی عزم و ثبات، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر اور شوقِ شہادت کی بڑی اثر انگیز تصویر ہے، اس تصویر کے کچھ حصے یہ ہیں:۔

لیس غزونا عدوا ممن حارب الله، لرغبة فی الدنیا، ولاحاجة للاستکثار منها...... ومایبالی أحدنا أکان له قناطیر من ذهب، أم کان لا یملك الا درهما، لأن غایة احدنا من الدنیا أکلة یاکلها یسد بها جوعته، لیلته ونهاره، وشملة یلتحفها، وان کان احدنا لا یملك إلا ذلك کفاه، وان کان له قنطار من ذهب أنفقه فی طاعة الله و اقتصر علی هذا الذی بیده، ویبلغه ما کان فی الدنیا، لأن نعیم الدنیا لیس بنعیم، ورخاءها لیس برخاء، انما النعیم والرخاء فی الآخرة، بذلك أمرنا الله و امرنا به نبینا، وعهد إلینا الا تکون همة أحدنا فی الدنیا الا ما یمسك جوعته، ویستر عورته، وتکون همته وشغله فی رضاء ربه، وجهاد عدوه.......

......أما ما تخوفنا به من جمع الروم وعددهم وکثرهم، وأنا لا نقوی علیهم، فلعمری إما هذا بالذی تخوفنا به، ولا بالذی یکسرنا عما نحن فیه، ان کان ما قلتم حقا فذلك والله ارغب ما یکون فی قتالهم، واشد لحرصنا علیهم، لان ذلك أعذر لنا عند الله إذا قدمنا علیه إن قتلنا

عن آخرنا كان أمكن لنا من رضوانه وجنته، وما من شيئ أقر لأ عيننا ولا احب إلينا من ذلك ..... وما منا رجل إلا وهو يدعو ربه صباحا ومساء أن يرزقه الشهادة، وألا يرده إلى بلده، ولا إلى أرضه، ولا إلى أهله وولده، وليس لأحد منا هم فيما خلفه، وقد استودع كل واحد منا ربه اهله، وولده، وانما همنا ما أمامنا۔

واما قولك إنا فى ضيق وشدة من معاشنا وحالنا، فنحن فى اوسع السعة لو كانت الدنيا كلها لنا ما اردنا منها لانفسنا أكثر مما نحن فيه، فانظر الذى تريد، فبينه لنا، فليس بيننا وبينك خصلة نقبلها منك، ولا نجيبك إليها إلا خصلة من ثلاث! فاختر أيتها شئت ولا تطمع نفسك بالباطل، بذلك أمرنى الأمير وبها أمره أمير المؤمنين وهو عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم من قبله إلينا۔

اللہ کے دشمنوں سے ہماری لڑائی اس بنا پر نہیں کہ ہمیں دُنیا کی رغبت ہے، یا ہم زیادہ دُنیا سمیٹنا چاہتے ہیں..... ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی شخص کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے پاس سونے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، یا اس کی ملکیت میں ایک درہم کے سوا کچھ نہیں، اس لیے ہم میں سے ہر شخص کو دُنیا کی زیادہ سے زیادہ جو مقدار درکار ہے، وہ بس اتنا کھانا ہے جس سے وہ صبح و شام اپنی بھوک مٹا سکے، اور ایک چادر ہے جسے لپیٹ سکے، اگر ہم میں سے کسی کو اس سے زائد دُنیا نہ ملے تو بھی اس کے لیے کافی ہے، اور اگر اسے سونے کا کوئی ڈھیر مل بھی جائے تو وہ اسے اللہ کی طاعت ہی میں خرچ

کرے گا ...... کیونکہ دُنیا کی نعمتیں حقیقی نعمتیں نہیں، اور نہ دُنیا
کی خوشحالی حقیقی خوشحالی ہے، نعمتیں اور خوشحالی تو آخرت میں ہوں
گی، اسی بات کا ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے، یہی بات ہمیں ہمارے نبی
(صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے سکھائی ہے، اور ہمیں یہ نصیحت کی ہے کہ ہم
دُنیا کی امر سے زیادہ فکر میں نہ پڑیں کہ ہماری بھوک مٹ جائے اور
ستر پوشی ہو جائے، باقی ہماری اصل فکر اور دُھن اپنے رب کو راضی
کرنے اور اس کے دشمنوں سے جہاد کرنے کی ہونی چاہیئے ......
...... اور یہ جو آپ نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے
مقابلے کے لیے رومی فوجیں اکٹھی ہو رہی ہیں، اور ان کی تعداد بہت
زیادہ ہے اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے، تو میں قسم
کھا کر کہتا ہوں کہ یہ چیز ہمیں ڈرانے والی نہیں ہے، اور نہ اس سے
ہمارے حوصلے ٹوٹ سکتے ہیں۔ اگر آپ کی یہ بات واقعی درست ہے
(کہ روم کا بڑا لشکر ہمارے مقابلے کے لیے آرہا ہے) تو خدا کی قسم
اس خبر سے ہمارے شوقِ جہاد میں اور اضافہ ہو گیا ہے، اس لیے کہ اگر
ہمارا مقابلہ اتنے بڑے لشکر سے ہوا، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری
جواب دہی اور آسان ہو جائے گی، اور اگر ہم میں سے ایک ایک فرد
اُن کا مقابلہ کرتا ہوا قتل ہو گیا تو ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی
اور اس کی جنّت کا امکان اور مضبوط ہو جائے گا، اور ہمارے لیے
کوئی بات اس سے زیادہ محبوب اور آنکھیں ٹھنڈی کرنے والی نہیں
ہو سکتی ...... ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص صبح و شام
یہ دُعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے شہادت نصیب فرمائے، اور اسے
اپنے شہر، اپنی زمین اور اپنے اہل و عیال کے پاس واپس نہ جانا پڑے
ہم لوگ اپنے وطن میں جو کچھ چھوڑ کر آئے ہیں، ہمیں اس کی فکر نہیں کیونکہ

ہم میں سے ہر شخص اپنے اہل و عیال کو اپنے پروردگار کی امان میں دے کر آیا ہے، ہماری فکر تو اپنے آگے پیش آنے والے حالات کے متعلق ہے۔

رہا آپ کا یہ کہنا کہ ہم اپنے معاشی حالات کے لحاظ سے تنگی اور شدت کی زندگی گذار رہے ہیں، تو آپ یقین رکھیں کہ ہم اتنی وسعت اور فراخی میں ہیں جس کے برابر کوئی وسعت نہیں ہو سکتی، اگر ساری دنیا ہماری ملکیت میں آجائے تب بھی ہم اپنے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں رکھنا چاہتے جتنا اس وقت ہمارے پاس ہے۔

لہٰذا اب آپ اپنے معاملے پر غور کر کے ہمیں بتا دیجئے کہ ہماری پیش کی ہوئی تین باتوں میں سے کون سی بات آپ پسند کرتے ہیں، جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تین باتوں کے علاوہ کسی اور بات پر نہ کبھی راضی ہوں گے، نہ اس کے سوا آپ کی کوئی بات قبول کریں گے، بس آپ ان تین چیزوں میں سے کسی چیز کو اختیار کر لیجئے، اور ناحق باتوں کی طمع چھوڑ دیجئے، یہی میرے امیر کا حکم ہے، اسی بات کا حکم انہیں ہمارے امیر المومنین (حضرت عمرؓ) نے دیا ہے، اور یہی وہ عہد ہے جو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں عطا فرمایا تھا۔[1]"

اس کے بعد حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے ان تین باتوں کی تشریح فرمائی، دینِ اسلام کا مفصل تعارف کرایا، اور مسلمان ہونے کے نتائج واضح فرمائے۔ مقوقس حضرت عبادہ کی باتیں سننے کے بعد جزیہ کی طرف مائل ہونے لگا تھا، لیکن اس کے ساتھیوں نے بات نہ مانی۔ بالآخر جنگ ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

بہر صورت یہ جزیرہ اس طرح فتح ہوا، پھر یہاں مسلمانوں نے بحری جہاز بنانے کا ایک کارخانہ لگا لیا تھا اس لیے اس کو "جزیرۃ الصناعۃ" بھی کہا جانے لگا، یہ کارخانہ مصر میں

---

[1] النجوم الزاہرۃ ص ۱۳ تا ۱۵ ج ۱

جہاز سازی کا پہلا کارخانہ تھا جو ۵۴ھ میں بنایا گیا۔ بعد میں اخشیدیوں کے دور میں یہاں ایک باغ لگا کر اُسے ایک تفریح گاہ بنا دیا گیا، اس لیے اُسے روضہ کہا جانے لگا، جو عربی میں باغ کو کہتے ہیں[1]۔ بعد میں یہاں بہت سے تغیرات آتے رہے، اور یہ باقاعدہ ایک محلہ بن گیا۔ اور ہمارے رہنما ڈاکٹر حسن الشافعی نے بتایا کہ یہاں اہل علم میں یہ بات مشہور ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بھی اسی محلے میں تھا۔

سور العیون

روضہ سے نکلے تو ہم سور العیون کے قریب سے گذرے۔ یہ ایک فصیل نما دیوار ہے جو دریائے نیل سے نکل کر مشرق میں قلعہ صلاح الدین تک گئی ہے۔ یہ دیوار سلطان صلاح الدین ایوبی نے بنائی تھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ نیل کا تازہ پانی اس کے ذریعہ قلعہ تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ نیل کے کنارے رہٹ لگائے گئے تھے جن کے ذریعہ دریا کا پانی اس دیوار پر چڑھایا جاتا، اور دیوار کے اُوپر ایک نہر بنائی گئی تھی جس کے ذریعہ یہ پانی قلعہ تک پہنچایا جاتا۔ اب آب رسانی کا یہ سلسلہ تو ختم ہو گیا، لیکن دیوار اب تک باقی چلی آتی ہے، اور اسے سور العیون (چشموں کی فصیل) کہا جاتا ہے۔

سلطان صلاح الدّین کا قلعہ

اس سور العیون کے ساتھ ساتھ چلیں تو یہ جس قلعے پر جا کر ختم ہوتی ہے، وہ ایک قلعہ ہے جو سلطان صلاح الدّین ایوّبی نے ۵۷۲ھ میں بنایا تھا، اور اس کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر اختیار کیا تھا، یہ قلعہ چونکہ ایک پہاڑی پر واقع ہے، اس لیے قدیم عربی کتب میں اس کا ذکر "قلعۃ الجبل" کے نام سے ملتا ہے۔ اس کی فصیل کی پیمائش تین ہزار تین سو ذراع ذکر کی گئی ہے[2]۔ عرصہ دراز تک یہ قلعہ مصر کے دار الحکومت کے طور پر

---

[1] روضہ کی پوری تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ، ص ۲۲۱ تا ۲۲۸، ج ۲

[2] النجوم الزاہرۃ ص ۵۴، ج ۶، احوال ۵۶۷ھ

استعمال ہوتا رہا۔ سرکاری دفاتر اسی قلعے میں واقع تھے۔ بعد میں محمد علی پاشا نے یہاں ایک شاندار جامع مسجد اور دوسری عمارتیں بنائیں اور یہ قلعہ فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال ہوتا رہا، اب اسے سیاحوں کے لیے بھی کھول دیا گیا ہے۔

جبل المقطّم

سلطان صلاح الدینؒ کا یہ قلعہ جس پہاڑی پر واقع ہے، وہ ایک پہاڑ کا ٹکڑا ہے جسے "جبل المقطّم" کہا جاتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدس پہاڑ ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے دامن میں عبادت کیا کرتے تھے[1] اس کے علاوہ بعض تاریخی روایات میں حضرت لیث بن سعدؒ سے یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عمرو بن عاصؓ نے یہ علاقہ فتح کیا تو مصر کے سابق بادشاہ مقوقس نے یہ پہاڑ ستّر ہزار دینار میں خریدنے کی پیشکش کی، اور وجہ یہ بتائی کہ ہماری کتابوں میں اس پہاڑ کے بڑے فضائل مذکور ہیں، اور یہ لکھا ہے کہ اس پہاڑ پر جنّت کے درخت اگیں گے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے بذریعہ خط حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "مسلمان جنّت کے درخت کے زیادہ حق دار ہیں، اس لیے یہاں مسلمانوں کا قبرستان بنا دو" چنانچہ اسے قبرستان بنا دیا گیا۔[2] لیکن یہ روایت استناد کے اعتبار سے مضبوط نہیں ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم۔

امام شافعیؒ کے مزار پر

ان تمام مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر ہم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر پہنچے، یہ پورا محلہ حضرت امامؒ ہی کے نام پر "حارۃ الشافعیؒ" کہلاتا ہے، اور یہاں حضرت امام شافعیؒ کے مزار پر بڑی شاندار عمارت بنی ہوئی ہے جس کے ساتھ ایک بڑی مسجد

---

[1] الخطط المقریزیۃ ص ۲۲۰، ج ۲

[2] الخطط المقریزیۃ ص ۲۲۰، ج ۲ وحسن المحاضرۃ ص ۶۷، ج ۱

بھی ہے، ہم نے نمازِ مغرب اسی مسجد میں ادا کی، اور اس کے بعد مزار پر حاضر ہوئے، ہم جیسے طالب علموں کو دن رات حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال اور آپ کی فقہی آراء سے جس قدر واسطہ رہتا ہے، اس کی بنا پر آپ سے عقیدت و محبت اور تعلق خاطر ایک طبعی امر ہے، عرصہ سے آپ کے مزار مبارک پر حاضری کا اشتیاق بھی تھا جو بحمد اللہ آج پورا ہوا۔ مزار کے مواجہہ میں کچھ دیر بیٹھ کر سرور و سکون کا ایک عجیب عالم رہا، یہ اُس فقیہ اُمت کا مزار تھا جس کی رہنمائی اور ہدایت سے کروڑوں مسلمان فیضیاب ہوتے اور ہو رہے ہیں، جن کی فقہ نے حنفی فقہ کے بعد دُنیا میں سب سے زیادہ رواج پایا، اور جن کے مقلدین چار دانگ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آپ یمن کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو نسبی اعتبار سے تو سادات میں سے تھا، لیکن معاشی اعتبار سے غریب تھا، والد ماجد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ چکا تھا، بچپن ہی میں آپ کی والدہ آپ کو مکہ مکرمہ لے آئیں، یہیں آپ پروان چڑھے، اور علوم حاصل کئے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور ان سے بھرپور استفادہ کیا، پھر نجران میں آپ کو ایک سرکاری عہدہ ملا، اور وہاں عرصہ دراز تک پوری دیانت و امانت کے ساتھ مفوضہ خدمات انجام دیتے رہے، لیکن بڑے لوگوں کے ساتھ آزمائشیں بھی زبردست پیش آتی ہیں، خلیفۂ وقت (ہارون الرشید) کو یمن کے کچھ علوی النسب افراد کے بارے میں یہ اطلاع ملی کہ وہ مرکز کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں، نجران کے والی نے دُشمنی میں آکر حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں بھی یہ افواہ پھیلادی کہ ان کا ان علوی افراد کے ساتھ رابطہ ضبط ہے۔ خلیفہ کو ان پر شبہ ہوگیا، اور اس نے ان افراد کے ساتھ امام شافعیؒ کو بھی گرفتار کرکے بغداد بُلا لیا۔

اس وقت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد حضرت امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا ہارون رشید کے دربار میں خاصا اثر و رسوخ تھا، امام شافعیؒ جب ہارون رشید کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے دفاع میں امام محمدؒ کا حوالہ دیا کہ وہ مجھے جانتے ہیں، ہارون رشید نے امامؒ سے اُن کے بارے

میں معلومات کیں تو امام محمدؒ نے بتایا کہ "میں انہیں جانتا ہوں، وہ بڑے عالم ہیں، اور ان کی طرف جن باتوں کی نسبت کی گئی ہے وہ ان جیسے آدمی سے سرزد نہیں ہو سکتیں" اس پر ہارون رشید نے امام محمدؒ سے کہا کہ "انہیں اپنے ساتھ لے جائیے، تاآنکہ میں ان کے بارے میں غور کر سکوں"۔ اس طرح جتنے لوگ بغاوت کے الزام میں یمن سے لائے گئے تھے، ان میں سے صرف امام شافعیؒ بچ سکے۔

یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے، جب امام شافعیؒ کی عمر ۳۴ سال تھی۔ اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں تھیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نجران کے سرکاری عہدے کے کاموں میں مشغول ہو گئے تھے، اس واقعہ کی بدولت انہیں دوبارہ خالص علم کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ دوسرے امام محمدؒ سے اب تک صرف شناسائی ہی تھی، اب وہ باقاعدہ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، اور ان کے ذریعہ اہلِ عراق کا علم اُن کی طرف منتقل ہوا۔ اور اس طرح امام شافعیؒ کو اہلِ حجاز اور اہلِ عراق دونوں کے علوم حاصل ہوئے۔

امام محمدؒ امام شافعیؒ کی اتنی عزت فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ امام محمدؒ گھوڑے پر سوار ہو کر خلیفہ کے پاس جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ امام شافعیؒ ان سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں، یہ دیکھ کر امام محمدؒ گھوڑے سے اُتر گئے۔ اور اپنے غلام سے کہا کہ "خلیفہ سے جا کر عذر کر دو۔" امام شافعیؒ نے کہا بھی کہ "میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔ لیکن امام محمدؒ راضی نہ ہوئے، اور انہیں ساتھ لے کر اپنے گھر کی طرف واپس ہو گئے۔

اس طرح تقریباً دو سال بغداد میں رہے اور امام محمدؒ سے استفادہ کے بعد امام شافعیؒ پھر مکہ مکرمہ واپس ہوئے، اور نو سال وہاں مقیم رہے، اسی دوران انہوں نے اصول فقہ کی تدوین پر سوچنا شروع کیا، پھر ۱۹۵ھ میں دوبارہ بغداد تشریف لے گئے، اور وہاں اپنی کتاب "الرسالہ" تالیف فرمائی، اور پھر آخر حیات میں مصر کے حکمران کی دعوت پر مصر تشریف لائے اور بالآخر رجب ۲۰۴ھ میں یہیں پر وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت امام شافعیؒ کو خصوصی مواہب سے نوازا تھا، آپ نے سات سال کی عمر میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا تھا، اور دس سال کی عمر میں پوری

موطا امام مالکؒ یاد کرلی تھی۔[1] تیر اندازی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، خود فرماتے ہیں کہ اگر میں دس تیر ماروں تو دس کے دس ٹھیک نشانے پر لگیں گے۔ قرآن کریم پڑھنے کا انداز اس قدر سحر آفریں تھا کہ سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی، خطیب بغدادیؒ نے امام شافعیؒ کے کسی ہم عصر کا قول نقل کیا ہے کہ جب کبھی ہم رونا چاہتے تو ایک دوسرے سے کہتے کہ آؤ اس مطلبی نوجوان کے پاس چل کر تلاوت کریں، جب ہم اُن کے پاس پہنچتے اور وہ خود تلاوت شروع کر دیتے تو لوگ ان کے سامنے گرنے لگتے، روتے روتے ان کی چیخیں نکل جاتیں، اس وقت وہ تلاوت روکتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ اعلیٰ درجے کی قوت بیان بھی عطا فرمائی تھی، اس لیے اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء سے انہوں نے علمی مسائل میں مناظرے فرمائے، بعض مناظروں کا حال خود "کتاب الام" میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اخلاص کا عالم یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

ما ناظرتُ اَحدًا، فاَحببت اَن اخطِئَ[2]

مَیں نے جس شخص سے بھی کبھی مناظرہ کیا، کبھی میری خواہش یہ نہیں ہوئی کہ میرے مدِ مقابل کی غلطی ثابت ہو۔

امام شافعیؒ کی کتابیں علم فقہ اور علم حدیث کی بُنیاد ہیں، اور علم اصول کا تو انہیں بانی کہا جاتا ہے، لیکن فرماتے ہیں کہ:-

وددت اَنّ النّاس لو تعلّموا هذه الكتب، ولم ينسبوها الیّ[3]

میری خواہش یہ ہے کہ لوگ ان کتابوں کو پڑھ کر ان سے نفع اُٹھائیں، لیکن انہیں میری طرف منسوب نہ کریں۔

جس شخص کے اخلاص کا یہ عالم ہو اُس کے علم میں برکت کیوں نہ آئے؟ اور اس کا علم چار دانگ عالم میں کیوں نہ پھیلے؟ چنانچہ بعض حضرات نے انہیں تیسری صدی ہجری کا مجدّد قرار دیا ہے[4] رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

---

[1] تہذیب التہذیب ص ۲۷، ج ۹۔ [2] آداب الشافعیؒ ومناقبہ، لابن ابی حاتم ص ۳۲۶ [3] ایضاً [4] تہذیب ص ۲۷، ج ۹

حضرت لیث بن سعدؒ کے مزار پر

مسجد امام شافعیؒ کے احاطے ہی میں امام شافعیؒ کے مزار سے ذرا ہٹ کر حضرت لیث بن سعدؒ کا مزار واقع ہے، حضرت لیث بن سعدؒ بھی اُونچے درجے کے ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ :-

اللیث أفقه من مالک، إلا ان اصحابه لم یقوموا به

لیث بن سعدؒ امام مالک سے زیادہ بڑے فقیہ ہیں، البتہ ان کے شاگردوں نے ان (کی فقہ کو محفوظ رکھنے) کا اہتمام نہیں کیا[1]

روایتِ حدیث میں بھی امام تھے، اور قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ان کے کسی شاگرد نے اُن سے کہا کہ "ہم بسا اوقات آپ کی زبان سے ایسی احادیث سُنتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں موجود نہیں ہیں"۔ اس پر حضرت لیث بن سعدؒ نے فرمایا کہ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے سینے کی تمام حدیثیں اپنی کتابوں میں لکھ لی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جتنی احادیث میرے سینے میں محفوظ ہیں، اگر میں وہ سب لکھنا چاہوں تو یہ ساری ان لکھی ہوئی کتابوں کے لیے کافی نہ ہوں"[2]

اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے ساتھ مال و دولت سے بھی نوازا تھا، کہا جاتا ہے کہ ان کی آمدنی بیس ہزار سے پچیس ہزار دینار سالانہ تک تھی، لیکن فیاضی، سخاوت اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا عالم یہ تھا کہ ساری عمر کبھی ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، بلکہ ان کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ سال کے آخر میں بعض اوقات مقروض ہو جاتے تھے[3]

---

[1] تہذیب التہذیب ص ۴۶۲، ج ۸ [2] ایضاً

[3] سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۱۵۲، ج ۸

قتیبہ فرماتے ہیں کہ وہ روزانہ تین سو مسکینوں پر صدقہ کیا کرتے تھے[1]۔

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت لیث بن سعدؒ سے کچھ پھل خریدے، خریدنے کے بعد انہیں اس کی قیمت گراں محسوس ہوئی اس لیے وہ واپس کرنے کے لیے آئے حضرت لیث بن سعدؒ نے پھل واپس لے کر قیمت لوٹا دی، پھر جب وہ جانے لگے تو اپنے آدمیوں سے کہا کہ انہیں پچاس دینار مزید دے دو، اُن کے صاحبزادے نے وجہ پوچھی تو فرمایا:۔

اَللّٰھُمَّ غَفْرًا، إنھم قد کانوا أمّلوا فیھا أملاً، فأحببت أن أعوضھم من أملھم بھذا۔

اللہ مجھے معاف فرمائے، ان لوگوں نے پھلوں کی خریداری میں ایک امید قائم کی تھی، (جو پوری نہیں ہوئی) اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کی امید کے بدلے انہیں کوئی معاوضہ دوں۔

ایک مرتبہ ایک عورت آئی اور کہا کہ میرا بیٹا بیمار ہے، اس کے لیے تھوڑا سا شہد درکار ہے، حضرت لیث بن سعدؒ نے اسے ایک مشک بھر کر شہد دلوا دیا جس میں ۱۲۰ رطل (تقریباً ۶۰ سیر) شہد تھا، وہ عورت انکار کرتی رہی کہ مجھے تو تھوڑا سا شہد چاہیئے تھا، لیکن حضرت لیث بن سعدؒ نہ مانے، اور مشک اس کے گھر پہنچا دی۔

آپ کی قدر و منزلت عوام و خواص میں اتنی زیادہ تھی کہ حکام وقت بھی آپ کے سامنے جھکتے، اور آپ کے مشوروں پر عمل کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے آپ کو مصر کی گورنری کی پیشکش کی، لیکن آپ نے عذر فرما دیا۔

آپ روزانہ چار مجلسیں منعقد فرماتے تھے، ایک مجلس امراء و حکام کے لیے ہوتی جس میں وہ لوگ آکر آپ سے امورِ سلطنت میں مشورہ کرتے، دوسری مجلس حدیث کے طلباء کے لیے ہوتی، تیسری مجلس فتویٰ کے لیے ہوتی جس میں لوگ آکر آپ سے مسئلے پوچھتے چوتھی مجلس عوام کی ضروریات میں ان کی مدد کے لیے ہوتی، لوگ آکر اپنی حاجتیں بیان کرتے،

---

[1] سیر اعلام النبلاء للذھبی ص ۱۵۸ / ج ۸

اور آپ انہیں پورا کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔

حضرت لیث بن سعدؒ کی وفات ۱۵ شعبان ۱۷۵ھ کو ہوئی، نماز جنازہ میں اس قدر اژدہام ہوا کہ خالد بن عبدالسلام کہتے ہیں "میں نے ایسا جنازہ کسی کا نہیں دیکھا"[1]

الحمدللہ! اس جلیل القدر محدث، فقیہ اور ولی اللہ کے مزار پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت نصیب ہوئی جن کو بعض حضرات نے ابدال میں شمار کیا ہے۔

شیخ الاسلام زکریّا انصاریؒ کے مزار پر

حضرت امام شافعیؒ اور امام لیث بن سعدؒ کے مزارات کے آس پاس کا علاقہ "قرافہ" کہلاتا تھا، اور یہیں حضرت شیخ الاسلام زکریّا الانصاری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، یہ نویں صدی ہجری کے مشہور محدّث، فقیہ اور صوفی بزرگ تھے جنہیں اپنی صدی کا مجدد بھی کہا گیا ہے۔ یہ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ ابن ہمامؒ کے شاگرد ہیں، اور علامہ ابن حجر ہیثمیؒ اور شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ جیسے حضرات کے استاذ، اور ان شخصیتوں میں سے ہیں جن پر اہل مصر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

انہوں نے مصر میں انتہائی فقر و فاقہ کی حالت میں تعلیم حاصل کی، خود فرماتے ہیں کہ میں جامع ازہر میں علم حاصل کرتا تھا، بعض اوقات فاقے کی شدت کی بنا پر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے کھانے کو کچھ نہ مل سکا تو میں نے وضو خانے کے قریب پڑے ہوئے تربوز کے چھلکے اٹھائے، اور انہیں اچھی طرح دھویا۔ اور انہیں کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ بعد میں ایک ولی اللہ نے جو ایک چکی پر کام کرتے تھے، میری دیکھ بھال شروع کر دی، وہ مجھے کھانے پینے کی ضروریات مہیا کر دیا کرتے تھے، اور اسی زمانے میں انہوں نے مجھے بشارت بھی دی تھی کہ تم انشاءاللہ بہت دن زندہ رہو گے، اور شیخ الاسلام بن گئے اور تمہارے شاگرد بھی تمہاری زندگی ہی میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہوں گے[2]

---

[1] سیر اعلام النبلاء ص ۱۵۰ ج ۸۔ اس سے پہلے کے واقعات بھی اسی کتاب میں مذکور ہیں۔

[2] الکواکب السائرۃ، للغزی ص ۱۹۶ و ۱۹۷، ج ۱

اللہ تعالیٰ نے بعد میں آپ کو واقعۃً بڑا عظیم مرتبہ عطا فرمایا، خدمتِ دین کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس میں شیخ الاسلام کا حصّہ نہ ہو، مال و دولت کا بھی یہ عالم ہوا کہ تین ہزار درہم یومیہ آمدنی ہوتی تھی۔ امام شافعیؒ کے مزار کے ساتھ جو مدرسہ تھا اس میں تدریس کا منصب اس دَور میں علمی اعتبار سے سب سے بڑا منصب سمجھا جاتا تھا۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ مدّت دراز تک اسی منصب پر فائز رہے۔ اس زمانے میں مصر کا حکمران ملک اشرف قاتیبائے تھا، وہ آپ کا بہت معتقد تھا، اس نے آپ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا، آپ نے شروع میں انکار کر دیا، لیکن قاتیبائے نے اصرار کیا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ اُس نے کہا کہ "اگر آپ چاہیں تو مَیں آپ کے سامنے پیدل چل کر آپ کے خچر کو ہنکاتا ہُوا آپ کے گھر تک لے جایا کروں" بالآخر اس شدید اصرار کے بعد آپ نے یہ منصب قبول فرمالیا، اور عرصۂ دراز تک قضاء کی خدمت انجام دی۔

اس دوران بھی آپ قاتیبائے پر جلوت و خلوت میں تنقیدیں فرماتے، خطبۂ جمعہ میں اس کی موجودگی میں اس پر نکیر فرماتے، خود فرماتے ہیں کہ "بعض اوقات خطبے میں میری تنقید اتنی سخت ہو جاتی کہ مجھے خیال ہوتا کہ شاید اب قاتیبائے مجھ سے بات بھی نہیں کرے گا، لیکن نماز کے بعد سب سے پہلے وہ مجھ سے ملتا، میرے ہاتھ پر بوسہ دیتا، اور کہتا "جزاک اللہ خیراً" ایک روز میں نے اُسے بہت سخت باتیں کہیں، یہاں تک کہ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر میں نے اُس سے کہا:

والله يا مولانا إنما أفعل ذلك معك شفقة عليك، وسوف تشكر في عند ربك، وإني والله لا أحب أن يكون جسمك هذا فحمة من فحم النار [1]

جنابِ والا! خدا کی قسم میں آپ کے ساتھ یہ معاملہ آپ پر شفقت کی بنا پر کرتا ہوں، جب آپ اپنے پروردگار کے پاس پہنچیں گے تو میرا شکر کریں گے، اس لیے کہ خدا کی قسم! مجھے یہ بات پسند نہیں کہ آپ کا یہ جسم جہنم کا کوئلہ بنے"

---

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ص ۱۱۲، ج ۲

آخر میں نابینا ہونے کی بنا پر آپ قضا کے منصب سے معزول ہوئے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آخری زمانے میں بادشاہ آپ سے ناراض ہو گیا تھا، اس لیے معزول ہوئے۔ معزولی کے بعد وہ قضا کا منصب قبول کرنے پر افسوس کا اظہار فرمایا کرتے تھے، آپ کے شاگرد شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "قضا کا منصب قبول کرنا میری غلطی تھی؛ اس لیے کہ میں پہلے لوگوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا تھا، اس کی وجہ سے لوگوں میں شہرت ہو گئی" اس پر میں نے عرض کیا کہ "حضرت! میں نے بعض اولیاء سے سنا ہے کہ شیخ کے منصب قضاء نے ان کے حالات پر پردہ ڈال دیا ہے، لوگوں میں اُن کے زہد و ورع اور مکاشفات کی شہرت ہونے لگی تھی" اس پر شیخؒ نے فرمایا! "الحمدُ للہ! بیٹے تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا[1]۔"

آپ نفل صدقات کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ نہ جانے کتنے حاجت مند افراد کے روزینے مقرر تھے، لیکن صدقہ میں ہمیشہ اخفا کا اہتمام فرماتے، اگر حاجت مند افراد میں سے کوئی ایسے وقت آجاتا جب اور لوگ بھی بیٹھے ہوتے تو اس سے فرما دیتے کہ "پھر آنا" یہاں تک کہ لوگوں میں مشہور یہ تھا کہ آپ صدقات کم دیتے ہیں[2]۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی، آخر میں نابینا بھی ہو گئے، لیکن آخر وقت تک درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ذکر و عبادت کا سلسلہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا، حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اُن کی مدح فرماتے ہیں:-

أحد أركان الطريقين، الفقه والتصوف، وقد خدمته عشرين سنته. فما رأيته قط في غفلة، ولا اشتغال بما لا يعني، لا ليلا ولا نهارا، وكان رضي الله عنه مع كبر سنه يصلي سنن الفرائض قائما، ويقول: لا أعوّد نفسي الكسل[3]

---

[1] الطبقات للشعرانیؒ ص ۱۱۲، ج ۲

[2] الکواکب السائرۃ ص ۲۰۲، ج ۱

[3] الطبقات الکبریٰ، للشعرانی ص ۱۱۱، ج ۲

وہ فقہ اور تصوف دونوں طریقوں کے ستون تھے، میں نے بیس سال آپ کی خدمت کی اس پورے عرصے میں میں نے کبھی آپ کو غفلت میں نہیں دیکھا نہ کسی فضول کام میں مشغول پایا، نہ دن میں، نہ رات میں اور آپ بڑھاپے کے باوجود نوافل کی سنتیں ہمیشہ کھڑے ہوکر ادا کرتے اور آپ فرماتے کہ میں اپنے نفس کو سستی کا عادی بنانا نہیں چاہتا۔

کوئی شخص آپ کے پاس آکر لمبی بات کرتا تو فرماتے! "جلدی کرو، تم نے ایک زمانہ ضائع کر دیا" اور علامہ شعرانیؒ ہی فرماتے ہیں کہ جب میں آپ سے کوئی کتاب پڑھتا تو بعض اوقات کتاب کا کوئی لفظ درست کرنے کے لیے بیچ میں ذرا سا وقفہ ہو جاتا۔ آپ اس وقفے کو بھی ضائع نہ فرماتے۔ اور اس وقفہ میں آہستہ آہستہ "اللہ، اللہ" کے ذکر میں مشغول ہو جاتے۔[1]

آپ نے مختلف علوم و فنون میں چالیس سے زائد عظیم الشان تالیفات چھوڑی ہیں۔ جن میں فقہ شافعیؒ کی "اسنی المطالب" اور "شرح البہجہ" بہت مشہور ہوئیں اور آج تک فقہ شافعیؒ کا مستند ماخذ شمار ہوتی ہیں۔ حافظ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے معاصرین کی تعریف میں بہت محتاط بزرگ ہیں، لیکن آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"بیننا أنسة زائدة، ومحبة من الجانبین تامة، و لا زالت المسرات و اصلة إلیّ من قبله بالدعاء والثناء و إن کان ذلك دأبه مع عموم الناس. فحظي منه أوفر"[2]

ہمارے درمیان جانبین سے بہت محبت اور انس ہے، ان کی طرف سے مجھے مسلسل دعا اور تعریف کے کلمات سے مسرت حاصل ہوتی رہتی ہے، اگرچہ ان کا سبھی لوگوں سے معاملہ ایسا ہی ہے۔ لیکن میرا حصہ ان کے یہاں بہت زیادہ ہے۔

---

[1] الطبقات الکبری، للشعرانیؒ ص ۱۱۱، ج ۲

[2] الضوء اللامع، للسخاویؒ ص ۲۳۷ ج ۳

علامہ ابن العمادؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ کا حلقۂ تلامذہ اس قدر وسیع تھا کہ ان کے عہد میں کوئی عالم ایسا نہ تھا جس نے آپ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلمذ کا شرف حاصل نہ کیا ہو، بلکہ آپ کی سند چونکہ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عالی تھی، اس لیے لوگ کوشش کر کے آپ سے تلمذ حاصل کرتے تھے بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے زبانی بلاواسطہ علم حاصل کیا، پھر ایسے لوگوں سے بھی علم حاصل کیا جن کے اور شیخ الاسلامؒ کے درمیان سات واسطے تھے، یہ خصوصیت کسی اور عالم کو حاصل نہیں ہوئی۔ [1]

فسطاط کا علاقہ

امام شافعیؒ کے مزار کے پاس مصر کا بڑا عظیم الشان مدرسہ تھا جس میں بڑے جلیل القدر اہل علم پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں، اب بھی یہاں درس اور ذکر کے کچھ حلقے ہوتے ہیں، لیکن باقاعدہ مدرسہ کی شکل باقی نہیں رہی، جب ہم مزارات سے فاتحہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو مسجد میں ذکر بالجہر کا ایک حلقہ ہو رہا تھا، لیکن اب یہ چیزیں رسوم کی حد تک باقی رہ گئی ہیں، اتباعِ سنّت کا اہتمام جو ذکر و عبادت کی رُوح ہے، خال خال ہی کہیں نظر آتا ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

ڈاکٹر شافعیؒ نے ۔جو احقر کے رہنما تھے۔ بتایا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا مزار بھی واقع ہے، لیکن راستہ ایسا ہے کہ گاڑی وہاں نہیں جاسکتی، پیدل چلنے کے لیے بھی جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں اور اندھیرا بھی ہو گا۔ لیکن اتنے قریب آچکنے کے بعد ایک جلیل القدر صحابیؓ کے مزار پر حاضر نہ ہونا کفرانِ نعمت تھا، احقر نے وہاں حاضری کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے جامع شافعیؒ سے ایک صاحب کو بطور رہنما ساتھ لیا اور ان کی رہنمائی میں ہم چل پڑے۔ یہ پورا علاقہ آجکل کی تمدنی زبان میں "پسماندہ" علاقہ

---

[1] شذرات الذہب، لابن العمادؒ ص ۱۳۵، ج ۸

ہے، مکانات کچے پکے، راستے ٹوٹے پھوٹے، جگہ جگہ تنگ اور تاریک گلیاں۔ لیکن مجھے یہ علاقہ وسطِ شہر کے ترقی یافتہ علاقوں سے زیادہ محبوب معلوم ہوا، اول تو اسلیے کہ یہاں لوگوں میں وسطِ شہر کے مقابلے میں تدین کا زیادہ غلبہ نظر آیا، اور قدیم روایتی اخلاق کی ایک جھلک محسوس ہوئی، دوسرے اس لیے کہ ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ یہ قاہرہ کا قدیم ترین علاقہ ہے، اور فسطاط کا شہر اسی قرب وجوار میں واقع تھا۔

فسطاط کا نام آتے ہی قلب و ذہن میں ماضی کے واقعات کی ایک فلم چلنے لگی کیونکہ یہ شہر صحابہ کرامؓ کا بسایا ہوا تھا۔

دراصل آج جس جگہ قاہرہ واقع ہے، تاریخ میں یہاں یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان شہر آباد رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں موجودہ قاہرہ کا مغربی علاقہ فرعونوں کا پایۂ تخت تھا، لیکن اس وقت یہ شہر منف کہلاتا تھا، اور دریائے نیل کے مغربی کنارے کی طرف آباد تھا۔ اور یہ وہی جگہ ہے جو آج جیزہ کہلاتی ہے، اور جہاں اہرامِ مصر واقع ہیں، منف کا یہ شہر صدیوں آباد رہا، لیکن بخت نصر کے حملے میں یہ تاخت و تاراج ہوکر ویران ہوگیا۔

بعد میں سکندر مقدونی نے جب ملکِ مصر فتح کیا تو اپنا پایۂ تخت اس علاقے کے بجائے بحرِ روم کے ساحلی علاقے کو بنایا، وہاں ایک نیا شہر بسایا جو آج تک سکندر ہی کے نام پر اسکندریہ کہلاتا ہے۔ اسکندریہ بھی صدیوں تک مصر کا پایۂ تخت رہا، اور جس وقت حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے مصر پر حملہ کیا، اس وقت تک مقوقس کا دار الحکومت اسکندریہ ہی تھا[1] اور جس جگہ آج قاہرہ آباد ہے، وہاں کوئی بڑا شہر موجود نہ تھا، بلکہ ایک فوجی قلعہ تھا۔ جو حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاصؓ اور ان کے رفقاء نے مصر کے چند ابتدائی علاقے فتح کرنے کے بعد اس قلعے کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ چھ مہینے جاری رہا۔ اس پورے عرصے

---

[1] دیکھئے الخطط المقریزیۃ ص ۲۲۶، ج ۱

ہیں قلعہ پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہ نکلا، بالآخر چھ ماہ گذرنے کے بعد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے قلعے کے ایک حصے میں پاؤں رکھنے کی کوئی گنجائش دیکھی تو قلعے کے اس حصے پہ ایک سیڑھی نصب کر دی، اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

إنّی أھب نفسی لله عزّ وجل، فمن شاء أن يتبعنی فليفعل

میں اپنی جان اللہ تعالیٰ کو ہدیہ کرتا ہوں، جو میرے پیچھے آنا چاہے آجائے۔

یہ کہہ کر حضرت زبیرؓ نے سیڑھی پر چڑھنا شروع کیا، آپ کے پیچھے اور بھی متعدد حضرات سیڑھی پر چڑھنے لگے، یہاں تک کہ سب سے پہلے حضرت زبیرؓ قلعے کی فصیل پر پہنچ گئے، دوسرے حضرات کو حوصلہ ہوا، اور انہوں نے مزید سیڑھیاں لگا کر چڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی، اور مقوقس نے بھاگ کر جزیرہ کے قلعے میں پناہ لی جس کا واقعہ روضہ کے تعارف میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ علامہ حمویؒ نے لکھا ہے کہ یہ سیڑھی جو حضرت زبیرؓ نے قلعے پر چڑھنے کے لیے استعمال فرمائی تھی، سنہ ۳۹۰ھ تک سوق وردان کے ایک گھر میں محفوظ تھی، پھر ایک آتشزدگی کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔[1]

اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک بڑا خیمہ قلعے کے سامنے نصب فرمایا تھا۔ پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو اس خیمے کو اکھاڑ کر ساتھ لے جانا چاہا، لیکن جب اکھاڑنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ خیمے کے اوپر کی جانب ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں، اور ان پر بیٹھی ہے، خیمہ اکھاڑنے سے یہ انڈے ضائع ہو جاتے، اس لیے حضرت عمرو بن عاصؓ نے فرمایا کہ اس کبوتری نے ہمارے خیمے میں پناہ لی ہے، اس لیے خیمے کو اس وقت تک باقی رکھو، جب تک یہ بچے پیدا ہو کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں، چنانچہ خیمہ باقی رکھا گیا، اور حضرت عمرو بن عاصؓ چند افراد کو وہاں چھوڑ کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسکندریہ کی فتح میں بھی چھ مہینے لگے، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی تو حضرت

---

[1] معجم البلدان، للحمویؒ ص ۲۶۲ ج ۴، "فسطاط"

عمرو بن عاص رضؓ نے اسکندریہ کو اپنا مستقر بنانے کے لیے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب فرمائی۔ حضرت فاروقِ اعظم رضؓ نے جواب میں لکھا کہ "مسلمانو! کوئی ایسی جگہ اپنا مستقر نہ بناؤ، جہاں میرے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی دریا یا سمندر حائل ہو" ظاہر ہے کہ اسکندریہ کو مستقر بنایا جاتا تو بیچ میں دریا حائل ہوتا، اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضؓ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کہ "ہم کس جگہ کو اپنا مستقر بنائیں؟" اس پر بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ :۔

نرجع ایها الأمیر إلی فسطاطك، فنکون علی ماء وصحرا

جناب امیر! ہمیں اسی جگہ جانا چاہیئے جہاں آپ کا خیمہ نصب ہے۔ وہاں پانی (دریائے نیل) ہمارے قریب بھی ہوگا، اور ہم صحرا میں بھی ہوں گے۔

چنانچہ حضرت عمرو بن عاص رضؓ نے اس مشورے کو قبول فرمایا، اور اسی جگہ واپس تشریف لے آئے جہاں خیمہ نصب تھا، اور یہاں مسلمانوں کا ایک شہر آباد کیا۔ اس وقت تک شہر کا کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا، اس لیے لوگ چند روز تک پتہ بتانے کے لیے اسی فسطاط (خیمے) کا حوالہ دیتے رہے کہ "میری جگہ فسطاط کی دائیں جانب ہے" کوئی کہتا کہ "میری جگہ فسطاط کے بائیں جانب ہے" ہوتے ہوتے اس شہر کا نام ہی فسطاط مشہور ہو گیا، اور یہ مصر میں مسلمانوں کا پایۂ تخت قرار پایا[۱] اور صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا رہا۔ یہ شہر دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر آباد تھا۔

پھر ۳۵۸ھ میں اخشیدیوں کے دورِ حکومت میں فاطمی بادشاہ معز لدین اللہ نے اپنے ایک غلام جوہر کے ذریعہ فسطاط پر حملہ کیا اور اُسے اپنے زیرِ نگیں لے آیا، فسطاط کے باشندوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ صلح کی کہ وہ ان کے ساتھ شہر فسطاط میں نہیں رہے گا۔ چنانچہ جوہر نے اس شرط کی پابندی کرتے ہوئے فسطاط سے باہر نکل کر

---

[۱] معجم البلدان للحموی ص ۲۶۳ ج ۴، والخطط المقریزیہ ص ۶۰، ج ۲

قیام کیا، اور وہاں ایک قلعہ بنایا، اور اس قلعہ کا نام "القاہرۃ" رکھا۔ یہ قلعہ فاطمیوں کے دَور میں سرکاری دفاتر اور امراء کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، لیکن عام سکونتی شہر فسطاط ہی تھا، لیکن جب سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی حکومت آئی تو انہوں نے "قلعہ القاہرہ" کو عام سکونت کے لیے کھول دیا، اور خود قلعہ الجبل" میں رہنے لگے جس کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے، اس وقت سے قاہرہ باقاعدہ سکونتی شہر بن گیا[1] یہ شہر فسطاط کے شمال مغرب میں دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر آباد تھا، یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری میں فسطاط کا شہر آتشزدگی وغیرہ کی بنا پر تباہ ہوگیا، اور صرف قاہرہ باقی رہ گیا جو اب تک چلا آتا ہے، اور اب اس نے وسعت اختیار کرکے نہ صرف فسطاط کے علاقے، بلکہ جزیرہ، جیزہ اور فرعون کے دَور کے منف کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

بہرکیف! حضرت امام شافعیؒ کے مزار سے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے مزار تک جانے کے لیے بیشتر اسی علاقے سے گذرنا ہوا جہاں کبھی فسطاط آباد تھا، یہاں قدامت کے آثار قدم قدم پر نمایاں ہیں، بہت سے پرانے گھر ویران پڑے ہیں، جگہ جگہ احاطے ہیں جن میں قبرستان بنے ہوئے ہیں، نہ جانے یہ علاقہ کتنے علماء، فقہاء، محدثین، کیسے کیسے اولیاء اللہ اور مجاہدین کا مرکز رہا ہوگا، میں ان ٹوٹے پھوٹے راستوں پر چلتا رہا اور چشمِ تصور یہاں قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ رہنما نے ایک چھوٹی سی مسجد کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیا جس کے آس پاس ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی مسجد کے ایک حصے میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، وہاں سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی۔

---

[1] الخطط المقریزیہ ص ۱۴۹ ج ۲۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ مشہور صحابہ کرامؓ میں سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی، اور اپنے وطن سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ ہی میں مقیم ہو گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں حصہ لیا، آپ کا شمار فقہاء صحابہؓ میں ہے، خاص طور پر میراث کے علم میں مشہور تھے، اور قرآن کریم کی تلاوت انتہائی دلکش انداز میں فرمایا کرتے، آپ نے اپنے ہاتھ سے قرآنِ کریم کا ایک نسخہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ اب تک مصر میں موجود ہے، اور اس میں سورتوں کی ترتیب مصحفِ عثمانی کی ترتیب سے مختلف ہے، اور اس کے آخر میں لکھا ہوا ہے: "وکتبہ عقبۃ بن عامر بیدہ"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ جہاد میں مشغول رہے، دمشق کی فتح میں بھی شامل تھے، بلکہ حضرت عمرؓ کو فتح دمشق کی خوشخبری انہوں نے ہی سنائی تھی، مشاجراتِ صحابہؓ کے دور میں آپ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے، جنگِ صفین میں حضرت معاویہؓ ہی کی طرف سے حصہ لیا۔ بالآخر حضرت معاویہؓ نے آپ کو مصر کا گورنر بنا دیا تھا[1]

آپ کے بہت زیادہ حالات زندگی کتابوں میں نہیں ملتے۔ البتہ آپ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ آپ کا مزار جس جگہ واقع ہے یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے میں "قلعہ صلاح الدین" کا تعارف کراتے ہوئے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ "جبل المقطم" کا ایک حصہ تھی، اور حضرت عمرؓ نے اسے قبرستان بنانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ یہاں بہت سے صحابہ کرامؓ مدفون ہیں۔

لیکن ان حضرات کے مزارات کا یا تو نام و نشان باقی نہیں رہا، یا انہیں جاننے والے ختم ہو گئے ہیں

---

[1] ان حالات کے لیے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۲۴۲ و ۲۴۳ ج ۷، و اسد الغابہ ص ۴۱۷ ج ۳

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے مزار کی زیارت کے بعد ہم واپس ہوٹل آگئے۔ مصر میں پاکستان کے سفیر جناب راجہ ظفر الحق صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں اُن کی گاڑی پہنچ گئی۔ اور اُن کے مکان پر جانا ہوا۔ یہ شاندار مکان جو ماشاء اللہ پاکستان کی ملکیت ہے، اور سفیر پاکستان کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، دریائے نیل کے کنارے شہر کے ایک خوبصورت حصے میں واقع ہے جو گارڈن سٹی کہلاتا ہے۔

راجہ صاحب سے کھانے پر دیر تک گفتگو رہی۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، انہوں نے یہاں آنے کے بعد مختصر مدت میں یہاں کے علمی حلقوں میں بڑی ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ بہت سے ملکوں میں ہماری سفارت بڑی کمزور رہی ہے اور اپنے سفارتی مشنوں کی بے عملی دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے، لیکن ماشاء اللہ راجہ صاحب بڑے فعال اور نشیط ہیں، اور ان کی فرض شناسی سے بحمد اللہ یہاں پاکستان کے تعارف اور اس کے موقف کی وضاحت میں بڑی مدد ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ملک و ملت کی مزید خدمت کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین۔

دریائے نیل

راجہ صاحب کے مکان سے واپسی کے بعد طبیعت میں معمولی ثقل سا تھا، اسلئے میں ہوٹل سے اُتر کر چہل قدمی کے لیے دریائے نیل کے کنارے چلا گیا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ دریا کے دونوں طرف بنی ہوئی عمارتوں کی رنگ برنگ روشنیاں نیل کے پانی میں منعکس ہو کر ایسے ایسے رنگ پیدا کر رہی تھیں جن کے لیے انسانی لُغت نے ابھی نام وضع نہیں کیے۔ دریا پر بنے ہوئے خوبصورت پُل پر کاروں کی مخالف سمتوں سے دوڑتی ہوئی روشنیوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے نیل کے دونوں کنارے سونے کی گیندیں ایک دوسرے کی طرف پھینک رہے ہوں۔

یہ تاریخی دریا قوموں کے عروج و زوال کی نہ جانے کتنی داستانیں اپنی لہروں میں چھپائے ہزارہا سال سے اسی طرح بہہ رہا ہے، صحیح احادیث میں اس کو "جنت کا دریا" کہا جاتا ہے، اور معراج کی شب جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو آپ نے اُس کی جڑ میں دو کھلے ہوئے اور دو چھپے ہوئے دریا دیکھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے سوال پہ بتایا کہ یہ کھلے ہوئے دریا نیل اور فرات ہیں۔[1]

"سیحان، جیحان، والفرات، والنیل کل من انہار الجنۃ"[2]

سیحان، جیحان، فرات اور نیل، جنت کے دریا ہیں۔

ان دریاؤں کے "جنت کے دریا ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں علماء کرام نے اس کی متعدد تشریحات کی ہیں[3] لیکن الفاظِ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے اور اکثر علماء نے اُس کی یہی تشریح کی ہے کہ ان دریاؤں کا اصل سرچشمہ جنت ہی کا کوئی دریا ہے، رہی یہ بات کہ جنت سے ساتھ ان دریاؤں کے ربط کی صورت کیا ہے؟ یہ نہ کوئی جانتا ہے نہ اسے حدیث میں بیان کیا گیا، اور نہ اس تحقیق میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہے

لیکن اتنی بات واضح ہے کہ دریائے نیل کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جن کی بنا پر وہ دُنیا کے دوسرے دریاؤں سے واضح طور پہ ممتاز ہے۔

۱ — یہ اپنے طول کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے بڑا دریا ہے جو چار ہزار میل میں پھیلا ہوا ہے۔[4]

۲ — اکثر و بیشتر دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہیں لیکن یہ دریا جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے[5]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب المعراج، حدیث نمبر ۸۸۷۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الجنۃ ص ۳۸۰، ج ۲

[3] ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۲۱۴، ج ۷ کتاب المناقب

[4] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۴۵۱، ج ۱۶۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ "NILE"

[5] الخطط المقریزیہ، ص ۱۱۲، ج ۱۔

۲ ۔ یہ بات ہزارہا سال تک محققین کے لیے ایک معمہ بنی رہی ہے کہ اس کا منبع کہاں ہے؟ علامہ مقریزیؒ نے "الخطط" میں اس عنوان پر بارہ صفحات لکھے ہیں، اور اس میں مختلف آراء اور روایات ذکر کی ہیں۔ جن سے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کے منبع کی دریافت کی صدیوں طویل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بالآخر اب جو نظریہ مقبول عام ہے، وہ یہ کہ یہ دریا یوگنڈا کی جھیل وکٹوریہ سے نکل رہا ہے۔ لیکن برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ یہ بات اس معنی میں تو درست ہے: کہ وکٹوریہ جھیل پانی کا وہ سب سے بڑا ذخیرہ ہے جہاں سے نیل نے اپنے چار ہزار میل لمبے سفر کا آغاز کیا ہے: لیکن اگر منبع سے مراد سرچشمہ لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وکٹوریہ جھیل کا پانی کہاں سے آرہا ہے؟ وکٹوریہ کو پانی مہیا کرنے والے ذرائع متعدد ہیں، ان میں سے اب تک کاجیرا کی وادی کو نیل کا آخری سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ ابھی تک اس کے سروے کا کام پوری طرح مکمل نہیں ہو سکا۔ اسی لیے مقالہ نگار کے الفاظ ہیں:۔

> "جغرافیائی تحقیق کے مسائل میں نیل کے منبع کے مسئلے کے سوا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس نے اتنے طویل عرصے تک انسانی تصورات پر اتنی شدت کے ساتھ اثر ڈالا ہو۔"[۱]

اگر انسان اتنی ہزار سال کی تحقیق اور ریسرچ کے بعد دنیا ہی میں اس دریا کا آخری سرا سو فی صد یقین کے ساتھ دریافت نہیں کر سکا تو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے ساتھ اس کے جس رابطے کی نشان دہی فرمائی ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک سراغ کون لگا سکتا ہے؟

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، محولہ بالا، ص ۴۵۵، ج ۱۶

اگلے دن صبح کو ڈاکٹر شافعی صاحب کی معیت میں قاہرہ کے مختلف کتب خانوں کی سیر میں وقت گذرا، مصر عربی دینی کتب کی اشاعت کا بڑا عظیم مرکز رہا ہے، اور وہاں سے ہر دینی موضوع پر اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں کہ ان کی گنتی مشکل ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ یہاں کے کتب خانے اپنی ماضی کی روایات کھوتے جا رہے ہیں۔ اُن شہرۂ آفاق کتب خانوں میں جانا ہوا، جنہوں نے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں، لیکن اب ان کی مطبوعات کا ذخیرہ بہت کم ہے، دار المعارف جیسا ادارہ جس نے ماضی میں گرانقدر علمی کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے، اب زیادہ تر ناول اور افسانے شائع کر رہا ہے، اور اس کی قدیم مطبوعات نایاب ہو چکی ہیں۔ تاہم اس گئی گذری حالت میں بھی مصر علمی کتابوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ "عیسی البابی" "مصطفے البابی" اور "محمد علی صبیح" جن کا نام ہمیشہ کتابوں پر پڑھتے آئے تھے، ان کے مراکز میں جانا ہوا، ظاہری اعتبار سے ان کتب خانوں کی حالت اتنی خستہ ہے کہ وہ دیکھنے میں کباڑ خانے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ڈھونڈنے والے کے پاس وقت ہو، اور وہ ریت مٹی کی پروا کئے بغیر ان کی الماریوں میں گھس جائے تو اسے اب بھی بہت سے گوہر نایاب ہاتھ آجاتے ہیں، چنانچہ بحمد اللہ بہت سی وہ نادر کتابیں جن کی عرصے سے تلاش تھی، ان کتب خانوں سے مل ہی گئیں۔

جامعۃ الازہر میں

دن کے ساڑھے گیارہ بجے شیخ الازہر سے ملاقات کا وقت مقرر تھا، اس لیے کتب خانوں کا کام بیچ میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے جامعۃ الازہر اور اس سے ملحقہ دفاتر میں جانا پڑا۔

جامعۃ الازہر اب تو ایک بڑی عظیم الشان یونیورسٹی ہے جس کے تحت بہت سے کلیات اور مدارس کام کر رہے ہیں، لیکن اس کا اصل آغاز اُس تاریخی مسجد سے ہوا

تھا جو ازہر یونیورسٹی کے ساتھ ہی واقع ہے اور "جامع الازہر" کے نام سے مشہور ہے، یہ ایک شاندار مسجد ہے جو ۳۶۱ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ جب معزلدین اللہ کے غلام جوہر الکاتب نے قاہرہ آباد کیا تو اس نے یہ مسجد بنائی تھی، اور یہ مشہور تھا کہ اس کی تعمیر میں کوئی ایسا طلسم رکھا گیا ہے جس کی بنا پر اس عمارت میں کوئی چڑیا، کبوتر یا اور کوئی پرندہ نہیں رہ سکتا۔ بعد میں حاکم بامر اللہ نے اس عمارت کی تجدید کی، اور اس کے لیے بہت سے اوقاف مخصوص کیے۔ (حسن المحاضرۃ السیوطی ۱۵۴ و ۱۵۵، ج ۱)

بہرکیف! یہ قاہرہ کی (فسطاط کی نہیں) قدیم ترین مسجد ہے، اور چونکہ اس دور میں رواج یہ تھا کہ بڑی بڑی مسجدوں ہی میں حلقۂ درس قائم ہوتے تھے، اور باقاعدہ مدرسے کی شکل بن جاتی تھی، اس لیے یہ مسجد صدیوں تک ایک عظیم دینی درسگاہ کی خدمات انجام دیتی رہی۔ جس میں بڑے بڑے علماء نے علم حاصل کیا، اور درس دیا۔

چنانچہ اس مدرسے کی شہرت کی بنا پر طلبہ اطراف عالم سے آنے لگے تھے۔ اسلئے آخری دور میں اسی مسجد کے قریب الگ عمارتیں تعمیر کر کے اسے بیسویں صدی کی ایک یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی، اب تعلیم "جامع الازہر" میں نہیں، بلکہ "جامعۃ الازہر" میں ہوتی ہے۔ اور "جامع الازہر" ایک تاریخی مسجد کی حیثیت میں باقی رہ گئی ہے۔

ازہر نے ماضی میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء پیدا کیے، اور اس صدی کے آغاز تک اس نے بے دینی کے سیلاب پر بند باندھنے میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کا تسلط ہوتا گیا جو مغربی افکار کے سامنے شکست خوردہ اور معذرت خواہانہ طرزِ فکر کے حامل تھے۔ اگرچہ ازہر ہی سے ہمیشہ ایسے متصلب اور راسخ العلم حضرات بھی پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس طرزِ فکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن پہلے گروہ کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی، اس لیے وہ ازہر پر چھاتا گیا، یہاں تک کہ اس درسگاہ کا پختہ دینی رنگ ماند پڑ گیا۔ اس کا اثر سب سے پہلے یہاں کی عام عملی فضا پر پڑا اور زندگی کے ہر شعبے میں اتباعِ سنت کا وہ اہتمام جو کسی دینی درسگاہ کی سب سے قیمتی متاع ہے، رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا۔ علم و تحقیق میں بھی انحطاط آیا۔ لیکن اس میدان میں پھر بھی ازہر نے کسی درجہ اپنا معیار [illegible]

رکھا ہے، مگر اب یہ علم و تحقیق ایک خشک علم و تحقیق ہے جس میں جذبۂ عمل کی جان شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے، طلبہ اور اساتذہ پر معاملات اور اخلاق میں دین کی عملداری پہلے ہی کم رہ گئی تھی، اس کے بعد عبادات کا اہتمام بھی کمزور پڑا، وضع قطع تبدیل ہونے لگی، چہروں پر سے داڑھیاں گھٹتے گھٹتے بے نشان ہوگئیں، سروں پر عمامے اور جسموں پر جبے باقی رہ گئے تھے، بالآخر وہ بھی رخصت ہوگئے۔

آج سے تقریباً سات سال پہلے جب میں پہلی بار قاہرہ آیا تھا تو ازہر کے علماء و طلبہ میں تقریباً چالیس فیصد افراد جبے اور عمامے میں نظر آتے تھے، لیکن اس مرتبہ ازہر کے عام ماحول میں ازہر کے اس مخصوص لباس کو نگاہیں ڈھونڈتی ہی رہیں تقریباً ننانوے فیصد افراد مغربی لباس ہی میں ملبوس نظر آئے، اور اساتذہ و طلبہ کو دیکھ کر ان کے سراپا میں کوئی ایسا امتیاز خوردبین لگا کر بھی نظر نہیں آیا جو ان کو عام لادینی یونیورسٹیوں کے طلبہ سے ممتاز کر سکے۔

بلکہ ایک خوش آئند بات۔ جس کا میں ان شاء اللہ آگے قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔ یہ ہے کہ مصر کے عام نوجوانوں میں بالخصوص کالجوں اور یونیورسٹیوں میں احیاء دین کا ایک غیر معمولی رجحان تیزی سے جڑ پکڑ رہا ہے، یہ نوجوان دین کی طرف لوٹنا اور قوم کو لوٹانا چاہتے ہیں اور الحمد للہ ان کے سراپا میں بھی ان کے اس ذوق کا نور چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہ نوجوان بھی ازہر کی اس فضا اور طرز عمل سے نالاں ہیں۔

بہرصورت! یہ ایک حسرت ناک حقیقت ہے کہ ازہر دینی معاملات میں اپنا پہلا جیسا وقار کھو چکا ہے، علم و تحقیق کے میدان میں بیشک وہاں سے مختلف موضوعات پر صف اول کی کتابیں اور مقالے اب بھی نکل رہے ہیں، اور بحمد اللہ اب ایسے مقالے بھی کم نہیں ہیں جن میں ٹھیٹھ دینی فکر کار فرما ہوتی ہے، اور جو مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ انداز فکر پر مکمل کر تنقید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گئی گذری حالت میں بھی وہاں بعض ایسے علماء موجود ہیں جو عملی دنیا میں طلبہ کے لیے ایک مثال بن سکتے ہیں، لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور وہ وہاں کی عام فضا پر اثر انداز نہیں ہیں۔

شیخ الازہر اور وکیل الازہر سے ملاقات

ساڑھے گیارہ بجے شیخ الازہر شیخ جاد الحق علی جاد الحق سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک، خوش اخلاقی اور محبت سے ملے۔ شیخ الازہر کا منصب مصر کے اعلیٰ ترین مناصب میں شمار ہوتا ہے، اور پروٹوکول کی ترتیب میں شیخ الازہر کا نمبر غالباً وزیر اعظم کے بعد سب سے پہلا ہے۔ اُن کو سرکاری سطح پر جو مراعات حاصل ہیں وہ بڑے بڑے وزراء کو حاصل نہیں۔ یہ ازہر کی قدر شناسی کی بڑی قدیم روایت ہے جو ابھی تک باقی چلی آتی ہے۔ ایک زمانے میں ازہر کے شیوخ اپنے اس منصب و وقار کو عمدہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے، اور حکومت کی طرف سے جب کوئی کام دینی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہوتا تو شیخ الازہر اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر اس کی اصلاح کراتے تھے، اور حکومت کے لیے ان کی مرضی کے خلاف اقدام کرنا مشکل ہوتا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ اثر و رسوخ کی یہ نوعیت ختم ہوتی گئی۔ اب شیخ الازہر کو صرف اعزازی مرتبہ حاصل ہے، لیکن کاروبارِ حکومت میں ان کا کوئی عملی دخل باقی نہیں رہا، تاہم اگر منصب پر کوئی شخص جرات مند اور با اثر شخصیت آ جائے تو وہ اپنی شخصیت کی خداداد صلاحیت سے بہت کچھ کام کر سکتا ہے۔ موجودہ شیخ الازہر شیخ جاد الحق، پہلے مصر کے مفتی رہ چکے ہیں، اور ان کے بارے میں یہاں شہرت یہ ہے کہ وہ نسبتاً جرأت مند بزرگ ہیں۔ مصر میں نفاذِ شریعت کی جو تحریک چل رہی ہے، ان کے طرزِ عمل سے اس کو فی الجملہ تقویت پہنچی ہے۔

احقر نے تقریباً ایک گھنٹے کی اس مُلاقات میں انہیں ذی علم، با وقار، مدبّر اور خوش اخلاق پایا۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ احقر نے اپنی تالیف "تکملہ فتح الملہم" کی پہلی جلد انہیں پیش کی، انہوں نے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا، اور ہمت افزائی کے کلمات کہے۔ ازہر اور مصر کے مجموعی حالات پر بھی گفتگو رہی۔ واپسی میں وہ دروازے تک چھوڑنے کے لیے تشریف لائے۔ بہت سی دُعائیں دیں اور محبت سے رخصت کیا۔

ان کے بعد وکیل الازہر اور نائب شیخ الازہر شیخ حسینی سے ملاقات ہوئی، یہ ازہر کے انتظامی سربراہ ہیں، اور معروف علمی شخصیت ہیں، مسند احمدؒ پر علامہ احمد شاکر نے جو کام اُدھورا چھوڑ دیا تھا، انہوں نے اس کی تکمیل شروع کی ہے، ایک جلد آ بھی چکی ہے، انہوں نے بتایا کہ باقی جلدوں پر کام جاری ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی مسجد میں

ازہر سے فارغ ہوئے تو نمازِ ظہر میں کچھ وقت باقی تھا، میں نے اپنے رہنما ڈاکٹر حسن الشافعی سے بہت پہلے کہہ رکھا تھا کہ میں حافظ ابنِ حجرؒ کے مزار پر بھی حاضر ہونا چاہتا ہوں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نماز انہیں کی مسجد میں ادا کر لی جائے۔ چنانچہ ازہر سے نکل کر ہم جامع الحسینؓ[1] کے سامنے کچھ تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک طویل سڑک پر آ گئے جو جامع الحاکم پر جا کر ختم ہوئی ہے، یہ بھی پرانے قاہرہ کی سڑک ہے۔ جو اس وقت تو شاہراہ رہی ہوگی، لیکن اب بہت تنگ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے دونوں طرف قدیم طرز کا بازار چلا گیا ہے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک طویل گلی تھی، ڈاکٹر حسن الشافعی خود ایک عرصے کے بعد یہاں آئے تھے، اس لیے انہیں بہت سے لوگوں سے پتہ پوچھنا پڑا۔ بالآخر اس گلی کے آخری سرے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی، یہ "مسجد الحافظ ابن حجر"

---

[1] "جامع الحسین" شہید کربلا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے اور یہاں یہ بات مشہور ہے کہ ان کا سرِ مبارک یہاں مدفون ہے، چنانچہ اس مسجد کے اندر ایک مزار بنا ہوا ہے جس پر اژدہام رہتا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ بات مستند نہیں، بظاہر زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ حضرت حسینؓ کا سرِ مبارک دمشق کی جامع اموی میں مدفون ہے، یہاں کے لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فاطمی حکمران اپنے عہدِ حکومت میں حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک یہاں لے آئے تھے، لیکن مستند مؤرخین جو فاطمی دور کے بہت بعد ہوئے ہیں، مثلاً علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ وغیرہ ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں کرتے، نہ انہوں نے "جامع الحسینؓ" کا کوئی ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بہت بعد کی پیداوار ہے۔

تھی۔ پہلے ڈاکٹر شافعی کا خیال یہ تھا کہ حافظ ابن حجرؒ کا مزار اسی مسجد میں واقع ہے، لیکن وہاں کوئی مزار نہیں تھا۔ مسجد کے خدام نے بتایا کہ ان کا مزار یہاں نہیں ہے، لیکن یہ مسجد انہی کی ہے جس میں وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور درس بھی دیتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا مزار قرافہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے مزار کے سامنے واقع ہے، جہاں ہم کل ہو آئے تھے۔ زمانۂ حال میں حافظ ابن حجرؒ کے ایک تذکرہ نگار ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم لکھتے ہیں :-

"حافظ ابن حجرؒ کا مزار سید عسل کے قرافہ کے پیچھے واقع ہے، اس کے بالمقابل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، افسوس ہے کہ یہ قبر بے توجہی کا شکار ہے جس پر مٹی جمی ہوئی ہے .... یہ ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے جو مستطیل شکل میں ہے اور زمین سے تدریجاً بلند ہے اس کے چاروں گوشوں پر چار بلند ستون ہیں جن کی شکل اوپر جا کر مخروطی ہو گئی ہے۔ قبر کے سرہانے ایک دھندلا سا کتبہ ہے جس پر یہ عبارت میں پڑھ سکا :-

"ھذا قبر احمد بن علی بن حجر العسقلانی"[1]

بہرحال ان کے مزار پر حاضری نہیں ہو سکی، لیکن ان کی مسجد میں نماز ظہر پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو اس وقت خستہ حال ہے، لیکن اب اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ اس مسجد کو حافظ ابن حجرؒ جیسے علم کے دریائے ناپیدا کنار نے اپنی فیض رسانی کا مرکز بنایا ہوا۔ اپنے عہد شباب میں یہاں تشنگانِ علم کے اژدہام کا کیا عالم ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مکان بھی اسی محلے میں کہیں اس پاس واقع تھا۔

یوں تو مشاہیر علمائے سلف کا ہر فرد ہی آفتاب و ماہتاب ہے، لیکن ہم طالب علموں پر

---

[1] ابن حجر العسقلانی و دراستہ مصنفاتہ شاکر محمود عبد المنعم ص ۱۹۴

جن حضرات کے احسانات بے پایاں ہیں، اور جن کا نام آتے ہی قلب میں عقیدت و محبت کی پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں، حافظ ابن حجرؒ ان میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے علم حدیث کی جو خدمت لی ہے، اس کے صحیح مقام کا اندازہ کرنے کے لیے بھی علم کی بھاری مقدار درکار ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ تھے۔

وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ اور ان کی تمام تر پرورش ان کے والد کے ایک تاجر دوست نے کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے آسرا بچے کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے چن لیا تھا، وہ تعلیم میں مشغول ہوئے تو خداداد ذہانت و ذکاوت اور غیر معمولی قوت حافظہ کی بدولت اپنے تمام ہمعصروں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ حدیث میں آپ کے خاص استاذ حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہ آپ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میرے اصحاب میں علم حدیث کا سب سے بڑا عالم یہ ہے۔[1]

جب حافظ ابن حجرؒ کو مکہ مکرمہ حاضر ہونے کا موقع ملا تو انہوں نے زمزم پیتے وقت یہ دعا کی کہ یا اللہ مجھے حافظ ذہبیؒ جیسا حافظہ عطا فرما [illegible] یہ دعا [illegible] بیس سال بعد پھر حاضر ہوئے تو یہ دعا فرمائی کہ مجھے مزید حافظہ عطا ہو۔ چنانچہ بعد کے اہل نظر علماء نے [illegible] کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس معاملے میں حافظ ذہبیؒ پر بھی فوقیت عطا فرما دی تھی۔[2]

عملی زندگی میں اتباع سنت کے اہتمام کا عالم یہ تھا کہ لوگ کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں ان کی ادائیں دیکھ دیکھ کر سنتیں سیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک ایسا کھانا کھا لیا جو مشتبہ تھا، بعد میں جب اس کا ذریعہ معلوم ہوا تو ایک طشت منگایا، اور فرمایا کہ "ہم وہی کام کریں گے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا" یہ کہا اور سارا کھانا قے

---

[1] ذیل طبقات الحفاظ للسیوطیؒ ص ۳۸۱

[2] لحظ الالحاظ، لابن فہد ص ۳۳۶، والضوء اللامع ص ۳۹ ج ۲

کرکے اگل دیا۔[1]

زندگی نظام الاوقات کی پابند تھی، ہر کام کا وقت مقرر تھا، اور ایک ایک لمحے کو تول تول کر خرچ کرتے تھے، یہاں تک کہ لکھنے کے دوران قلم پر قط رکھنے کی ضرورت پیش آتی تو اتنی دیر بھی بیکار نہ گذارتے، اس وقفے میں زبان سے ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتے تھے[2] وقت کی اس قدر دانی ہی کی برکت تھی کہ اللہ تعالی نے ان سے وہ کام لیا کہ آج اگر ان کی تمام تصانیف کو کوئی شخص صرف نقل ہی کرنا چاہے، شاید عمر بھر میں وہ نقل بھی نہ ہو سکیں۔ اور تصانیف بھی کوئی عامیانہ نہیں، ایسی محققانہ کہ جو بات قلم سے نکل وہ سند بن گئی، بلکہ حدیث کے معاملے میں تو حافظ [illegible] کا محض سکوت اختیار [illegible] کسی حدیث کو بیان کرکے اس پر [illegible] نہ کرنا بھی فتح الباری اور تلخیص میں بہت سے علما کے نزدیک حجت قرار پاتا ہے۔[3]

لیکن فتح الباری جیسی بے مثال کتاب [illegible] وقت [illegible] خود [illegible] کیا [illegible] ہوتا؟ تواضع کا عالم [illegible] ہے کہ خود اپنی تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

[illegible] ولکن جری القلم بذلک

میں [illegible] علما [illegible] ایک کتاب [illegible] بس قلم چل پڑا۔

البتہ اپنی کتابوں میں صرف فتح الباری، [illegible] الساری، تغلیق التعلیق، نخبۃ الفکر، المشتبہ، التہذیب اور لسان المیزان پر اطمینان کا اظہار فرمایا، اور باقی کتب کے بارے میں لکھا:

اما سائر المجموعات فھی کبیرۃ العدد، واھیۃ العدد، ضعیفۃ القوی۔[4]

---

[1] ابن حجر العسقلانی، للدکتور شاکر بحوالہ الجواھر والدرر، ورقہ ۲۳۳

[2] ایضاً

[3] لیکن یہ بات اکثری ہے، کلی نہیں۔

باقی تمام مجموعات گنتی میں تو زیادہ ہیں، لیکن مواد کے لحاظ سے کمزور ہیں[1]:
اپنی تالیف کے بارے میں یہ اعتراف علم و فضل کی اعلیٰ ترین چوٹیوں کو چھونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ و سعۃ:

حافظ بُلقینیؒ کے مزار پر

حافظ ابن حجرؒ کی مسجد سے باہر نکلے تو واپسی پر کچھ دُور چل کر اسی گلی میں دائیں ہاتھ پر ایک اور مسجد نظر آئی جس کے اُوپر ایک بورڈ لگا ہُوا تھا، اس بورڈ سے پتہ چلا کہ یہ علامہ عمر بن رسلان البُلقینی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔

علامہ عمر بن رسلان البلقینی رحمۃ اللہ علیہ حافظ ابن حجرؒ کے استاذ تھے، حافظ ابن حجرؒ نے جن اساتذہ سے خاص تعلق رکھا، اور بہت استفادہ کیا، ان میں حافظ زین الدین عراقیؒ، علامہ بلقینیؒ اور حافظ ابن الملقنؒ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ علامہ بُلقینیؒ یوں تو حدیث میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے، لیکن ان کا خصوصی موضوع فقہ تھا، اور حافظ ابن حجرؒ نے فقہ میں ان سے خصوصی استفادہ کیا۔ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے حدیث میں حافظ ابن حجرؒ کا اور فقہ میں علامہ بُلقینیؒ کا مرتبہ عطا فرما دے[2]

علامہ بُلقینیؒ اصلاً شام کے باشندے تھے، لیکن بچپن ہی میں مصر آ گئے تھے، اور یہاں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ پھر ایک عرصہ تک دمشق میں قاضی بھی رہے۔ لیکن بعد میں پھر مصر لوٹ آئے آخر تک یہیں مقیم رہے۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ جب وہ مدرسہ کاملیۃ میں داخل ہوئے تو مدرسے کے مہتمم سے رہائش کے لیے ایک کمرے کی فرمائش کی، مہتمم نے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں ایک روز ایک شاعر آیا، اور اس نے انہی مہتمم صاحب کی تعریف میں ایک

---

[1] ابن حجر العسقلانی ص ۲۶۴ بحوالہ الجواہر والدرر ق: ۱۵ ب
[2] حسن المحاضرۃ۔

ہوئیں قصیدہ سنایا، جب شاعر قصیدہ ختم کر چکا تو علامہ بلقینی نے کہا کہ "مجھے یہ قصیدہ یاد ہوگیا ہے"۔ شاعر صاحب نے کہا کہ اگر تم قصیدہ زبانی سنا دو تو میں تمہیں کرہ دے دوں گا، انہوں نے قصیدہ از بر سنا دیا، اور اس طرح انہیں کرہ مل گیا[1]

عصر سے لے کر مغرب تک روزانہ فتویٰ لکھنے کا معمول تھا، اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس پورے عرصے میں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ البتہ جس کسی فتویٰ میں ذرا بھی شبہ ہوتا اسے کتابوں کی مراجعت اور مطالعہ کے انتظار میں روک لیتے، اور جب تک پوری طرح شرح صدر نہ ہو جاتا، جواب نہ لکھتے، خواہ اس میں کتنی ہی دیر ہو جاتی۔

درس و تدریس میں آپ کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ علامہ برہان حلبیؒ کہتے ہیں کہ میں ان کے "مختصر صحیح مسلم" کے درس میں بارہا حاضر ہُوا۔ اس حلقے میں چاروں مذاہب کے فقہاء شریک ہوتے تھے، انہوں نے ایک حدیث پر صبح سویرے بیان شروع کیا تو ظہر کے قریب تک اسی ایک حدیث کا درس جاری رہا۔

لیکن آپ کا علم تصنیف کے ذریعہ زیادہ نہ پھیل سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ کوئی کتاب لکھنا شروع کرتے تو تبحر علمی کی بنا پر چھوٹی سے چھوٹی بات کی بہت تفصیل فرماتے، نتیجہ یہ کہ تصنیف مکمل نہ ہو پاتی، پھر دوسری شروع کر دیتے، مثلاً صحیح بخاری کی شرح شروع کی تو صرف بیس حدیث میں دو جلدیں ہو گئیں، اس لئے ان کی تصانیف زیادہ نہ ہو سکیں[2]

آپ کو بعض حضرات نے نویں صدی کا مجدد بھی قرار دیا ہے، آپ کی وفات ۸۰۵ھ میں ہوئی، اس وقت آپ کے جلیل القدر شاگرد حافظ ابن حجرؒ حج کو گئے ہوئے تھے، واپسی پر ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو بہت غمگین ہوئے، اور ان کا بڑا پُر درد مرثیہ کہا، جس کا مطلع یہ ہے ؎

---

[1] الضوء اللامع للسخاوی ص ۸۶، ج ۶۔

[2] ملاحظہ ہو الضوء اللامع للسخاوی ص ۹۰، ج ۶۔ ذیل لحظ الالحاظ، لابن فہد ص ۲۰۶ تا ۲۱۱، و شذرات الذهب لابن العماد ص ۵۱ و ۵۲ ج ۷۔

یا عین جودی لفقد البحر بالمطر
واذری الدموع ولا تبقی ولا تذری

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ[1]

جامع الحاکم

قاہرہ کا تو چپہ چپہ تاریخ ہے' بالخصوص شہر کا پرانا علاقہ ایسا ہے کہ کوئی مؤرخ یا ماہرِ آثار اگر اس کی ہر تاریخی جگہ کی تحقیق کر کے اس کے حالات مرتب کرے تو اس کے لیے سالہا سال چاہئیں۔ مسجد الحافظ ابن حجرؒ والی گلی سے نکل کر بائیں ہاتھ کی طرف چلیں تو ایک بڑی طویل و عریض' شاندار اور قلعہ نما مسجد نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ یہ "جامع الحاکم" ہے۔ جامع الحاکم ایک ظالم اور جابر فاطمی بادشاہ حاکم بامر اللہ کے نام سے منسوب ہے جس کی رعونت' فرعونیت اور بے سروپا احکام اہلِ مصر کے لیے سالہا سال وبال بنے رہے اور جس کے بارے میں علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ مصر پر فرعون کے بعد اس سے زیادہ بدتر حکمران کوئی نہیں آیا۔ ابتداءً اس کی تعمیر عزیز باللہ نے شروع کی تھی' بعد میں حاکم نے اس کی تکمیل کی' اسی لیے جامع الحاکم کہا جاتا ہے۔ اس مسجد میں بھی مذاہب اربعہ کے حلقہ ہائے درس قائم رہتے ہیں[2] لیکن چونکہ یہ فاطمی دور کی عظیم الشان مسجد ہے' اس لیے یہ بوہریوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے' اور بوہری فرقے کے لوگ دور دور سے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

ابن ہشام نحویؒ

جامع الحاکم لمبائی میں جس جگہ ختم ہوئی ہے' وہاں بائیں ہاتھ پر ایک قدیم فصیل شروع ہو گئی ہے جو کسی وقت شہر پناہ کا کام دیتی تھی' اس فصیل میں ایک دروازہ ابھی تک موجود ہے جس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔ اس دروازے کی بنیاد میں ایک چبوترہ سا بنا ہوا

---

[1]

[2] حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ ص ۱۵۵ ج ۲

ہے۔ ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ میں نے اپنے اساتذہ اور آباء و اجداد سے سُنا ہے کہ یہ چبوترہ مشہور نحوی عالم ابن ہشامؒ کی قبر ہے۔

یہ وہی ابن ہشامؒ ہیں جن کی کتاب "مغنی اللبیب" عربی نحو کے مستند ترین مآخذ میں شمار ہوتی ہے اور ان کی کتاب "قطر الندیٰ" ابتدائی نحو کے لیے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ ان کا پورا نام عبداللہ بن یوسف جمال الدین ابن ہشامؒ ہے، فقہ میں پہلے شافعی تھے، پھر حنبلی مسلک اختیار کر لیا تھا، لیکن انہوں نے اپنا خاص موضوع نحو اور ادب کو بنایا، اور اپنے زمانے میں نحو کے مسلم الثبوت امام مانے گئے۔ ابن خلدونؒ کہتے ہیں کہ ہم نے مغرب ہی میں یہ شہرت سن لی تھی کہ مصر میں نحو اور علوم عربیت کا ایک ایسا عالم پیدا ہوا ہے جو نحو میں سیبویہ سے زیادہ ماہر ہے۔ مذکورہ دو کتابوں کے علاوہ انہوں نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور ذی القعدہ ۷۶۱ھ میں وفات پائی۔[1]

علامہ عینیؒ کی مسجد

ہم یہاں سے واپس ہوتے ہوئے دوبارہ جامعۃ الازہر پہنچے، کیونکہ ہماری گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ جامع الازہر کی پشت پہ ایک چھوٹی سی گلی ہے۔ اس گلی میں ایک مسجد کے پاس سے گذرے تو ڈاکٹر شافعی نے بتایا کہ یہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد ہے اور اسی میں ان کا مزار بھی واقع ہے۔

ہم جیسے طالب علموں کے لیے یہاں کچھ دیر رکنے کے لیے یہ کشش کم نہ تھی، کہ یہ علامہ عینیؒ کا محلہ، ان کی مسجد، ان کا مدرسہ اور ان کا مزار تھا، وہی علامہ عینیؒ جن کے احسانات سے اُمتِ مسلمہ، بالخصوص حنفی علماء کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ ان کی شرح بخاری، شرح ہدایہ اور شرحِ کنز فقہِ حنفی کا بہت بڑا ماخذ شمار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر علم و فن میں ان کی تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ حافظ سخاویؒ جیسے مردم شناس راوی علماء کی

---

[1] الدرر الکامنۃ، للحافظ ابن حجر ص ۳۰۸ تا ۳۰۳ ج ۲

تعریف میں بہت محتاط بزرگ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ میری معلومات میں ہمارے شیخ (یعنی حافظ ابن حجرؒ) کے بعد علامہ عینی سے زیادہ کثیر التصانیف بزرگ کوئی اور نہیں۔ انہوں نے جامع الازہر کے قریب ہی اپنی مسجد اور مدرسہ اس لیے بنایا تھا کہ وہ جامع الازہر میں نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہ سمجھتے تھے، کیونکہ اسے ایک تبرائی رافضی نے وقف کیا تھا۔ ؎

علامہ عینیؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل، حافظے اور قوتِ تحریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا جو خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ سرعتِ تحریر کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ پوری مختصر القدوری ایک رات میں نقل کر دی۔

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ کے درمیان معاصرانہ چشمک مشہور و معروف ہے۔ اگرچہ علامہ عینیؒ عمر میں حافظ ابن حجرؒ سے بارہ سال بڑے تھے، اور حافظؒ نے ان سے بعض احادیث بھی پڑھی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک دوسرے کے معاصر ہی شمار ہوتے تھے۔ حافظؒ شافعی تھے، اور علامہ عینیؒ حنفی، وہ بھی قاضی رہے، اور یہ بھی، انہوں نے بخاری شریف کی شرح لکھی، اور انہوں نے بھی، اس لیے دونوں کے درمیان لطیف علمی چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرح پہلے لکھنی شروع کی تھی، اور وہ اپنے شاگردوں کو املاء بھی کراتے جاتے تھے، ان شاگردوں میں سے ایک علامہ برہان الدین ابن خضر کا تعلق علامہ عینی سے بھی تھا۔ علامہ عینیؒ نے ان سے خواہش کی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کاپیاں ان کو مستعار دے دیا کریں، علامہ ابن خضر نے حافظؒ سے اجازت لے کر علامہ عینیؒ کو شرح کے حصے مستعار دینے شروع کر دیئے، اور اس طرح علامہ عینیؒ نے اپنی شرح کی تالیف کے وقت حافظؒ کی شرح کو سامنے رکھا اور جا بجا اس پر تنقید بھی فرمائی۔ بعد میں حافظؒ نے عینیؒ کے اعتراضات کے جواب میں مستقل دو کتابیں لکھیں۔

دونوں کی لطیف چوٹوں کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے حکمران

؎ الضوء اللامع للسخاویؒ، ص ۱۳۳ ج ۱۰

"الملک المؤید" کی سیرت پر علامہ عینیؒ نے ایک طویل قصیدہ کہا تھا، جس میں اس کی بنائی ہوئی جامع مسجد کی بھی تعریف تھی، اتفاق سے کچھ دن بعد اس مسجد کا منارہ جھک کر گرنے کے قریب ہوگیا، اس پر حافظ ابن حجرؒ نے پرچے پر دو شعر لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیئے۔

لجامع مولانا المؤید رونق   منارتہ تزھو علی الفخر والزّین

تقول وقد مالت علیّ ترفقوا   فلیس علی حسنی أضرّ من العین

(یعنی: جناب مؤید کی جامع مسجد بڑی بارونق ہے، اور اس کا منارہ فخر و زینت کی وجہ سے بڑا خوشنما، لیکن جب وہ جھکا تو اس نے کہا کہ: مجھ پر رحم کرو، کیونکہ میرے حسن کے لیے "عین" (چشم بد) سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں)۔

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ اس میں "عین" کو "عینی" پڑھا جاتا ہے جس سے علامہ عینیؒ پر تعریض ہوتی ہے۔

ملک مؤید کو یہ رقعہ ملا تو اس نے علامہ عینیؒ کے پاس بھیج دیا، اس پر علامہ عینیؒ نے دو شعر لکھ کر واپس بھیجے:۔

منارۃ کعروس الحسن قد جلیت   وھدمھا بقضاء اللہ والقدر

قالوا أصیبت بعین، قلت ذا خطأ   وإنما ھدمھا من خیبۃ الحجر[1]

یعنی (یہ منارہ عروس حسن کی طرح درخشاں ہے، اور اس کا گرنا محض اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کی وجہ سے ہوا ہے، لوگ کہنے لگے کہ اسے نظر لگ گئی، میں نے کہا: غلط ہے، دراصل وہ اپنے "حجر" (پتھر) کے فساد کی بنا پر گرا ہے)۔

علامہ دردیر مالکیؒ

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد سے ذرا آگے بڑھے تو وہاں مشہور مالکی فقیہ علامہ احمد الدردیر مالکیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تھا، یہ وہی بزرگ ہیں جن کی مختصر خلیل کی شرح کو اب

---

[1] ابن حجر العسقلانی تالیف محمود عبد المنعم ص ۱۷۸ بحوالہ الیواقیت والدرر۔

فقہ الکی کی دردیرکی بڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بارھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں جنہوں نے جامع الازہر میں تعلیم حاصل کی اور فقہ و تصوف کے امام سمجھے گئے۔ یہاں تک کہ انکو "مالک الصغیر" (چھوٹے امام مالک) کہا جانے لگا۔

اس وقت مغرب (مراکش) کا بادشاہ علما۔ ازہر کو ہدیہ بھیجا کرتا تھا، ایک مرتبہ (۱۱۹۸ھ) میں کچھ ہدیہ علامہ دردیرؒ کی خدمت میں بھی بھیجا، اتفاق سے اسی سال بادشاہ کا بیٹا حج کو گیا تھا، اور واپسی میں جب مصر پہنچا تو اس کا سفر خرچ ختم ہو چکا تھا، علامہ دردیرؒ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے پاس آئی ہوئی ہدیہ کی رقم ان کو بھجوادی ـــ آئندہ سال بادشاہ نے انہیں دس گنا زائد ہدیہ بھیجا، شیخ نے اس رقم سے حج کیا۔ اور باقی ماندہ رقم سے اپنی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، اور آخر عمر تک اسی میں تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲۰۱ھ میں وفات ہوئی۔

علامہ دردیرؒ کے مزار پر حاضری کے بعد ہم نے ہوٹل واپس آکر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر اس روز شام کو اور اگلے دن بارہ بجے تک مختلف کتب خانوں کی سیر اور خریداری کتب میں وقت گذرا۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد وطن واپسی کے لیے ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔

مجموعی تأثرات

مصر صدیوں علم و دین کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ اور اس سرزمین نے علوم اور دینی اخلاق کے وہ آفتاب و ماہتاب پیدا کئے ہیں جن پر تاریخ ہمیشہ فخر کرے گی۔ لیکن جس طرح اس ملک نے مدتوں علمی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کی قیادت کی ہے، اسی طرح مغربی افکار کے استیلا کے بعد اسی ملک کے بعض دانشوروں نے مغربیت کی نشر و اشاعت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ "مفتی محمد عبدہٗ" "سید رشید رضا" ان کے بعد "طٰہٰ حسین" اور "احمد امین" جیسے متجددین اسی ملک میں پیدا ہوئے جن کے افکار اور تحریروں نے پورے عالم اسلام کے تجدد پسند حلقے کو اسلحے فراہم کئے، یہاں تک کہ ازہر جیسا علمی مرکز بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

دوسری طرف راسخ العقیدہ اہل علم کی تعداد بھی یہاں کبھی کم نہیں رہی اور انہوں نے شروع میں ان افکار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اوّل الذکر حلقے کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی، اس لیے عملی زندگی میں اس حلقے کے اثرات غالب آتے چلے گئے۔ اس سلسلے کی انتہا جمال عبدالناصر کے عہدِ حکومت میں ہوئی، جس نے دین کو نظام حکومت کی بنیاد قرار دینے کی ہر تحریک کو انتہائی تشدد کے ساتھ کچل کے رکھ دیا۔ اخوان المسلمین کے افراد عموماً اخلاص اور دینی جذبے دونوں سے سرشار تھے، اور انہوں نے بڑی زبردست قربانیاں پیش کیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا طریقِ کار منتخب کرنے میں بھی ہوش و حکمت اور تدبر سے اتنا کام نہیں لیا جتنا جوش سے۔ بہر کیف جمال ناصر کے عہد میں دین کو عملاً جاری کرنے کی فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا، اور ملک میں عربی قوم پرستی، بے دینی، عریانی اور فحاشی کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔

انور السادات کے عہد میں دینی حلقوں کے ساتھ قدرے نرمی کا معاملہ کیا گیا اور بظاہر موجودہ حکومت بھی اسی پالیسی پر گامزن ہے، چنانچہ اس دور میں تبلیغ و دعوت کا کام خاصا آگے بڑھا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں دینی جذبے کی وہ چنگاری جسے زبردستی دبا دیا گیا تھا۔ اب اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔

ایک طرف حکومتوں کی مسلسل مغرب نواز پالیسیوں کا اثر یہ ہے کہ اب بھی عریانی و فحاشی کا بازار گرم ہے، اور بعض علاقوں میں لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ یورپ کا کوئی شہر ہے، یا عالم اسلام کا؟ شراب نوشی کی وبا بھی عام ہے، ذرائع ابلاغ کسی ادنیٰ رُو رعایت کے بغیر علی الاعلان عریانی و فحاشی کی تبلیغ کر رہے ہیں، لیکن دوسری طرف نوجوانوں میں دین کی طرف لوٹنے کا ایک غیر معمولی جذبہ بیدار ہو رہا ہے اور مختلف حلقے اس سمت میں متواتر کام کر رہے ہیں، تبلیغی جماعت کے آثار بھی ماشاء اللہ نمایاں محسوس ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اخوان کے افراد بھی مختلف ذرائع سے نوجوانوں میں اسلام کو عملاً برپا کرنے کا جذبہ پیدا کر رہے ہیں، اس وقت مصر میں نفاذِ شریعت کا آوازہ بلند کرنے میں ایک بڑی مسجد کے خطیب حافظ سلامہ پیش پیش ہیں، لیکن جن دنوں میں وہاں

تھا، وہ جیل میں تھے۔

پہلے کے مقابلے میں حکومت کی پالیسی کے باوجود نوجوانوں میں بڑھتے ہوئے دینی رجحان کو حکومت کے حلقوں میں کن نظروں سے دیکھا جا رہا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے کہ ان نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے پرچوں (STICKERS) پر کلمہ طیبہ ـــــ اور صرف کلمہ طیبہ ـــــ لکھ کر لوگوں میں تقسیم کیا تھا، اور یہ اپیل کی تھی کہ یہ پرچے کاروں پر چسپاں کئے جائیں، کچھ ہی عرصے میں یہ پرچے اس قدر عام ہوئے کہ قاہرہ کی تقریباً ہر کار پر چسپاں ہو گئے ـــــ حکومت نے اس صورتِ حال کا بھی نوٹس لیا، اور فوری طور پر کاروں سے یہ پرچے ہٹانے کا حکم صادر کیا۔

اس اقدام پر نوجوانوں کی برافروختگی ایک طبعی امر تھی، چنانچہ میرے دورانِ قیام میں ان کے اور پولیس کے درمیان کشمکش جاری رہی۔

تاہم اگر دینی حلقے اخلاص، حکمت، تدبر اور استقامت کے ساتھ دعوت کا کام جاری رکھیں اور کام کے پہلے ہی مرحلے میں حکومت کو براہِ راست اپنا مدِ مقابل بنا کر اپنے لیے غیر معمولی رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق پر اس دعوت کو سرکاری حلقوں تک وسعت دیں تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ حالات کے روبہ اصلاح ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اُحد سے قاسیون تک

سعودی عرب۔ اردن۔ شام

ربیع الاول سنہ ۱۴۰۶ھ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء

فرنگیوں کو عطا خاکِ سُوریا نے کیا
نبیِّ عفّت و غم خواری و کم آزاری

صِلہ فرنگ سے آیا ہے سُوریا کے لیے
مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

(۳)

اُحُد سے قاسیون تک

۱۹۵۶ء میں احقر کے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے شام کا سفر کیا تھا، اُس وقت سے شام دیکھنے کی دل میں شدید خواہش تھی، شام انبیاء علیہم السلام کی سرزمین رہی ہے، قرآنِ کریم نے جگہ جگہ اُس کے تقدس اور اس کی برکات کی تعریف کی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اُس کے ساتھ اسلامی تاریخ کے ناقابلِ فراموش واقعات وابستہ ہیں۔ جن اہلِ شام سے کبھی ملاقات ہوئی اُنہیں بھی اپنے وطن کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان پایا، اور ان کی صورت و سیرت میں شام کا حُسن جھلکتا دکھائی دیا۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ حرمین شریفین کے بعد دُنیا کے جس خطّے کو دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا، وہ شام کا خطہ تھا۔

اس سال ربیع الاوّل میں "مجمع الفقہ الاسلامی" کا سالانہ اجلاس جدّہ میں منعقد ہونا تھا، میں نے پہلے سے ارادہ کیا ہوا تھا کہ اجلاس سے فراغت کے بعد شام کا سفر کروں گا۔ میرے بھانجے مولوی امین اشرف صاحب سلمہٗ (جو مدینہ طیبہ کے ہائی کورٹ میں افسر ہیں) نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ احقر کے ساتھ اس سفر میں ساتھ ہوں گے۔ برادرِ محترم جناب قاری بشیر احمد صاحب پہلے سے اس کے لیے تیار تھے، اور وقت پر میرے بھانج داماد مولوی عطاء الرحمٰن صاحب بھی (جو سعودی نیشنل ہیں) رفاقت کے لیے تیار ہوگئے، ان سب کی رائے تھی کہ یہ سفر سڑک کے ذریعے کیا جائے، اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب

---

[1] قاسیون ۔ دمشق کا پہاڑ جس کے دامن میں شہر آباد ہے۔

نے ایک نئی کار بھی اسی وقت خریدی تھی۔ اس لیے اسی کار کے ذریعہ سفر کا ارادہ کر لیا گیا۔ اس طرح ایک چھوٹا سا قافلہ بن گیا جس کے ساتھ سفر بڑا دلچسپ اور پُرلطف گزرا۔

سنہ ۱۹۸۶ء کا پہلا دن تھا یعنی جنوری کی پہلی تاریخ، جب ہم صبح ۷ بجے مدینہ طیبہ سے بذریعہ کار روانہ ہوئے، جبلِ اُحد کے مغربی جانب سے ہوتے ہوئے ہم شام جانے والی سڑک پر آ گئے، جو مدینہ طیبہ کے شمال میں خیبر، مدائنِ صالح اور تبوک ہوتی ہوئی اردن کی سرحد تک پہنچتی ہے۔

مدینہ طیبہ سے نکلنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف دُور تک پتھریلے ٹیلے پھیلے نظر آتے تھے، یہی وہ راستہ تھا جہاں سے صحرا نشینانِ عرب کے قافلے شام کا رُخ کیا کرتے تھے، خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم چار مرتبہ اسی راستے سے گزرے ہوں گے، دو مرتبہ بعثت سے پہلے سفرِ شام کے لیے، ایک مرتبہ خیبر پر حملہ کے لیے اور ایک مرتبہ غزوۂ تبوک کے موقع پر۔ ان سنگلاخ ٹیلوں نے تاریخ انسانیت کی مقدس ترین ہستیوں کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا ہوگا، انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی ہوگی۔ تصور کی نگاہیں ان پہاڑیوں اور وادیوں میں انسانیت کے نجات دہندوں کے قافلوں اور ان کے گھوڑوں اور اُونٹوں کو اُترتے چڑھتے دیکھتی رہیں اور ان تصورات نے اس سفر میں سیاحت سے زیادہ عقیدت، محبت اور تقدس کا رنگ پیدا کر دیا۔

تقریباً تین گھنٹے کے متواتر سفر کے بعد ایک بڑی بستی کے آثار شروع ہوئے۔ رفقاء نے بتایا کہ یہ خیبر ہے۔ خیبر کی جدید بستی تو مین روڈ پر ہی واقع ہے، لیکن خیبر کے قدیم شہر جانے کے لیے مرکزی سڑک سے ذرا ہٹنا پڑتا ہے۔ میرے سوا تمام رفقاء پہلے خیبر آ چکے تھے، اس لیے ان کی معیت میں مطلوبہ مقامات تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ مرکزی شاہراہ سے چند میل ہٹ کر ہم خیبر کی قدیم بستی میں پہنچے، یہ بستی گھنے نخلستانوں کے درمیان آباد ہے، اور اس کی اُونچی نیچی گلیاں قدامت کی داستانیں سناتی ہیں، کچے پکے راستوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بوسیدہ قلعے کی فصیل کے نیچے پہنچ گئے۔ یہ قلعہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے موجود چلا آتا ہے، پہلے لوگ اس کی فصیل پر چڑھ کر اس کے اندر بھی چلے جاتے تھے، لیکن اب یہ انتہائی بوسیدہ ہونے کی بنا پر نہایت مخدوش ہوگیا ہے۔ اس لیے اب اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

خیبر:

خیبر دراصل کئی قلعوں پر مشتمل ایک وسیع اور زرخیز علاقہ تھا، کہا جاتا ہے کہ اسے عمالقہ کے ایک شخص نے آباد کیا تھا جس کا نام خیبر بن قانیہ تھا، اس لیے یہ علاقہ اسی کے نام سے مشہور ہوگیا۔[1] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "خیبر" عبرانی زبان میں قلعے کو کہتے ہیں، اور چونکہ یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا گیا تھا، اس لیے اس کو خیبر کہنے لگے۔ بعد میں یہاں اور بھی قلعے تعمیر کیے گئے، جو ناعم، قموص، نطاۃ، قصارہ، الوطیح اور السلالم کے نام سے مشہور تھے، اور اس لیے اس مجموعی علاقے کو "خیابر" (خیبر کی جمع) بھی کہا جاتا تھا۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس پورے علاقے پر یہودی قابض تھے، اور ان کے مختلف خاندان مختلف قلعوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کیے ہوئے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد سے مسلسل مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے یہودیوں میں سے بنو نضیر بھی مدینہ طیبہ سے اپنی بدعہدی کی بنا پر جلاوطن کیے گئے تو وہ بھی یہیں آکر آباد ہوگئے، اور یہاں بیٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں کے جال بننے لگے۔ غزوۂ خندق میں عرب کے جو بہت سے قبائل مدینہ طیبہ پر چڑھ کر آئے تھے، اس میں بھی خیبر کے یہودیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا، اور چونکہ یہ لوگ مالدار تھے، اور دفاعی اعتبار سے خاصے مستحکم بھی، اسلیے خیبر اسلام کا سب سے بڑا حریف بن چکا تھا، جس سے مدینہ طیبہ کے لیے چند در چند خطرات

---

[1] معجم ما استعجم للبکری، ص ۵۲۳، ج ۱۔

[2] معجم البلدان للحموی، ص ۴۰۹، ج ۲۔

پیدا کر دیتے تھے، اور اس کا علاج اس پر ایک کاری وار کے بغیر ممکن نہ تھا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو عمرے کی ادائیگی کے بغیر واپس لوٹنا پڑا تو مسلمانوں کے دل اس واقعے سے متاثر تھے۔ اس موقع پر قرآن کریم نے بشارت دی تھی کہ (اس صبر و تحمل کے صلے میں) اللہ تعالیٰ انہیں عنقریب ایک اور سرزمین کی فتح سے نوازے گا۔ اس سرزمین سے مراد خیبر ہی کی سرزمین تھی۔

چنانچہ محرم ۷ھ میں حدیبیہ سے واپسی کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لشکر اسلام کو لے کر خیبر کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ روایات میں ہے کہ جب آپ خیبر کے قریب صہبار کے مقام پر پہنچے تو عصر کا وقت تھا، اور یہاں سے آگے بڑھے تو خیبر کی عمارتیں نظر آنے لگیں، آپ نے لشکر کو روک کر یہ دعا فرمائی:

اللّٰھم انا نسألك خیر ھذہ القریۃ وخیر أھلھا وخیر ما فیھا، ونعوذبك من شرھا وشرّ أھلھا وشرّ ما فیھا۔

یا اللہ! ہم آپ سے اس بستی کی، اس کے رہنے والوں اور اس کی تمام چیزوں کی بھلائی مانگتے ہیں، اور ان کی تمام برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول یہی تھا کہ جب کسی نئی بستی میں داخل ہوتے تو یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اگلی صبح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے قلعے ناعم پر حملہ کیا، اسی حملے میں حضرت محمود بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بڑی جانبازی سے لڑے، لیکن ایک موقع پر ایک یہودی نے قلعے کے اوپر سے ان پر ایک چکی کا پاٹ پھینک کر مارا جس سے وہ شہید ہو گئے، لیکن اس کے بعد قلعہ جلد ہی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد کئی قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوتے رہے، لیکن سب سے بڑا معرکہ قلعۂ قموص پر ہوا، اور یہی وہ قلعہ تھا جس کے دامن میں ہم کھڑے تھے۔

یہ قلعہ دفاعی اعتبار سے خیبر کا سب سے مستحکم قلعہ سمجھا جاتا تھا، اور دشمن نے اپنی

فوج کا سارا زور بھی اسی پر صَرف کر دیا تھا۔ اس قلعے کا محاصرہ تقریباً بیس دن جاری رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے کئی صحابہ کرامؓ کو اس پر حملے کے لیے بھیجا لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا، اور یہ حضرات فتح کیے بغیر واپس آئے۔ بالآخر ایک دن آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دُوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے محبت کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ انشاء اللہ اس کے ہاتھ پر قلعہ فتح فرمائیں گے۔

ہر شخص منتظر تھا کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟ صحابہ کرامؓ کی وہ رات اشتیاق و انتظار کے عالم میں بسر ہوئی۔ صبح کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر جھنڈا ان کے حوالہ فرمایا۔ لوگ اس انتخاب پر اس لیے حیران تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت آشوب چشم میں مبتلا تھے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آنکھیں دُکھنے کی وجہ سے اپنے پاؤں کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آنکھوں پر اپنا لعاب مبارک لگایا، اور دُعا فرمائی، آنکھیں فوراً اچھی ہوگئیں، اور حضرت علیؓ جھنڈا لے کر آگے بڑھے، اور قلعے کے دامن میں پہنچ کر عَلَم نصب کر دیا۔

مشہور یہودی پہلوان مرحب رجز پڑھتا ہوا مقابلے پر آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مقابلے کے دوران اس کے سر پر تلوار ماری تو اس کے سر کے دو ٹکڑے ہو گئے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق قلعہ انہی کے ہاتھ پر فتح ہُوا۔

یہی وہ قلعہ ہے جس کا دروازہ اکھاڑنے کی داستان "درِ خیبر" کے نام سے لوگوں میں مشہور ہے، کہ حضرت علیؓ کی ڈھال لڑائی کے دوران گر گئی تھی، اس لیے حضرت علیؓ نے قلعے کے دروازے کو اُکھاڑ کر اسے ڈھال کے طور پر استعمال کیا، لیکن یہ روایت انتہائی ضعیف اور ناقابلِ اعتماد روایت ہے جس کی محدثین نے سختی سے تردید کی ہے۔

قموص کی فتح کے بعد دشمن کی کمر ٹوٹ گئی، اور اس کے بعد وطیح اور سلالم کے قلعے مقابلے کے بغیر فتح ہو گئے، اور یہودیوں نے ہتھیار ڈال کر صلح کر لی۔

یہ قلعہ اس وقت چھوٹے چھوٹے بوسیدہ پتھروں کا بنا ہوا ہے، اور ایک پہاڑی پر واقع ہے، اور اس کی فصیل خم کھاتی ہوئی دُور تک چلی گئی ہے، اوپر کچھ قدیم عمارتیں بھی بنی ہوئی نظر آتی ہیں، اور یہاں کے لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ اس کی بناوٹ وغیرہ میں بہت کم تغیّر ہوا ہے۔

قلعے کے دامن میں ایک پکا احاطہ سا بنا ہوا ہے جس میں ایک کھڑکی کے ذریعہ جھانکا جا سکتا ہے۔ اس احاطے کے بارے میں یہاں مشہور یہ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں گدھوں کا گوشت حرام ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، اور گدھوں کے گوشت کو پکانے کے لیے جو دیگیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آگ پر چڑھائی تھیں، وہ اس اعلان پر اُلٹ کر ضائع کر دی گئی تھیں، جس کا مفصل واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔

اگر اس احاطے کے بارے میں یہ بات درست ہو تو اسی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ یہ قلعہ قموص ہی ہے، کیونکہ روایات میں گدھوں کے گوشت کی حرمت اور دیگوں کو اُلٹنے کا واقعہ قلعۂ قموص کی فتح کے بعد ہی بیان کیا گیا ہے۔

قلعے کے سامنے کئی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی دُور تک چلی گئی ہیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے نخلستانوں کی دیواریں ہیں، یہ نخلستان اب غیر آباد اور ویران سے نظر آتے ہیں، لیکن ان میں کھجور کے درخت اب بھی بہت زیادہ ہیں، اور ان کے بیچ میں ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی ہے جو آگے جا کر ایک بڑے تالاب میں تبدیل ہو گئی ہے، اس تالاب کا نام یہاں "عین علی رضی اللہ عنہ" مشہور ہے، لوگ اس کا پانی ذوق و شوق سے پیتے ہیں، اور پانی واقعۃً بڑا ٹھنڈا، صاف ستھرا اور میٹھا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس چشمے کی نسبت کی کوئی وجہ احقر کو معلوم نہیں ہو سکی۔ عبداللہ البکری رحمہ اللہ نے مرحب کے قلعے کے قریب ایک چشمے کا ذکر کیا ہے جو "قسمۃ الملائکۃ" کہلاتا تھا[1]، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اسے منسوب نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] معجم ما استعجم، ص ۵۲۲، ج ۱۔

ہم تھوڑی دیر ویران نخلستانوں اور خیبر کی قدیم بستی میں رہے، اس کے بعد واپس مین روڈ کی طرف روانہ ہوئے، خیبر کی قدیم بستی سے چند کیلو میٹر طے کرنے کے بعد دائیں ہاتھ پر ایک پہاڑ تھا، اس پہاڑ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ "سد الصہبا" ہے، یعنی یہ وہ مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملے سے پہلے شام کے وقت قیام فرمایا تھا، اور پھر خیبر سے واپس مدینہ طیبہ جاتے ہوئے اسی مقام پر ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپؐ نے نکاح فرمایا۔

حضرت صفیہؓ بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی اور قلعہ قموص کے سردار کنانہ کی بیوی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیبر پر حملہ کرنے سے کچھ ہی پہلے انہوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک چاند یثرب (مدینہ) کی سمت سے چل کر ان کی گود میں آگیا ہے، انہوں نے یہ خواب اپنے شوہر سے بیان کیا تو اس نے ان کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا کہ "تو شاہِ یثرب کی بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے"[1] اس کے فوراً بعد قلعہ قموص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح فرما لیا، کنانہ اسی جنگ میں مارا گیا، اور حضرت صفیہؓ جنگی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہوگئیں۔ صحابۂ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ ایک سردار کی بیٹی اور ایک سردار کی بیوی ہیں، اس لیے ان کو کسی اور کی کنیز بنانے کے بجائے آپ اپنی کنیز بنائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلا کر فرمایا کہ اگر تم اپنے دین پر قائم رہنا چاہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے، لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کو اختیار کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اس پر حضرت صفیہؓ نے اسلام قبول کر لیا[2] آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو تمہیں آزاد کر کے تمہارے اہلِ خاندان کے پاس بھیج دیا جائے کہ انہی کے ساتھ رہو، اور اگر چاہو تو میں تمہیں آزاد کر کے تم سے نکاح کر لوں، حضرت صفیہؓ نے دوسری صورت اختیار فرمائی،[3] اور اس طرح انہیں

---

[1] الروض الأنف للسہیلی ص ۲۴۰ ج ۲ مطبوعہ ملتان [2] مغازی الواقدی، ص ۶۷۴، ج ۲

[3] مسند احمد بن حنبل، جلد ۳، ص ۱۳۸ مرویات انسؓ بذیل قصۂ حجاج بن علاط و تاریخ الخمیس للدیار بکری، ص ۵۷، ج ۲۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صہبا کے اس مقام پر تین دن قیام پذیر رہے، اسی جگہ پر حضرت صفیہ رضؓ کے ساتھ نکاح کی دعوتِ ولیمہ بھی منعقد ہوئی۔ ولیمہ کی شان بھی عجیب تھی، چمڑے کا ایک دستر خوان بچھا دیا گیا، اور حضرت انسؓ کو حکم ہُوا کہ اعلان کر دو کہ جس کے پاس جو کچھ ہو لے آئے، کوئی کھجور لایا، کوئی پنیر، کوئی ستّو لایا، کوئی گھی جب اس طرح کچھ سامان جمع ہو گیا تو سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھا لیا، نہ گوشت تھا، نہ روٹی۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

صہبا سے گذر کر ہم پھر اس سڑک پر روانہ ہوئے جو شام جانے والی شاہراہ سے جا ملتی ہے۔ راستے میں ایک چڑھائی کے دائیں جانب ایک وسیع احاطہ بنا ہُوا نظر آیا۔ رفقاء نے بتایا کہ یہ شہداءِ خیبر کے مزارات ہیں۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے اُترے اور ان شہداء کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر میں تقریباً بیس صحابۂ کرامؓ شہید ہوئے تھے۔

انہی شہداء میں ایک اسود راعی رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے اسلام لانے کے بعد کبھی ایک نماز بھی نہیں پڑھی، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق وہ سیدھے جنّت میں پہنچے، ان کا واقعہ یہ ہُوا تھا کہ وہ خیبر کے ایک چرواہے تھے اور اُجرت پر بکریاں چرانے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا محاصرہ فرمایا تو ایک دن انہوں نے قلعہ والوں سے جنگی تیاریوں کا سبب پوچھا، انہوں نے بتایا کہ ایک مدعیٔ نبوت سے مقابلہ ہے، ان کے دل میں خیال ہُوا کہ ان سے ملنا چاہیئے، چنانچہ وہ ایک دن بکریاں چرانے کے لیے قلعے سے باہر نکلے، سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر فروکش تھا، سیدھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اور آپؐ سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں، آپؐ نے انہیں اسلام کی بُنیادی تعلیمات سے آگاہ فرمایا، اُن کے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہو گئی، انہوں نے پوچھا کہ اگر میں اسلام لے آؤں تو صلہ کیا ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنّت! انہوں نے کہا کہ میں سیاہ فام اور بدشکل ہوں

اور میرے جسم سے بدبُو آرہی ہے، کیا پھر بھی اسلام لانے سے میں جنت کا مستحق ہوجاؤں گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! اللہ تعالیٰ تمہیں حُسن عطا فرمادے گا، اور تمہارے جسم کی بُو خوشبُو سے تبدیل ہوجائے گی۔

یہ سُنکر اسود راعیؓ اسلام لے آئے، اور عرض کیا کہ یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، ان کا کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ان کو قلعے کی طرف ہنکا دو، چنانچہ انہوں نے بکریاں قلعے کی طرف ہنکا دیں، اور وہ سب قلعے میں چلی گئیں، اس کے بعد اسود راعیؓ جہادِ خیبر میں شریک ہوئے، جنگ کے بعد جب شہداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے گئے تو ان میں اسود راعیؓ کی لاش بھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے مُنہ پھیرلیا، صحابۂ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ یہ اس وقت جنت کی دو حوروں کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے کو حسین بنا دیا ہے، اور جسم کو خوشبُو سے مہکا دیا ہے۔ صحابۂ کرامؓ ان کا ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے کہ یہ وہ جنتی ہے جس نے اللہ کے لیے کوئی نماز نہیں پڑھی، لیکن سیدھا جنت میں پہنچا ہے۔[1]

شہداءِ کرامؓ کے مزارات پر حاضری کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا، اور کچھ دیر بعد تبوک اور شام جانے والی مرکزی شاہراہ پر پہنچ گئے۔ خیبر تک سڑک کے دونوں طرف پہاڑیوں اور ٹیلوں کے سلسلے نظر آتے رہے تھے، لیکن یہاں سے آگے بڑھے تو دونوں طرف لق و دق صحرا تھا، حدِ نظر تک نہ کوئی آبادی نظر آتی تھی نہ کوئی ٹیلہ، نہ درخت، نہ جھاڑی، نہ سبزہ، نہ پانی، بس چٹیل میدان تھا جس میں زندگی کے آثار دور دور نظر نہیں آتے تھے، یہ اسی انداز کا صحرا خیبر سے تبوک تک، بلکہ اس سے بھی آگے اردن کی سرحد کے کئی سو کیلو میٹر اندر تک اسی طرح چلا ہے، اور تقریباً آٹھ نو سو کیلو میٹر لمبا ہوگا۔ اسے "صحراء النفود" کہتے ہیں، اور اتنا طویل صحرا کار کے ذریعے میں نے پہلے کبھی قطع نہیں کیا۔

---

[1] عیون الاثر، لابن سید الناسؒ، ص ۱۸۴، ج ۲۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارا یہ سفر سردی کے خوشگوار موسم میں ہو رہا ہے۔ سفر کے لیے نئی نویلی آرام دہ اور ریفیف (ائیر کنڈیشنڈ) کار میسّر ہے، بحمدللہ زادِ راہ وافر ہے، شاندار پختہ سڑک ہے، اور مولوی عطاء الرحمن صاحب ۱۲۰ سے ۱۵۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار کو دوڑا رہے ہیں، پھر بھی کہیں ہلکا سا جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا، اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ اطمینانِ خاطر میسّر ہے کہ انشاء اللہ شام تک تبوک پہنچ جائیں گے۔

لیکن یہی لق و دق اور دل اُلٹ دینے والا صحرا تھا، شُنبلہ کی قیامت خیز گرمی تھی جس میں آسمان آگ برساتا اور زمین شعلے اگلتی ہے، نہ سڑک تھی، نہ کاریں، نہ گرمی سے بچنے کا کوئی اور انتظام۔ ایسی گرمی کے عالم میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جانثار صحابہؓ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر متواتر دو ہفتے سے زیادہ اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعے اس وحشت ناک صحرا کو قطع فرمایا تھا جہاں دور دور تک کسی جھاڑی کی کوئی پتی بھی نظر نہیں آتی۔ اور حضرتِ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تو اس غزوے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے لشکر کے نکل جانے کے بعد تن تنہا پیدل روانہ ہو گئے تھے۔

اللہ اکبر! آج ان حضرات کے عزم، حوصلے اور تن فراموشی کے تصور ہی سے پسینہ آتا ہے۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔

اس شاہراہ پر کچھ دیر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر ایک موڑ آیا، معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک سڑک مدائنِ صالح علیہ السلام کی طرف جا رہی ہے، اور وہ یہاں سے صرف چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی بستی تھی۔ جہاں قوم ثمود اپنے تعمیری عجائبات کے ساتھ آباد رہی ہے، اور پھر حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب اور متواتر نافرمانیوں کی پاداش میں اُن پر لرزہ خیز عذاب نازل ہوا۔ اُن کی بستی کے آثارِ قدیمہ اب تک یہاں نظر آتے ہیں، اور ہمارے رفقاء میں سے قاری بشیر احمد صاحب اور عطاء الرحمن صاحب انہیں دیکھ چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ پہاڑوں میں بنے ہوئے مکانات کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں، ایک خیال یہ تھا کہ یہ بستی بھی دیکھ کر جانی چاہیئے،

لیکن عذابِ الٰہی کی اس جگہ کو باقاعدہ مقصود بنا کر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ روایات میں پڑھا تھا کہ جب تبوک جاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بستی کے قریب سے گذرے تو آپؐ نے چہرے پر کپڑا ڈال لیا، ناقہ کو تیز فرما دیا، اور صحابہ کرامؓ کو تاکید فرمائی کہ کوئی شخص ان کے کسی مکان میں نہ داخل ہو، نہ یہاں کا پانی پیئے، نہ اس سے وضو کرے، اور جن حضرات نے غلطی یا لاعلمی سے پانی لے لیا تھا، یا اس سے آٹا گوندھ لیا تھا، ان کو حکم ہوا کہ وہ پانی گرا دیں اور وہ آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور وہاں سے سرنگوں ہوتے ہوئے گذر جائیں۔ (صحیح بخاری و فتح الباری ص ۲۶۹ ج ۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کے نزول کے مقامات سے بحالتِ استغفار گذرنا چاہیئے۔ خدا جانے ان مقامات میں روحانی طور پر کیسے زہریلے اثرات ہوتے ہوں گے جن سے بچانے کے لیے آپؐ نے اس طرزِ عمل کی تاکید فرمائی۔

تیماء میں:

بہرکیف، ہم اس معذب بستی کی طرف نہیں مڑے اور تبوک کی شاہراہ پر سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو ڈھائی بجے سہ پہر تک مسلسل سفر کرنے کے بعد تیماء شہر آیا، اور ہم نے یہاں رک کر نمازِ ظہر ادا کی اور ایک ترکی ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔

تیماء کا شہر بھی قدیم شہر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ یہاں بھی یہودی کافی تعداد میں آباد تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر اور وادی القریٰ فتح فرما لیا تو یہاں کے لوگوں نے خود آکر جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی، اور اس طرح یہ علاقہ بھی صلحاً آپؐ کے زیرِ نگیں آ گیا تھا۔ اور آپؐ نے حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو یہاں کا گورنر مقرر فرما دیا تھا[1]۔ عرب کا مشہور قبیلہ بنوطی

---

[1] عیون الاثر ص ۱۸۸، ج ۲۔

(حجر کے۔ انم طائی مشہور ہیں) تیما سے کچھ ہی فاصلے پر آباد تھا۔[1] یہاں مشہور یہودی سردار سموءل بن عادیا کا قلعہ بھی واقع تھا۔[2] جس کے اشعار دیوان حماسہ میں آئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی فتح کے بعد وہاں کے یہودیوں کی یہ درخواست قبول فرمالی تھی کہ خیبر کی زمینیں انہی یہودیوں کو بٹائی پر دے دی جائیں۔ چنانچہ وہاں کی زمینیں یہودی ہی کاشت کرتے رہے، اور آمدنی کا نصف حصّہ مسلمانوں کے پاس جاتا رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں بھی خیبر کے یہودیوں سے یہی معاملہ برقرار رہا۔ لیکن ان کی فطری شرارتیں مختلف اوقات میں اپنا رنگ دکھاتی رہیں، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے خیبر گئے تو یہاں کے یہودیوں نے اُن پر رات کے وقت حملہ کیا جس سے ان کے ہاتھ پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ان یہودیوں کے ساتھ بٹائی کا معاملہ ختم فرما کر ان کو خیبر سے نکال دیا، اُس وقت یہ لوگ تیما میں آکر آباد ہوئے۔[3]

تیما میں سردی خاصی شدید تھی، کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے عصر کا وقت قریب آگیا، چنانچہ عصر کی نماز یہیں کی ایک مسجد میں ادا کی، لیکن وضو کیا تو پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ ہاتھ پاؤں سُن ہونے لگے۔

نمازِ عصر کے بعد پھر سفر شروع ہوا، پھر وہی حدِ نظر تک پھیلا ہوا صحرا سامنے تھا، اب گاڑی مولوی امین اشرف سلمہٗ چلا رہے تھے، اور اس کوشش میں تھے کہ مغرب تک کسی طرح تبوک پہنچ جائیں، سڑک صاف تھی، اس لیے تیز رفتاری میں زیادہ دشواری بھی نہ تھی چنانچہ سورج غروب ہوتا دکھائی دیا تو ساتھ ہی شہرِ تبوک کے آثار نظر آنے لگے، اور بفضلہ تعالیٰ نمازِ مغرب ہم نے تبوک پہنچ کر ہی ادا کی۔

---

[1] فتح الباری ص ۲۴۰، ج ۵۔

[2] معجم البلدان للحموی ص ۶۷، ج ۲۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الشروط مع فتح الباری ص ۲۴۰، ج ۵۔

(۲)

تبوک میں ایک رات:

ہم مغرب کے وقت تبوک پہنچے تھے، اور وہ رات ہمیں تبوک ہی میں گذارنی تھی۔ ہمارے رفیقِ سفر جناب قاری بشیر احمد صاحب نے یہاں کے مرکزی بازار میں ایک صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ دن بھر کے سفر سے تھکن اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، لہٰذا ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں پہنچ کر بڑی راحت محسوس ہوئی، لیکن تصور یہ بندھا ہوا تھا کہ ہم اتنے آرام و راحت کے ساتھ شاندار کار میں صرف دن بھر کا سفر طے کر کے اتنے تھک گئے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء نے یہ لق و دق صحرا شدید گرمی کے موسم میں اُونٹوں پر طے فرمایا تھا۔

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

یہاں سردی مدینہ منورہ سے کافی زیادہ تھی۔ عشاء کے وقت گرم پانی سے وضو کر کے ہم اُس مقدس مسجد کی طرف روانہ ہوئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خیمہ گاہ پہ بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد ہوٹل سے کچھ فاصلے پر تھی، اس لیے کار میں جانا پڑا۔ نمازِ عشاء الحمدللہ اسی مسجد میں ادا کی۔ اس وقت تو مسجد بڑی طویل و عریض اور شاندار ہے، لیکن اس کے ہال کے بیچوں بیچ چھت میں ایک مربع نشان بنا ہُوا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ تبوک کے قیام کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمۂ مبارک اس جگہ پر نصب تھا۔

تبوک اِس وقت تو ایک جدید انداز کا شہر ہے، جو چھوٹا ہونے کے باوجود بڑا خوبصورت، بارونق اور جدید تمدنی سہولیات سے آراستہ ہے، لیکن عہدِ رسالت میں یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، اور یہاں پانی کا ایک چشمہ تبوک کہلاتا تھا، اسی کے نام پر بستی تبوک کے نام سے مشہور ہو گئی۔ غزوۂ تبوک کا سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام سفروں میں غالباً سب سے زیادہ پُرمشقت سفر تھا۔ اور اس کی وجہ یہ پیش آئی تھی کہ ۹ھ میں عرب کے

عیسائیوں نے روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس یہ لکھ بھیجا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا (معاذ اللہ) انتقال ہو گیا ہے، لوگ قحط زدہ ہیں اور بھوکوں مر رہے ہیں، لہٰذا عرب پر حملہ کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا۔ ہرقل نے یہ سنکر فوراً تیاری کا حکم دے دیا، اور چالیس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر جرار حملے کے لیے تیار ہو گیا۔[1]

دوسری طرف شام کے کچھ نبطی سوداگر زیتون فروخت کرنے کے لیے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے، انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ ہرقل نے آپ پر حملے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار کیا ہے جس کا ہراول دستہ بلقا تک پہنچ چکا ہے، اور ہرقل نے اپنی فوج کو سال کی تنخواہیں بھی تقسیم کر دی ہیں۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سُن کر بنفسِ نفیس تبوک تشریف لے جانے کا فیصلہ فرمایا، اور صحابۂ کرامؓ کو تیاری کا حکم دے دیا۔

وہ وقت صحابۂ کرام کے لیے شدید آزمائش کا وقت تھا، روم جیسی اُس دور کی سُپر پاور سے مقابلہ، صحرائے عرب میں گرمی کے شباب کا وہ زمانہ جس میں آسمان شعلے برساتا اور زمین آگ اُگلتی ہے۔ تقریباً آٹھ سو کیلو میٹر کا فاصلہ جو وحشت ناک صحراؤں سے گذرتا تھا، سواریوں کی قلت، معاشی خستہ حالی اور مدینہ منورہ میں کھجوریں پکنے کا موسم، گویا سال بھر کی سخت محنت کا پھل اسی زمانے میں کھجوروں کی شکل میں سامنے آنے والا تھا جس پر سال بھر کی معیشت کا دارومدار تھا، ایسی حالت میں مدینہ منورہ سے سفر اختیار کرنا مزید معاشی مشکلات کو دعوت دینے کے مرادف تھا۔

لیکن یہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے فدا کار صحابۂ کرامؓ ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ ان تمام مشکلات کو عبور کر کے اس صبر آزما سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات ظاہر ہوئے، بالآخر تبوک میں اسی جگہ قیام فرمایا جہاں آج یہ مسجد بنی ہوئی ہے۔

---

[1] مجمع الزوائد ص ۱۹۱، ج ۶۔ بحوالہ معجم طبرانی، و فتح الباری ص ۸۵، ج ۸۔

[2] طبقات ابن سعد ص ۱۱۹، ج ۲۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا، لیکن ہرقل کی طرف سے
دی مقابلہ پر نہیں آیا۔ بظاہر جنگ نہیں ہوئی، لیکن آپؐ کے اتنی قربانیاں دے کر یہاں
شریف لانے سے اسلامی فتوحات کے سلسلے میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ دشمنوں پر
سلمانوں کا رعب طاری ہوا، اور آس پاس کے قبائل خود حاضر ہو کر مطیع ہوئے، شام ہی
ے علاقوں جربا، اذرح اور ایلہ کے حکمرانوں نے خود آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر صلح
ل، اور جزیہ ادا کرنے پر راضی ہوئے۔ آپؐ نے انہیں صلحنامہ لکھ کر دیا۔

یہیں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو چار سو
سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل روانہ فرمایا۔ دومۃ الجندل بھی ہرقل کے زیرِ نگیں تھا، اور
س کا فرماں روا اکیدر شاہِ روم کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
ضرت خالدؓ کو بھیجتے وقت ان سے فرمایا تھا کہ جب تم دومۃ الجندل پہنچو گے تو اس کا
حاکم اکیدر تمہیں شکار کرتا ہوا ملے گا۔ تم اسے قتل کرنے کے بجائے گرفتار کر کے میرے
اس لے آنا۔ چنانچہ جب حضرت خالدؓ دومۃ الجندل کے قلعے کے قریب پہنچے تو اکیدر
رمیوں کی چاندنی رات میں قلعے کی فصیل پر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا گانا سن رہا تھا،
چانک اس نے دیکھا کہ ایک نیل گائے قلعہ کے پھاٹک سے ٹکرا رہی ہے، اکیدر فوراً
اپنے بھائی وغیرہ کے ہمراہ اس کے شکار کے لیے قلعے سے اترا، اور گھوڑے پر سوار ہو کر
اس کے پیچھے دوڑا۔ ادھر سے حضرت خالد بن ولیدؓ آ پہنچے، اکیدر کا بھائی حسان مارا گیا،
اور حضرت خالدؓ اکیدر کو گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اکیدر
نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار
سو نیزے دینے کا معاہدہ کر کے صلح کی[1] اور جزیہ ادا کر کے اسلامی ریاست کے
تابع بننا منظور کیا۔

تبوک کی اس مسجد میں جسے وہاں مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے۔ پہنچنے

---

[1] عیون الاثر، لابن سید الناس، ص ۲۸۲ و ۲۸۳

کے بعد غزوۂ تبوک کے یہ تمام واقعات بزمِ خیال پر چھائے رہے، اور ان کے تصور سے ایک عجیب کیف و سرُور محسوس ہوتا رہا۔ اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا و مولانا مُحمّد النبی الأمی وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ و بارك وسلّم۔

نمازِ عشاء کے بعد ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، تبوک سے کچھ فاصلے پر سعودی فوج کی چھاؤنی ہے، اور پاکستانی فوج کی ایک خاصی تعداد وہاں مدت سے مقیم ہے، اس لیے تبوک میں پاکستانیوں کی آمد و رفت کافی رہتی ہے۔ چنانچہ یہاں پاکستانی ریسٹورنٹ بھی کافی ہیں۔ اس ریسٹورنٹ کے مالک بھی پاکستانی تھے اور ہمارے رفیقِ سفر قاری بشیر احمد صاحب کے دوست۔ رات کا کھانا انہی کی طرف سے تھا، اور انہوں نے بڑی محبت سے خاص پاکستانی کھانے تیار کرائے تھے، جو دن بھر کی تھکن کے بعد بڑی رغبت سے کھائے گئے۔

کھانے کے بعد مختصر سی چہل قدمی کر کے ہم لوگ جلد ہی سو گئے۔

اگلی صبح (۲ جنوری ۱۹۸۶ء) فجر پڑھتے ہی ہم نے مختصر سا ناشتہ کیا اور اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہاں سے اُردن کی سرحد تقریباً سو کیلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ مولوی عطاء الرحمٰن صاحب نے اپنی تازہ دم ڈرائیونگ کے ذریعے یہ فاصلہ بہت جلد طے کر لیا۔ اس سمت میں سعودی عرب کی سرحدی بستی حالۃ عمارۃ تھی۔ وہاں کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کی چوکیاں بنی ہوئی ہیں، صبح سویرے یہاں ہجوم زیادہ نہ تھا، اس لیے یہ مراحل جلد ہی طے ہو گئے۔ دوبارہ گاڑی میں سوار ہوئے تو چند لمحوں میں ہم سعودی عرب سے نکل کر اُردن کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے، اردن کی سرحدی چوکی مدوّرہ پر دوبارہ کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کے مراحل سے گذرنا پڑا، یہاں قدرے دیر لگی۔ اور جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تو دس بج چکے تھے۔

چند گز کا فاصلہ طے کرتے یہ دُنیا بدلی ہوئی تھی، لوگوں کا لباس، طرزِ گفتگو، سڑکوں اور عمارتوں کا انداز، غرض ہر چیز میں فرق نمایاں تھا۔ مدینہ منورہ سے حالۃ عمارۃ تک کی سڑک اگرچہ چوڑی زیادہ نہیں تھی، لیکن نہایت ہموار اور شاندار تھی جس پر گاڑی تیرتی

پہ چلی آئی لیکن اردن میں داخل ہونے کے بعد سڑک کی حالت خستہ تھی، اس لیے سفر کی رفتار بھی سست ہوگئی، اور سفر نسبتاً پُرمشقت بھی ہوگیا۔ جگہ جگہ سڑک کی مرمّت ہو رہی تھی۔ اس لیے بار بار نیم پختہ راستوں پر اُترنا پڑتا تھا۔ سرحد سے عمان تقریباً دو سو کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اور یہ سارا راستہ خشک صحراؤں اور چٹانوں سے بھرپور رہے۔ کچھ دُور جانے کے بعد ایسی پہاڑیاں نظر آنے لگتی ہیں جن سے فاسفورس یا سفید پتھر نکل رہا ہے، لیکن اس راستے پر سبزہ نام کو بھی نظر نہیں آتا۔ تقریباً تین گھنٹے اسی سڑک پر سفر جاری رہا، راستے میں چھوٹی چھوٹی بستیاں اور شہر گذرتے رہے۔ بالآخر تقریباً ایک بجے اردن کے دارالحکومت عمّان کے آثار نظر آنے شروع ہوئے۔

عمّان میں :

عمّان میں داخل ہو کر راستوں کا تو کچھ علم نہ تھا، بعض راہ گیروں سے پوچھ پوچھ کر ایک ہوٹل میں پہنچے، اور وہیں قیام کیا۔ سردیوں کا چھوٹا دن تھا، نمازِ ظہر اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تو عصر ہو چلی تھی۔ نمازِ عصر کے بعد یہاں کے ایک مشہور کتب خانے "دارالبشیر" جانے کا خیال تھا، وہاں سے بعض احباب کا پتہ بھی معلوم کرنا تھا، پیچھے اُتر کر پتے پوچھتے پوچھتے "دارالبشیر" پہنچ گئے۔ یہ کتب خانہ عمّان کے ایک بارونق علاقے "عبدلی" میں واقع ہے، اور عربی کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا بڑا عظیم الشان مرکز ہے۔ یہاں سے شام کے ایک عالم شیخ وہبی سلیمان کا پتہ بھی معلوم ہوا۔ کتب خانے سے ایک صاحب رہنمائی کے لیے ساتھ ہوگئے، اور انہوں نے شیخ وہبی سلیمان تک پہنچا دیا۔ ان سے تقریباً نصف گھنٹہ ملاقات رہی، اور بعض امور پر تبادلۂ خیال ہوا۔

یہاں سے ہم ہوٹل واپس آگئے۔ اردن میں پاکستان کے سفیر اُس وقت ڈاکٹر احسان رشید صاحب تھے، جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، عصر کے وقت ان سے فون پر بات ہوئی تھی، اور اُن کی خواہش پر رات کا کھانا ان کے یہاں طے ہوگیا تھا چنانچہ انہوں نے ۷½ بجے گاڑی بھیج دی، اور ہم آٹھ بجے کے قریب ان کے گھر پہنچ گئے۔ کھانے

کے بعد رات گئے تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ اردن کے بہت سے حالات معلوم ہوئے اور رات گیارہ بجے کے قریب ہوٹل واپسی ہوئی۔

اگلا دن جمعہ تھا، اور ہم چاہتے تھے کہ اس دن ہم عمّان اور اس کے مضافات کے خاص خاص مقامات کی زیارت کریں۔ سفیر پاکستان ڈاکٹر احسان رشید صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں کہ انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری ملک افضل صاحب کو رہنمائی کے لیے ہمارے ساتھ کر دیا، چنانچہ وہ صبح سویرے ہمارے پاس پہنچ گئے۔

رومی اسٹیڈیم

ہوٹل سے نیچے اُترے تو میرے بھانجے مولوی امین اشرف سلمہٗ نے توجہ دلائی کہ ہوٹل کے بالکل برابر میں ایک قدیم اسٹیڈیم بنا ہوا ہے، قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ یہ عہدِ رسالت سے بھی پرانی عمارت کا کھنڈر ہے جو ٹھیک اسی طرز پر بنی ہوئی ہے جیسے آجکل کھیلوں کے اسٹیڈیم بنائے جاتے ہیں۔ ملک افضل صاحب نے بتایا کہ یہ رومی دور کا بنا ہوا اسٹیڈیم ہے جو اُس وقت کے مشہور اولمپک کھیلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسٹیڈیم بنانے کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا ہے۔ درحقیقت "اسٹیڈیم" ایک یونانی لفظ کی لاطینی ترمیم ہے۔ لاطینی زبان میں اسٹیڈ (STADE) ایک مسافت کا پیمانہ تھا جو تقریباً ۶۰۰ فیٹ کے برابر ہوتی تھی۔ اُس دور میں پیدل دوڑ کے جو مقابلے ہوتے تھے اس کے لیے یہ معیاری مسافت سمجھی جاتی تھی، اور چونکہ دوڑ کے لیے جو میدان بنایا جاتا تھا، وہ ایک اسٹیڈ کی مسافت کا ہوتا تھا، اس لیے اس کا نام "اسٹیڈیم" (STADIUM) رکھا گیا۔ شروع میں یہ نام صرف دوڑ کے میدان کے لیے استعمال ہوا۔ لیکن اس دور میں چونکہ دوسرے کھیلوں کے بھی مقابلے ہوتے تھے، اس لیے بعد میں توسّعاً ہر قسم کے کھیلوں کے "اسٹیڈیم" کہا جانے لگا۔[1] اور اس کے ساتھ تماشائیوں کی سہولت کے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ص ۲۷۲، ج ۲۱، مقالہ "STADIUM"

لیے سیڑھیوں کے انداز کی نشیبی نشستیں بھی بنائی جانے لگیں۔

یہ اسٹیڈیم جو ہمارے سامنے تھا، اسی انداز پر بنا ہوا تھا، اس میں بنی ہوئی نشیبی نشستیں اب تک باقی ہیں، اور شاہی خاندان کے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے الگ نشستوں کا بھی انتظام ہے۔ اگرچہ عمارت اب ویران پڑی ہے، اور اسے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے محض سیاحوں کی دلچسپی کے لیے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ ویران کھنڈر بھی رومی دور کے عیش و عشرت کی داستان سناتے ہیں، اور دیدۂ عبرت ہو تو اس کی ایک ایک اینٹ پر "کل من علیھا فان" کی ناقابلِ انکار حقیقت کندہ نظر آتی ہے۔ نہ جانے شان و شوکت کے کتنے مجسمے یہاں کتنی مدت تک دادِ عیش دیتے رہے، لیکن عیش و تنعم کی وہ ساعتیں کتنی مختصر تھیں، اور ان کے مقابلے میں فنا و عدم کا زمانہ جو اب تک گذرا ہے وہ کتنا طویل ہے، اور آگے بھی اس کی کوئی انتہا نہیں ؎

بس نامور کہ زیرِ زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بروئے زمیں بر نشاں نماند
خبرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

یہاں سے ہم ملک افضل صاحب کی رہنمائی میں روانہ ہوئے، ذہن میں پروگرام یہ تھا کہ عمّان کے مضافات میں بعض انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بستیاں اور ان کے مزارات ہیں، نیز متعدد تاریخی مقامات واقع ہیں، ان کی زیارت کریں گے۔

گاڑی عمّان کی مختلف خوبصورت سڑکوں سے گذرتی رہی۔ عمّان اردن کا دارالحکومت ہے، اور ایک درجن سے زائد پہاڑوں پر اور ان کے دامن میں واقع ہے۔ ان میں سے سات پہاڑ زیادہ بڑے اور نمایاں ہیں، اور شہر کو سات بڑے محلّوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہاڑوں اور ان کی وادیوں میں آباد ہونے کی بنا پر شہر میں نشیب و فراز بہت زیادہ ہیں، اور ان کی بنا پر شہر میں ایک منفرد حسن پیدا ہو گیا ہے۔ شہر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شہر کی تقریباً تمام عمارتیں ایک ہی رنگ کے پتھر کی بنی ہوئی ہیں یہ ایک ہلکا سرمئی

ماٹل سفید پتھر ہے جو اردن ہی سے نکلتا ہے اور بیشتر تعمیرات میں وہی استعمال ہوتا ہے، اس طرح شہر کی عمارتوں میں ایک دلآویز یک رنگی نظر آتی ہے۔

عمّان ہزاروں سال پرانا شہر ہے، کہتے ہیں کہ اس کی تاریخ حضرت لوط علیہ السلام کے زمانے تک پہنچتی ہے، اور اس وقت سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ جس علاقے میں عمّان آباد ہے۔ اُسے بلقا کہا جاتا تھا، یہ رُومی سلطنت کا ایک ڈویژن جیسا تھا جس کا صدر مقام عمّان تھا۔ اسی لیے اُسے "عمّان البلقاء" بھی کہا جاتا ہے، اور حدیث میں اس شہر کا یہی نام آیا ہے۔ کتابوں میں پڑھا تھا کہ عمّان بڑا سرسبز و شاداب شہر ہے، لیکن اس وقت شہر کو تو زیادہ سرسبز نہیں پایا، البتہ اس کے مضافاتی علاقے کافی زرخیز اور شاداب ہیں۔

حضرت یوشع علیہ السلام کے مزار پر:

عمّان شہر سے نکلنے کے بعد ہم سب سے پہلے ایک انتہائی خوبصورت وادی سے گزرتے ہوئے ایک پہاڑی چوٹی پر پہنچے جو اس علاقے میں سب سے بلند چوٹی نظر آتی تھی، اور وہاں سے دور تک پھیلی ہوئی سرسبز وادیاں بڑی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پہاڑ کے ایک کنارے پر ایک مسجد بنی ہوئی تھی، ملک افضل صاحب نے بتایا کہ حضرت یوشع علیہ السلام کا مزار اسی مسجد کے ایک کمرے میں واقع ہے۔ ہم مسجد میں داخل ہوئے تو اس نے ایک کمرے میں ایک نہایت طویل قبر بنی ہوئی تھی، اس کی لمبائی بارہ سے پندرہ گز کے درمیان ہوگی۔ اسی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت یوشع علیہ السلام کا مزار مبارک ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم خاص تھے، ان کا اسم گرامی تو اگرچہ قرآن کریم میں مذکور نہیں ہے، لیکن ان کا نام لیے بغیر ان کے متعدد واقعات قرآن کریم میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے پر آمادہ کرنا چاہا، اور پوری قوم نے انتہائی سرکشی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت کو رد کر دیا تو حضرت یوشع علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو ہمت

دلانے کی کوشش کی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا جو واقعہ سورۂ کہف میں بیان ہوا ہے اس میں جو نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ایک صحیح حدیث کے مطابق یہی حضرت یوشع علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کو نبوت عطا فرمائی گئی، اور بنی اسرائیل کی سربراہی بھی انہی کو عطا ہوئی، اور فلسطین کے عمالقہ سے جہاد کا جو مشن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارک میں تشنۂ تکمیل رہ گیا تھا وہ آپ ہی کے ہاتھوں پورا ہوا۔ آپ نے بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین پر قابض جابر و ظالم قوم عمالقہ سے جہاد کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطا فرمائی، اور آپ پوری ارضِ مقدس پر قابض ہو گئے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

اب اس بات کی سو فیصد تحقیق تو قریب قریب ناممکن ہے کہ یہ واقعۃً حضرت یوشع علیہ السلام کی قبر ہے یا نہیں، البتہ یہ تمام علاقہ اسی ارض مقدس کا حصہ ہے جسے حضرت یوشع علیہ السلام نے فتح فرمایا تھا۔ اس لیے یہ بات جو یہاں کے لوگوں میں مشہور چلی آتی ہے کچھ بعید بھی نہیں۔ قبر کی غیر معمولی لمبائی ہمارے لیے حیران کن تھی، لیکن بعد میں اُردن اور شام کے اندر جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مزارات دیکھے، وہاں بھی یہی صورت نظر آئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں کسی مقدس شخصیت کی تعظیم کے خیال سے اس کی قبر بہت لمبی بنائی جاتی تھی۔ واللہ اعلم۔

بہر صورت! ایک جلیل القدر پیغمبر کے مزار پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، احقر کے لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کے بعد کسی پیغمبر کے مزار پر حاضری کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

مسجد سے باہر نکلے تو سردی ناقابلِ برداشت حد تک شدید تھی۔ زبردست برفانی ہوائیں چل رہی تھیں، اور عجب نہیں کہ یہاں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد تک پہنچا ہوا ہو۔ اس لیے باہر زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہ تھا، ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گئے۔

وادیٔ شعیبؑ میں:

یہاں سے نکل کر ہماری اگلی منزل وادیٔ شعیبؑ تھی، یہ ایک انتہائی خوبصورت وادی ہے، یہاں تک پہنچنے کے لیے کئی پہاڑی راستے طے کرنے پڑتے ہیں، سڑک ایک سرسبز پہاڑ کا طواف کرتی ہوئی چوٹی تک پہنچتی ہے، اس سڑک کے دونوں طرف انجیر اور زیتون کے خوشنما درختوں کی قطاریں سڑک پر سایہ کئے ہوئے ہیں، اور دھوپ چھن چھن کر سڑک تک پہنچتی ہے۔ بالکل اُوپر پہنچنے کے بعد یہ وادی شروع ہوتی ہے۔ اسی وادی میں حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار ہے۔

جس جگہ یہ مزارِ مبارک واقع ہے، وہ آجکل ایک فوجی مرکز کے طور پر استعمال ہو رہا ہے، اور ممنوعہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن ملک افضل صاحب خصوصی طور پر اجازت لے کر ہمیں اندر لے گئے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہم دائیں جانب مڑے تو ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی اس مسجد کے اندر حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار ہے۔ یہاں حاضر ہو کر سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ قبر کی لمبائی یہاں بھی حضرت یوشع علیہ السلام کے مزار کی طرح غیر معمولی تھی۔

حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خُسر تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے مصر سے روپوش ہو کر آپؑ ہی کے گھر میں پناہ لی تھی، اور آپؑ کی صاحبزادی سے نکاح کیا تھا جس کا مفصّل واقعہ قرآن کریم نے سورۃ القصص میں بیان فرمایا ہے

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اُسے قرآن کریم میں کہیں "مدین" اور کہیں "اصحاب الأیکۃ" کہا گیا ہے، بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ قومیں تھیں، اور آپؑ پہلے مدین اور پھر اصحاب الأیکہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہی ہے اور ان کا رجحان اس طرف ہے کہ مدین اردن کی حدود میں واقع ہے، اور ایکہ تبوک کا دُوسرا نام ہے[1]۔ اور بعض مفسرین کا کہنا یہ

---

[1] ارض القرآن ص ۲۶۶، ج ۲۔

ہے کہ یہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں، مدین اس قوم کا نسبی نام ہے، کیونکہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک صاحبزادے تھے، اور یہ قوم انہی کی نسل سے تھی اور اصحاب الایکہ (بن والے) ان کا جغرافیائی نام تھا۔ یہ لوگ جس جگہ آباد تھے، وہاں نہایت گھنا جنگل تھا اسی لیے ان کو "اصحاب الایکہ" کہتے تھے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان اسی طرف ہے[1]

حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف اس مزار کی نسبت کس حد تک درست ہے؟ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یمن کے شہر حضرموت کے قریب شبام کے مقام پر بھی ایک قبر حضرت شعیب علیہ السلام سے منسوب بتائی جاتی ہے، لیکن عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں اس نسبت کو مشتبہ قرار دیا ہے[2]

قیاس کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر یمن میں نہیں اردن یا شام کے کسی علاقے میں ہونی چاہیے، کیونکہ مدین اور ایکہ خواہ ایک ہی جگہ کے دو نام ہوں، یا الگ الگ مقامات ہوں، بہرصورت! ان کا محل وقوع عرب کے شمال مغربی حصے اور اردن و فلسطین کے درمیان ہی بتایا گیا ہے۔ لہٰذا یمن کا ان علاقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں مقامی طور پر مشہور یہ ہے کہ جس جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار واقع ہے، یہ مدین ہی کا علاقہ ہے، بلکہ جب ہم حضرت شعیب علیہ السلام کے مزار سے باہر نکلے تو ہمیں افضل ملک صاحب نے ایک چھوٹا سا کنواں دکھایا جو منّ کے بغیر تھا، اور اس پر ایک لوہے کا ڈھکن اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ وہ اوپر سے ایک گڑھا معلوم ہوتا تھا، ملک صاحب نے بتایا کہ یہاں مشہور یہ ہے کہ یہ مدین کا وہی کنواں ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں "وَ لَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْیَنَ" کے نام سے آیا ہے، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تھے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں پانی بھرنا چاہ رہی تھیں اور ہجوم کی وجہ سے بھر نہیں

---

[1] قصص القرآن ص ۳۴۵، ج ۱۔

[2] قصص الانبیاء، عبدالوہاب النجار۔

سکتی تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو پانی بھر کر دیا، اور یہیں سے حضرت شعیب علیہ السلام کے خاندان کے ساتھ ان کے تعارف کی ابتدا ہوئی۔

کیا یہ کنواں واقعی وہی کنواں ہے؟ اس کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کا کوئی راستہ نہیں، لیکن قرآن سے یہ بات کافی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے انداز سے مترشح یہ ہوتا ہے کہ وہ کنواں حضرت شعیب علیہ السلام کی رہائش گاہ سے قابلِ ذکر فاصلے پر واقع تھا، مگر یہ کنواں حضرت شعیب علیہ السلام کے مزار سے تقریباً پچیس تیس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہاں اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ آپ کا مزار آپ کی اس رہائش گاہ میں نہ ہو جس میں آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مقیم تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

بہرکیف! ہم نیازمندوں کے لیے یہ محتمل نسبت بھی کیا کم تھی؟ یہ پوری سرزمین انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے، اور یہاں پہنچ کر دیدہ و دل کو حاصل ہونے والا کیف و سُرور لفظ و بیان کی حدود سے ماورا تھا، اور دل کا تقاضا یہ کہ ؏

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

اغوار میں:

اردن کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ اس کے مغرب میں فلسطین اور بیت المقدس واقع ہیں جو آجکل ہماری شامتِ اعمال سے اسرائیل کے قبضے میں ہیں، اور دریائے اردن کے مغربی کنارے کے پیچھے تمام تر پہاڑی علاقہ ہے، دوسری طرف مشرق میں بھی پہاڑی علاقے ہیں، ان دونوں پہاڑی علاقوں کے درمیان ایک درمیانی علاقہ شمالاً جنوباً چلا گیا ہے۔ جو دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر واقع ہے اور بڑا زرخیز علاقہ ہے، اس علاقے کو اغوار (نشیبی علاقہ) کہا جاتا ہے، اور یہاں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مزارات اور تاریخی مقامات واقع ہیں۔

وادیٔ شعیب علیہ السلام سے نکل کر ہم اغوار کی طرف روانہ ہوئے اور سب سے پہلے اس علاقے کے ایک چھوٹے شہر "الشونۃ الجنوبیۃ" پہنچے، یہاں سے ایک سیدھی سڑک

شمال کی طرف گئی ہے جس کے دائیں طرف (مشرق میں) چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے، اور بائیں طرف (مغرب میں) چند کیلومیٹر تک میدانی علاقہ ہے، جس میں دُور تک کھیتوں اور باغات کے سلسلے نظر آتے ہیں، ان کھیتوں اور باغات کی انتہا دریائے اردن پر ہوتی ہے، جس کے مغربی سرے پر فلسطین اور نابلس کے سربفلک پہاڑ نظر آتے رہتے ہیں جو اس وقت اسرائیل کے قبضے میں ہیں۔

ہم الشّرقة الجنوبیة سے ذرا آگے بڑھے تو ایک چھوٹی سی بستی کے کنارے ایک چھوٹی سی خستہ حال مسجد نظر آئی جس کے مینار پر گولیوں کے نشانات ہیں، معلوم ہُوا کہ یہ وہ مقام ہے کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیلی فوجیں یہاں تک گھس آئی تھیں، اس علاقے کو اسرائیلی تسلّط سے آزاد کرانے کے لیے اردن کی افواج نے جان کی بازی لگادی تھی، اور بالآخر بہت سے جانبازوں نے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر کے اسے اسرائیل سے آزاد کرا لیا، اور اسرائیلی فوجیں دریائے اردن کے اُس پار پسپا ہوگئیں۔

جمعہ کا دن تھا، اور ہم جمُعہ کی نماز "مسجد ابو عبیدہؓ" میں پڑھنا چاہتے تھے جس میں حضرت ابو عبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کا مزار واقع ہے، اس لیے تیزی سے سفر کرتے ہوئے ہم تقریباً پونے بارہ بجے دوپہر "مسجد ابو عبیدہؓ" پہنچ گئے۔

---

(۳)

نمازِ جمعہ ہم نے اسی مسجد میں ادا کی جو "مسجد ابی عبیدة بن الجرّاحؓ" کے نام سے مشہور ہے، اور جس کے ایک حصّے میں امینِ اُمّت حضرت ابو عبیدہ ابن الجرّاح رضی اللہ عنہ آرام فرما ہیں۔

یہ مسجد کافی کشادہ ہے، اور خطبۂ جمعہ میں نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ مسجد بھر گئی، امام صاحب خطبے میں جہاد کے فضائل اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی پستی کے

اسباب بڑے مؤثر انداز میں بیان فرما رہے تھے، لیکن نماز کا جو وقت مقرر تھا، اسی پر خطبہ ختم کر کے نماز شروع کر دی۔

نماز کے بعد مسجد کے اندرونی حصے میں دائیں جانب حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری کی سعادت ملی۔ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جاں نثار صحابیؓ کے مزار پر حاضری کے وقت دل کی جو کیفیت تھی وہ ناقابلِ بیان ہے، عہدِ رسالت اور اس کے بعد کے کتنے واقعات ذہن کے دریچوں کو روشن کر رہے تھے۔ ایک انمول تاریخ تھی جس کے اوراق چند لمحوں میں نگاہوں کے سامنے اُلٹتے چلے گئے، اور دل میں عقیدت و محبت کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔

حضرت ابُوعُبیدہ ابنِ جراحؓ:

حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن جلیل القدر صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں جن کی ذاتِ گرامی اُس دور کے تمام اعلیٰ فضائل و مناقب کا مجموعہ تھی۔ آپ سابقینِ اوّلین میں سے ہیں، اور اس وقت اسلام لے آئے تھے جب مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ آپ اُن دس خوش نصیب صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں جن کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے، اور جن کو خود سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت دی تھی۔ آپ کا شمار اُن صحابۂ کرامؓ میں بھی ہے جنہیں دو مرتبہ ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی، پہلی بار آپؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور دوسری بار مدینہ منورہ کی طرف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپؓ کے غزوات میں ہمیشہ نہ صرف شامل رہے، بلکہ ہر موقع پر اپنی جانبازی، عشقِ رسولؐ اور اطاعت و اتباع کے انمٹ نقش قائم فرمائے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر ان کے والد کفارِ مکہ کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے، اور جنگ کے دوران اپنے بیٹے (حضرت ابو عبیدہؓ) کو نہ صرف تلاش کرتے تھے

بلکہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اُن سے آمنا سامنا ہو جائے، حضرت ابو عبیدہؓ اگرچہ اپنے والد کے کفر سے بیزار تھے، لیکن یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اُن پر اپنے ہاتھ سے تلوار اٹھانی پڑے، اس لیے جب کبھی وہ سامنے آکر مقابلہ کرنا چاہتے تو یہ کترا جاتے لیکن باپ نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا، اور بالآخر انہیں مقابلہ کرنا ہی پڑا، اور جب مقابلہ سر پر آ ہی گیا تو اللہ تعالیٰ سے جو رشتہ قائم تھا، اس کی راہ میں حائل ہونے والا ہر رشتہ ٹوٹ چکا تھا، باپ بیٹے کے درمیان تلوار چلی، اور ایمان کفر پر غالب آگیا۔ باپ بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔[1]

غزوۂ اُحد کے موقع پر جب کفار کے ناگہانی حملے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مغفر کے دو حلقے آپؐ کے رخسار مبارک میں اندر گھس گئے تو حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا۔ یہاں تک کہ اس کشمکش میں حضرت ابو عبیدہؓ کے سامنے کے دو دانت گر گئے۔ دانت گر جانے سے چہرے کی خوشنمائی میں فرق آجانا چاہیے تھا، لیکن دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کے دانتوں کے گرنے سے حضرت ابو عبیدہؓ کے حسن میں کمی آنے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ کوئی شخص جس کے سامنے کے دانت گرے ہوئے ہوں حضرت ابو عبیدہؓ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا گیا۔[2]

جب یمن کے لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے اپنے درمیان کوئی معلّم بھیجنے کی درخواست کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "ھذا امین ھذہ الأمۃ" (یہ اس اُمت کے امین ہیں)[3] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تو صحیحین میں مروی ہے کہ:

---

[1] الاصابہ للحافظ ابن حجرؒ ص ۲۴۴، ج ۲

[2] مستدرک الحاکم ص ۲۶۶، ج ۳ و طبقات ابن سعد ص ۲۹۸، ج ۳،

[3] الاصابہ ص ۲۴۳، ج ۲، بحوالہ مسند احمد

لكلّ أمّة أمين، و أمين هذه الامة أبو عبيدة ابن الجراح

"ہر امّت کا ایک امین ہوتا ہے، اور اس امّت کے امین ابو عبیدہ ابن جراح ہیں۔"

حضرت عائشہ رضؓ سے پوچھا گیا کہ "آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے صحابہؓ میں سب سے زیادہ محبوب کون تھے؟" حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ "ابوبکرؓ"، پوچھا گیا کہ "ان کے بعد کون؟" فرمایا: "عمرؓ"، پھر پوچھا گیا کہ "ان کے بعد کون؟" اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "ابو عبیدہ ابن جراحؓ"۔[1]

حضرت حسن بصریؒ (مرسلاً روایت) فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابۂ کرامؓ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

مامنكم من أحد إلا لو شئت لأخذت عليه بعض خلقه، إلا أبا عبيدة،

تم میں سے ہر شخص ایسا ہے کہ میں چاہوں تو اس کے اخلاق میں کسی نہ کسی بات کو میں قابلِ اعتراض قرار دے سکتا ہوں سوائے ابو عبیدہؓ کے۔[2]

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے بعد جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں صحابۂ کرامؓ کا اجتماع ہوا اور خلافت کی بات چلی تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے دو نام پیش فرمائے، ایک حضرت عمرؓ کا اور دوسرے حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کا، لیکن حضرت صدیق اکبرؓ کی موجودگی میں کسی اور پر اتفاق ہونے کا سوال ہی نہ تھا، مسلمان آپ ہی پر متفق ہوئے، لیکن اس موقع پر حضرت ابو عبیدہؓ کا نام صدیق اکبرؓ کی طرف سے پیش ہونا واضح کرتا ہے کہ جلیل القدر صحابۂ کرامؓ کی نگاہ میں آپ کا مقام کیا تھا؟

حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں شام کی مہمات حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ ہی کے سپرد فرمائی تھیں، چنانچہ اردن اور شام کا بیشتر علاقہ آپ ہی کے مبارک

---

[1] جامع الترمذی، ابواب المناقب، حدیث نمبر ۳۶۵ و سنن ابن ماجہ، مقدمہ، حدیث نمبر ۱۰۲

[2] مستدرک الحاکم ص ۲۶۶، ج ۳، و الاصابہ للحافظ ص ۲۴۴، ج ۲،

ہاتھوں پر فتح ہوا۔ بیچ میں جب غزوۂ یرموک کے موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو عراق سے شام بھیجا تو اس وقت حضرت خالدؓ کو شام کی مہمات کا امیر بنا دیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت کے آغاز ہی میں حضرت خالدؓ کو امارت سے معزول کر کے آپ کو امیر بنا دیا، اور پھر سارا شام آپ کی سرکردگی میں فتح ہوا، اور حضرت خالدؓ آپ کی ماتحتی میں شریکِ جہاد رہے[1]۔ اور آپ نے حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے گورنر کے فرائض انجام دیئے۔

شام کا خطہ اپنی زرخیزی، آب و ہوا، اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے عرب کے صحرا نشینوں کے لیے ایک جنتِ ارضی سے کم نہ تھا، دوسری طرف یہاں اس وقت کے لحاظ سے انتہائی متمدن تہذیب یعنی رومی تہذیب کا دور دورہ تھا، لیکن ان صحابۂ کرامؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے جو اَنمٹ رنگ اپنے قلب و دماغ پر چڑھا لیا تھا، اس میں وہ اس قدر پختہ تھے کہ شام کی رنگینیاں اُن کے زہد و قناعت، دُنیا بیزاری اور آخرت کی ہمہ وقتی فکر پر ذرہ برابر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس بات کا اندازہ حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کے ایک واقعے سے ہوگا۔

جب حضرت ابوعبیدہؓ شام کے گورنر تھے، تو اسی زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لائے، ایک دن حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ "مجھے اپنے گھر لے چلیے"[2]۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے جواب دیا: "آپ میرے گھر میں کیا کریں گے؟ وہاں آپ کو شاید میری حالت پر آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو؟"

لیکن جب حضرت عمرؓ نے اصرار فرمایا تو حضرت عمرؓ کو اپنے گھر لے گئے۔ حضرت عمرؓ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۹۴، ج ۷۔

[2] حضرت عمرؓ کو یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کہیں ان کے گورنر بیرونی تہذیبوں سے متاثر ہو کر زیادہ عیش و عشرت میں نہ پڑ گئے ہوں، اس لیے شاید حضرت ابوعبیدہؓ کا گھر دیکھنے کے پیچھے یہی فکر کارفرما ہو۔

گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی سامان ہی نظر نہ آیا۔ گھر ہر قسم کے سامان سے خالی تھا۔ حضرت عمرؓ نے حیران ہو کر پوچھا:

"آپ کا سامان کہاں ہے؟ یہاں تو بس ایک نمدہ، ایک پیالہ، ایک مشکیزہ نظر آرہا ہے۔ آپ امیرِ شام ہیں، آپ کے پاس کھانے کی بھی کوئی چیز ہے؟"

یہ سنکر حضرت ابو عبیدہؓ ایک طاق کی طرف بڑھے، اور وہاں سے روٹی کے کچھ ٹکڑے اُٹھا لائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا تو رو پڑے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا:

"امیر المؤمنین! میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ میری حالت پہ آنکھیں نچوڑیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کے لیے اتنا اثاثہ کافی ہے جو اُسے اپنی خوابگاہ (قبر) تک پہنچا دے۔"[1]

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ابو عبیدہؓ! دُنیا نے ہم سب کو بدل دیا، مگر تمہیں نہیں بدل سکی۔"

اللہ اکبر! وہ ابو عبیدہؓ جس کے نام سے قیصرِ روم کی عظیم طاقت لرزہ براندام تھی، جس کے ہاتھوں روم کے عظیم الشان قلعے فتح ہو رہے تھے، اور جس کے قدموں پر روزانہ رومی مال و دولت کے خزانے ڈھیر ہوتے تھے، وہ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں پر زندگی بسر کر رہا تھا ــــ دُنیا کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر اُسے تا ذلیل و رُسوا کسی نے کیا تو وُہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی جاں نثار تھے۔ ؎

شانِ آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی

حضرت ابو عبیدہؓ اُن خوش نصیب حضرات میں سے تھے جو نبیِ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مُبارک سے اپنے جنت میں جانے کی بشارت سُن چکے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی خبر پر ادنیٰ تردد کا بھی ان کے یہاں کوئی سوال نہ تھا۔

---

[1] سیر اعلام النبلاء للذہبیؒ ص ۷، ج ۱۔ بحوالہ سنن ابی داؤد بروایۃ ابن الاعرابی اس واقعے کا اختصار امام ابو نعیمؒ کی حلیۃ الاولیاء ص ۱۰۱ و ۱۰۲، ج ۱، مصنف عبدالرزاق (حدیث نمبر ۲۰۶۲۸) اور امام احمدؒ کی کتاب الزھد ص ۱۸۴ میں بھی مروی ہے۔

ں کے باوجود خشیتِ الٰہی کا عالم یہ تھا کہ بعض اوقات فرماتے تھے کہ :۔

ودِدتُ انّی کنت کبشا، فیذبحنی اھلی، فیاکلون لحمی، ویحسون مرقی۔[1]

"کاش کہ میں ایک مینڈھا ہوتا، میرے گھر والے مجھے ذبح کرکے میرا گوشت کھاتے اور میرا شوربا پیتے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اتنے قدردان تھے کہ ایک مرتبہ جب اپنے بعد لیفہ کے تقرر کا سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ "اگر ابوعبیدہؓ کی زندگی میں میرا وقت آگیا تو ھے کسی سے مشورے کی بھی ضرورت نہیں، میں ان کو اپنے بعد خلیفہ بنانے کے لیے نامزد ر جاؤں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس نامزدگی کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں عرض کرسکوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا تھا کہ ہر اُمت کا ایک امین وتا ہے، اور اس امت کے امین ابوعبیدہؓ ابن الجراح ہیں"۔[2]

جب اردن اور شام میں وہ تاریخی طاعون پھیلا جس میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل نے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے :۔

سلام علیک، اما بعد، فإنه قد عرضت لی إلیک حاجة ارید ان اشافهک بها فعزمت علیک إذا نظرت فی کتابی هذا ان لا تضعه من یدک حتی تقبل الیّ،

"سلام کے بعد، مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے جس کے بارے میں آپ سے زبانی بات کرنا چاہتا ہوں، ہٰذا میں پوری تاکید کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ جونہی آپ میرا یہ خط دیکھیں تو اُسے اپنے ہاتھ سے رکھتے ہی فوراً میری طرف روانہ ہوجائیں۔"

---

[1] سیر اعلام النبلاء، ص ۱۸، ج ۱ و طبقات ابن سعد ص ۳۰۰، ج ۳۔

[2] مسند احمد ص ۱۸، ج ۱ و مستدرک حاکم ص ۲۶۸، ج ۳۔

حضرت ابو عبیدہؓ اطاعتِ امیر کے ساری زندگی پابند رہے، لیکن اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ حضرت عمرؓ کی یہ شدید ضرورت جس کے لیے مجھے مدینہ منورہ بلایا ہے صرف یہ ہے کہ وہ مجھے اس طاعون زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں' چنانچہ یہ خط پڑھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

عرفت حاجة أمیر المؤمنین، إنه یرید أن یستبقی من لیس بباق۔

مَیں امیر المؤمنین کی ضرورت سمجھ گیا، وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں۔

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کو یہ جواب لکھا۔

یا أمیر المؤمنین، إنی قد عرفت حاجتك إلیّ، و إنی فی جند من المسلمین لا أجد بنفسی رغبة عنهم، فلست أرید فراقهم حتی یقضی الله فیّ و فیهم أمره و قضاءه فخلّنی من عزمتك یا أمیر المؤمنین، ودعنی فی جندی،

امیر المؤمنین، آپ نے مجھے جس ضرورت کے لیے بُلایا ہے وہ مجھے معلوم ہے، لیکن میں مسلمانوں کے ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس کے لیے میں اپنے دل میں اعراض کا کوئی جذبہ نہیں پاتا، للذا میں ان لوگوں کو چھوڑ کر اس وقت تک آنا نہیں چاہتا جب تک اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنی تقدیر کا حتمی فیصلہ نہیں فرما دیتا۔ لہٰذا امیر المؤمنین! مجھے اپنے اس تاکیدی حکم سے معاف فرما دیجئے اور اپنے لشکر ہی میں رہنے دیجئے۔"

حضرت عمرؓ نے خط پڑھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جو لوگ پاس بیٹھے تھے وہ جانتے تھے کہ خط شام سے آیا ہے، حضرت عمرؓ کو آبدیدہ دیکھ کر انہوں نے پوچھا: "کیا ابو عبیدہ کی وفات ہو گئی؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ہوئی تو نہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہونے والی ہے۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرا خط لکھا:

سلام علیك، أما بعد، فإنك أنزلت الناس أرضا عمیقة
فارفعهم إلى أرض مرتفعة نزهة،

"سلام کے بعد، آپ نے لوگوں کو ایسی زمین میں رکھا ہوا ہے جو نشیب میں ہیں، اب انہیں کسی بلند جگہ پر لے جائیے جس کی ہوا صاف ستھری ہو۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رض فرماتے ہیں کہ جب یہ خط حضرت ابو عبیدہ رض کو پہنچا تو انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ امیر المومنین کا یہ خط آیا ہے۔ اب آپ ایسی جگہ تلاش کیجیے جہاں لے جا کر لشکر کو ٹھہرایا جا سکے۔ میں جگہ کی تلاش میں نکلنے کے لیے پہلے گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری اہلیہ طاعون میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ میں نے واپس آکر حضرت ابو عبیدہ رض کو بتایا۔ اس پر انہوں نے خود تلاش میں جانے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے اونٹ پر کجاوہ کسوایا۔ ابھی آپ نے اس کی رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ آپ پر بھی طاعون کا حملہ ہو گیا۔ اور اسی طاعون کے مرض میں آپ نے وفات پائی[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کا یہ مزار مسجد کی دائیں دیوار کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے۔ اس کمرے میں کچھ پرانے کتبات بھی رکھے ہیں جو اس جگہ سے برآمد ہوئے تھے۔ لیکن ان کی عبارتیں صاف پڑھی نہیں جاتیں۔

مسجد سے باہر نکلیں تو دائیں طرف ایک بڑا وسیع و عریض قبرستان ہے جس میں قدیم اور بوسیدہ قبروں کے نشانات دور تک نظر آتے ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ اس میں بہت سے صحابہ کرام رض اور طاعونِ عمواس کے بہت سے شہداء مدفون ہیں۔ یہاں اجتماعی اور اجمالی طور پر تمام اہلِ قبور کو سلام عرض کرنے اور ان پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

---

[1] اس پورے واقعے کے لیے ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ص ۷۸، ج ۷، و سیر اعلام النبلاء ص ۱۸، ۱۹، ج ۱، و مستدرک حاکم ص ۲۶۳، ج ۳،

حضرت ضرّار بن ازورؓ:

حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ کی مسجد سے نکل کر ہم نے شمال کو جانے والی سڑک پر دوبارہ سفر شروع کیا تو ذرا چلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار تھا۔ یہ بھی اُن مجاہد صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں جن کی شجاعت و بسالت کی داستانوں سے شام کی فتوحات کی تاریخ بھری پڑی ہے، واقدی کی فتوح الشام کے تو حضرت ضرار ہیرو ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے خاص ساتھی جن کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ جنگ کے وقت نہ صرف یہ کہ وہ سینے پر زرہ نہیں پہنتے تھے، بلکہ قمیص بھی اُتار دیتے تھے، اور ننگے بدن لڑا کرتے تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مشکوک ہے کہ اُن کی وفات کہاں اور کس زمانے میں واقع ہوئی؟ حافظ ابن حجرؒ نے اس بارے میں مؤرخین کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں[1] بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ بعض سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ اجنادین میں ان کی شہادت ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ وہ جنگ یرموک میں شامل تھے، اور اس کے بعد دمشق میں ان کا انتقال ہوا۔ واللہ سبحانہ اعلم

حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کا مزار:

یہاں سے شمال کی طرف شاید دو تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ بائیں ہاتھ پر ایک عمارت نظر آئی، یہ عمارت سرسبز کھیتوں اور باغات کے درمیان واقع ہے، اور اس میں فاتح اردن حضرت شرحبیل ابن حسنہؓ کا مزار ہے۔

حضرت شُرَحبیل[2] ابن حسنہؓ اپنی والدہ کی طرف منسوب ہیں جن کا نام حسنہ تھا، یہ بھی اوّل دور کے مسلمانوں میں سے ہیں جنہوں نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور بعد میں

---

[1] ملاحظہ ہو الاصابہ ص ۲۰۰ ج ۲۔

[2] شین پر پیش، را پر زبر، حا ساکن اور با مکسور ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں تک کو ان کا نام "شرجیل" (جیم سے) لیتے ہوئے سنا، جو بالکل غلط ہے۔

مدینۂ منورہ کی طرف بھی حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے شام کی فتح کے لیے چار مختلف سمتوں سے چار لشکر روانہ فرمائے تھے، ان میں سے ایک لشکر کے سربراہ حضرت شرجبیل بن حسنہ تھے، اور اردن کا بہت بڑا علاقہ آپ ہی کے ہاتھ پر فتح ہُوا۔ آپ کو ایک زمانے میں فلسطین کا گورنر بھی بنادیا گیا تھا۔ شام کی فتوحات میں آپ کی شجاعت و جانبازی اور حُسنِ تدبیر کے واقعات تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، عمواس کا وہ زبردست طاعون جس کا پیچھے ذکر آچکا ہے، اسی میں حضرت شرجبیل بن حسنہ بھی شہید ہوئے، اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آپ کی وفات بھی ٹھیک اُسی دن واقع ہوئی جس دن حضرتِ ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہُوا۔[1]

---

(۴)

حضرت شرجبیل بن حسنہ کے مزار سے جنوب کی طرف اور آگے چلیں تو تقریباً ۲ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شہر "شونہ شمالیہ" سے ذرا پہلے حضرت معاذ بن جبل رضؓ کا مزار مبارک واقع ہے، ہمیں یہاں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ یہ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جس کا فرش اُس وقت بارش کی وجہ سے بھیگا ہُوا تھا، اسی مسجد کے شمالی حصے میں حضرت معاذ رضؓ کا مزار ہے۔

حضرتِ معاذ بن جبل رضؓ وہ جلیل القدر انصاری صحابی ہیں جن کو آنحضرتِ صلی اللہ علیہ وسلم نے "أعلمھم بالحلال والحرام" (صحابۂ کرام رضؓ میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم) قرار دیا۔[2] آپ مدینۂ منورہ کے قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، اور ہجرت سے پہلے جب ستر انصارِ مدینہ نے آنحضرتِ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عقبہ میں بیعت کی تو اُن میں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۹۳ و ۹۴ ج ۷، والاصابہ ص ۱۴۱ ج ۲۔

[2] جامع الترمذی، کتاب المناقب باب مناقب معاذ، حدیث نمبر ۳۷۹۳، وسنن ابن ماجہ مقدمہ، باب فضائل خباب رضؓ۔

حضرت معاذؓ بھی شامل تھے۔ اس وقت آپ اتنے کمسن تھے کہ داڑھی بھی نہیں نکلی تھی۔ غزوہ بدر میں آپ بیس سال کے تھے اور تقریباً تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ البتہ غزوہ حنین کے موقع پر آپؐ نے حضرت معاذؓ کو اہلِ مکہ کی تعلیم کے لیے مکہ مکرمہ میں چھوڑ دیا تھا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت معاذؓ سے بہت محبت تھی، اور آپ وہ خوش نصیب صحابی ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے فرمایا: "اے معاذ! میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے تم سے اللہ کے لیے محبت ہے۔" حضرت معاذؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم یا رسول اللہ! مجھے بھی آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے۔" اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو تم ہر نماز کے بعد کہا کرو: رَبِّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ۔[2]

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "نعم الرجال ابوبکر، نعم الرجل عمر، نعم الرجل معاذ بن جبل" یعنی "ابوبکر اچھے آدمی ہیں، عمر اچھے آدمی ہیں، معاذ بن جبل اچھے آدمی ہیں۔"[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخر میں حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا، اور آپ ہی سے قضاءِ شرعی کے بارے میں وہ مشہور سوالات فرمائے تھے کہ "کس طرح فیصلہ کرو گے؟" حضرت معاذؓ نے فرمایا: "کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ "اگر رسول کے فیصلے میں بھی کچھ نہ ملے تو کیا کرو گے؟" حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ "اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور حق تک پہنچنے کی کوشش میں کوتاہی نہ کروں گا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسولؐ کی مرضی کے مطابق ہے۔[4]

---

[1] مستدرک الحاکم ص ۲۷۰، ج ۳ و سیر اعلام النبلاء ص ۴۵۹ ج ۱۔

[2] سنن النسائی، کتاب الصلوٰۃ فی السہو نوع آخر من الدعاء وسنن ابی داود، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستغفار حدیث نمبر ۱۵۲۲۔

[3] جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ، حدیث نمبر ۳۷۹۶

[4] جامع الترمذی، ابواب الاحکام، حدیث نمبر ۱۳۲۷ و ۱۳۲۸۔

پھر یہی نہیں، جب حضرت معاذؓ کی روانگی کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں الوداع کہنے کے لیے خود تشریف لے گئے، یہاں تک کہ حضرت معاذؓ کو اپنے سامنے اونٹنی پر سوار کرایا، پھر اسی پر بس نہیں کیا، جب ان کی اونٹنی روانہ ہوگئی تو آپؐ کافی دیر تک ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ یہ اپنے محبوب فداکار سے میری آخری ملاقات ہے، اور وہ بہت دُور جا رہے ہیں۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جذبات کا اظہار بہت کم مواقع پر ثابت ہے۔ لیکن یہ حضرتِ معاذؓ کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کا کرشمہ ہے کہ اس موقع پہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے کچھ ایسے الفاظ صادر ہوئے جو ایک آنکھوں سے دُور ہوتے ہوئے محبوب کو جُدا کرتے وقت آپ کے دل جذبات کے آئینہ دار تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

یا معاذ! انك عسى أن لا تلقاني بعد عامي هذا،

أو لعلك أن تمرّ بمسجدي أو قبري۔

معاذ! بہت ممکن ہے کہ شاید اس سال کے بعد مجھ سے تمہاری ملاقات نہ ہو، یا شاید اب تم میری مسجد یا میری قبر کے پاس سے گذرو۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو نہ جانے کب سے اپنے جذبات کو ضبط کئے ہوئے ہوں گے، یہ فقرہ سُنتے ہی پھوٹ پڑے۔ شاید پہلے دل کو یہ تسلی دیتے رہے ہوں گے کہ یہ ایک ڈیڑھ سال کی جُدائی ہوگی، لیکن جب سرکارؐ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سنا تو یقین ہوگیا ہوگا کہ یہ جلوۂ جہاں تاب اب جیتے جی نظر آنے والا نہیں ہے، اُن کے مُنہ سے آہ نکلی، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ سرکارؐ نے فرمایا: مُعاذ! روؤ نہیں! — اور یہ فرما کر آپؐ نے خود اپنا رُخ بھی موڑ کر مدینہ منورہ کی طرف کر لیا، اور پھر فرمایا:

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِيَ الْمُتَّقُوْنَ، مَنْ كَانُوْا وَحَيْثُ كَانُوْا [1]

"مجھ سے قریب ترین لوگ وہ ہیں جو متقی ہوں، خواہ وہ کوئی ہوں اور

---

[1] مسند احمد ص ۲۳۵ ج ۵ و سیر اعلام النبلاء ص ۴۴۸ ج ۱،

کہیں ہوں۔"

چنانچہ اس کے بعد حضرت معاذؓ یمن چلے گئے، اور جب واپس آئے تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے محبوبِ حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے — اس کے بعد حضرت معاذؓ مدینہ منورہ میں نہیں رہے، شام جانے کا ارادہ کر لیا، پیشِ نظر غالباً یہ تھا کہ وہاں جہاد میں حصہ لیں گے، یہاں تک کہ شہادت کی منزل حاصل ہو جائے، حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ان کو مدینہ منورہ ہی میں روک لیجئے، لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، لیکن حضرت صدیقؓ نے جواب دیا کہ "انہوں نے ایک راستے کا انتخاب کر لیا ہے، (یعنی شہادت کا) لہٰذا میں انہیں روک نہیں سکتا[۱]" چنانچہ حضرت معاذؓ شام چلے آئے۔ یہاں آپ نے جہاد میں بھی حصہ لیا۔ تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کے دستِ راست بنے رہے۔

حضرت عمرؓ کو بھی حضرت معاذؓ سے بہت تعلق تھا، وہ فرماتے تھے کہ :۔

عجزت النساء آن یلدن مثل معاذؓ[۲]

"عورتیں معاذؓ جیسا شخص پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔"

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک غلام کو چار سو دینار دے کر کہا کہ یہ ابو عبیدہؓ کے پاس لے جاؤ، پھر تھوڑی دیر ان کے گھر میں ٹھہر کر دیکھو کہ وہ ان کا کیا کرتے ہیں؟ غلام وُہ دینار حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس لے گیا، حضرت ابو عبیدہؓ نے دینار لے کر حضرت عمرؓ کو دعائیں دیں کہ "اللہ تعالیٰ ان کو اس کا صلہ دے[۳] اور ان پر رحم فرمائے۔" پھر اپنی کنیز سے کہا کہ "یہ سات دینار فلاں کے پاس لے جاؤ، یہ پانچ فلاں کے پاس" یہاں تک کہ وہ سارے دینار اسی وقت تقسیم کر ڈالے۔ غلام حضرت عمرؓ کے پاس لوٹ آیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اتنے ہی دینار اسے

۱؎ سیر اعلام النبلاء ص ۴۵۲، ج ۱،

۲؎ ایضاً ص ۴۵۲، ج ۱۔

۳؎ طبقات ابن سعد ص ۳۰۱ ج ۳ و حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ص ۲۳۷ ج ۱ و سیر اعلام النبلاء ص ۴۵۶ ج ۱

دوبارہ دیئے کہ "اب یہ معاذ بن جبل رضؓ کے پاس لے جاؤ، اور اسی طرح دیکھو کہ وہ کیا کرتے ہیں:" وہ حضرت معاذ رضؓ کے پاس پہنچا تو انہوں نے بھی وہی معاملہ کیا۔ جب سارے دینار ختم ہونے لگے تو اندر سے ان کی اہلیہ نے آواز دی کہ "ہم بھی نادار ہیں کچھ ہمیں بھی دے دیجئے:" اس وقت تھیلی میں دو دینار باقی تھے، حضرت معاذ رضؓ نے وہ دو دینار اہلیہ کی طرف لڑھکا دیئے۔ غلام نے لوٹ کر حضرت عمر رضؓ کو یہ واقعہ بتایا تو حضرت عمر رضؓ نے خوش ہو کر فرمایا کہ "یہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک جیسے ہیں۔"[1]

حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ جب طاعون میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو اپنے بعد شام کی حکومت کیلئے نامزد فرمایا۔ اس زمانے میں طاعون انتہائی تیز رفتاری سے پھیل رہا تھا، اس موقع پر حضرت معاذ رضؓ نے لوگوں کو سنایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تم لوگ شام کی طرف ہجرت کرو گے، وہ تمہارے ہاتھ پر فتح بھی ہوگا، اور وہاں ایک ایسی بیماری ظاہر ہوگی جو پھوڑے یا گٹھلی کی طرح ہوگی ...... اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت بخشیں گے اور تمہارے اعمال کا تزکیہ فرمائیں گے:"

اس کے بعد حضرت معاذ رضؓ نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! اگر معاذ نے واقعتہً یہ ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو اُسے اور اس کے گھر والوں کو بھی اس فضیلت سے وافر حصہ عطا فرما۔ چنانچہ طاعون ان کے گھر میں بھی داخل ہوگیا، حضرت معاذ رضؓ کے گھر کا کوئی فرد اس سے نہیں بچا، حضرت معاذ رضؓ کو طاعون کی گٹھلی شہادت کی انگلی میں نکلی، آپ اسے دیکھ کر فرماتے: "اگر کوئی اس کے بدلے مجھے سُرخ اُونٹ بھی دے تو وہ مجھے پسند نہیں":[2]

حضرت معاذ رضؓ کو طاعون میں مبتلا دیکھ کر ایک صاحب رونے لگے، حضرت معاذ رضؓ

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۳۰۱ ج ۳ و حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ص ۲۳۷ ج ۱ و سیر اعلام النبلاء ص ۵۶ ج ۱

[2] مجمع الزوائد للہیثمی ص ۳۱۱ ج ۲، رواہ احمد وقال الہیثمی: "اسمٰعیل بن عبد اللہ لم یدرک معاذاً۔"

نے پوچھا: کیوں روتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میں اس وجہ سے نہیں روتا کہ مجھے آپ کے ذریعے کوئی دُنیوی دولت ملتی تھی، بلکہ اس علم پر رو رہا ہوں جو میں آپ سے حاصل کرتا تھا۔" حضرت معاذؓ نے فرمایا: "تم کو بھی نہ روؤ۔ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسی زمین میں پیدا ہوئے تھے جہاں کوئی علم نہیں تھا، اللہ نے انہی کو علم عطا فرمایا۔ لہٰذا میرے مرنے کے بعد چار افراد کے پاس علم تلاش کرنا: عبداللہ بن مسعودؓ، سلمان فارسیؓ، عبداللہ بن سلامؓ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم۔" [1]

بہرکیف! ان کی دُعا قبول ہوئی، اور اسی طاعون میں (۱۸ھ میں) آپ نے وفات پائی جبکہ آپ کی عمر ۳۲-۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔

عقیدت و محبت کے ناقابلِ بیان جذبات کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خوش نصیب صحابی کے مزار پر حاضری دے کر جب ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ مغرب کی جانب میدانی علاقہ کے اُس پار افق پر جو پہاڑی سلسلہ شروع سے ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے، وہ یہاں پہنچ کر بہت قریب آ گیا ہے۔ ہمارے رہنما نے بتایا کہ یہاں سے دریائے اردن کل ڈیڑھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اور اس کے مغربی سرے سے اسرائیل کا مقبوضہ علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ حضرت معاذؓ کے مزارِ مبارک کے مجاور نے بتایا کہ یہ پہاڑ جو مغربی سمت نظر آ رہے ہیں نابلس کے پہاڑی سلسلے کا ایک حصہ ہیں، اور ہمارے بالکل سامنے جو پہاڑی ہے اسے "کوکب الہوا" کہا جاتا ہے، ان پہاڑوں پر بہت سی بستیاں ہیں جن میں بعض فلسطینی بھی آباد ہیں، لیکن بیت سا ستہ صیہونی قابضین کے تسلط میں ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اغوار کے اس مشرقی علاقے میں شمالاً جنوباً سڑک کی جو پٹی ہے، اُس پر تمام تر وہ صحابۂ کرامؓ آرام فرما ہیں جنہوں نے اپنے خون پسینے سے اُردن، فلسطین اور شام کو رُومی سلطنت کے جور و استبداد سے آزاد کرایا تھا، جنہوں نے اس علاقے کو

---

[1] سیر اعلام النبلاء، ص ۴۵۹، التاریخ الصغیر للبخاری ص ۴۷ و ۴۷، مصنف: عبدالرزاق (حدیث نمبر ۲۰۱۶۴)

کلمۂ توحید کے انوار سے منور کرنے کے لیے اپنے وطن کو خیرباد کہا، عزیز و اقارب کو چھوڑا، جنگ کی سختیاں برداشت کیں، دنیا کی عظیم ترین فوجی طاقت سے ٹکر لی اور بالآخر عظیم ترین طاقت جو اپنے سونے اور لوہے پر مغرور تھی، ان بے سروسامان صحرا نشینوں کے عزم و استقامت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی، یہ خدا مست مجاہدین اپنے مشن کی تکمیل کے بعد پوری طرح سرخ رو ہو کر اس علاقے میں آسودہ ہوئے ـــــ لیکن آج ان کے مزارات سے صرف چند کیلومیٹر کے فاصلے پر اسرائیل نے اپنے غاصبانہ تسلط کے جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں، ہم جو انہی صحابہ کرامؓ کے ناخلف نام لیوا ہیں، اس سرزمینِ مقدس کو ان دشمنانِ خدا سے محفوظ بھی نہ رکھ سکے اور ہزار چیخ و پکار کے باوجود اب بھی اس کے ہاتھوں اتنے بے بس ہیں کہ وہ ہمارے علاقوں کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور ہمارے پاس اس کی جارحیت کا جواب غم و غصے کی قراردادوں کے سوا کچھ نہیں ـــــ کیا اس حالت میں ہم ان جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو اپنا منہ دکھانے کے قابل ہیں؟ اس تصور سے جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی، کاش! کہ ایسی جھرجھریوں میں ہمارے عمل کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی لا کر ہمارے دن پھیرنے کی صلاحیت ہوتی۔ لیکن ؎

وصل کی ہوتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

غم و حسرت اور ندامت کے یہ جذبات جو یہاں پہنچ کر پیدا ہوئے تھے، وہ دیر تک قلب و دماغ پر چھائے رہے، لیکن ہماری گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی شمال کی طرف رواں ہو گئی۔

بحرِ میت کے کنارے:

یہاں سے خاصا طویل فاصلہ طے کر کے ہماری اگلی منزل اردن کا معروف سمندر بحرِ میت تھی، یہ چھوٹا سا سمندر اپنی تاریخی اور جغرافیائی خصوصیات کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ جب شام و فلسطین کے دورے پر تشریف لائے تھے تو یہاں سے بھی گذرے تھے، اور ان کی زبانی ہم نے بچپن ہی سے اس کے کچھ

حالات سُن رکھے تھے۔ ہمارے ساتھی بھی یہ سمندر دیکھنے کے شائق تھے، چنانچہ ہم عصر کے وقت اس کے کنارے پہنچ گئے۔

یہ چھوٹا سا سمندر کل ۵۰ میل لمبا اور ۱۱ میل چوڑا ہے۔ اس کی سطح کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے، زیادہ سے زیادہ گہرائی ۱۲۰۰ فٹ ہے۔ ۱۹۶۷ء سے پہلے اس کا نصف شمالی حصہ مکمل طور پر اردن میں تھا، اور نصف جنوبی حصہ اردن اور اسرائیل کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیلی فوجیں پورے مغربی ساحل پر قابض ہو گئی ہیں۔ اور اس کی جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کسی بڑے سمندر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اپنے طول وعرض کے لحاظ سے اس کو "ایک جھیل" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، لیکن چونکہ اس کا پانی خالص سمندری پانی ہے، بلکہ اس کی نمکیات اور کیمیاوی اجزا عام سمندروں سے سے زیادہ ہیں اس لیے اس کو "بحر" یا "بحیرہ" ہی کہا جاتا ہے۔

اس سمندر کی دوسری جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام سطح سمندر سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے، یہاں سے قریب ترین سمندر بحر متوسط (یا بحر روم) کی خلیج عقبہ ہے، لیکن بحر میّت اس کی سطح سے ۱۳۰۰ فٹ نیچے واقع ہے، اور اس طرح یہ کرۂ زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے۔ دریائے اردن اسی سمندر میں آکر گرتا ہے، اور آس پاس کی پہاڑی ندیاں بھی اسی میں آکر شامل ہوتی ہیں۔

اب بہت سے جدید محققین کا کہنا یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی وہ قوم جس پر بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوا، اور جس کی بستیوں کا نام بائیبل اور تاریخی روایات میں سدوم اور عمورہ ذکر کیا گیا ہے، اسی بحر میّت کے آس پاس کہیں واقع تھی۔

اگرچہ قدیم مسلمان جغرافیہ نگاروں اور مؤرخین مثلاً علامہ حموی اور بکری وغیرہ نے سدوم اور عمورہ کے حالات بیان کرتے ہوئے بحر میّت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ علامہ قزوینی نے اپنی کتاب "آثار البلاد واخبار العباد" میں سدوم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ "آج اس بستی کی جگہ پر سیاہ پتھر ہی پتھر نظر آتے ہیں"، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یا تو خود اس جگہ کا مشاہدہ کیا ہے یا کسی مشاہدہ کرنے والے سے اس کے حالات سُنے ہیں، اس کے

باوجود انہوں نے یہ اشارہ تک نہیں دیا کہ اس کے آس پاس "بحرِ میت" کے نام سے کوئی سمندر واقع ہے۔

لیکن مشہور یہودی مؤرخ جوزیفس (Josephus) نے جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں گذرا ہے، اپنی تاریخ میں یہی لکھا تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں سدوم اور عمورہ "بحرِ میت" کے کنارے میں واقع تھیں۔ غالباً اسی بنیاد پر ۱۹۲۴ء میں مستشرقین کی ایک جماعت قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کی تحقیق کے لئے نکلی تھی اور اس نے پورے علاقے کا سروے کر کے یہ حتمی رائے دی تھی کہ ان بستیوں میں سے سدوم، عمورہ اور ذعر بحرِ میت کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع تھیں، اور باقی بستیاں سمندر کے نیچے آ گئی ہیں[1] کہتے ہیں کہ سمندر کے جنوب مشرقی کنارے پر ہی کھدائی کی گئی تو وہاں سے ان بستیوں کے کچھ آثار بھی برآمد ہوئے اسی بنیاد پر آخر دور کے مصری محقق عبدالوہاب النجار نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ یہ سمندر پیدا ہی اس طرح ہوا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا، ان کی بستیاں الٹ گئیں تو یہاں سمندر کا پانی نکل آیا[2] ورنہ حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے یہاں کوئی سمندر موجود نہیں تھا۔

اس رائے کی تائید مندرجہ ذیل دلائل و قرائن سے ہوتی ہے:۔

(۱) قرآنِ کریم نے قوم لوطؑ کی بستیوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے اہلِ عرب کو یہ یاد دلایا ہے کہ یہ بستیاں اس سڑک پر واقع ہیں جس کے ذریعے تم شام جاتے آتے رہتے ہو، ارشاد ہے:

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ

اور بلاشبہ یہ بستیاں سیدھے راستے پر واقع ہیں۔

ایک اور جگہ حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام دونوں کی بستیوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مطبوعہ ۱۹۸۸ء ص ۱۰۰، ج ۷ مقالہ " DEAD SEA "

[2] قصص الانبیاء لعبدالوہاب النجار۔ ص ۱۱۳، مطبوعہ بیروت

وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ۔

اور بلاشبہ یہ دونوں قومیں واضح راستے پر واقع ہیں۔

لہٰذا ان بستیوں کا محلِ وقوع اسی علاقے میں کہیں ہونا چاہیے۔

(۲) عبدالوہاب النجار کی یہ رائے کہ یہ سمندر پیدا ہی بستیوں کے اُلٹنے سے ہوا۔ اس لحاظ سے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ اس سمندر کا کوئی رابطہ کسی بڑے سمندر سے نہیں ہے۔ اس لیے کوئی غیر معمولی واقعہ ہی اس سمندر کے ظہور کا سبب ہوسکتا ہے۔

(۳) اس سمندر کا پانی بھی عام سمندروں کے مقابلے میں بہت بھاری ہے۔ اور اس میں نمکیات بہت زیادہ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عام بڑے بڑے سمندروں میں چار سے چھ فیصد تک نمکیات ہوتے ہیں لیکن بحر میت کے پانی میں نمکیات کا تناسب ۲۳ فیصد سے ۲۵ فیصد تک ہے[1] چنانچہ جو لوگ اس سمندر میں دیر تک غسل کرلیتے ہیں ان کو اپنے جسم سے ان کیمیاوی اجزاء کی چپکاہٹ چھڑانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور عام پانی سے ایک آدھ مرتبہ نہاکر آسانی سے یہ اجزاء جسم سے نہیں چھوٹتے۔

پانی کی یہ غیر معمولی کیفیت بھی کسی غیر معمولی واقعے کی نشان دہی کرتی ہے۔

(۴) اس سمندر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مچھلی سمیت کوئی جانور زندہ نہیں رہتا، اور نہ کوئی پودا اُگ سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جب دریائے اُردن یا دوسرے چشمے اس سمندر میں گرتے ہیں تو بعض اوقات اپنے ساتھ مچھلیاں بہاکر لے آتے ہیں، لیکن یہ مچھلیاں سمندر میں گرتے ہی فوراً مرجاتی ہیں[2] سائنسی طور پر اس کی توجیہ عموماً یہ کی جاتی ہے کہ یہ اس سمندر کی غیر معمولی نمکیات کا اثر ہے اور ظاہری طور پر شاید یہی سبب ہو، لیکن باطنی طور پر یہ اس عبرتناک عذاب کے اثرات

---

[1] برٹانیکا ۱۹۵۰ء ص ۹۹، ج ۷،

[2] برٹانیکا، میکروپیڈیا مطبوعہ ۱۹۸۱ء ص ۵۲۵، ج ۵، کالم ۲،

ہوں تو بعید نہیں جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر نازل ہوا تھا۔
سمندر کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس سمندر کو "بحرِ میّت" کہا جاتا ہے، اور اس کا یہ نام یونانی دور سے چلا آتا ہے۔ اہلِ عرب اس کو "بحیرۂ لوط" بھی کہتے رہے ہیں۔

(۵) جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، بحرِ میّت کا علاقہ دُنیا کا سب سے پست علاقہ ہے، بحرِ میّت کی سطح عام سطحِ سمندر سے ۱۳۰۰ فیٹ نیچے ہے۔ دُنیا بھر میں سطحِ سمندر سے اتنا نیچا علاقہ کوئی نہیں ہے، مجھے جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ذہن فوراً قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط علیہ السلام کی بستیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا[1]

ہم نے اس زمین کے بلند علاقے کو زمین کا پست علاقہ بنا دیا۔

عام طور سے اس آیت کا مفہوم یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ بستی اُلٹ گئی تو چھتیں زمین بوس ہو گئیں، لیکن قرآنِ کریم کا یہ معجزہ بیان شاید اس طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ صرف بستی کی عمارتیں ہی پست نہیں ہوئیں، بلکہ ان بستیوں کا پورا علاقہ روئے زمین کا پست ترین خطہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ بحرِ میّت کے شمال اور مشرق کی جانب کے علاقے تو ہم نے بھی دیکھے کہ وہاں میلوں دُور سے زمین کی سطح بتدریج پست ہوتی گئی ہے، زمین کا جو حصہ سطحِ سمندر کے مساوی ہے، وہاں علامت کے طور پر بورڈ لگا دیا گیا ہے، اس کے بعد ہر تھوڑے فاصلے پر سطح کی پستی کی مقدار بتانے کے لیے جگہ جگہ بورڈ لگے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ پست ترین سطح بحرِ میّت پہنچ کر آتی ہے۔

اللہ اکبر! اس سے ایک طرف قرآنِ کریم کا یہ اعجاز سامنے آتا ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے ایک ایسی جغرافیائی حقیقت کو واضح فرما رہا ہے جو صدیوں کے بعد ماہرین پر منکشف ہوئی۔ اور بیان بھی اس طرح فرما رہا ہے کہ اُس دور کے لوگوں کو بھی اس بیان کے صاف اور سادہ معنی سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

اور دوسری طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس قوم پر عذابِ الٰہی کا یہ پہلو ایسا

ہے کہ قیامِ قیامت تک دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بنا رہے گا۔ بستیاں اُلٹ گئیں، آبادی بے نشان ہوگئی۔ ایک عجوبۂ روزگار سمندر اُبل آیا، اور قیامت تک کے لیے یہ زمین دُنیا کی پست ترین زمین بن کر رہ گئی:

فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ؕ

پس یہ ہیں ان کے رہنے کے مقامات جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئے مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث تھے۔

ہزارہا سال پہلے حضرت لُوط علیہ السلام نے اسی سرزمین پر کوہِ استقامت بن کر اپنی اس بے ہنگم قوم کی اصلاح کی کوشش فرمائی تھی جو انسانیت کی ہر قدر کو نوچ کر اپنی کمینگی پر مگن تھی۔ یہ قوم اپنے غیر فطری جنسی عمل میں تو دُنیا بھر میں بدنام ہے، یہاں تک کہ اس گھناؤنے فعل کا نام ہی اس قوم سے منسوب ہوگیا، لیکن قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ قوم رہزنی کی لت میں بھی مبتلا تھی اور کوئی اجنبی مسافر ان کے یہاں آجائے تو اس کی جان، مال اور آبرو تینوں خطرے میں پڑ جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی اس اخلاقی گراوٹ اور پستی کو قیامت تک کے لیے یہاں ایک محسوس شکل دے دی گئی ہے کہ یہ علاقہ دُنیا کا سب سے پست علاقہ بنا دیا گیا ہے۔

یہ جگہ بڑی عبرت کی جگہ ہے، لیکن یہ دیکھ کر دل لرزتا ہے کہ اسے ایک سمندری تفریح گاہ بنا لیا گیا ہے، ریسٹورنٹ کی حد تک تو شاید بات اتنی ناگوار نہ تھی، لیکن سیاحت کی ہمت افزائی نے یہاں وہ فضا پیدا کر دی ہے جو یورپ کی ساحلی تفریح گاہوں پر عام ہے۔ خاص طور پر مغربی سیاحوں کے ہجوم اور اُن کو حکومت کی طرف سے ملی ہوئی بے روک ٹوک آزادی نے اُسے بے حیائی کا ایک مرکز بنا دیا ہے ـــ اور دیکھ کر دل دکھتا ہی رہا کہ جو جگہ فحاشی کے خلاف ذہن تیار کرنے کے لیے عبرت کا بہترین پیغام تھی، وہیں پر بے حیائی کے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ شرافت منہ چھپا کر رہ جائے۔

ہم یہاں پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، بلکہ تنگ ہونے کے قریب تھا، تلاش سے

بعد ایک "جائے عافیت" دریافت کر کے جماعت سے نماز ادا کی، نماز کے بعد سمندر کے کنارے تک پہنچے، بلاشبہ منظر بڑا حسین تھا، سمندر کی نیلگوں موجوں کے اُس پار فلسطین کے پہاڑ بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ یہ منظر کے حُسن سے لطف لینے سے زیادہ ڈرنے، خوف کھانے اور عبرت حاصل کرنے کی جگہ ہے۔

البتہ یہاں کھڑے ہونے کی کشش ایک اور وجہ سے تھی۔ ملک افضل صاحب نے بتایا تھا کہ مغرب میں سمندر کے پار فلسطین کے جو پہاڑ یہاں کھڑے ہو کر نظر آتے ہیں انہی میں بیت المقدس واقع ہے، جو یہاں سے ۱۲-۱۵ میل سے زیادہ دُور نہیں ہے، چنانچہ اگر مطلع صاف ہو تو بعض اوقات انہی پہاڑوں کے کسی درمیانی خلا سے مسجد اقصےٰ کے مینارے بھی نظر آ جاتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی ایک جھلک ــــ دُور ہی سے سہی ــــ دیکھنے کے شوق نے دیر تک یہاں کھڑا رکھا، لیکن مغرب کی طرف کے پہاڑ دُھند کی ہلکی ہلکی تہہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے بہت سے زاویے بدلنے کے باوجود منارے نظر نہیں آ سکے ــــ ایسا محسوس ہُوا کہ گویا یہ مقدس منارے نہ جانے کب سے اُمتِ مسلمہ کو فریاد کے لیے بلاتے رہے ہیں، لیکن جب کوئی ابوبیؒ آگے نہ بڑھ سکا تو وہ منہ چھپا کر روپوش ہو گئے۔ اب ہم جیسے گفتار کے غازیوں کو وہ اپنے چہرے کی ایک جھلک دکھانے کے لیے بھی تیار نہیں۔

اس تصوّر سے دل پہ ایک چوٹ سی لگی ــــ کیا نوّے کروڑ مسلمانوں پر مشتمل یہ عالمِ اسلام اپنے قبلۂ اوّل سے مستقل طور پر صرفِ نظر کر لے گا؟ کیا محض غم اور غصّے کی قراردادوں سے قبلۂ اوّل کا حق ادا ہو جائے گا؟ کیا ہماری صفوں سے اب کوئی صلاح الدین ایوّبی نہیں اُٹھ سکے گا؟ کیا صیہونی استعمار کا اژدھا ہمیں ایک ایک کر کے اسی طرح نگلتا رہے گا؟ ــــ جواب تو ان سارے سوالات کا ایک ہی تھا، اور وہ یہ کہ ؎

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

لیکن اِس کو کیا کہیے کہ دشمن کے جبڑوں میں بیٹھ کر بھی ہمیں "فضائے بدر" کے بجائے "شانزالیزے"

کی فضا پیدا کرنے کا شوق کھائے جا رہا ہے۔

اسی سوال و جواب کی پُر درد اُدھیڑ بُن میں سامنے کے پہاڑوں کے پیچھے سُورج غروب ہو گیا ہم نے مغرب کی نماز اسی ساحل پر ادا کی اور واپس عمّان کیلئے روانہ ہو گئے۔

طویل فاصلہ طے کر کے جب عمّان کے پہاڑوں کے قریب پہنچے تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ گاڑی کو یکے بعد دیگرے کئی پہاڑ طے کرنے تھے، باہر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، کار کی ہیڈ لائٹس کے سامنے بھی بارش کے پردے حائل ہو گئے تھے۔ پُر خطر پہاڑی راستوں پر بارش کی وجہ سے راستہ دیکھنا دُشوار ہو رہا تھا، اور اگر کچھ نظر آئے بھی تو ہم جیسے اجنبیوں کے لیے راستے کا سمجھنا ناممکن تھا، ایک موقع پر پہنچ کر کم از کم مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ ہم بالکل غلط رُخ پر جا رہے ہیں، لیکن بحمد للہ ملک افضل صاحب راستوں کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف تھے، اُنہیں ٹوک کر اپنا اجتہاد چلانا حماقت کی بات تھی اس لیے چُپ ہو کر رہ گیا، چنانچہ وہ اندھیری رات اور پُر شور بارش میں بھی اعتماد و اطمینان سے راستہ بتاتے رہے، اور عطاء الرحمٰن صاحب ان پُر خطر راستوں پر بڑی احتیاط اور مہارت سے مناسب رفتار کے ساتھ گاڑی چلاتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ بحمد للہ رات کے نو بجے ہم بعافیت تمام اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ سبق یہ ملا کہ رہنما نشیب و فراز سے واقف اور ڈرائیور ماہر و محتاط ہو تو تاریک رات میں پُر خطر سے پُر خطر راستہ بھی اطمینان سے طے ہو جاتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ انسان ایسے میں اپنی عقل لڑانے کے بجائے اپنے آپ کو ایسے رہنما اور ایسے ڈرائیور کے حوالے کر دے ــــــ بات تو سیدھی اور صاف ہے، لیکن یہی بات علماءِ فقہ اور مشائخِ طریقت کہتے ہیں تو آجکل اُن پر جمود، اندھی تقلید اور شخصیت پرستی کے طعنوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے۔

---

(۵)

اگلی صبح ہم مزید دو مقامات پر جانا چاہتے تھے، ایک اصحابِ کہف کے غار پر، اور دوسرے غزوۂ موتہ کے میدانِ جنگ تک۔ خیال یہ تھا کہ ان دو مقامات کی زیارت کے بعد ہم وہیں سے سیدھے دمشق روانہ ہو جائیں گے۔

اصحابِ کہف کے غار میں:

چنانچہ صبح آٹھ بجے کے قریب ہم ملک افضل صاحب کی رہنمائی میں پہلے اصحابِ کہف کے مقام کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مسئلے میں علماء اور محققین کی آراء ہمیشہ مختلف رہی ہیں کہ اصحابِ کہف کا وہ غار جس میں وہ تین سو سال سے زیادہ سوتے رہے، کس جگہ واقع ہے؟ بعض حضرات نے اس کی جگہ ترکی کے شہر افسس میں بتائی ہے۔ بعض نے اندلس کے ایک غار کو اصحابِ کہف کا غار قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ اردن میں واقع ہے، بعض کا کہنا ہے کہ شام میں ہے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یمن میں ہے، لیکن اردن کے ایک محقق محمد تیسیر ظبیان صاحب، جو وہاں کے رسالے "الشریعۃ" کے اڈیٹر تھے ۱۹۷۶ء میں پاکستان تشریف لائے تو حضرت والد ماجد قدس سرہٗ سے ملاقات کے لیے دارالعلوم بھی تشریف لائے۔ اُس وقت انہوں نے بڑے جزم اور وثوق کے ساتھ بتایا کہ یہ غار حال ہی میں عمّان کے قریب ایک پہاڑ پر دریافت ہو گیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ میں نے اس کی تحقیق کے لیے ایک مقالہ بھی لکھا ہے، جو دلائل و قرائن اُس وقت انہوں نے ذکر کئے، ان کے پیشِ نظر یہ بات بہت قرینِ قیاس معلوم ہوتی تھی کہ غالباً اصحابِ کہف کا یہ غار وہی ہو گا۔

اُس وقت سے اس مقام کو دیکھنے کی خواہش تھی جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دس سال بعد آج پوری ہوئی۔ تیسیر ظبیان صاحب کا تو اب انتقال ہو چکا تھا، لیکن وہ اپنی تحقیق کے نتائج ایک مفصل کتاب میں محفوظ کر گئے ہیں جو "موقع اصحاب الکہف" کے

نام سے دارالاعتصام نے شائع کر دی ہے۔

"اصحابِ کہف" کا واقعہ قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے، اور اسی واقعے کی وجہ سے قرآنِ کریم کی ایک پوری سورت کا نام "سورۃ الکہف" ہے۔ "کہف" عربی زبان میں غار کو کہتے ہیں، اور واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بُت پرست بادشاہ کے زمانے میں کچھ نوجوان دینِ توحید پر ایمان لے آئے تھے، اور شرک و بُت پرستی سے بیزار تھے۔ بُت پرست بادشاہ اور اس کے کارندوں نے ان پر ظلم وستم توڑنے شروع کئے، لہٰذا یہ لوگ بستی سے فرار ہو کر ایک غار میں مقیم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر گہری نیند مسلط فرما دی اور یہ سالوں تک پڑے سوتے رہے، غار کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ سورج کی روشنی اور ہوا تو بقدرِ ضرورت اندر پہنچتی تھی، لیکن دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی تھی، کئی سال گذرنے کے بعد بُت پرست بادشاہ کی حکومت ختم ہو گئی، اور اس کی جگہ ایک موحد اور صحیح العقیدہ نیک بادشاہ برسرِ اقتدار آگیا۔ اُس کے زمانے میں یہ لوگ اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ بھوک لگی ہوئی تھی، انہوں نے اپنے میں سے ایک ساتھی کو سکے دے کر شہر بھیجا، اور یہ تاکید کی کہ خفیہ طریقے پر جا کر کوئی حلال کھانا خرید لائے، وہ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ابھی تک اُسی بُت پرست بادشاہ کا زمانہ ہے۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اگر ان لوگوں کا اتہ پتہ انہیں معلوم ہو گیا تو وہ ظلم وستم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ چنانچہ یہ صاحب چھپتے چھپاتے بستی میں پہنچے، اور ایک نانبائی کی دُکان سے کھانا خریدنا چاہا، لیکن جب سکہ اس کے حوالے کیا تو وہ بہت پرانے زمانے کا تھا، جس سے سارا راز کھل گیا، انہیں یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا کہ حکومت بدل چکی ہے، شدہ شدہ بادشاہِ وقت کو بھی اطلاع پہنچی، اور ان صاحب نے اپنے ساتھیوں کو بھی نئے حالات کی اطلاع دے دی۔

قرآنِ کریم نے اجمالی طور پر مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اُس دَور کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی قدردانی کے طور پر ان کے اوپر ایک مسجد بھی تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

قرآنِ کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق اس واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی

تفصیلات بیان نہیں فرمائیں کہ یہ واقعہ کس دور میں اور کہاں پیش آیا؟ چنانچہ تاریخی روایات کی بنیاد پر مفسرین اور مورخین نے اس سلسلے میں مختلف آرا ظاہر کی ہیں۔ زیادہ تر محققین کا یہ رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروجِ آسمانی کے کچھ ہی عرصہ بعد یعنی پہلی سے تیسری صدی عیسوی تک کا ہے۔ اُس وقت اِس علاقے پر بھی بُت پرست بادشاہ کی حکمرانی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ دینِ عیسوی جو فلسطین کے علاقے میں ظاہر ہوا تھا اس کے اثرات یہاں تک پہنچ رہے تھے۔ انہی کی بنا پر یہ نوجوان اس دین کے حلقہ بگوش ہوئے۔ پھر جس زمانے میں یہ سعید روحیں غار میں محوِ خواب تھیں، اس دور میں رفتہ رفتہ دینِ عیسوی کے پیرو کار اس علاقے کو بت پرست حکمرانوں سے آزاد کرا کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہاں کے باشندوں نے بھی دینِ عیسوی قبول کر لیا۔

پھر جب نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان حضرات کو بدلے ہوئے حالات معلوم ہوئے تو اگرچہ انہیں دینِ برحق کی نشر و اشاعت سے خوشی ہوئی لیکن انہوں نے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ اسی غار میں اپنی باقی زندگی گذار دیں۔ لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ اب شہر میں آ جائیں لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ اور اپنی باقی زندگی اسی غار میں گذار دی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہِ وقت ان کا حال معلوم کر کے ان کی زیارت کے لیے غار میں پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن دوسری روایات ان کی وفات کے بارے میں خاموش ہیں۔

مسیحی مصادر میں بھی یہی قصہ معمولی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس واقعے کی تفصیلات ۵۲۱ء میں ساروغ (عراق) کے ایک کاہن نے جس کا نام یعقوب (یا جیمس) تھا، ایک مفصل مقالے میں لکھی تھیں۔ یہ مقالہ سریانی زبان میں تھا، پھر اس کے یونانی اور لاطینی ترجمے ہوتے رہے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۲۵۰ء میں ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں پیش آیا تھا، ان نوجوانوں کی تعداد سات تھی، اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا پیغام دنیا کو سنا کر دوبارہ اسی غار میں سو گئے۔[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مطبوعہ ۱۹۵۰ء، ص ۳۸۲ ج ۲۰، مقالہ "SEVEN SLEEPERS"

چونکہ یعقوب ساروغی نے ان کے بارے میں "دوبارہ سونے" کا لفظ استعمال کیا تھا، اس لیے بہت سے لوگوں کا اعتقاد یہ بھی ہے کہ اصحاب کہف ابھی تک زندہ ہیں، اور قیامت کے قریب دوبارہ اٹھیں گے۔

مسیحی مصادر میں تقریباً جزم کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر اُفسس کے قریب پیش آیا تھا۔ (جس کا اسلامی نام طرسوس ہے) اور وہیں پر ایک غار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ شاید انہی مسیحی روایات کے زیر اثر بہت سے مسلمان مفسرین اور مؤرخین نے بھی اصحاب کہف کا محل وقوع اُفسس ہی کو بتایا ہے۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت تفسیر ابن جریرؒ میں مروی ہے۔ جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصحاب کہف کا غار ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب (یعنی اردن میں) واقع ہے۔ اس روایت اور متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر بہت سے محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ غار اردن میں واقع ہے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ نے قصص القرآن میں اس موضوع پر بڑی مفصل بحث کی ہے اور متعلقہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد کی روشنی میں اسی کو درست قرار دیا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ارض القرآن میں اردن کے قدیم شہر پٹرا کو رقیم قرار دیا ہے۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی تفسیر معارف القرآن میں مفصل بحث کے بعد اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے، اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے بھی یہی تھی۔

ان تمام حضرات کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اردن کے مشہور تاریخی شہر پٹرا کا اصل نام رقیم تھا۔ جسے رومی حکومت نے بدل کر پٹرا کر دیا، اور یہ غار اسی کے قریب کہیں واقع تھا۔

لیکن ۱۹۵۳ء میں اردن کے محقق تیسیر ظبیان صاحب کو کسی طرح پتہ چلا کہ عمان کے قریب ایک پہاڑ پر ایک ایسا غار واقع ہے جس میں کچھ قبریں اور مردہ ڈھانچے موجود ہیں، اور اس غار کے اوپر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے، چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس غار کی تلاش میں روانہ ہوئے، یہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر واقع تھی، اس لیے کئی کیلومیٹر دشوار گذار

راستہ طے کر کے وہ اس غار کے دھانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تیسیر ظبیان صاحب کے الفاظ میں :۔

"ہم ایک اندھیرے غار کے سامنے کھڑے تھے جو ایک دور افتادہ جگہ اور ایک چٹیل پہاڑ پر واقع تھا، غار میں اس قدر اندھیرا تھا کہ ہمارا اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا، ایک چرواہے نے ہمیں بتایا کہ غار کے اندر کچھ قبریں ہیں اور ان میں بوسیدہ ہڈیاں پڑی ہیں، غار کا دروازہ جنوب کی سمت تھا، اور اس کے دونوں کناروں پر دو ستون تھے جو چٹان کو کھود کر بنائے گئے تھے، میری نظر اچانک ان ستونوں پر بنے ہوئے نقوش پر پڑی تو اس پر بیزنطی نقوش نظر آرہے تھے، غار کو ہر طرف سے پتھروں کے ڈھیروں اور ملبے نے چھپایا ہوا تھا۔ اور یہاں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی تھی جس کا نام "رجیب" تھا"[۱]

تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی تحقیق جاری رکھی، محکمۂ آثارِ قدیمہ کو متوجہ کیا، بالآخر ایک ماہر اثریات رفیق رجانی صاحب نے ماہرانہ تحقیق کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اس کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو اس رائے کی تائید میں بہت سے قرائن و شواہد ملتے چلے گئے، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ اس غار کا دہانہ جنوب کی طرف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت پوری طرح صادق ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِنْهُ،

اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ طلوع ہوتا تو ان کے غار سے دائیں جانب جھکتا ہوا

---

[۱] موقع اصحاب الکہف، مؤلفہ تیسیر ظبیان، ص ۳۹۔ مطبوعہ قاہرہ

گزرتا اور جب غروب ہوتا تو ان کے بائیں جانب سے کترا کر گزرتا، اور یہ لوگ اُس غار کے کشادہ حصے میں تھے۔

اس غار میں صورتِ حال یہی ہے کہ دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی، بلکہ طلوع و غروب کے وقت دائیں بائیں سے گزر جاتی ہے۔ اور غار کے اندر ایک کشادہ خلا بھی ہے جس میں ہوا اور روشنی آرام سے پہنچتی ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بستی کے لوگوں نے اس غار کے اوپر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس غار کے ٹھیک اوپر کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے کے بعد ایک مسجد بھی برآمد ہوئی ہے۔ جو قدیم رومی طرز کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا، اور عبد الملک بن مروان کے زمانے میں اُسے مسجد بنا دیا گیا۔

۳۔ عہدِ حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی تھی، ٹراجان تھا جو ۹۸ء سے ۱۱۷ء تک حکمراں رہا ہے، اور اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ بُت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ٹراجان نے ۱۰۶ء میں شرقِ اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا، اور اسی نے عمّان کا وہ اسٹیڈیم تعمیر کیا تھا جس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اور وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحابِ کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین تھیوڈوسیس بتاتے ہیں جو پانچویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے۔

دوسری طرف اس نئے دریافت شدہ غار کے اندر جو سکے پڑے ہوئے ملے ہیں ان میں سے کچھ ٹراجان کے زمانے کے ہیں (موقع اصحاب الکہف ص ۳۵)، جس سے اس خیال کو بہت تقویت ملتی ہے کہ یہی اصحابِ کہف کا غار ہے۔

۴۔ قرآن کریم نے اصحابِ کہف کو "اصحاب الکہف والرقیم" (غار اور رقیم والے)

کہا ہے، رقیم کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح میں مختلف آراء بیان کی جاتی ہیں، لیکن بیشتر محققین کا خیال یہ ہے کہ رقیم اُس بستی کا نام تھا جس میں ابتداً یہ حضرات آباد تھے۔ اب جس جگہ یہ غار واقع ہے وہاں سے کل سو میٹر کے فاصلے پہ ایک چھوٹی سی بستی "رجیب" کہلاتی ہے۔ رفیق الدجانی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ "رقیم" کی بگڑی ہوئی شکل ہے، کیونکہ یہاں کے بدو اکثر قاف کو جیم اور میم کو باء سے بدل کر بولتے ہیں (موقع اصحاب الکہف ص ۱۱۸) چنانچہ اب حکومتِ اردن نے اس بستی کا نام سرکاری طور پر "رقیم" ہی کر دیا ہے، بعض قدیم علماء جغرافیہ نے بھی رقیم کی بستی کو عمان کے قریب بتایا ہے، چنانچہ معروف جغرافیہ نگار ابوعبداللہ البشاری المقدسی اپنی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" میں لکھتے ہیں:

والرقیم بلد فی شرق الأردن بالقرب من عمان، حیث وجدت مغارۃ فیھا عدد من الجثث غیر البالیۃ

(موقع اصحاب الکہف ص ۹۴)

رقیم شرق اردن میں عمان کے قریب ایک شہر ہے جہاں ایک غار بھی پایا گیا ہے جس میں کچھ انسانی ڈھانچے بھی ہیں جو زیادہ بوسیدہ نہیں ہوئے۔

اس کے علاوہ علامہ یاقوت حموی نے بھی رقیم کی تشریح کرتے ہوئے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ:

إن بالبلقاء بأرض العرب من نواحی دمشق موضعا یزعمون أنہ الکھف والرقیم قرب عمان۔

دمشق کے مضافات میں جو عربی سرزمین بلقاء کہلاتی ہے، اس میں شہر عمان کے قریب ایک جگہ ہے جس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہی کہف اور رقیم ہے۔[1]

---

[1] معجم البلدان للحموی، ص ۶۱، ج ۹

(۵) تیسیر ظبیان صاحب نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اسی علاقے کے کسی غار کو اصحابِ کہف کا غار سمجھتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں بادشاہ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تو وہ راستے میں شام و حجاز کے راستے پر ایک پہاڑ سے گذرے جس کا نام جبل الرقیم تھا، اس میں ایک غار بھی تھا جس میں کچھ ڈھانچے تھے اور وہ بوسیدہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ نیز تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ وہ اس غار سے گذرے تھے اور اسے اصحابِ کہف کا غار قرار دیا تھا۔ فتوح الشام میں واقدی نے بھی حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا ایک طویل قصہ لکھا ہے کہ وہ شام کی طرف جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور راستہ بھول گئے، بالآخر بھٹکتے بھٹکتے جبل الرقیم کے پاس پہنچے تو اسے دیکھ کر پہچان گئے۔ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے، چنانچہ وہاں نماز پڑھ کر عمّان شہر میں داخل ہوئے۔ (موقع اصحاب الکہف ص ۴۶ و ۴۷ و ۱۰۳)

بہرکیف! اتنے پرانے واقعے کے محل وقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ کہنا تو مشکل ہے، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں مقام اصحابِ کہف ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے، اُن سب میں جتنے زیادہ قرائن و شواہد اس غار کے حق میں ہیں کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں۔ تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی کتاب میں افسس کے غار سے اس غار کا موازنہ بھی کیا ہے، اس موازنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

یہ غار عمّان شہر سے ۷ کیلومیٹر جنوب میں واقع ہے، اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمّان تک گئی ہے، اس سے اس کا فاصلہ ۳ کیلومیٹر ہے۔ ہم تقریباً نو بجے صبح یہاں پہنچے۔ اب کاروں کیلئے پہاڑ کے اُوپر تک جانے کے لیے راستہ بنا دیا گیا ہے۔ کار سے اُتر کر تھوڑا سا اُوپر چڑھے تو ایک کشادہ صحن سا ہے جس میں قدیم طرزِ تعمیر کے کچھ ستون وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس صحن کو عبور کرکے غار کا دہانہ ہے۔ دہانہ کے فرش پر ایک خاصی چوڑے پتھر

کی بنی ہوئی ایک چوکھٹ سی ہے۔ اس سے غار کے اندر اترنے کے لیے تقریباً دو سیڑھیاں نیچے جانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر یہ غار تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک حصہ دہانے سے سیدھا شمال تک گیا ہے، دوسرا دائیں ہاتھ مشرق کی طرف مڑ گیا ہے اور تیسرا بائیں ہاتھ مغرب کی طرف۔ مشرقی اور مغربی حصوں میں آٹھ تابوت نما قبریں بنی ہوئی ہیں۔ مشرقی حصے کی ایک قبر میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی ہے۔ اس سوراخ میں جھانک کر دیکھیں تو ایک انسانی ڈھانچہ صاف نظر آتا ہے۔ اگر اندھیرا ہو تو غار کا مجاور موم بتی جلا کر اندر کا منظر دکھا دیتا ہے۔

لیکن غار کا جو حصہ جنوب سے شمال کی طرف سیدھا گیا ہے، وہ تقریباً سپاٹ ہے اور اسی کے بارے میں تیسیر ظبیان صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ "فجوہ" ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ جب ۱۹۶۱ء میں اس غار کی صفائی اور کھدائی کا کام شروع ہوا تو رفیق الدجانی کہتے ہیں کہ غار کی اسی درمیانی جگہ میں ایک جانور کا جبڑا پڑا ہوا ملا، جس میں ایک نوکیلا دانت اور چار داڑھیں محفوظ تھیں، تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ اصحاب کہف کے کتے کا جبڑا تھا۔ اس کے علاوہ اسی جگہ پر رومی، اسلامی اور عثمانی دور کے بہت سے سکے، ٹھیکری کے برتن، کوڑیوں کے ہار، پیتل کے کنگن اور انگوٹھیاں بھی پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اب یہ ساری چیزیں ایک الماری میں جمع کر کے غار کی شمالی دیوار میں محفوظ کر دی گئی ہیں جو ہم نے بھی دیکھیں۔

غار کے مشرقی حصے میں ایک اوپر کو بلند ہوتی ہوئی چھوٹی سی سرنگ ہے جو دھواں نکالنے والی چمنی کی شکل میں ہے۔ یہ سرنگ غار کی چھت پر جو مسجد بنی ہوئی ہے، اس میں جا کر نکلی ہے، لیکن جب یہ غار دریافت ہوا، اس وقت اس سرنگ کے بالائی دہانے پر ایک پتھر رکھا ہوا ملا تھا۔ اتفاق سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے لشکر کے ایک جرنیل اسامہ بن منقذ نے اپنی کتاب "الاعتبار" میں بھی ذکر کیا ہے کہ میں تیس شہسواروں کے ساتھ اس غار میں گیا، اور وہاں نماز پڑھی، لیکن وہاں ایک تنگ سرنگ تھی، اس میں داخل نہیں ہوا۔ تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ وہی تنگ سرنگ ہے۔

(موقع اصحاب الکہف، ص ۴۹)

غار کو جب صاف کر کے دیکھا گیا تو اس کی دیواروں پر خطِ کوفی اور خطِ یونانی میں کچھ عبارتیں بھی لکھی ہوئی تھیں، جو اب پڑھی نہیں جاتیں۔

غار سے باہر نکلے تو سامنے کے صحن میں ایک گول دائرہ بنا نظر آیا۔ مجاور نے بتایا کہ غار کی دریافت کے وقت یہاں ایک زیتون کے درخت کا تنا برآمد ہوا تھا۔ رفیق الدجانی صاحب نے لکھا ہے کہ زیتون کا یہ درخت بدوی دور کا ہے، اور اس کے قریب ایک مسقف قبر بھی تھی۔ اور جب ہم نے پہلے پہل یہاں کھدائی اور صفائی شروع کی تو آس پاس کے معمر لوگوں نے بتایا کہ زیتون کا یہ درخت بیس سال پہلے تک تر و تازہ تھا اور ہم اس کا پھل بھی کھایا کرتے تھے۔

غار کے ٹھیک اوپر ایک قدیم مسجد کی دیواریں ایک محراب سمیت چند فٹ تک اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب شروع میں تیسیر ظبیان اور رفیق دجانی صاحب یہاں پہنچے تھے اُس وقت یہ مسجد نظر نہیں آتی تھی۔ کھدائی اور صفائی کے بعد مسجد برآمد ہوئی۔ یہ مسجد دس میٹر لمبی اور دس میٹر چوڑی ہے اور کھدائی کے دوران اس کے بیچ میں بارہ گول ستون برآمد ہوئے جو رومی طرز کے ہیں۔ یہاں سے رومی بادشاہ جسٹن کے عہد (۵۱۸ء سے ۵۲۷ء) کے کچھ پیتل کے سکے بھی کھدائی کے دوران برآمد ہوئے۔ ڈیڑھ میٹر کے برابر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی نکلا جس کی چھت کو شاید اذان کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اسی کے قریب کچھ مٹی کے لوٹے بھی پائے گئے جو وضو میں استعمال ہوتے ہوں گے۔ یہیں سے ایک کتبہ بھی برآمد ہوا جس کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کے زمانے (۸۹۵ عیسوی) میں اس مسجد کی مرمت کی گئی تھی۔

اس تمام مجموعے سے ماہرین نے جو نتائج نکالے ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں یہاں رومیوں نے ایک عبادت گاہ بنائی تھی، عہدِ اسلام میں (غالباً عبدالملک بن مروان کے زمانے میں) اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کے طول و عرض میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس وقت اردن کے محکمۂ آثارِ قدیمہ اور محکمۂ اوقاف نے اس غار کے تحفظ اور اس کی

صفائی وغیرہ پر خاص توجہ صرف کی ہے، اس کے قریب ایک نئی مسجد بھی تعمیر کردی ہے زائرین کی سہولت کے لیے راستہ آسان بنادیا ہے، اور غار کے اندر کتبات لگا دیتے ہیں۔

بہرکیف! عہدِ حاضر کی اس عظیم قرآنی دریافت کی زیارت زندگی کے یادگار ترین تجربات میں سے ایک تھی۔ اصحاب کہف کا واقعہ دیدۂ بینا کے لیے عبرتوں کے بیشمار پہلو رکھتا ہے۔ مخدوم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے اسی واقعے کے بصائر و عبر پر ایک مستقل کتاب "معرکۂ الایمان والمادیت" کے نام سے تحریر فرمائی ہے، جو واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور قرآن کریم میں اس واقعے کا ذکر درحقیقت انہی عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے آیا ہے۔

---

(۶)

مُوتہ کا سفر:

اصحاب کہف کے اس غار کے بعد ہمارا ارادہ مُوتہ جانے کا تھا، اور وہاں سے سیدھے دمشق جانا چاہتے تھے، اس لیے ملک افضل صاحب عمان ہی میں رک گئے، اور ہمیں اس سڑک تک لے گئے جو سیدھی مُوتہ جاتی تھی، انہوں نے بتایا کہ اگرچہ وہ اس راستے سے کبھی مُوتہ نہیں گئے، لیکن انہیں معلوم ہے کہ یہ سڑک سیدھی مُوتہ جاتی ہے اور اندازہ یہ ہے کہ موتہ کا فاصلہ یہاں سے ۵۰ - ۶۰ کیلومیٹر کے قریب ہوگا۔

اسی اندازے پر اعتماد کرتے ہوئے ہم نے اس سڑک پر سفر شروع کردیا، خیال یہ تھا کہ دوپہر یا سہ پہر تک ہم وہاں سے فارغ ہوکر دمشق کی طرف روانہ ہوجائیں گے، لیکن جب اس سڑک پر سفر کیا تو یہ سفر لمبا ہوتا چلا گیا، راستے میں بیشمار بستیاں اور قصبے گذرتے رہے، ایک ڈیڑھ گھنٹے چلنے کے بعد ہم نے مقامی حضرات سے راستے کی تصدیق کرنی چاہی تو لوگوں نے بتایا کہ واقعۃً یہ سڑک سیدھی مُوتہ جارہی ہے، لیکن فاصلے کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ جب

کسی شخص سے مُوتہ اور اس کی قریبی بستی مزار کے بارے میں پوچھو، تو وہ کہتا۔
"دُغری"[1] یعنی سیدھے چلتے جاؤ۔
ایک صاحب نے اُس پر یہ بھی اضافہ کیا کہ:
"لاھیك ولا ھیك" میں یہ جناتی زبان بالکل نہیں سمجھ سکا تو قاری بشیر
صاحب نے تشریح کی کہ اس کا مطلب ہے" لاھکذا لاھکذا" "یعنی نہ ادھر نہ ادھر
بس سیدھے چلے جاؤ۔"

چنانچہ ہم سیدھے چلتے رہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ سڑک آباد میدانی علاقوں سے
ہٹ کر پہاڑی علاقے میں داخل ہونے لگی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت اُونچے پہاڑ پر
چڑھنی شروع ہوگئی، یہ پہاڑی راستہ بڑا پیچ دار بھی تھا اور خطرناک بھی، جگہ جگہ ایسے اندھے
موڑ سامنے آتے کہ چند گز کے بعد سڑک نظروں سے غائب ہو جاتی تھی، اور ہر موڑ کے بعد گاڑی
مزید بلندی پر چڑھ جاتی۔ یہاں تک کہ جب اللہ اللہ کرکے پہاڑ کی چڑھائی اترائی ختم ہوئی
تو ایک اور اُس سے بھی اُونچا سر بفلک پہاڑ سامنے آگیا، دیکھا کہ ایک درمیانی ندی عبور
کرنے کے بعد اب سڑک دوسرے پہاڑ پر چڑھ رہی ہے۔ یہ دوسری چڑھائی پہلے سے بھی
زیادہ خطرناک تھی، اور اُوپر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ہم شاید کئی ہزار فٹ اُوپر آچکے ہیں مسلسل
پیچ دار چڑھائی عبور کرنے سے عطاء الرحمٰن صاحب کو گاڑی چلاتے ہوئے کچھ چکر سا بھی آنے
لگا تھا، اس لیے چوٹی پر پہنچ کر ہم تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ پہاڑ کے دونوں طرف دُور
تک پھیلی ہوئی وادیوں اور ان کے درمیان بہتے ہوئے چشموں کا بڑا دلکش منظر نظروں
کے سامنے تھا۔ وادیوں میں چرتے ہوئے مویشی رینگتی ہوئی چیونٹیوں کی طرح نظر آرہے
تھے، یہاں سردی بھی زیادہ تھی، لیکن کھلی ہوئی دھوپ نے اس خنکی کو بہت خوشگوار بنا دیا تھا
اس حسین منظر اور پُرکیف فضا سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی دامنگیر تھی
کہ نہ جانے مُوتہ ابھی کتنی دُور ہے؟ ان انجانے راستوں پر ابھی اور کونسی گھاٹیاں آنے والی ہیں

---

[1] غالباً یہ ترکی لفظ ہے، جو شام اور اردن کی عوامی زبان میں "سیدھے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اور ہم سب وہاں سے دمشق کے لیے روانہ ہوسکیں گے؟ اگر شام اسی علاقے میں ہوگئی تو رات کو بے وقت دمشق کا سفر مناسب بھی ہوگا یا نہیں؟ ان سوالات کے ساتھ ساتھ ذہن تقریباً چودہ سو سال پیچھے لوٹ گیا۔ تین روز سے ہم جن لق و دق صحراؤں چٹیل میدانوں اور سر بفلک پہاڑوں کا نظارہ کرتے آرہے تھے، یہ سب اُن مجاہدینِ اسلام کے راستے کی منزلیں تھیں جو اِن اَنجانے راستوں پر ایمان کی مشعلیں روشن کرنے کے لیے نکلے تھے' اور جن کے لیے یہ راستے صرف اجنبی ہی نہ تھے' بلکہ ہر موڑ پر یہ خطرہ بھی تھا کہ یہ دشمن کی کوئی کمین گاہ نہ ہو، لیکن نہ ان کے عزم و استقامت کو کوئی پہاڑ جنبش دے سکا، نہ راستے کی صعوبتیں اُنہیں ڈگمگا سکیں' وہ ہر مشکل سے مشکل راستے پر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے بڑھتے رہے' یہ کٹھن اور سنگلاخ چٹانیں ان کی راہ کا غبار بن کر ان کا منہ تکتی رہ گئیں' اور ان کے عزم و ثبات کا قافلہ منزلوں آگے نکل گیا۔

یہ غازی' یہ تیرے پُراسرار بندے | جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا | سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اس کوہستان سے کسی طرح باہر نکلے تو میدانی علاقہ شروع ہوگیا یکے بعد دیگرے بہت سی بستیاں گذرتی رہیں، ہم عمان سے روانہ ہونے کے بعد شاید ڈیڑھ سو کیلومیٹر سفر طے کر چکے تھے، اس کے بعد کہیں منزلِ مقصود کے آثار شروع ہوئے۔ لوگوں نے بتایا کہ اب مُوتہ قریب ہی ہے۔ راستہ پوچھتے پوچھتے بالآخر ہم مُوتہ پہنچ ہی گئے۔ آج مُوتہ کے میدانِ جنگ کے شمال میں ایک شاندار یونیورسٹی "جامعہ مُوتہ" ہی کے نام سے بنی ہوئی ہے' ہم نے گاڑی اس کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑی کی، اور لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے مُوتہ کے میدانِ جنگ کا راستہ بتا دیا۔ اس میدان کے شمالی کنارے پر کچھ بوسیدہ عمارتوں کے کھنڈر باقی ہیں' اور ایک مُجاور یہاں زائرین کی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ شمال میں حدِ نظر تک ایک میدان پھیلا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ نشیب و فراز نظر آتے تھے۔ مُجاور نے بتایا کہ یہ میدان معرکۂ مُوتہ کے وقت سے آج تک ایک ہی حالت میں ہے' اور یہاں کبھی کوئی انقلابی تغیر نہیں آیا۔

غزوۂ مُوتہ :

غزوۂ مُوتہ ۸ھ میں پیش آیا، اور اس کا واقعہ یہ ہُوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت حارث بن عمیر ازدی رضؓ کو بصریٰ (شام) کے بادشاہ کے پاس دعوتِ اسلام کے لیے ایک مکتوب گرامی دے کر بھیجا تھا، ابھی وہ بصریٰ پہنچے بھی نہ تھے کہ راستے میں شرحبیل بن عمرو غسانی نے اُنہیں گرفتار کر کے بصریٰ کے حاکم کے پاس پیش کر دیا، اور اُس نے آپ کو قتل کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچیوں میں حضرت حارث بن عمیرؓ وہ تنہا ایلچی ہیں جنہیں اس طرح شہید کیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو آپؐ کو شدید صدمہ ہُوا۔ ایلچی کو قتل کرنا اُس دَور میں بھی بین الاقوامی قوانین اور رسم ورواج کے مطابق بدترین بدعہدی اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت تھی، اور یہ انتہائی پست قسم کا اعلانِ جنگ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اُس وقت مسلمان طرح طرح کے مسائل میں گھرے ہوئے تھے ابھی مکہ مکرمہ بھی فتح نہیں ہُوا تھا، اور ایسے میں شام اور روم کی طاقت سے ٹکرا کر ایک نیا خطرناک محاذ کھولنا آسان نہ تھا، لیکن ایک صحابی ـــ اور وہ بھی ایلچی ـــ کو اس طرح بلاوجہ شہید کر دینا بھی ایسی بات نہ تھی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو کر بیٹھ جاتے۔

آپؐ نے اس موقع پر صحابۂ کرامؓ کو جمع کر کے انہیں اس حادثے سے باخبر فرمایا۔ اور ساتھ ہی ایک لشکر ترتیب دیا جس کی سربراہی اپنے متبنّیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سونپی۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر حضرت زید بن حارثہؓ شہید ہو جائیں تو آپؐ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کو امیر بنایا جائے، اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کو امیرِ لشکر قرار دیا جائے۔ اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان باہمی مشورے سے جس کو چاہیں امیر منتخب کر لیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح یکے بعد دیگرے تین امیروں کو نامزد فرمانا

ایک غیر معمولی بات تھی، اور اس میں بظاہر یہ اشارہ بھی تھا کہ یہ تینوں بزرگ اس معرکے میں شہادت سے سرفراز ہوں گے، چنانچہ ایک یہودی جو آپؐ کی یہ گفتگو سُن رہا تھا، اُس نے حضرت زید بن حارثہؓ سے کہا کہ: "بنی اسرائیل میں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی نبی کسی مہم پر بھیجتے وقت یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں کے بارے میں یہ کہے کہ اگر فلاں شہید ہو گیا تو ایسا کرنا تو وہ ضرور شہید ہوتا تھا، لہٰذا اے زید! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی نبی ہیں تو تم اب واپس لوٹ کر اُن کے پاس نہیں آؤ گے" یہودی شاید یہ سمجھتا ہو گا کہ حضرت زیدؓ یہ سُن کر خوفزدہ ہوں گے، لیکن حضرت زیدؓ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"تو سُن لو! میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ سچے اور پاکباز نبی ہیں"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے حضرت زید بن حارثہؓ کو جھنڈا عنایت فرمایا، اور تین ہزار صحابہ کرامؓ پر مشتمل یہ لشکر اس طرح مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس اور مدینہ طیّبہ کے باشندوں کا ایک بڑا مجمع اسے الوداع کہنے کے لیے ثنیّۃ الوداع تک آیا، جب لشکر وہاں سے روانہ ہوا تو مجمع نے دُعا دی:

صحبکم اللہ ودفع عنکم، وردکم صالحین غانمین

اللہ تمہارا ساتھی ہو، اللہ تم سے بلائیں دُور کرے، اللہ تمہیں صحیح سلامت کامیاب و کامران واپس لائے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ بڑے قادر الکلام شاعر تھے؛ انہوں نے یہ فقرہ سُنا تو یہ اشعار پڑھے۔

لکننی أسأل الرحمٰن مغفرۃً — وضربۃ ذات فرغ تقذف الزبدا

أو طعنۃ بیدی حرّان مُجھزۃ — بحربۃ تنفذ الأحشاء والکبدا

حتی یقال إذا مروا علی جدثی — أرشدہ اللہ من غاز وقد رشدا

---

[1] مغازی الواقدی، ص ۷۵۶، ج ۲۔

"لیکن مَیں تو اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں"
"اور تلوار کی ایسی ضرب کا طالب ہوں جو پھیلتی چلی جائے اور خون کی جھاگ اُبال کر رکھ دے"
"یا پھر کسی حرّانی شخص کے ہاتھوں نیزے کے کاری وار کا"
"ایسے نیزے کے ذریعے جو آنتوں اور جگر کے پار ہو جائے"
"یہاں تک کہ جب لوگ میری قبر کے پاس سے گذریں تو کہیں"
"کہ اس غازی کو اللہ نے ہدایت دی تھی، اور وہ ہدایت کی منزل پا گیا"[1]

اس شان سے شوقِ شہادت کی اُمنگیں دل میں لیے ہوئے یہ قافلہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ذہن میں یہ تھا کہ بُصریٰ کے حاکم سے مُقابلہ ہوگا، بظاہر اس بات کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ روم کی وہ زبردست طاقت تین ہزار افراد کے اس انتقامی حملے کو اتنی اہمیت دے گی کہ اپنی پوری فوجی طاقت اس کے مقابلے پر لے آئے۔ لیکن جب صحابۂ کرامؓ اردن کے علاقے معان میں پہنچے (یہ علاقہ اب بھی اسی نام سے موجود ہے، اور اردن کا ایک اہم شہر سمجھا جاتا ہے) تو پتہ چلا کہ روم کا بادشاہ ہرقل ایک لاکھ کا لشکر لے کر بذاتِ خود مآب تک پہنچ چکا ہے، اور لخم، جذام، قین اور بہراء وغیرہ کے قبائل نے ایک لاکھ افراد مزید ان کی مدد کے لیے فراہم کر دیے ہیں — اس غیر متوقع خبر کا مطلب یہ تھا کہ تین ہزار کا مقابلہ دو لاکھ سے ہوگا!

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال غور اور مشورے کی متقاضی تھی۔ چنانچہ صحابۂ کرامؓ نے معان میں ایک مشاورتی اجلاس منعقد کیا۔ بہت سے حضرات نے یہ رائے دی کہ اس صورتِ حال کا چونکہ پہلے اندازہ نہیں تھا، اس لیے مناسب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع بھجوائی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ یہ خبر سُن کر کچھ کمک روانہ فرمائیں یا کوئی اور حکم دیں۔ بات بظاہر معقول تھی، اور ظاہر اسباب کے تحت جنگی تدبیر کا تقاضا بھی یہی تھا چنانچہ

---

[1] سیرت ابن ہشام مع الروض الأنف، ص ۲۵۶، ج ۲ -

بہت سے صحابۂ کرامؓ اسی رائے پر عمل کرنے کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ لیکن اتنے میں ہی حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کھڑے ہوئے اور یہ ولولہ انگیز تقریر فرمائی:۔

"اے قوم! جس چیز سے تم اس وقت گھبرانے لگے ہو، خدا کی قسم یہ وہی چیز ہے جس کی تلاش میں تم وطن سے نکلے تھے ۔۔۔ اور وہ ہے شہادت! یاد رکھو کہ ہم نے جب بھی کوئی جنگ لڑی ہے تو نہ کثرتِ تعداد کی بنیاد پر لڑی ہے، اور نہ ہتھیاروں اور گھوڑوں کی بنیاد پر، میں بدر میں شریک تھا تو خدا کی قسم! ہمارے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ میں احد میں شامل تھا تو ہمارے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ ہاں ہم نے جس بنیاد پر ہمیشہ جنگ لڑی ہے وہ ہمارا یہ دین ہے جس کا اعزاز اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ آگے بڑھو، دو سعادتوں میں سے ایک سعادت یقیناً تمہارا مقدر ہے۔ یا تو تم دشمن پر غالب آجاؤ گے، اور اس طرح اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا وہ وعدہ پورا ہو گا جو کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا، یا پھر تم شہید ہو کر جنت کے باغات میں اپنے بھائیوں سے جا ملو گے"[1]

بس پھر کیا تھا؟ تمام صحابۂ کرامؓ شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر جہاد کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ لشکر معان سے روانہ ہو کر پہلے مشارف اور پھر موتہ میں مقیم ہوا، اور پھر موتہ ہی کے اس میدان میں یہ زبردست معرکہ پیش آیا، دونوں لشکر مقابل ہو کر گتھ گئے۔ جنگ کے دوران حضرت

---

[1] "یاقوم! واللہ إن التی تکرھون للتی خرجتم تطلبون، الشھادۃ! (ابن ہشام ص ۲۵۷ ج ۲ وعیون الاثر ص ۱۹۹) واللہ ما کنّا نقاتل الناس بکثرۃ عدد، ولا بکثرۃ خیول، إلّا بھذا الدین الذی أکرمنا اللہ بہ۔ انطلقوا! واللہ لقد رأیتنا بدر ما معنا إلا فرسان۔ ویوم أُحد فرس واحد۔ وإنما ھی إحدی الحسنیین، إما ظھور علیھم فذلک ما وعدنا اللہ ووعدنا نبیّنا، ولیس لوعدہ خلف، إما الشھادۃ۔ فنلحق بالإخوان نرافقھم فی الجنان" (مغازی الواقدی ص ۷۶۰ ج ۲)

زید بن حارثہؓ شہید ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے پرچم اٹھالیا، گھمسان کے رَن میں چاروں طرف سے نیزوں اور تیروں کی بارش ہو رہی تھی، حضرت جعفرؓ کے لیے گھوڑے پر بیٹھنا مشکل ہوگیا، نتیجہ یہ کہ وہ گھوڑے سے اُتر پڑے، اور پیدل دُشمن کی صفوں میں گھس گئے، کسی نے وار کیا تو دایاں ہاتھ جس میں پرچم سنبھالا ہوا تھا، کٹ کر گر گیا، حضرت جعفرؓ نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا، کسی نے اُس ہاتھ پر بھی وار کیا۔ اب دونوں ہاتھ کٹ گئے، حضرت جعفرؓ کو جیتے جی اس پرچم کو چھوڑنا گوارا نہ تھا، انہوں نے اُسے کٹے ہوئے بازوؤں میں دبا کر روکے رکھنے کی کوشش کی، لیکن تیسرے وار نے اُنہیں اپنی منزل پر پہنچا دیا۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ بعد میں ان کی نعش مُبارک دیکھی گئی تو ان کے جسم پر نیزے اور تلواروں کے پچاس زخم شمار کیے گئے۔ جن میں سے کوئی ان کی پشت پر نہیں تھا[1] - رضی اللہ عنہ وارضاہ -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمُودہ ترتیب کے مُطابق اب حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی باری تھی، انہوں نے عَلَم اٹھایا، اور دشمن کی طرف بڑھنے لگے۔ نہ جانے کب سے کوئی غذا پیٹ میں نہیں گئی تھی، اس لیے چہرے پر شاید بھوک کی نقاہت کے آثار نمایاں ہوں گے، اُن کے ایک چچازاد بھائی نے دیکھا تو گوشت کی چند بوٹیاں کہیں سے لاکر ان کے سامنے پیش کیں کہ "ان دنوں میں آپ نے بہت محنت اُٹھائی ہے، یہ کھا لیجئے، تاکہ کم از کم اپنی پیٹھ سیدھی رکھ سکیں۔" حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے گوشت ان کے ہاتھ سے لے کر کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک گوشے سے مسلمانوں پر شدید حملے کی آواز سنائی دی، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے اپنے آپ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "اِس حالت میں تم دُنیا کے کام میں لگے ہوئے ہو؟" یہ کہہ کر گوشت چھوڑ دیا، تلوار اُٹھائی، اور دُشمن کے پَروں میں جا گھسے، اور وہیں پر لڑتے لڑتے جانِ جاں آفریں کے سپرد کر دی[2] - رضی اللہ عنہ وارضاہ

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی باب ۴۴ - حدیث ۴۲۶۰،

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۸، ج ۲ -

ان تین بزرگوں کے بعد کسی کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز نہیں فرمایا تھا، بلکہ اسے مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ حضرت ثابت ابن اقرمؓ نے زمین سے جھنڈا تو اٹھا لیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں سے کہا کہ: "اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنانے پر متفق ہو جاؤ" لوگوں نے کہا کہ "بس آپ ہی امیر بن جائیے" لیکن حضرت ثابت بن اقرمؓ اس پر راضی نہ ہوئے بالآخر مسلمانوں نے اتفاقِ رائے سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو امیر مقرر کر لیا۔ حضرت ثابتؓ نے پرچم ان کے حوالے کر دیا، حضرت خالدؓ بے جگری سے لڑے، اور اُس روز ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں[1]۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی اور حضرت خالدؓ مسلمانوں کے لشکر کو بحفاظت واپس لانے میں کامیاب ہو گئے[2]۔

اُدھر مدینہ طیبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جنگ کے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ ابھی شام سے کوئی ایلچی جنگ کی خبر لے کر نہیں آیا تھا، کہ ایک روز آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ: "جھنڈا زیدؓ نے اٹھایا تھا، وہ شہید ہو گئے، پھر جعفرؓ نے اٹھایا وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہؓ نے اٹھایا، وہ بھی شہید ہو گئے" یہ فرما کر سرکارؐ کی مبارک آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پھر فرمایا: "یہاں تک کہ جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار حضرت خالدؓ نے اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرما دی"[3]۔

حضرت اسماء بنت عمیسؓ، جو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی اہلیہ تھیں فرماتی ہیں کہ

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر ۴۲۶۵۔

[2] اس جنگ کے انجام کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو مکمل فتح ہوئی تھی، بعض سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان دشمن کے لشکر کے ایک دستے پر فتح پا کر باہر نکل آئے تھے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ کی کامیابی یہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو بحفاظت واپس لے آئے۔ بہر صورت دو لاکھ افراد سے تین ہزار کے مقابلے کا ان تینوں میں سے جو بھی انجام ہوا ہو، یہ مسلمانوں کی ایک اہم کامیابی تھی۔

[3] صحیح البخاری، حدیث ۴۲۶۲،

انہی دنوں میں اپنے گھر میں تھی، اور میں نے اپنے بچوں کو نہلا دُھلا کر تیار کیا تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف لائے، آپ نے بچوں کو بُلایا، اُنہیں گلے لگا کر پیار کرنے لگے، میں نے دیکھا کہ آپ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں، میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ رو کیوں رہے ہیں؟ کیا جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کوئی خبر آئی ہے؟"

آپ نے فرمایا: "آج وہ شہید ہوگئے۔"

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ یہ سُنکر میری چیخ نکل گئی، عورتیں میرے پاس جمع ہونے لگیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے، اور گھر جا کر فرمایا کہ "جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا بنا کر بھیج دو۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر یہ بشارت بھی دی کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جعفرؓ کو ان کے ہاتھوں کے بدلے دو ایسے بازو عطا فرمائے جن کے ذریعے وہ جہاں چاہیں اُڑ کر چلے جاتے ہیں۔[2] اسی لیے حضرت جعفرؓ کا لقب "طیّار" (اڑنے والا) مشہور ہوگیا۔

میدانِ مُوتہ:

یہ واقعات کتابوں میں پڑھے ہوئے تھے، اور آج وہی میدان گنہگار نگاہوں کے سامنے تھا۔ جہاں صحابۂ کرامؓ نے اپنے مقدس خون سے جانبازی اور فداکاری کی یہ تاریخ لکھی تھی۔ تصور کی نگاہیں اس میدان کے مختلف گوشوں میں اس معرکۂ رستخیز کے مختلف مناظر دیکھتی رہیں جس نے ان حضراتِ صحابہؓ کو فرشتوں سے بھی بلند مقام عطا فرمایا۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

---

[1] سیرت ابن ہشام، ص ۲۵۹، ج ۲،

[2] ایضاً ص ۲۵۸، ج ۲،

ابھی ذہن ان تصورات میں گم تھا کہ اس میدان کے مقامی مجاور نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ "یہ حضرت زید بن حارثہؓ کا مقامِ شہادت ہے" یہاں چند فٹ اونچا ایک پتھروں کا بنا ہوا استون نصب تھا، اور اس پر ڈھندلے حروف میں لکھی ہوئی یہ عبارت پڑھی جا سکتی تھی کہ: "ھنا استشھد زید بن حارثه (حضرت زید بن حارثہؓ اس مقام پر شہید ہوئے)" — اسی سے کچھ فاصلے پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا مقامِ شہادت بیان کیا جاتا ہے۔ وہاں پر بھی اسی قسم کا ایک ستون کھڑا ہوا ہے۔ مجاور نے بتایا کہ یہاں سے جنوب میں تقریباً ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر میدان کے بیچوں بیچ ایک جگہ ہے، جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ وہاں شہید ہوئے تھے، اس جگہ ایک زیرِ زمین سرنگ سی بنی ہوئی ہے، مجاور کے کہنے کے مطابق کسی زمانے میں یہاں یہ بات مشہور تھی کہ اس سرنگ سے خوشبو آتی ہے۔ کوئی شخص اس کی تحقیق کے لیے اندر داخل ہوا، لیکن پھر واپس نہیں آسکا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے مزارات اس میدان سے کافی فاصلے پر ایک بستی میں واقع ہیں۔ اس بستی کا نام غالباً انہی مزارات کی وجہ سے "مزار" مشہور ہے۔ چنانچہ ہم لوگ میدان موتہ سے اس بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت زید بن حارثہؓ:

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ صحابۂ کرامؓ میں کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں، تمام صحابۂ کرامؓ میں یہ امتیاز انہی کو حاصل ہے کہ اُن کا نام قرآن کریم میں مذکور ہے۔ (فلما قضی زید منها وطرا ...... سورة الاحزاب) یہ اعزاز کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہے، اسی طرح آپ کی ایک امتیازی سعادت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) بنایا ہوا تھا۔ اور اس کا واقعہ بھی

بڑا عجیب ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضؓ کے والد (حارثہ) قبیلۂ بنو کعب سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی والدہ سُعدیٰ بنو معن کے قبیلے سے۔ حضرت زیدؓ کے لڑکپن کے زمانے میں ان کی والدہ اپنے میکے گئیں تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ جاہلیت کا زمانہ تھا، اور قبائل عرب کے درمیان جنگیں چلتی ہی رہتی تھیں۔ حضرت زیدؓ کی ننھیال پر ایک دشمن قبیلہ حملہ آور ہوا، اور اس زمانے کے دستور کے مطابق وہ حضرت زیدؓ کو قید کر کے لے گیا، اور انہیں غلام بنا لیا۔ یہ بیچارے اپنے والدین سے دُور غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جب عکاظ میں میلہ لگا تو ان کا آقا انہیں اس میلے میں بیچنے کے لیے لایا، اتفاق سے وہاں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حضرت حکیم بن حزامؓ (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے) تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے چار سو درھم میں یہ غلام اپنی پھوپی حضرت خدیجہؓ کے لیے خرید لیا۔

اس کے بعد جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تو انہوں نے حضرت زید بن حارثہؓ کو بطور غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا، اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باقاعدہ غلامی میں آگئے۔

اُدھر حضرت زیدؓ کے والد حارثہ اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ان کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا تھا، اُنہی کی یاد میں انہوں نے یہ شعر بھی کہا کہ ؎

بکیت علی زید ولم أدر ما فعل

أحیٌّ فیرجیٰ أم أتی دونه الأجل

"میں زید پر روتا ہوں، معلوم نہیں کہ اس کا کیا بنا؟"

"پتہ نہیں کہ وہ زندہ ہے کہ کبھی اس سے ملنے کی امید کی جائے، یا اس کو موت آچکی ہے"۔

جب حج کا موسم آیا تو بنو کلب کے کچھ لوگ حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آئے، وہاں انہوں نے حضرت زیدؓ کو دیکھا تو پہچان گئے، اور حضرت زیدؓ نے بھی انہیں پہچان لیا، اور ان سے کہا کہ میرے گھر والوں کو میرا یہ شعر پہنچا دینا:

أحنّ إلى قومي وإن كنت نائيا
بأنّي قطين البيت عند المشاعر

یعنی " میں اپنی قوم کو اب بھی یاد کرتا ہوں، اگرچہ میں دور ہوں"
" اور مقاماتِ مقدسہ کے پاس بیتُ اللہ کا مجاور بن چکا ہوں"
یہ لوگ جب واپس پہنچے تو انہوں نے حضرت زیدؓ کے والد کو سارا واقعہ بھی سنایا، اور حضرت زیدؓ کا پتہ بھی بتا دیا۔ حارثہ اور حضرت زیدؓ کے چچا کعب ان کی تلاش میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ پتہ چلا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بنے ہوئے ہیں، وہ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، آپؐ اُس وقت مسجدِ حرام میں تشریف فرما تھے، انہوں نے آکر عرض کیا کہ :

" آپ عبد المطلب کے بیٹے ہیں، وہ اپنی قوم کے سردار تھے، آپ لوگ حرم کعبہ کے پاسبان ہیں، اور آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ غلاموں کو آزاد کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہمارا بیٹا آپ کا غلام ہے۔ ہم اس کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں، آپ ہم پر احسان کیجیے، جو فدیہ بھی آپ طلب کریں، ہم وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں، انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیجیے، وہ غلام زید بن حارثہ ہیں"
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " یہ تو کچھ مشکل بات نہیں، مَیں ابھی ان کو بُلا لیتا ہوں، اُن سے اُن کی مرضی معلوم کر لیجیے، اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہیں تو مَیں کسی فدیہ کے بغیر انہیں آپ کے حوالے کر دوں گا، لیکن اگر انہوں نے خود میرے ساتھ ہی رہنا پسند کیا تو جو شخص میرے ساتھ رہنا پسند کرے، اسے چھوڑ کر فدیہ لینا مجھ سے نہ ہو سکے گا"
انہوں نے کہا: " آپ نے ہماری آدھی سے زیادہ مشکل تو حل کر دی"
(ان کا خیال تھا کہ حضرت زیدؓ یقیناً اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانا پسند کریں گے۔)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو بلوا کر اُن سے پوچھا کہ: " ان دونوں کو پہچانتے ہو؟"
حضرت زیدؓ نے فرمایا: " جی ہاں، یہ میرے والد ہیں، اور وہ میرے چچا۔"

آپؐ نے فرمایا: "تم میرے ساتھ ایک مدت تک رہ چکے ہو، اب تمہیں اختیار
ہے، چاہو تو میرے ساتھ رہو، اور چاہو تو ان کے ساتھ۔"

حضرت زیدؓ نے جواب دیا: "میں آپ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا،
آپ میرے باپ بھی ہیں اور چچا بھی۔"

باپ اور چچا نے یہ سنا تو چیخ پڑے: "زید! تمہیں کیا ہوگیا؟ تم آزادی پر غلامی کو
اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں پر ایک اجنبی کو ترجیح دے رہے ہو؟"

حضرت زیدؓ نے جواب دیا: "جی ہاں! میں نے ان صاحب کے پاس ایک ایسی چیز
دیکھی ہے کہ اس کے بعد ان کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کی یہ گفتگو سنی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر
حطیم کی طرف لے گئے، اور بلند آواز سے فرمایا:

"تمام لوگ گواہ رہیں کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث ہوگا، اور میں اس کا[1]

حضرت زیدؓ کے والد اور چچا نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی مطمئن ہو گئے، اور خوش دلی
سے واپس چلے گئے۔[2] اس کے بعد لوگ حضرت زیدؓ کو "زید بن حارثہ" کے بجائے "زید بن محمدؐ"
کہنے لگے، یہاں تک کہ قرآن کریم میں سورۂ احزاب کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ
حکم دیا گیا کہ متبنّٰی کو بھی اس کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کرکے پکارنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی جنگی مہمات کا امیر حضرت زید بن حارثہؓ
کو بنایا، اور اس طرح یہ عملی سبق دیا کہ اسلام میں فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے، غلامی
اور آزادی نہیں، یہاں تک کہ آخری بار غزوۂ مؤتہ کی سربراہی انہیں سونپی گئی۔ اور وہ

---

[1] شروع میں منہ بولے بیٹے کو وارث بنایا جا سکتا تھا، بعد میں قرآن کریم نے یہ حکم منسوخ فرما دیا۔
اب کوئی منہ بولا بیٹا وارث نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ بعد میں یہ حکم بھی آگیا کہ انبیاء کرام
علیہم السلام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔

[2] یہ پورا واقعہ حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابہ" (ص ۵۴۵ و ۵۴۶، ج ۱) میں نقل فرمایا ہے۔

شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت وصحبت کی خاطر اپنے باپ، چچا اور پورے خاندان کو چھوڑ دیا تھا، اللہ کے دین کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ایک ہزار کیلومیٹر کے فاصلے پر اس اجنبی سرزمین میں آسودہ ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

حضرت زید بن حارثہؓ کے مزارِ مبارک کے ساتھ ایک عالیشان مسجد بنی ہوئی ہے، ہم نے نمازِ ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔

حضرت جعفر طیارؓ کے مزار پر:

یہاں سے کچھ فاصلے پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، وہاں بھی حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت ملی۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے جو عمر میں ان سے دس سال بڑے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکل و شباہت بہت ملتی تھی، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اشبهت خَلقی و خُلقی" (بخاری ومسلم)

تم صورت میں بھی میرے مشابہ ہو، اور اخلاق میں بھی۔

حضرت جعفرؓ غریب نواز بہت تھے، غریبوں اور مسکینوں کی بہت مدد کرتے تھے، اس لیے ان کا لقب "ابو المساکین" مشہور ہوگیا تھا، اور حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جعفر بن ابی طالبؓ تمام لوگوں سے افضل ہیں"۔ آپ نے کفار کے ظلم وستم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، اور آپ ہی نے نجاشی کے دربار میں وہ پُر اثر تاریخی تقریر فرمائی جس کے نتیجے میں نجاشی مسلمان ہوئے۔ چنانچہ جب آپ حبشہ سے غزوۂ خیبر کے موقع پر واپس تشریف لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکل کر آپ کا استقبال فرمایا، اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ یہ واقعہ ۷ھ کا واقعہ ہے، اور اگلے ہی سال ۸ھ میں غزوۂ موتہ پیش آگیا جس میں آپ کی فداکارانہ شجاعت اور شہادت کا واقعہ پیچھے آ ہی چکا ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

حضرت عبداللہ بن رُوَاحہؓ :

یہاں سے کچھ فاصلے پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا مزار تھا، وہاں بھی حاضری ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ انصاری صحابی ہیں، اسلام سے پہلے یہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے، اور ان کے اشعار پورے عرب میں پھیلے ہوئے تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد باقاعدہ شاعری ترک کر دی تھی۔ ایک جہاد کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان سے فرمائش کی کہ "اپنے اشعار سے قافلے کو گرماؤ۔" حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے جواب دیا کہ "یارسول اللہ! میں یہ باتیں چھوڑ چکا ہوں" حضرت عمرؓ نے انہیں ٹوکا، اور فرمایا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنکر اسے ماننا چاہیئے۔" اس پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے موقع کی مناسبت سے یہ اشعار پڑھے:

یا رب لولا أنت ما اهتدینا ولا تصدقنا ولا صلّینا

فأنزلن سکینة علینا وثبّت الأقدام إن لاقینا

إن الکفار قد بغوا علینا وإن أرادوا فتنة أبینا

"اے پروردگار! آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی"

"نہ ہم صدقہ کر سکتے، نہ نمازیں پڑھ سکتے"

"اب آپ ہی ہم پر سکینت نازل فرمایئے"

"اور جب ہم دشمن کے مقابل ہوں تو ہمیں ثابت قدم رکھیئے"

"کفار نے ہمارے خلاف سر اٹھایا ہوا ہے"

"اگر وہ فتنہ برپا کرنا چاہیں گے تو ہم کرنے نہیں دیں گے۔"

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقع پر مسجد حرام میں داخل ہوئے، اور طواف کے لیے آگے بڑھے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ آپ کے ساتھ تھے، اور آپ کے لیے راستہ بناتے ہوئے چل رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بھی متعدد جنگی مہمات میں امیر بنایا، اور

آخری بار غزوۂ مُوتہ میں آپ سربراہ لشکر بنے، جس میں آپ کے شوقِ شہادت اور جذبۂ سرفروشی کے واقعات پیچھے گذر چکے ہیں۔[1]

غزوۂ مُوتہ کے میدان اور تینوں بزرگوں کے مزارات پر حاضری اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی سکینت و طمانینت آج کے دن کا وہ عظیم سرمایہ تھی جو زندگی بھر یاد رہے گی۔

---

(۷)

سہ پہر کا تقریباً ڈیڑھ بجا ہو گا جب ہم میدانِ مُوتہ اور شہدائے مُوتہ کی زیارت سے فارغ ہوئے۔ اب ہم یہاں سے عمّان کے راستے سیدھے دمشق جانا چاہتے تھے، لوگوں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ عمّان جانے کے لیے ایک اور راستہ نسبۃً مختصر بھی ہے اور مرکزی شاہراہ ہونے کی وجہ سے زیادہ آباد بھی۔ لیکن اس مرکزی شاہراہ پر پہنچنے کے لیے کافی دور تک ایک چھوٹی سڑک پر سفر کرنا پڑے گا۔ گاڑی میں پٹرول کم تھا، اور اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دُور چلنے کے بعد پٹرول پمپ مہیا ہو سکے گا، اس لیے چاہا کہ مزار کی بستی ہی سے پٹرول ڈلوالیں، یوں بھی اردن کے زمینی راستوں کے نقشے پر یہ ہدایت درج تھی کہ چھوٹے راستوں پر پٹرول پمپ کم ہیں، اس لیے کسی لمبے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے گاڑی میں پٹرول کی کافی مقدار کا اطمینان کر لیا کریں۔

لیکن مزار کی بستی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تلاش کرنے کے باوجود کوئی پٹرول پمپ نہ ملا۔ بعض مقامی افراد کی رہنمائی سے ایک پٹرول پمپ تک پہنچے، لیکن وہ بند پڑا تھا، اور مالک کا سُراغ نہ مل سکا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رہے سہے پٹرول کے ساتھ ہی کسی طرح مرکزی شاہراہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، اُس

---

[1] مذکورہ بالا واقعات کے لیے دیکھئے طبقات ابن سعد ص ۵۲۵ تا ۵۲۸، ج ۳،

زمانے میں وہاں ڈھائی پونے تین بجے کے قریب عصر کی اذان ہو جاتی تھی، اس لیے دن ڈھلتا جا رہا تھا۔ ہم اندھیرے سے پہلے عمان پہنچنا چاہتے تھے۔

چنانچہ اللہ کے نام پر سفر شروع کیا، لیکن کچھ دور چلنے کے بعد کار کی ایندھن کی سوئی اختتام کے آخری نشان کو چھونے لگی، دوسری طرف ہمارے چاروں طرف ریگستان تھا۔ اور سڑک اتنی سنسان کہ دُور دُور تک کسی گاڑی کا نشان نظر نہیں آتا تھا، کبھی کوئی اکا دکا گاڑی آ کے پیچھے سے گزر جاتی تھی، اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ مرکزی شاہراہ کتنی دُور ہے، کسی بھی وقت گاڑی جواب دے سکتی تھی، اور جواب دے دیتی تو اس لق و دق صحرا میں کوئی مدد ملنی مشکل تھی۔ تمام رفقاء اس صورتِ حال سے خاموش بھی تھے اور کسی قدر متفکر بھی۔ انسان کی نگاہیں صبح و شام اسباب ہی پہ لگی رہتی ہیں، اور وہ انہی اسباب کی تلاش میں دن رات سرگرداں رہتا ہے، اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہ سارے اسباب کسی مُسبّب کے ہاتھ میں ہیں، وہ مُسبّب کے بجائے اسباب ہی سے لو لگائے رکھتا ہے۔ لیکن جب کبھی ظاہری اسباب کے تمام راستے بند ہو جائیں، اور کوئی چارہ نہ رہے تو اُس وقت خدا ہی یاد آتا ہے، قرآن کریم نے انسان کی اسی کمزوری کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

اور جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اسی وقت اللہ کو پکارتے ہیں، اور اس وقت بندگی خالص اسی کے لیے کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے رہے کہ سلامتی کے ساتھ کسی پٹرول پمپ تک پہنچ جائیں، ایندھن کی سوئی بہت دُور سے پٹرول ختم ہونے کا اشارہ دیتی آ رہی تھی، لیکن گاڑی بفضلہ تعالیٰ پوری رفتار سے چلتی رہی، یہاں تک کہ سوئی کے "اختتام" کے نشان پر پہنچنے کے بعد معمولی حالات میں جتنا فاصلہ طے ہونے کی توقع ہوتی ہے، وہ بھی طے ہو گیا، لیکن گاڑی نہ رکی، اب کسی بھی لمحے خطرہ پیش آ سکتا تھا، اسی امید و بیم کے عالم میں کافی دیر بعد دُور اُفق پر ایک سڑک کی لکیر نظر آئی جس پر دونوں طرف سے گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ یہی وہ مرکزی شاہراہ تھی جس کا پتہ بتایا گیا تھا۔ دُعا دُرود کرتے کرتے بفضلہ تعالیٰ ہم اس شاہراہ پر پہنچ ہی گئے۔

اس شاہراہ پر کچھ دُور اور سفر کرنے کے بعد بائیں ہاتھ پر دو ریسٹورنٹ اور ایک پٹرول پمپ نظر آ گیا۔ نمازِ عصر ادا کی۔ اس کے بعد بھوک اپنے شباب پر تھی۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اردن اور شام میں کھانوں کی انواع و اقسام بہت سی ہوتی ہیں اُن میں سے بہت کم اپنے مُنہ کو لگتی ہیں، لیکن سیخ کے کباب (جنہیں یہاں "شیش کباب" کہا جاتا ہے) اور تکّے (جنہیں یہاں "اوصال" کہتے ہیں) یہ لوگ بہت اچھے بناتے ہیں، وہی منگوائے گئے۔

ایک طویل، پُرمشقت اور پُرخطر سفر کے بعد ایسے صاف ستھرے اور پُرفضا ریسٹورنٹ میں عافیت کے یہ لمحات، اور ایسی بھوک کے عالم میں یہ لذیذ غذا ایک مُسافر کیلئے اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ ہم دن رات ایسی عافیت اور ایسی راحت و لذّت سے نہ جانے کتنی مرتبہ بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں، مگر اکثر ان نعمتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا جب کبھی خطرات سے گذرنے کے بعد یہ چیزیں میسّر آتی ہیں، تب ان کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

کھانے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا، جب عمّان کے مضافات میں پہنچے تو سُورج کا سفینہ کنارے لگ رہا تھا، اور اس کی الوداعی کرنیں رات کی آمد کا پیغام دے رہی تھیں، ہمیں ابھی دمشق جانا تھا، معلوم ہوا کہ ایک سڑک عمّان کے باہر ہی باہر دمشق کی طرف جاتی ہے، اور شہر میں داخل ہونا نہیں پڑتا، ہم اسی سڑک پہ ہو لیے۔ یہ سڑک عمّان کی شمالی جانب میں ایک ہلالی نصف دائرہ بناتی ہوئی اردن کے دوسرے اہم شہر زرقا پہنچ گئی جو عمّان کے قریب ہی آباد ہے، بلکہ اب دونوں شہروں کی آبادیاں بڑھتے بڑھتے یک جان ہو گئی ہیں۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد "مسجد خالد بن ولیدؓ" میں ہم نے نمازِ مغرب ادا کی، اور سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ رات کے نو بجے کے قریب ہم اردن کی آخری سرحدی بستی رمثا پہنچے، جس کے بعد شام کا علاقہ شروع ہو رہا ہے۔

دریائے اردن:

یہ واقعہ جنوری ۱۹۸۶ء کا ہے۔ اس کے بعد اسی سال اکتوبر میں مجمع الفقہ الاسلامی کا سالانہ اجلاس عمّان میں منعقد ہُوا۔ اس میں شرکت کے لیے مجھے دوبارہ عمّان جانے کا

موقع ملا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس دوسرے سفر کی چند باتیں بھی ذکر کردینا مناسب ہے۔

اس مرتبہ عمان میں میرا قیام ایک ہفتہ رہا۔ لیکن مجمع کے اجلاسات کی مصروفیت اتنی تھی کہ کہیں اور جانے کا موقع کم ملا، وہاں کے ایک معروف ہوٹل ریجنسی پیلس میں قیام کا انتظام تھا، اور اسی کے ایک ہال میں اجتماعات ہوتے تھے، لہٰذا صبح و شام ہوٹل ہی میں رہنا ہوتا تھا، البتہ اجلاس کے اختتام پر منتظمین نے ایک دن شرکاء اجتماع کے لیے اجتماعی طور پر اردن کے خاص خاص مقامات کی سیاحت کا پروگرام رکھا تھا، میں اگرچہ بیشتر مقامات پہلے دیکھے ہوئے تھا، لیکن یہ قافلہ بہت سے اہلِ علم پر مشتمل تھا، وزارۃ الاوقاف کے سیکریٹری ڈاکٹر عبدالسلام العبادی (جن کی کتاب "الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ" تین جلدوں میں اپنے موضوع پر ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے) بطور رہنما ساتھ تھے، اور رفقاءِ سفر میں ڈاکٹر مصطفیٰ الزرقا، شیخ علی احمد السالوس، شیخ محمد ہشام البرہانی، شیخ عبداللطیف آل سعد اور بہت سے حضرات شامل تھے۔

اس سفر میں ہم اصحابِ کہف کے غار، بحرِ میت اور اغوار کے علاقے میں گئے، ان سب علاقوں کی تفصیل میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں، البتہ اس مرتبہ چند نئے مقامات پر جانا ہوا، ان میں سے پہلا مقام تو دریائے اردن تھا۔ بحرِ میت کی سیاحت کے بعد ہمیں منتظمین دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر لے گئے۔ جو آجکل اردن اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی لائن کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

دریائے اردن بڑا قدیم دریا ہے، یہ لمبائی میں ۲۱۹ کیلومیٹر کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ کنعان اور کچھ فلسطین اور سوریا میں ہے، اس کا تذکرہ قدیم ترین کتابوں میں پڑھنے آتے تھے، بائبل کے بہت سے صحیفوں میں جا بجا اس دریا اور اس کے کنارے پیش آنے والے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی کم از کم دو مقامات پر اس دریا کا نام لیے بغیر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پہلا ذکر سورۂ بقرہ میں ہے، جہاں حضرت طالوت کے عمالقہ کے ساتھ جہاد کا واقعہ بیان ہوا ہے، وہاں قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت طالوت نے اپنے رفقاء سے کہا تھا کہ:

إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ،

بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک دریا سے آزمائے گا پس جو شخص اس دریا کا پانی پئے گا اس کا مجھ سے تعلق نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ بلاشبہ میری جماعت سے ہے، سوائے اس کے جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے۔

قرآن کریم نے دوسری بار دریائے اردن کی طرف سورۂ روم میں اشارہ فرمایا ہے، یعنی اس جگہ جہاں ایرانی لشکر کے ہاتھوں رومیوں کی شکست کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہے۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّومُ فِيٓ أَدْنَى الْأَرْضِ،

الٓمٓ۔ روم کے لوگ نزدیک ترین زمین میں مغلوب ہو گئے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں "نزدیک ترین زمین" سے مراد دریائے اردن کی وادی ہے، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کے لشکر نے روم کے لشکر کو شکستِ فاش دی تھی۔

دریائے اردن کی وادی مختلف اقوام اور تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اسی کے کناروں پر سینکڑوں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، اور تاریخ کے جانے کتنے ابواب لکھے گئے۔ اس کے مغربی کنارے سے فلسطین کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے جسے قرآن کریم نے ہر جگہ "ارضِ مقدسہ"، "ارضِ مبارکہ" وغیرہ کے ناموں سے تعبیر فرمایا ہے۔

کتابوں میں دریائے اردن اور اس سے وابستہ تاریخی واقعات کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا تھا، اس کی بنا پر ذہن میں تاثر یہ تھا کہ یہ کوئی بڑا سا دریا ہو گا لیکن یہاں پہنچ کر دیکھا تو یہ چوڑائی میں اتنا چھوٹا ہے کہ اس کے لیے "دریا" کے بجائے "نالے" کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی ہمارے پاکستان کے دریائے سوات یا دریائے کنہار کے برابر ہو گی، اور بہت سی جگہوں پر اس سے بھی کم، اور سردی کے موسم کی وجہ سے اس میں پانی بھی بہت کم تھا۔

دریا پر ایک پُل بنا ہوا ہے جس کے مشرقی حصے پر اردن کی آخری چوکی اور ایک بڑا اسا دفاعی مورچہ بنا ہوا ہے، پُل کا تقریباً دو تہائی حصہ اردن کے قبضے میں ہے، اور باقی ایک تہائی حصہ اسرائیل کے تسلط میں، دونوں حصّوں کو ممتاز کرنے کے لیے بیچ میں ایک بڑا سا ڈرم رکھا ہوا ہے، ہم اس ڈرم تک گئے۔ اس سے آگے اسرائیل کے فوجی پہرہ دے رہے تھے، اور پُل کے مغربی کنارے پر ان کی چوکی نظر آ رہی تھی۔ بیت المقدس یہاں سے بارہ پندرہ میل سے زیادہ نہیں تھا، لیکن بیت المقدس تو کجا، ہمارے لیے اسرائیل کا ممنونِ احسان ہوئے بغیر دریا پار کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ ہماری بداعمالیوں کی پاداش مغربی کنارے پر اسرائیل کے لہراتے ہوئے پرچم کی صورت میں ہمارے سامنے تھی، دل تھا کہ حسرت و ندامت اور یاس و اضطراب کے جذبات سے پسا جا رہا تھا، لیکن ہمارے پاس اپنی بے بسی کا ماتم کرنے کے سوا اس صورت حال کا کوئی علاج نہ تھا۔ تمام رفقاء خاموش اور دم بخود تھے، کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا، شاید سب اسی قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے تھے، جب لوٹ کر واپس گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ہمارے ایک رفیق نے سکوت توڑتے ہوئے کہا:

"یہ جگہ تو سیاحت کے لیے نہیں جہاد کے لیے آنے کی تھی!"

ہم سب یہ نشتر بھی سہہ گئے اور تھوڑی دیر میں گاڑی واپس مشرق کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہاں سے ہمارا قافلہ مسجد ابی عبیدہؓ کے لیے روانہ ہوا، راستے ہی میں جمعہ کا وقت ہو گیا۔ بیشتر بلادِ عربیہ میں معمول یہ ہے کہ زوال ہوتے ہی اوّل وقت جمعہ پڑھ لیتے ہیں اور تمام مسجدوں میں ایک ہی وقت جمعہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر ایک مسجد میں جمعہ نہ ملے تو پھر کہیں نہیں مل سکتا، لہٰذا ہم نے راستے کے ایک شہر میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد ابی عبیدہؓ پہنچے، وہاں سے منتظمین ہمیں ایک قریبی بستی میں لے گئے، یہاں ایک زمیندار کے گھر میں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا، یہ کھانا اردن کے مقامی روایتی انداز میں ترتیب دیا گیا تھا، کئی بڑے بڑے تھالوں میں چاول رکھ دیئے گئے جن میں پہلے سے دہی اور چلغوزے پڑے

ہوئے تھے۔ تھال کے بیچ میں ایک مسلّم دُنبے کا گوشت اُبلا ہُوا رکھا تھا۔ اُردن کے دیہات کی روایت یہ ہے کہ معزّز ترین مہمانوں کے سامنے یہ کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ چمچوں اور چھُری کانٹے کے تکلّفات نہ تھے، دس دس بارہ بارہ آدمیوں نے ایک ایک تھال میں ہاتھوں سے کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد عمّان واپسی کے لیے دُوسرا راستہ اختیار کیا گیا جو تمام تر سرسبز و شاداب پہاڑیوں سے گذرتا تھا، قدم قدم پر کھیت اور باغات، سبزے سے لدے ہوئے پہاڑ، دل کش وادیاں اور پہاڑوں پر چڑھتی اُترتی سڑکیں۔ غرض پورا راستہ بڑا خوبصورت اور دلآویز تھا۔ راستے میں ایک قلعۃ الربض بھی دیکھا جو اس علاقے کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے تعمیر کیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب بیت المقدس پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا، اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اُسے عیسائیوں سے واگذار کرانے کے لیے اُٹھے تھے۔ یہ قلعہ پورے علاقے کا بلند ترین مقام ہے۔ اس کا رُخ مغرب کی جانب ہے، اور یہاں کے بُرج سے دُور دُور تک فلسطین کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً یہاں کی نصب شدہ منجنیق مغرب میں دشمن پر حملہ کرنے کے لیے انتہائی مؤثر ثابت ہوتی ہوگی — یہ قلعہ آج پھر کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں چشم براہ ہے۔

عصر کا وقت ہو گیا تو راستے کے ایک قصبے کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے اُترے، دیکھا تو یہ قصبہ عجلون تھا۔ حدیث کی مشہور کتاب "کشف الخفاء" کے مصنف علامہ اسمٰعیل بن محمد عجلونیؒ اسی قصبے کی طرف منسوب ہیں۔ جس مسجد میں ہم نے عصر کی نماز پڑھی، وہ بھی بڑی قدیم مسجد تھی، وہاں لگے ہوئے ایک کتبے کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام عبادی نے بتایا کہ یہ مسجد سلطان ظاہر بیبرس نے تعمیر کی تھی۔

یہاں سے روانہ ہو کر ہم مغرب کے وقت واپس عمّان پہنچے۔

مجموعی تاثرات

اردن ایک چھوٹا سا ملک ہے، اسرائیل کے مقبوضات سمیت اس کا کل رقبہ

ایک لاکھ آٹھ ہزار مربع کیلومیٹر تھا، اور عرب اسرائیل جنگ کے بعد ستانوے ہزار سات سو چالیس کیلومیٹر رہ گیا ہے۔ آبادی بارہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ زیادہ تر رقبہ خشک اور غیر آباد ہے۔ البتہ بعض علاقے بڑے زرخیز ہیں غذائی اجناس اور زیتون یہاں کی خاص پیداوار ہے، فاسفورس بھی نکلتا ہے۔ ترکی خلافت کے زمانے میں یہ اسلامی حکومت کا ایک چھوٹا سا صوبہ، بلکہ ایک ڈویژن تھا، اردن، سوریا، لبنان اور فلسطین جو آج چار خود مختار ملک ہیں، یہ چاروں مل کر شام کہلاتے تھے، جو اسلامی حکومت کا ایک صوبہ تھا، مغربی ممالک کی سازشوں سے شام چار حصوں میں تقسیم ہوا، پہلی جنگ عظیم کے بعد اردن ترکی خلافت سے الگ ہوا، اور ۱۹۴۶ء میں موجودہ شاہی خاندان نے "المملکۃ الہاشمیۃ الأردنیۃ" کے نام سے اپنی بادشاہت قائم کی۔

حکومت کے انتظام کے لحاظ سے بلاشبہ اس وقت اردن عالم اسلام کے ان چند ملکوں میں سے ہے جہاں کا نظم و ضبط اور معیار زندگی قابل تعریف ہے اور ملک کو اس معیار تک پہنچنے میں حکمرانوں کی جد و جہد کو بڑا دخل ہے۔ یہاں خواندگی کی شرح ۸۰ فیصد ہے۔ لوگوں میں تہذیب، شائستگی اور خوش اخلاقی نمایاں محسوس ہوتی ہے صفائی ستھرائی کا معیار بھی عالم اسلام کے دوسرے پسماندہ یا ترقی پذیر ملکوں سے بہتر ہے۔ سنتے ہیں کہ شاہ حسین اور ولی عہد شہزادہ حسن بہت سادگی کے ساتھ لوگوں میں گھلے ملے رہتے ہیں، سڑکوں پر جاتے ہوئے کسی شخص کو کوئی غلط کام کرتے دیکھتے ہیں تو خود کار سے اتر کر اُسے نرمی سے فہمائش کر دیتے ہیں۔

عوام کو سرکاری دفتروں میں رشوت، بدنظمی یا کام چوری کی شکایت نہیں ہے، جو شخص بھی اپنا کوئی جائز کام دفتروں میں لے کر جاتا ہے، وہ بآسانی اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ جرائم بھی بہت کم ہیں، اور بحیثیت مجموعی امن وامان کی فضا نظر آتی ہے۔

لوگوں میں خوش اخلاقی اور نرم خوئی اتنی عام ہے کہ کسی بھی شخص سے بات کر کے دل خوش ہو جاتا ہے، لوگوں میں خوش اخلاقی کا یہ معیار بلند احقر کو کسی دوسرے عرب ملک میں نظر نہیں آیا۔ ایک اجنبی اگر راستے پر جاتے ہوئے کسی جگہ ٹھٹکے تو ہر راہ گیر رک کر اس

سے دریافت کرتا ہے کہ اُسے کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔

عوام کی دینی حالت بہت اچھی نہیں تو بہت بُری بھی نہیں ہے، مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد کافی ہوتی ہے، دھوکہ فریب بہت کم ہے۔ البتہ اردن پر امریکی اثرات روز افزوں ہیں، اور ان کی وجہ سے دینی فضا بھی روز بروز خراب ہو رہی ہے، ذرائع ابلاغ سے عُریانی و فحاشی کے پرچار پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ انتہائی عُریاں اور مخربِ اخلاق فلموں کی نمائش ٹی وی کے روزمرہ کے معمول میں داخل ہے۔ اور اس لحاظ سے معاشرہ تیزی سے اخلاقی ابتری کی طرف جا رہا ہے، عُریانی و فحاشی اور شراب نوشی کی وبائیں عوام تک تو ابھی نہیں پہنچیں، لیکن ملک کے با اثر پڑھے لکھے اور دولت مند حلقوں میں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔

اُردن اپنی مختصر آبادی اور اندرونی مسائل کی کمی کی وجہ سے نفاذِ شریعت کے لیے بہترین ملک ہے، جو اگر شریعت کو اپنانے کی مثال قائم کرے تو دُنیا بھر کے لیے ایک نمونہ بن سکتا ہے، لیکن نہ حکمرانوں کو اس طرف کوئی توجہ ہے، نہ ملک میں اس مقصد کے لیے کسی مؤثر تحریک کا کوئی وجود ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہاں امریکی اثرات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں، اور ان پر روک لگانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

شام کی حدود میں:

اس جملۂ معترضہ کے بعد میں پھر جنوری ۱۹۸۶ء کے سفر کی طرف لوٹتا ہوں:۔

رمثا اردن کی آخری بستی تھی، وہاں امیگریشن وغیرہ کی کارروائی کے بعد ہم آگے جانا چاہتے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ شام کی حدود میں داخل ہونے کے لیے شامی حکومت کی طرف سے ایک رہنما گاڑی آتی ہے، اسی کی رہنمائی میں سرحد عبور کی جا سکے گی، تنہا کسی گاڑی کو جانے کی اجازت نہیں۔

چنانچہ اس گاڑی کے انتظار میں خاصی دیر لگ گئی، جب چند کاریں جمع ہو گئیں تو شامی گاڑی آئی، اور اس کی رہنمائی میں ہماری کار نے چلنا شروع کیا، رمثا کی چوکی سے نکل کر شام کی سرحدی چوکی درعہ تک پہنچنے کے لیے تقریباً دو کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

یہاں سڑک کے دونوں طرف باڑھ لگی ہوئی ہے۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ باڑھ کے پار کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بس اگلی رہنما گاڑی کی عقبی روشنی کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، یہاں تک کہ شام کی پہلی چوکی درعہ آ گئی۔

یہاں امیگریشن اور کسٹم کی کارروائی میں کافی وقت لگا۔ میرے ساتھ کچھ کتابوں کا ایک بنڈل تھا جو سعودی عرب اور اردن سے خریدی تھیں، گاڑی کے رُکتے ہی اسٹم کا ایک آدمی کتابوں کا وہ بنڈل اٹھا کر کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا۔ کسٹم کے کچھ اور لوگوں نے بعد میں کار کے دوسرے سامان کی تلاشی لی اور گاڑی کو پاس کر دیا۔ انہی سے کتابوں کا اتہ پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ایک دفتر کا پتہ بتایا کہ وہاں ان کتابوں کا جائزہ لیا جائے گا، اس کے بعد وہ آپ کو واپس کر دی جائیں گی۔

رات کے دس بج چکے تھے، ابھی تک عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی تھی، امیگریشن کی کارروائی کے بعد ہم نے پہلے نماز پڑھی، اس کے بعد کتابوں کی تلاش میں کافی دیر گرداں رہے، بالآخر تلاش بسیار کے بعد کتابوں کا بنڈل مل گیا۔ یہاں سے ہمیں دمشق جانا تھا جو تقریباً سو میل دور ہوگا، اس لیے رات کے کھانے کی جگہ تھوڑا سا ناشتہ بھی کیا، اور جب یہاں سے روانہ ہوئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

درعہ سے نکلنے کے بعد دمشق جانے والی سڑک پر گھُپ اندھیرے میں چلتے رہے، جب کہیں کوئی موڑ آتا تو راستہ معلوم کرنا پڑتا، صبح آٹھ بجے سے ہم مسلسل کار میں سفر کر رہے تھے، اس لیے خواہش یہ تھی کہ جلد از جلد منزل تک پہنچ جائیں، لیکن راستہ تھا کہ لمبا ہوتا جا رہا تھا، جہاں کچھ زیادہ روشنیاں نظر آئیں خیال ہوتا کہ شاید یہی دمشق ہو، لیکن وہ کوئی اور بستی ہوتی اور اس کے پاس سے گزرنے کے بعد پھر وہی اندھیرا چھا جاتا۔ ایک دو مرتبہ راستے کے تعین کے لیے پیچھے بھی لوٹنا پڑا۔ اللہ اللہ کر کے اُفق پر ایک پہاڑ روشنیوں سے جگمگ کرتا نظر آیا جس کے دامن میں دُور تک قمقمے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ دمشق کا مشہور پہاڑ قاسیون تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے جب ہم دمشق کی حدود میں داخل ہوئے، آدھی رات

گذر جانے کے باوجود شہر کی چہل پہل برقرار تھی۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ ہوٹل کے انتخاب کے لیے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ عطاء الرحمٰن صاحب پہلے بھی دمشق آ چکے تھے، انہوں نے بتایا کہ وہ مرجہ کے محلے میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں اور بھی دوسرے ہوٹل موجود ہیں، چنانچہ ہم سیدھے وہیں پہنچ گئے۔ جس ہوٹل کا ذکر عطاء الرحمٰن صاحب نے کیا تھا، اس میں کوئی جگہ خالی نہ تھی، اس لیے مولوی عطاء الرحمٰن صاحب اور مولوی امین اشرف صاحب کسی دوسرے ہوٹل کی تلاش میں چلے گئے۔ میں اور قاری بشیر صاحب ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے رہے۔

ان لوگوں کو واپس آنے میں کچھ دیر لگی تو ہم انہیں دیکھنے کے لیے باہر نکلے، کچھ دور چل کر عجیب وحشت خیز منظر آیا۔ کچھ لوگ سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے تھڑے لگائے کھڑے تھے، ان تھڑوں پر کچھ بوتلیں رکھی تھیں، اور وہ بلند آواز سے پکار رہے تھے: ”وہسکی، وہسکی، وہسکی“

دوسری طرف کچھ ناپسندیدہ وضع کے لوگ ان تھڑوں کے اردگرد ہاتھوں میں شراب لیے شور وغل کر رہے تھے۔ شراب کی اس طرح خرید و فروخت اور استعمال کا یہ کریہ منظر میں نے اس سے پہلے کم از کم کسی مسلمان ملک میں نہیں دیکھا تھا ـــــ اندازہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ اچھے لوگوں کا نہیں ہے، یہاں سے کہیں اور منتقل ہونا چاہیئے۔ اتنے میں عطاء الرحمٰن صاحب اور امین اشرف صاحب یہ خبر لے کر آ گئے کہ آس پاس کے تمام اچھے ہوٹل بھرے ہوئے ہیں، اور بیشتر ہوٹل ایرانی زائرین نے بک کرا رکھے ہیں، صرف ایک نئے ہوٹل میں ایک کمرہ موجود ہے ـــــ اس علاقے سے کراہیت کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہاں سے کسی اور محلے میں جا کر کوئی اچھا ماحول تلاش کریں، لیکن رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا، اور بستر تک پہنچنے کی خواہش اس درجہ غالب تھی کہ کم از کم ایک رات کے لیے اسی کمرے میں رہنا منظور کر لیا، شدید تھکن کے بعد بستر میسر آیا تو جلد ہی نیند آ گئی۔

صبح کو بیدار ہونے اور معمولات سے فراغت کے بعد میں نے پاکستانی سفارت خانہ فون کیا، قونصل جنرل توحید احمد صاحب سے بات ہوئی، وہ غائبانہ احقر سے واقف تھے، میں نے اُن سے ذکر کیا کہ ہمیں قیام کے لیے کسی اچھے ہوٹل کی بھی ضرورت ہے، اور ایک

رہنمائی کی۔ انہوں نے کہا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں خود آپ کے پاس پہنچتا ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے ایک اچھے ہوٹل میں ہماری بکنگ بھی کرادی تھی، یہ ایک فور اسٹار ہوٹل فندق البستان تھا جو دمشق کے بارونق علاقے وکٹوریا پر جبل قاسیون کے سامنے واقع تھا، اور ہماری ضروریات کے لیے بہت مناسب۔ چنانچہ ہم اس میں منتقل ہو گئے۔

جامعہ دمشق میں:

اسی دوران توحید صاحب نے ہمیں دمشق یونیورسٹی لے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا، چنانچہ ہم ہوٹل سے سیدھے دمشق یونیورسٹی پہنچے، یہاں "کلیۃ الشریعۃ" کے سربراہ ڈاکٹر فتحی الدرینی ہمارے منتظر تھے۔ میں درینی صاحب سے غائبانہ ان کی کتابوں کے توسط سے متعارف تھا، انہوں نے اصولِ فقہ اور جدید فقہی مسائل پر متعدد تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب "المناھج الأصولیۃ" میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ توحید صاحب نے اُن سے میرا تعارف کرایا، وہ بڑے تپاک سے ملے، اور کلیۃ الشریعۃ کے دوسرے اساتذہ کو بھی جمع کر لیا۔ یہاں دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، ڈاکٹر درینی صاحب نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ بھی احقر کو تحفۃً دیا۔

دمشق یونیورسٹی کا کلیۃ الشریعۃ عالم عرب میں علمی اور تحقیقی معیار کے لحاظ سے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا رہا ہے، اور شاید جامعۃ الأزہر اور جامعۃ الزیتونہ کے بعد اس کی علمی شہرت سب سے زیادہ رہی، لیکن موجودہ لادینی حکومت نے یہاں کے اہلِ علم و فضل پر جو ستم ڈھائے، اُن کی بنا پر یہاں سے بڑے بڑے صاحبانِ علم و فضل ہجرت کر گئے، اور وہ پہلا سا علمی معیار بھی باقی نہیں رہا اور عملی تدین کے اعتبار سے تو یہاں کی فضا اور بھی گر گئی۔

یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم ہے، لیکن اس کے باوجود متعدد طالبات مکمل برقعے میں ملبوس بھی نظر آئیں۔

دوپہر کے وقت ہم ہوٹل واپس آگئے، اور عصر تک آرام کیا۔ توحید صاحب نے سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری عنایت صاحب کو ہماری رہنمائی کے لیے متعین کردیا تھا۔ عصر کی نماز کے وقت وہ ہوٹل آگئے۔ اور ان کی معیت میں ہم دمشق کے مختلف مقامات کی زیارت و سیاحت کے لیے روانہ ہوئے۔

شہر دمشق:

دمشق [1] اس وقت دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد کشتی سے اُتر کر سب سے پہلے دو بستیاں آباد فرمائیں، پہلے حرّان اور پھر دمشق۔ اس طرح طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلا حرّان اور دمشق آباد ہوئے۔ بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک غلام کا نام دمشق تھا اس نے سب سے پہلے یہاں بستی بسائی تھی، اس لیے اس کا نام دمشق ہو گیا۔ بعض تاریخوں میں یہ مذکور ہے کہ یہ بستی ذوالقرنین کی بسائی ہوئی ہے، اور بعض نے اس کی تعمیر کو سکندر مقدونی کے ایک غلام کی طرف منسوب کیا ہے۔[2]

ان متعارض تاریخی روایتوں سے حتمی نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے، لیکن یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ شہر ہزاروں سال سے آباد ہے، بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، اور جب سے تاریخ کی تدوین شروع ہوئی۔ اس وقت سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دمشق دنیا کا سب سے پُرانا شہر ہے جو اب تک آباد ہے۔[3]

۱۔ اس کا صحیح تلفظ دِمَشْق (دال پر زیر، میم پر زبر اور شین پر جزم) ہے۔

۲۔ ان روایات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ دمشق لابن عساکر، و مختصر تاریخ دمشق لابن منظور، ص ۳۴ تا ۵۱، ج ۱

۳۔ دیکھیے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۱، ج ۷

اسلام سے پہلے اس شہر پر بیشمار طاقتیں حکمرانی کرتی رہیں۔ طلوعِ اسلام کے وقت یہ روم کی بازنطینی سلطنت کا اہم تجارتی شہر تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضؓ کی سرکردگی میں فتح ہوا، اور صوبۂ شام کا پایۂ تخت قرار پایا۔ حضرت عمر رضؓ ہی کے زمانے میں حضرت معاویہ رضؓ اس کے گورنر مقرر ہوئے۔ اور حضرت علی رضؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے اسے پورے عالم اسلام کا دارالخلافہ قرار دے دیا۔ چنانچہ بنو امیہ کے عہدِ حکومت میں تقریباً ایک صدی تک یہ اُس اسلامی حکومت کا پایۂ تخت رہا جس کی حدود بحرِ ظلمات (اٹلانٹک) سے بحرِ ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔

تقریباً ایک لاکھ انبیاء کرام علیہم السلام کے جدّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ شام ہی کو اپنا دارالہجرۃ قرار دیا تھا، اس لیے جن انبیاء کرام کے حالات معلوم ہیں، ان میں سے بیشتر شام ہی کے علاقے میں پیدا ہوئے، اور دمشق کا پہاڑ قاسیون ان کی تبلیغ و دعوت کا بہت بڑا مستقر بنا رہا۔

مسلمانوں کے ہاتھوں دمشق کی فتح کے بعد جلیل القدر صحابۂ کرام رضؓ کی بہت بڑی تعداد یہاں آکر آباد ہوئی۔ لہٰذا اس شہر کو انبیاء علیہم السّلام اور صحابۂ کرام رضؓ کا شہر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اور اسی بنا پر اس کے چپے چپے سے تاریخِ اسلام کی بیشمار یادیں وابستہ ہیں۔

یہ شہر سطحِ سمندر سے دو ہزار دو سو فیٹ بلند ہے، اس لیے یہاں کا موسم اور آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے، سردی کے موسم میں برف بھی پڑ جاتی ہے، اور شدید گرمی میں بھی راتیں ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوتی ہیں۔ نہرِ بردٰی شہر کے قریب سے گذرتی ہے اور اس کے پانی سے نہ صرف شہر کے لوگ سیراب ہوتے ہیں، بلکہ اس کی بنا پر علاقہ کافی سرسبز و شاداب ہو گیا ہے۔

---

(۸)

غوطہ میں:

عنایت صاحب نے دمشق کے مختلف مقامات کی سیاحت کے لیے سہولت کی خاطر جو ترتیب قائم کی، اُس میں وہ سب سے پہلے ہمیں غوطہ لے گئے۔ غوطہ قدیم زمانے سے دمشق کا وہ مضافاتی علاقہ ہے جو اپنی زرخیزی اور رعنائی و دلکشی کے لیے پوری دُنیا میں مشہور بلکہ ضرب المثل تھا۔ مشہور جغرافیہ نگار علامہ حمویؒ لکھتے ہیں:

هی بالإجماع أنزه بلاد الله و أحسنها منظرا، و هی إحدی جنان الأرض الأربع: و هی الصُّغد، و الأُبلّة، وشعب بوّان والغوطة[1]

اللہ کے پیدا کیے ہوئے شہروں میں یہ علاقہ باتفاق سب سے زیادہ پاکیزہ اور خوش منظر ہے، اور یہ اُن چار علاقوں میں سے ایک ہے جنہیں جنت ارضی قرار دیا گیا ہے۔ وہ چار علاقے یہ ہیں: صُغد، اُبلّہ، شعب بوان اور غوطہ۔

کسی زمانے میں یہ علاقہ باغات، پہاڑیوں، نہروں اور چشموں سے بھرپور تھا اور اسی بنا پر اسے دُنیا کا حسین ترین خطہ قرار دیا گیا تھا، اب بھی یہاں انجیر اور زیتون کے خوشنما باغات موجود ہیں، لیکن اوّل تو موسم سردی کا تھا، اور باغات پر خزاں کی حکمرانی تھی، دوسرے اب اس علاقے کی تر و تازگی بھی اُس درجے میں باقی نہیں رہی، اس لیے کتابوں میں غوطہ کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا، اور اُس سے ذہن پر جو تأثر قائم تھا، یہ علاقہ اُس سے کافی مختلف نظر آیا۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ضرور ہے، لیکن اس وقت دُنیا کے حسین مقامات میں شاید وہ کوئی قابلِ ذکر نمبر حاصل نہ کر سکے ــــ دُنیا کے

---

[1] معجم البلدان للحموی، ص ۲۱۹ ج ۴۔

انقلابات و تغیرات کا حال یہی ہے کہ یہاں کسی چیز کی آب و تاب ہمیشہ سلامت نہیں رہتی، ہر جوانی کا انجام بڑھاپا اور ہر وجود کا انجام عدم ہے۔

غوطہ سے ہوتے ہوتے عنایت صاحب ہمیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ سیدہ زینب بنت علی (رضی اللہ عنہما) کے مزار پر لے گئے۔

حضرت زینب بنت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی صاحبزادی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی حقیقی بہن، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں پیدا ہو گئی تھیں، لیکن بہت کمسن تھیں، حضرت علیؓ نے آپ کا نکاح اپنے بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے کر دیا تھا، سانحۂ کربلا کے وقت آپ اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں، اور حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپ کو دیگر اہلِ بیت کے ساتھ دمشق لایا گیا۔ آپ اپنے زمانے میں بڑی عاقلہ اور فصیح و بلیغ خاتون مشہور تھیں[1] حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے آپ کے دل پر جو کچھ گذری ہوگی وہ تو ظاہر ہے، اُس صدمے کا شرعی حدود میں اظہار بھی ہوا ہو گا، لیکن جن روایتوں میں آپ کی غیر معمولی نوحہ گری بیان کی گئی ہے وہ غیر مستند ہیں اور بعید از قیاس بھی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی اُس قسم کے بین اور ماتم سے یقیناً بلند تھیں جو آپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت زینبؓ کا ایک مزار مصر میں بھی مشہور ہے، لیکن کسی مستند روایت سے آپ کا مصر جانا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ سانحۂ کربلا کے بعد دمشق آنا ضرور ثابت ہے۔ لہٰذا دمشق میں آپ کا مدفون ہونا مصر کی بہ نسبت زیادہ قرینِ قیاس ہے، اگرچہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے آپ اور دوسرے اہلِ بیت کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ مدینہ طیبہ واپس بھیج دیا تھا جس کے جواب میں حضرت زینبؓ اور حضرت سکینہؓ نے اپنے کچھ زیور یزید کے پاس بھیجے لیکن یزید نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے جو سلوک آپ کے ساتھ کیا، وہ کسی دنیوی لالچ کی وجہ سے نہیں، بلکہ آپ کے حقِ قرابت

---

[1] طبقات ابنِ سعد ص ۴۶۵ ج ۸، و الاصابہ ص ۳۱۵، ج ۴

کی بنا پر کیا[1] واللہ سبحانہ اعلم

عراق کے اہل بیت کے مزارات کی طرح حضرت زینبؓ کا یہ مزار بھی بڑی شاندار عمارت میں واقع ہے جس کے مناروں وغیرہ کا طرز تعمیر عراقی مزارات سے ملتا جلتا ہے ہم قبر پر حاضر ہوئے تو وہاں شیعہ زائرین کی مرثیہ خوانی، نوحہ گری اور ماتم کا ایک شور وشیون برپا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، مزار کے قریب تک پہنچنا بھی مشکل تھا، اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ مزار میں داخل ہوتے ہی سلام پڑھوانے والے معلموں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آیا جو قدم قدم پر اپنی خدمات رہائت پیش کرتے تھے اُن سے معذرت کرنا ایک مستقل کام تھا جو واپسی تک مسلسل جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم کی ارواح پر ابدی رحمتیں نازل فرمائے، اُن کی محبت کے دعوے داروں کی طرف سے وفات کے بعد بھی اُن کی ارواح قدسیہ کو تکلیف پہنچانے کا سلسلہ جاری ہے، اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا؟

الباب الصّغیر کے قبرستان میں:

یہاں سے عنایت صاحب ہمیں دمشق کے قدیم قبرستان میں لے گئے۔ جو "الباب الصغیر" کا قبرستان کہلاتا ہے اور جس میں بیشمار صحابہؓ و تابعین اور بزرگان دین کے مزارات ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے دمشق فتح کیا تو وہ اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے، یہاں بہت سے حضرات شہید ہوئے تو انہیں یہیں پر دفن کیا گیا، بعد میں اسی جگہ کو عام قبرستان بنا لیا گیا۔ اس جگہ کا نام پہلے "باب توما" تھا، بعد میں اسے "الباب الصغیر" یا "مظاہر دمشق" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے[2]

جن صحابۂ کرامؓ کے مزارات اس قبرستان میں بیان کئے جاتے ہیں ان کی فہرست

---

[1] اعلام النساء ص ۹۸، ج ۲

[2] تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۲۶۴، ج ۱

بہت طویل ہے، لیکن جن حضرات کے مزارات پر سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی، اُن کا مختصر تذکرہ مناسب ہوگا۔

حضرت بلال حبشیؓ :

سب سے پہلے ہم اُس مزار پر حاضر ہوئے جو حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ اور اسلام کے لیے اُن کی خدمات سے کون مسلمان ناواقف ہے؟ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی آتے ہی عقیدت و محبت کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس نہ کرتا ہو۔ مکہ مکرمہ میں اسلام سے پہلے اُنہوں نے غلامی کی زندگی گذاری، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ اُن چند صحابۂ کرامؓ میں سے تھے جو آپؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ یہاں تک کہ اُس دور میں جب حضرت عمرو بن عبسہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعارف حاصل کرنے کے لیے آپؐ سے پوچھا کہ: "(توحید کے) اس پیغام میں آپؐ کا ساتھی اور کون ہے" ؟ تو آپؐ نے جواب دیا: حرٌ وعبدٌ[1] "یعنی" ایک آزاد شخص ہے اور ایک غلام" آزاد شخص سے مُراد حضرت صدیقِ اکبرؓ تھے، اور غلام سے مراد حضرت بلالؓ۔

اسلام لانے پر ان کے آقا نے ان پر جو ظلم و ستم توڑے، اس کے واقعات مشہور ہیں؛ انہیں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں تپتے ہوئے سنگریزوں پر لٹایا جاتا اور لات و عزّیٰ کو معبود ماننے پر مجبور کیا جاتا، لیکن ان کے مُنہ سے "احد، احد" کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ بالآخر حضرت صدیقِ اکبرؓ نے انہیں خرید کر آزاد کیا۔

اُس کے بعد سے حضرت بلالؓ سفر و حضر میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، اور آپؐ کے باقاعدہ مؤذن قرار پائے۔ ان کی فضیلت کے لیے ایک ہی حدیث کافی ہے جس میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فجر کی نماز کے بعد

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، بابِ اسلام عمرو بن عبسہؓ۔

حضرت بلال رضؓ سے پوچھا کہ: "مجھے اپنا وہ عمل بتاؤ جو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ اُمید افزا ہو، کیونکہ میں نے آج رات جنت میں تمہارے پاؤں کی آہٹ، اپنے سامنے سُنی"۔ حضرت بلال رضؓ نے عرض کیا کہ "میں رات دن میں کسی بھی وقت جب کبھی وضو کرتا ہوں تو اپنے پروردگار کے لیے جتنی توفیق ہوتی ہے نماز ضرور پڑھتا ہوں۔"[1]

پھر وہ وقت بھی آیا کہ اُسی مکۂ مکرمہ میں جہاں حضرت بلال رضؓ کو کلمۂ طیبہ پڑھنے کی خاطر اذیتیں دی جاتی تھیں، جب مکۂ مکرمہ فتح ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں، چنانچہ آپ نے پہلی بار مکۂ مکرمہ میں کعبے کی چھت سے اذان دی[2]

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت بلال رضؓ سے مدینہ طیبہ میں نہ رہا گیا، اور وہ جہاد کے لیے شام آ کر مقیم ہو گئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صدیق اکبر رضؓ کے عہدِ خلافت ہی میں شام آ گئے تھے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت صدیق اکبر رضؓ نے انہیں روک لیا تھا، پھر حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں شام آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ شام کے قیام کے دوران حضرت بلال رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی، دیکھا کہ آپؐ ان سے فرما رہے ہیں: "بلال! ایسی بھی کیا بے مروتی؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم مجھ سے آ کر ملو؟" یہ بیدار ہوئے تو غمگین تھے، فوراً سواری منگائی، اور مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئے"، روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے، وہاں روتے رہے، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما وہاں تشریف لے آئے، حضرت بلال رضؓ نے انہیں گلے سے لگا لیا، حضرات حسنین رضؓ نے ان سے فرمائش کی کہ "ہمارا آپ کی اذان سُننے کو دل چاہتا ہے"۔ حضرت بلال رضؓ نے چھت پر کھڑے ہو کر اذان دینی شروع کی "اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر" کہا تو سارا مدینہ گونج اُٹھا، "اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ" کہا تو کہرام مچ گیا، اور جب "اشہد ان محمدا رسول اللّٰہ" کہا تو پردہ نشین خواتین تک بے تابی کے عالم میں گھروں سے نکل

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۶۷ ج ۳/۱ [2] تاریخ مکہ للازرقی

آئیں، اور کہنے لگیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ مبعوث ہو گئے۔" کہتے ہیں کہ لوگ اُس دن سے زیادہ کسی اور دن مدینہ طیبہ میں روتے نہیں دیکھے گئے۔[1]

یہ روایت سنداً کمزور ہے، اس کے مقابلے میں وہ روایت زیادہ مضبوط ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ شام میں پیش آیا، یعنی حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت بلالؓ سے اذان کی فرمائش کی، اور جب انہوں نے اذان دی تو لوگ رونے لگے اور اُس دن سے زیادہ کسی اور دن روتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔[2]

حضرت بلالؓ کی سیرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ آخرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے انتظار سے عبارت تھا۔ چنانچہ جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ بیخودی کے عالم میں یہ شعر پڑھ رہے تھے:

غداً نلقى الأحبه   محمداً وحزبه

کل ہماری محبوب شخصیتوں سے ملاقات ہوگی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابہؓ سے۔

موت کی شدت دیکھ کر آپ کی اہلیہ نے کہا:

"واویلاہ" (ہائے افسوس!)

لیکن حضرت بلالؓ نے فرمایا:

"وا فرحاہ" (واہ رے خوشی!)[3]

حضرت بلالؓ کا مزار شام میں تین جگہ بیان کیا جاتا ہے، ایک یہاں، دوسرے داریا نامی قصبے میں، تیسرے حلب میں۔ لیکن زیادہ تر علماء کا رجحان اسی طرف ہے کہ آپ باب الصغیر کے اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔

---

[1] اُسد الغابہ ص ۲۴۴ و ۲۴۵، ج ۱

[2] سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۳۵۷، ج ۱

[3] ایضاً ص ۳۵۹، ج ۱

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری کے وقت دل کی عجیب کیفیت تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی رشکِ ملائک زندگی کے واقعات یاد آ رہے تھے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی نے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ عرب کے وہ قریشی سردار جو پورے جزیرہ عرب میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور جن کے سامنے عرب کے باعزت خاندانوں کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، وہ تو اسلام سے رُوگردانی کر کے ذلت و گمنامی کے غار میں جا گرے، آج کوئی احترام کے ساتھ ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا، اور حبشہ کے یہ باشندے جن کی زندگی غلامی میں بسر ہو رہی تھی، اور جنہیں کوئی گلے لگانے کے لیے تیار نہ تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچ کر زندۂ جاوید ہو گئے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے ایک عربی شعر میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

فداك أبو جهل، أخو الذل والعمى

وإن بلالا لا فاق أحرار حميرا

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بلند عطا فرمایا اُس کے تصور سے اقبال مرحوم کے یہ اشعار ذہن میں گونجنے لگے جو انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہے ہیں ؎

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہُوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کیلئے — کسی کے عشق میں تُو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری — شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
مدینہ تیری نگاہوں کا نُور تھا گویا — ترے لیے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید — خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسا ئید

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دَور کہ دیدار عام تھا اس کا

اقبالؔ نے ایک اور نظم میں سکندرِ رُومی اور حضرتِ بلال رضؓ کا موازنہ کیا ہے ؎

لکھا ہے ایک مغربیِ حق شناس نے — اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولانگہ سکندرِ رُومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رُومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورسؔ و دارا نے خام تھا
دُنیا کے اس شہنشہِ انجم سپاہ کو — حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا

آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں

لیکن بلال رضؓ، وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جس کی نُورِ نبوّت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہُوا سینۂ بلال رضؓ — محکوم اُس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط — کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز — صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے؟
رُومی فنا ہُوا، حبشی کو دوام ہے

حضرت ابنِ اُمِّ مکتوم رضؓ :

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مزار کے بالکل قریب، ایک قبر پر حضرت عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم رضؓ کے اسمِ گرامی کا کتبہ لگا ہُوا ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دُوسرے

مؤذن تھے جو عہدِ رسالت میں اکثر فجر کی اذان دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ کے باشندے تھے، اور اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ماموں زاد بھائی۔ بچپن ہی میں آنکھیں جاتی رہی تھیں، اور نابینا ہو گئے تھے۔ پھر جب ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی مدینہ طیبہ میں جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ قرآن کریم کی دو آیتیں آپ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۵ شروع میں اس طرح تھی:

لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔

مہاجرین میں سے جو لوگ جہاد سے بیٹھے ہوئے ہوں (یعنی جہاد نہ کریں) وہ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

اس آیت کے نزول پر حضرت ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو تشویش ہوئی کہ وہ اپنی آنکھوں کے عذر کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بینائی کا عذر بیان کیا۔ اس پر اسی آیت کا یہ ٹکڑا نازل ہوا۔

غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ[1]

سوائے ان لوگوں کے جن کو عذر ہو۔

اسی طرح سورۂ "عبس" کی ابتدائی آیات بھی آپ ہی کے بارے میں نازل ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے سرداروں کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ حضرت ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے آئے۔ اور نابینا ہونے کی بنا پر یہ نہ دیکھ سکے کہ آپ کے پاس کون لوگ بیٹھے ہیں، اس لیے بار بار آپ کو مخاطب کر کے سوال کرنے لگے۔ آپ نے (یہ سمجھ کر کہ ان سے بے تکلفی ہے) اُن سے رُخ پھیر لیا، اور اُس شخص کو تبلیغ کرنے میں مصروف رہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر ۴۵۹۳، ۴۵۹۴۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی ○ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ○ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی ○ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ○ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی ○ وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّکّٰی ○ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ○ وَھُوَ یَخْشٰی ○ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی ○

چیں بہ جبیں ہوئے، اور منہ موڑ لیا، اس بات سے کہ اُن کے پاس نابینا آیا، اور آپ کو کیا خبر کہ شاید وہ (آپ کے جواب سے) پاک ہو جاتا، یا نصیحت قبول کرتا، اور نصیحت اس کے لیے نفع بخش ہوتی. جو شخص استغنار کا معاملہ کرتا ہے، اس کی تو آپ فکر میں پڑتے ہیں، اور وہ شخص جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے، اور وہ (اللہ سے) ڈرتا بھی ہے، اُس سے آپ بے اعتنائی کرتے ہیں.

ان آیات میں "نابینا" سے مُراد حضرت ابن اُمِّ مکتوم رضؓ ہی ہیں اور ان کی فضیلت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ قرآن کریم نے اُن کی خشیتِ الٰہی کی گواہی دی ہے۔

مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی جہاد وغیرہ کے لیے مدینہ طیبہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اکثر حضرت ابن اُمِّ مکتوم رضؓ ہی کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب بنا کر تشریف لے جاتے تھے، چنانچہ آپؐ نے تیرہ مرتبہ آپ کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا[1]

اگرچہ قرآن کریم نے آپ کو جہاد کی ذمہ داری سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا، لیکن جہاد کا شوق اس قدر تھا کہ بہت سی لڑائیوں میں شامل ہوتے، اور امیرِ لشکر سے یہ مطالبہ فرماتے کہ جھنڈا میرے سپرد کر دو، کیونکہ میں نابینا ہونے کی وجہ سے بھاگ نہیں سکتا[2]۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران کے ساتھ شہرۂ آفاق جنگِ قادسیہ میں آپ

---

[1] الاصابہ، ص ۵۱۶ و ۵۱۷، ج ۲

[2] طبقات ابن سعد، ص ۱۵۴، ج ۴

بھی شامل ہوئے، آپ نے ایک سیاہ رنگ کا جھنڈا اُٹھایا ہوا تھا اور سینے پر زرہ پہنی ہوئی تھی[1]

جنگِ قادسیہ کے بعد آپ کے حالات معلوم نہیں ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ قادسیہ ہی میں شہید ہو گئے تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ وہاں سے مدینہ منورہ واپس آگئے تھے، اور مدینہ طیبہ ہی میں آپ کی وفات ہوئی[2]

کتابوں میں آپ کے شام آنے کا تذکرہ مجھے تلاش کے باوجود نہیں ملا، اِس لیے یہ پتہ نہیں لگتا کہ دمشق کے اس قبرستان میں آپ کیسے مدفون ہو سکتے ہیں؟ اور اس قبر کی نسبت آپ کی طرف درست ہے یا نہیں؟

اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا:

اسی قبرستان میں ذرا سا چل کر ایک اور مزار ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی آرام گاہ ہے۔

حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام رملہ تھا، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے نکاح کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ یہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، حضرت ابوسفیان رضؓ فتحِ مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے، لیکن اس سے پہلے وہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، اور جنگِ بدر میں ابوجہل وغیرہ کے قتل ہو جانے کے بعد کفارِ مکہ کی سرداری انہی کے حصے میں آئی تھی، اور اسی لحاظ سے وہ غزوۂ احد اور غزوۂ خندق وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے مدِمقابل تھے۔

حضرت اُمِّ حبیبہ رضؓ انہی ابوسفیان کی بیٹی تھیں، اور ابوسفیان نے ان کا نکاح عبید اللہ

---

[1] طبقات ابن سعد، ص ۱۵۵، ج ۴

[2] الاصابہ ص ۵۱٦، ج ۲ و سیر اعلام النبلاء، ص ۳٦۵، ج ۱

بن جحش سے کر دیا تھا۔ ابو سفیان کے گھر میں دن رات مسلمانوں کی مخالفت کے چرچے ہوتے تھے، لیکن یہ اسلام کی حقانیت کی دلکشی تھی کہ ایسے دشمن گھرانے میں ابو سفیان کی یہ بیٹی اور داماد دونوں مسلمان ہو گئے۔ اس وقت اسلام قبول کرنا انواع و اقسام کے مصائب و آلام کو دعوت دینے کے مرادف تھا، اور ایسے گھرانے میں اسلام لانا تو اور زیادہ سنگین جرم تھا جہاں دن رات مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندیاں ہوتی تھیں۔

چنانچہ حضرت اُمّ حبیبہؓ اور ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش دونوں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فیصلہ کیا، مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس وقت ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھی، یہ دونوں میاں بیوی بھی حبشہ جا کر مقیم ہو گئے۔ وہیں پر ان دونوں کی بیٹی حبیبہ پیدا ہوئیں جن کی نسبت سے آپ کو اُمّ حبیبہؓ کہا جاتا ہے۔

ایک رات حضرت اُمّ حبیبہؓ سوئیں تو خواب میں دیکھا کہ ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش کا چہرہ بُری طرح مسخ ہو گیا ہے، یہ گھبرا کر اٹھیں، اور دل میں سوچنے لگیں کہ شاید عبیداللہ بن جحش کی حالت میں کوئی بُرا تغیر آنے والا ہے۔ شوہر سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ: "میں نے تمام مذاہب پر غور کیا ہے، اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عیسائی مذہب سے بہتر کوئی مذہب نہیں، چنانچہ میں عیسائی ہو گیا ہوں"۔

اندازہ کیجئے کہ یہ الفاظ سن کر حضرت اُمّ حبیبہؓ کو کیسا دھکا لگا ہو گا؟ انہوں نے جلدی سے عبیداللہ کو اپنا خواب سنا کر ارتداد سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن ہدایت اس کے مقدر میں نہ تھی، اُس نے خواب کی بات کو بے پروائی سے ٹلا دیا، اور شراب نوشی میں مشغول ہو گیا، اور اسی ارتداد کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی بیچارگی اور کسمپرسی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، وہ اسلام کی خاطر اپنے باپ بھائیوں اور پورے خاندان سے کٹ چکی تھیں، انہوں نے اپنے وطن کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا، لے دے کر ایک شوہر اس پردیس میں مونس و غمخوار ہو سکتا تھا، لیکن وہ مرتد بھی ہو گیا اور چند دن میں اُس کا انتقال بھی ہو گیا۔ اب یہ اس دیارِ غربت میں تن تنہا رہ گئی تھیں۔

اس کسمپرسی کی حالت میں ایک رات سوئیں تو خواب میں دیکھا کہ کوئی پکارنے والا انہیں "اُمّ المؤمنین" کہہ کر پکار رہا ہے۔ اس خواب کی تعبیر انہوں نے یہ لی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح فرمائیں گے۔

ابھی اس خواب کو دیکھے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، دیکھا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی ایک کنیز (جس کا نام ابرہہ تھا) بادشاہ کا ایک پیغام لے کر آئی ہے، کنیز نے کہا کہ "مجھے بادشاہ نے بھیجا ہے، اور کہا ہے کہ میرے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط آیا ہے جس میں آپؐ نے مجھے یہ خدمت سونپی ہے کہ میں آپ سے ان کے نکاح کا انتظام کردوں۔ لہٰذا آپ کسی کو اپنے نکاح کا وکیل بنا دیں، تاکہ وہ آپ کی طرف سے نکاح کر سکے۔"

حضرت ام حبیبہؓ یہ سُن کر بہت خوش ہوئیں، اور اس خوشی میں جو زیور پہنے ہوئی تھیں، وہ سب اُتار کر کنیز کو دے دیا، اور حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ کے پاس پیغام بھیج کر انہیں اپنا وکیل مقرر فرما دیا۔ نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور دوسرے مسلمانوں کو جمع کیا، اور خطبہ دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت ام حبیبہؓ کا مہر چار سو دینار مقرر کرکے اُسی وقت حضرت خالد بن سعیدؓ کے حوالہ کر دیا، حضرت خالد بن سعیدؓ نے وکیل کی حیثیت سے نکاح کو قبول کیا۔ نکاح کے بعد جب سب لوگ اُٹھ کر جانے لگے تو نجاشی نے کہا کہ: "ذرا ٹھہریئے! انبیاء کرام کی سنّت یہ ہے کہ نکاح کے بعد ولیمہ بھی کرتے ہیں۔" چنانچہ کھانا منگوایا گیا، اس کے بعد سب رخصت ہوئے۔

حضرت اُمّ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے مہر کے طور پر جو چار سو دینار دیئے گئے تھے میں نے ان میں سے سو دینار ابرہہ کنیز کو مزید انعام کے طور پر دینے چاہے، لیکن اس کنیز نے کہا کہ مجھے بادشاہ نے آپ سے کچھ لینے سے منع کر دیا، اور جو زیور آپ نے دیئے تھے، وہ بھی آپ کو واپس کرنے کی تاکید کی ہے، اس کے بدلے انہوں نے مجھے از خود بہت انعام دے دیا ہے۔

نجاشی (رضی اللہ عنہ) نے اس کے بعد حضرت اُمّ حبیبہؓ کی خدمت میں بہت سے تحفے بھیجے جن میں شاہی خوشبوئیں بھی شامل تھیں اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کو مدینہ طیبہ بھیجنے کا بندوبست فرمایا۔ جب حضرت اُمّ حبیبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ جانے لگیں تو ابرہہ کنیز نے آکر آپ سے کہا کہ "میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں، اور میری طرف سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کر دیجئے گا۔" حضرت اُمّ حبیبہؓ نے سلام پہنچانے کا وعدہ کیا، اور رخصت ہو گئیں، مدینہ طیبہ پہنچ کر انہوں نے حسبِ وعدہ ابرہہ کا سلام حضورؐ کو پہنچایا۔ آپؐ نے سارا واقعہ سُن کر تبسم فرمایا۔ اور ابرہہ کو دُعائیں دیں[1]۔

حضرت اُمّ حبیبہؓ اس واقعے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ اور اُمّ المومنین بن چکی تھیں، دوسری طرف اِن کے والد ابوسفیان بدستور مسلمانوں کے سب سے بڑے مدِّمقابل بنے ہوئے تھے[2]۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جنگ بندی کا جو معاہدہ ہُوا تھا، خود کفارِ مکہ نے اس کی خلاف ورزی کر کے اسے توڑ دیا، صلح ختم ہو گئی، اور ابوسفیان کو اندازہ ہُوا کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت مکہ مکرمہ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ جنگ بندی کی مدت میں توسیع کی تجویز لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجویز مسترد کر دی۔

اس موقع پر انہیں خیال ہُوا کہ اپنی بیٹی (حضرت اُمّ حبیبہؓ) کے پاس جا کر ان سے

---

[1] واقعے کی یہ تفصیل امام ابن سعدؒ نے واقدی کے حوالے سے بیان کی ہے (طبقات ابن سعد ص ۹۷، ۹۸، ج ۸)۔ لیکن اتنی بات سنن ابوداؤد وغیرہ میں بھی مروی ہے کہ حضرت اُمّ حبیبہؓ سے آپؐ کا نکاح حبشہ میں ہُوا، نجاشی کی معرفت ہُوا، اور چار سو دینار مہر مقرر ہُوا۔ امہات المومنینؓ میں سب سے زیادہ مہر آپ ہی کا تھا۔

[2] ان کو اطلاع ملی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیٹی سے نکاح فرما لیا ہے، تو سخت دُشمنی کے باوجود انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو جملہ کہا وہ یہ تھا کہ: "محمدؐ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کا پیغام رَد نہیں کیا جا سکتا۔"

سفارش کروائیں، دنیا کے عام قاعدے کے مطابق اُن کی یہ توقع بیجا بھی نہیں تھی کہ بیٹی اپنے شوہر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ضرور سفارش کریں گی۔ چنانچہ ابوسفیان حضرت اُمِ حبیبہؓ کے پاس پہنچے، ابتدائی ملاقات کے بعد جب وہ بستر پر بیٹھنے لگے تو حضرت اُمِ حبیبہؓ نے جلدی سے آگے بڑھ کر بستر تہہ کردیا۔ ابوسفیان نے پوچھا:

"یہ بستر میرے لائق نہیں، یا میں اس بستر کے لائق نہیں ہوں؟"

حضرت اُمِ حبیبہؓ نے جواب دیا "یہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بستر ہے، اور آپ ابھی تک کفر و شرک کی نجاست میں مبتلا ہیں۔"

ابوسفیان اپنی بیٹی کا یہ جواب سُن کر تلملا گئے، اور بولے "تمہارے اندر مجھ سے جدا ہونے کے بعد کافی تغیر آگیا ہے۔"

یہ تھیں حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تیس چالیس سال زندہ رہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آپ کے بھائی تھے، اسی لیے ان کا لقب "خالُ المؤمنین" (مسلمانوں کے ماموں) مشہور ہوگیا۔ جب وہ خلیفہ بنے تو حضرت اُمِ حبیبہؓ اُن سے ملاقات کے لیے دمشق تشریف لائیں۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے بہت سے فقہی مسائل حاصل کیے، اور متعدد احادیث اُن سے روایت فرمائیں۔ اتنی بات تو تاریخ سے ثابت ہے۔ پھر بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت اُمِ حبیبہؓ دمشق ہی میں مقیم ہوگئی تھیں، یہیں آپ کا انتقال ہوا، اور "الباب الصغیر" میں تدفین ہوئی۔ حافظ ابن عساکرؒ نے "الباب الصغیر" کی قبروں میں آپ کی قبر کا بھی ذکر فرمایا ہے[1] لیکن حافظ ذہبیؒ نے اس کی سختی سے تردید کی ہے، اور فرمایا ہے کہ آپ کی قبر دمشق میں نہیں، مدینہ منورہ میں ہے[2]۔ واللہ سبحانہ اعلم

---

[1] تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۲۶۴، ج ۱

[2] سیر اعلام النبلاء، ص ۲۲۰، ج ۲

حضرت اسماء بنت یزید رضؓ:

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی طرف جو مزار منسوب ہے، اسی کے قریب ایک اور قبر پر لکھا ہے کہ یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی قبر ہے، اس سے عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضؓ کا مزار ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے ہمیں یہی بتایا۔ احقر کو یہ بات اس لیے درست معلوم نہیں ہوتی تھی کہ حضرت ام سلمہ رضؓ کا مزار مدینہ منورہ میں بتایا جاتا ہے اور حضرت ام سلمہ رضؓ کے دمشق میں مدفون ہونے کے کوئی معنی اس لیے نظر نہیں آتے کہ ان کا دمشق آنا ہی کہیں تاریخ میں مذکور نہیں۔ بعد میں حافظ شمس الدین ذہبیؒ کی کتاب "سیر اعلام النبلاء" میں نظر سے گذرا کہ دمشق کے الباب الصغیر میں جو خاتون "ام سلمہ" کے نام سے مدفون ہیں، وہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضؓ نہیں، بلکہ ایک انصاری صحابیہ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا ہیں[1]، ان کی کنیت بھی چونکہ ام سلمہ تھی، اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا حضرت معاذ بن جبل رضؓ کی چچا زاد بہن ہیں، یہ بڑے پائے کی مقرر بھی تھیں، اس لیے ان کا لقب "خطیبۃ النساء" مشہور ہو گیا تھا۔ انہوں نے متعدد احادیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمائی ہیں۔ حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں روم کی فوجوں سے یرموک کے مقام پر جو فیصلہ کن معرکہ ہوا، اس میں یہ دوسری مسلم خواتین کے ساتھ شریک تھیں۔ یہ خواتین اپنے زخمی رشتہ داروں کی مرہم پٹی وغیرہ کے لیے جایا کرتی تھیں، اور جنگ کے سخت موقع پر مسلمانوں کی ہمت بھی بڑھایا کرتی تھیں، لیکن غزوۂ یرموک کے موقع پر ایسے گھمسان کی جنگ ہوئی کہ خواتین کو اپنے دفاع کے لیے دست بدست لڑائی میں بھی حصہ لینا پڑا۔ اس موقع پر حضرت اسماء بنت یزید رضؓ

---

[1] سیر اعلام النبلاء، للذہبیؒ ص ۲۲۰، ج ۲ ترجمہ ام حبیبہ رضؓ۔

نے اپنے خیمے کے ستون سے نو رُومی فوجیوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

حضرت اسماء بنت عمیس رضؓ:

یہیں پر "اسماء" نام کی ایک اور خاتون کا مزار ہے، یعنی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا۔ یہ بھی مشہور صحابیہ ہیں، ام المؤمنین حضرت میمونہ رضؓ کی ماں شریک بہن ہیں، اور بالکل ابتدا میں اسلام لے آئیں تھیں، ان کا نکاح حضرت جعفر طیار رضؓ سے ہو گیا تھا، چنانچہ جب حضرت جعفر طیار رضؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ ان کے ساتھ تھیں، ۷ھ میں اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ سے واپس مدینہ طیبہ آئیں، حضرت جعفر رضؓ غزوۂ موتہ میں شہید ہو گئے جس کا واقعہ پیچھے گذر چکا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نکاح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کرا دیا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئیں تو ذوالحلیفہ کے مقام پر ان کے یہاں ولادت ہوئی، اور محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے، اس کے باوجود انہوں نے احرام باندھ کر حج کا سفر جاری رکھا۔ حضرت فاطمہ رضؓ کے مرض وفات میں حضرت صدیق اکبر رضؓ کی طرف سے یہی ان کی تیمارداری فرماتی تھیں۔ حضرت صدیق اکبر رضؓ کی وفات کے بعد یہ حضرت علی رضؓ کے نکاح میں آئیں، اور ان سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ ایک مرتبہ ان کے دو بیٹوں محمد بن ابی بکرؓ اور محمد بن جعفر کے درمیان بحث ہو گئی۔ محمد بن ابی بکر نے کہا کہ میرے والد (صدیق اکبر رضؓ) افضل ہیں، اور محمد بن جعفر نے کہا کہ میرے والد (یعنی جعفر طیار رضؓ)، حضرت علی رضؓ نے حضرت اسماء بنت عمیس رضؓ سے کہا کہ "تم فیصلہ کرو"، حضرت اسماء رضؓ نے جواب دیا: "میں نے عرب کا کوئی جوان جعفر رضؓ سے بہتر نہیں دیکھا، اور کوئی ادھیڑ شخص ابو بکر رضؓ سے بہتر نہیں پایا۔" حضرت علی رضؓ نے فرمایا: "تم نے ہمارے لیے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، لیکن تم نے جو جواب دیا

---

[1] الاصابہ ص ۲۲۹، ج ۴

[2] طبقات ابن سعد، ص ۲۸۵، ج ۸ و سیر اعلام النبلاء ص ۲۸۷، ج ۲

ہے اگر تم اس کے سوا کچھ اور جواب دیتیں تو میں ناراض ہو جاتا۔" اس پر حضرت اسماءؓ نے فرمایا: "کہ یہ تین حضرات جن میں آپ سب سے کمتر ہیں، سبھی اچھے لوگ ہیں"۔ ؎

---

(۹)

جامعِ اموی دمشق میں:

"الباب الصغیر" کے قبرستان سے فارغ ہوئے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی، ہم نے قریب ہی کی ایک مسجد میں نماز مغرب ادا کی، اور نماز کے بعد دمشق کی شہرہ آفاق تاریخی مسجد جامعِ اموی روانہ ہو گئے۔

یہ عظیم الشان مسجد پرانے شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے، اور اس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے سڑکیں اتنی تنگ اور پُر ہجوم ہیں کہ کار کافی دُور رکھڑی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ تنگ گلیوں سے گذرتے ہوئے ہم اس مسجد کے قریب پہنچے، اب مسجد کے آس پاس سے مکانات اور دُکانوں کو ہٹا کر مسجد کے سامنے ایک کشادہ چوک سا بنا دیا گیا ہے۔ اس سے گذر کر ہم مسجد میں داخل ہوئے۔

یہ جامعِ اموی، جو کسی زمانے میں فنِ تعمیر کے عجائب میں سے شمار ہوتی تھی، بنو امیہ کے مشہور خلیفہ ولید بن عبد الملک نے تعمیر کی تھی۔ رومیوں کے عہدِ حکومت میں یہاں عیسائیوں کا ایک کلیسا تھا جو کنیسۃ یوحنا کہلاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے دمشق پر حملہ کیا تو آدھا شہر لڑائی کے ذریعے بزورِ فتح ہوا، لیکن جب تقریباً آدھا شہر فتح ہو گیا تو اہلِ شہر نے ہتھیار ڈال کر مسلمانوں سے صلح کر لی، چنانچہ باقی نصف شہر صلح کے ذریعے فتح ہوا۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ دشمن کا جو علاقہ لڑائی کے ذریعے فتح ہوا، اس کے بارے میں اسلامی حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس میں جو تصرف چاہے کرے، لیکن جو علاقہ مصالحت کے ذریعے فتح ہو، اس میں صلح کی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

اتفاق سے اس کلیسا کا نصف حصّہ لڑائی سے اور باقی نصف حصّہ مصالحت سے فتح ہُوا تھا۔ جو حصّہ لڑائی سے فتح ہُوا تھا، اس میں تو مسلمانوں نے اپنے شرعی اختیار پر عمل کرتے ہوئے مسجد بنالی، لیکن باقی نصف حصّہ جو صلحاً فتح ہُوا تھا، اس کو معاہدے کی شرائط کے تحت کلیسا ہی برقرار رکھا۔

چنانچہ فتحِ دمشق کے بعد سالہا سال تک یہاں مسجد اور کلیسا برابر برابر قائم رہے، جب ولید بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو نماز پڑھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ مسجد تنگ پڑ گئی، دوسری طرف مسجد کے بالکل برابر کلیسا ہونے کی وجہ سے ایک مستقل بدمزگی شروع سے چلی آتی تھی۔ ولید بن عبدالملک چاہتے تھے کہ کلیسا کا حصّہ بھی مسجد میں شامل کرلیا جائے، لیکن معاہدے کی شرائط کے مطابق کلیسا قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے کلیسا کے ذمّہ داروں کو بُلا کر اُن سے بات چیت کی، اور اس جگہ کے بدلے اُنہیں چار کلیساؤں کے برابر جگہ دینے، یا اس کے معاوضے میں مُنہ مانگی رقم پیش کرنے کی پیش کش کی، لیکن وہ یہاں سے کلیسا ہٹانے پر رضامند نہیں ہوئے۔

اس حد تک تو روایات متفق ہیں، اس کے بعد روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے انکار کے بعد ولید بن عبدالملک نے زبردستی اس حِصّے پر قبضہ کرکے وہاں مسجد تعمیر کردی، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا دَور آیا تو عیسائیوں نے ان سے اس زبردستی کی شکایت کی۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان عیسائیوں کے حق میں فیصلہ دیا، اور اس حصّے سے مسجد ختم کرکے اسے عیسائیوں کے حوالے کرنے کا ارادہ فرمالیا، لیکن بعد میں دمشق کے حاکم نے عیسائیوں کو مُنہ مانگا معاوضہ دے کر راضی کرلیا، اور پھر وہ بخوشی اس حصّے سے دستبردار ہوگئے۔[1]

اور بعض روایات سے اس کے برخلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے شروع ہی سے عیسائیوں پر کوئی زبردستی نہیں کی تھی، بلکہ یہ کہا تھا کہ اگر وہ یہ کلیسا

---

[1] فتوح البلدان للبلاذری ص ۱۲۹۔ القسم الاول

کی زمین مسجد کے لیے دینے پر رضامند ہو جائیں تو دمشق اور اس کے مضافات کا جو حصہ مسلمانوں نے بزور فتح کیا تھا، وہاں کے جن چار کلیساؤں کے انہدام کا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ فیصلہ واپس لے لیا جائے گا، اور یہ چاروں کلیسا آپ کو واپس کر دیئے جائیں گے، چنانچہ اس پر عیسائیوں نے اپنی رضامندی سے یہ کلیسا مسلمانوں کے حوالے کر دیا[1]

بہرصورت! ولید نے جب کلیسا کو اپنی تحویل میں لے کر اسے منہدم کرنے کا ارادہ کیا تو عیسائیوں نے کہا کہ ہمارے یہاں یہ عقیدہ مشہور رہے کہ جو شخص اس کلیسا کو منہدم کرے گا وہ پاگل ہو جاتے گا، لہٰذا آپ اسے منہدم نہ کیجئے۔ لیکن ولید نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اس کا انہدام خود اپنے ہاتھوں سے شروع کروں گا۔ چنانچہ سب سے پہلی کدال ولید نے ماری، اور اس کے بعد دوسرے مسلمانوں نے اسے مسمار کر دیا۔

اب ولید بن عبدالملک نے دونوں حصّوں کو ملا کر ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا جو اپنے فنِ تعمیر کے لحاظ سے اُس دَور کی سب سے عالیشان اور سب سے خوبصورت مسجد قرار پائی۔ کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر پر ایک کروڑ بارہ لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔

مسجد کا اندرونی ہال جس میں محراب بنی ہوئی ہے۔ شرقاً غرباً دو سو فیٹ لمبا اور سو فیٹ چوڑا تعمیر کیا گیا، اس کے قبلے کی دیواریں سنگِ مرمر کے ساتھ سونا بھی جڑا گیا تھا۔ اس ہال کے اُوپر ایک شاندار گنبد تعمیر کیا گیا جسے "قبۃ النسر" کہتے ہیں، یہ کسی زمانے میں دمشق کی بلند ترین عمارت تھی، اور اس کا پُرشکوہ منظر دُنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اندلس کا مشہور سیاح محمد بن جبیر ۵۸۰ھ میں یہاں پہنچا تو اس گنبد پر چڑھنے کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> "ہم نے دُنیا میں جو عجیب و غریب مناظر دیکھے ہیں، اور جن پُرشکوہ عمارتوں کا مشاہدہ کیا ہے، ان میں جامع اموی کے قبّے پر چڑھنے کا تجربہ ایک عظیم ترین تجربہ تھا۔"[2]

---

[1] تاریخ ابن عساکر ص ۱۹، ج ۲ والبدایۃ والنہایۃ ص ۱۴۵، ج ۹۔

[2] رحلۃ ابن جبیر ص ۳۰۔

ابنِ جُبیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ جامعِ اموی کے گنبدوں کی یہ خاصیت مشہور رہی ہے کہ ان میں نہ مکڑی جالے بُن سکتی ہے، اور نہ چمگادڑیں ان کو اپنا مسکن بنا سکتی ہیں۔

مسجد کی دیوارِ قبلہ میں کئی محرابیں ہیں، اور یہ خلافت عثمانیہ کے دَور میں مختلف فقہی مذاہب کے علیحدہ علیحدہ مصلّوں کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں، اب بھی جامع اموی میں حنفی اور شافعی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں، لیکن دونوں جماعتوں میں محراب ایک ہی استعمال ہوتی ہے، اور اب ان جماعتوں میں، لوگوں کی شرکت کسی مخصوص فقہی مسلک سے وابستگی کی بنیاد پر کم اور اپنی سہولت کی بنیاد پر زیادہ ہو گئی ہے، مثلاً تمام اوقات میں شافعی مسلک کی جماعت پہلے ہوتی ہے، اور حنفی مسلک کی بعد میں۔ اب جس شخص کو اپنی مصروفیات کے لحاظ سے جس جماعت میں شرکت کا موقع مل جاتا ہے، وہ اس میں شریک ہوجاتا ہے، خواہ حنفی ہو یا شافعی۔

مسجد کے ہال میں ایک مقبرہ بنا ہُوا ہے جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سرِ مبارک مدفون ہے۔ حافظ ابنِ عساکرؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جامع اموی کی تعمیر کے دوران ایک غار دریافت ہُوا، ولید بن عبدالملک کو اس کی خبر کی گئی، ولید بن عبدالملک خود اس غار میں داخل ہوئے تو اس میں ایک صندوق رکھا ہُوا ملا، اس صندوق میں ایک انسانی سَر رکھا ہُوا تھا، اور اس پر لکھا تھا کہ "یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سَر ہے۔" زید بن واقد جو اُس وقت مسجد کی تعمیر کی نگرانی کر رہے تھے، اُن کا بیان ہے کہ اس سَرِ مبارک کی میں نے زیارت کی، اس کے چہرے بشرے اور بالوں میں ذرا بھی تغیر نہیں آیا تھا[1]۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے ایک اور جلیل القدر پیغمبر کو سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار کی مغربی جانب میں ایک طویل و عریض شمع لگی ہوئی ہے، یہ موم بتّی ہے، لیکن اس کی اُونچائی بارہ فٹ اور گولائی تقریباً دو فٹ ہے۔

---

[1] تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۱۹۷، ج ۱

جامع اموی میں ایسی ایسی بہت سی شمعیں رکھی ہوئی تھیں۔ بجلی کی دریافت سے پہلے انہی شمعوں کو روشنی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ رات کے وقت جب شمعیں گُل کی جاتی تھیں تو پُوری مسجد مُشک کی خوشبو سے اس قدر مہک اُٹھتی تھی کہ لوگ اس تیز خوشبو کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور باہر نکل جاتے تھے۔

مسجد کے ہال سے صحن کی طرف جائیں تو درمیان میں ایک کشادہ برآمدہ ہے جو صحن کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسی برآمدے کے مشرقی حصے میں ایک جگہ ایک اور مزار بنا ہُوا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ کا سَرِ مُبارک مدفون ہے۔ یہ بات آجکل تو بہت مشہور ہو گئی ہے، ایک روایت بھی ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپ کا سرِ مبارک یزید کے پاس دمشق لایا گیا تھا، اس روایت کی بنا پر اس خیال کو کچھ تقویت بھی ملتی ہے کہ شاید بعد میں سرِ مبارک یہاں دفن کر دیا گیا ہو لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دمشق اور جامع اموی کے قدیم مؤرخین میں سے کوئی بھی یہ بات ذکر نہیں کرتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ کا سرِ مبارک یہاں دفن کیا گیا۔ حافظ ابنِ عساکرؒ جو دمشق کے فضائل و مناقب اور اس کے مفاخر کو بیان کرنے کے بڑے حریص ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے ضعیف، منکر بلکہ موضوع احادیث بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا، وہ کہیں حضرت حسینؓ کے مزار کا تذکرہ نہیں فرماتے۔ علامہ نعیمیؒ جن کی کتاب "تنبیہ الطالب" تاریخ دمشق پر ابنِ عساکرؒ کے بعد سب سے بڑا ماخذ ہے، انہوں نے بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا۔

علامہ شہاب الدین ابن فضل اللہ العمری (متوفی ۷۴۹ھ) نے اپنی کتاب "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" میں جامع دمشق کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس میں بھی حضرت حسینؓ کے مزار کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف ابنِ جبیرؒ نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سرِ مبارک یہاں موجود تھا، لیکن بعد میں اُسے قاہرہ منتقل کر دیا گیا[1]۔

واللہ سبحانہٗ اعلم۔

---

[1] الجامع الاموی بتحقیق محمد مطیع الحافظ ص ۲۳ مطبوعہ دار ابن کثیر دمشق۔

ہم برآمدے کے شمال مشرقی کونے کے پاس پہنچے تو وہاں ایک عجیب و غریب گاڑی بھی نظر آئی، یہ گاڑی بانسوں اور لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لوہے کے بڑے بڑے دیو ہیکل پہیے لگے ہوئے تھے، یہ اتنی بڑی گاڑی تھی کہ اس نے برآمدے کا خاصا بڑا حصّہ گھیرا ہوا تھا، رہنماؤں نے بتایا کہ یہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی بنائی ہوئی منجنیق ہے جو انہوں نے بہت سی جنگوں میں استعمال کی، اب اسے یادگار کے طور پر جامعِ اموی میں رکھ دیا گیا ہے۔

مسجد کے صحن میں کھڑے ہوں تو چاروں طرف سے مسجد کا نظارہ بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے، قبۃ النسر کے علاوہ مسجد کے تینوں مینار (غربی، شرقی اور منارۃ العروس) یہاں سے نظر آتے ہیں۔ کسی زمانے میں صحن کے اندر ایک فوارہ بھی تھا جس کا پانی ایک پیالی نصف دائرہ بناتا ہوا گرتا تھا، اور اتنا دلکش تھا کہ لوگ اسے دُور دُور سے دیکھنے آتے تھے۔ اب یہ فوارہ موجود نہیں ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ جامعِ اموی کے صحن کی رونق لوگوں میں ضرب المثل تھی، یہ صحن صدیوں سے علمِ دین کے طالبوں اور بڑے بڑے اساتذہ و مشائخ کا مرکز رہا ہے، یہاں علم و فضل کے دریا اُمڈے ہیں، نہ جانے کتنی بیشمار کتابیں یہاں بیٹھ کر لکھی گئیں، اور علم و دانش کے نہ جانے کتنے آفتاب و ماہتاب یہیں سے طلوع ہوئے، سنا ہے کہ آج بھی یہاں کچھ تدریسی حلقے ہوتے ہیں، لیکن وہ زیادہ تر وعظ و ارشاد کی محفلیں ہیں، علومِ اسلامیہ کی درس و تدریس کا وہ ٹکسالی انداز تو اس ملک سے بھی کا رخصت ہو چکا۔

اس عظیم تاریخی مسجد نے مسلمانوں کے عروج و اقبال کے دن بھی دیکھے ہیں، اس کی زمین پر اُن فرشتہ صفت انسانوں نے بھی سجدے کئے ہیں جو دُنیا کے لیے ایک مثال بن کر آئے تھے، اور آج یہی مسجد اسی امت کے زوال و انحطاط کا بھی نظارہ کر رہی ہے اور ہم جیسوں کے بے رُوح سجدے بھی اسی زمین پر ثبت ہو رہے ہیں ـــ اور انشاءاللہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب اُمّت کا آخری حصّہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام اور امام مہدی کی سرکردگی میں اسی مسجد سے ہمت و عزیمت کا نیا قافلہ لے کر نکلے گا، اس کے ہاتھوں میں

ہدایت کی وہی مشعلیں ہوں گی جن سے ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی انسانیت پر ایک بار پھر عدل و انصاف اور خدا پرستی کی کرنیں ضیا بار رہوں گی، اور یہ دنیا جو آج ظلم و جہالت کی تیرگی میں پھنسی ہوئی ہے اس پر دوبارہ رشد و ہدایت کا سویرا طلوع ہو جائے گا۔

نُورالدین زنگی کے مزار پر:

جامعِ اموی سے نکلے تو مسجد کے بالکل برابر تاریخِ اسلام کے بطلِ جلیل نورالدین زنگیؒ کا مزار تھا، وہاں سلام عرض کرنے اور فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

نُورالدین زنگیؒ تاریخِ اسلام کے ان چند فرماں رواؤں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے عدل وانصاف، رعایا دوستی، عزم و شجاعت اور حُسنِ انتظام میں خلافتِ راشدہ کے زمانے کی یادیں تازہ کیں۔ اتابکی خاندان کے اس اولوالعزم مجاہد کی پوری زندگی صلیب برداروں کے ساتھ میدانِ جہاد میں گذری۔ اور اُس نے اپنی جانبازی کے ذریعے نہ جانے کتنی بار جرمنی، فرانس اور یورپ کی دوسری طاقتوں کے چھکے چھڑائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلجوقی حکومت زوال پذیر ہو چلی تھی، عباسی خلافت طرح طرح کے فتنوں کی شکار تھی اور یورپ کی صلیبی طاقتیں مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر عالمِ اسلام کو ہضم کرنا چاہتی تھیں اس نازک موقع پر سب سے پہلے نورالدین کے والد عمادالدین زنگیؒ اور ان کے بعد نورالدین زنگیؒ نے امتِ مسلمہ میں ایک نئی بیداری پیدا کی اور یورپی سازشوں کو ناکام بنا کر چھوڑا۔

نورالدین زنگیؒ کی فتوحات اور کارناموں کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے، یہاں ان تفصیلات کا موقع نہیں ہے، لیکن علامہ ابنِ اثیر جزریؒ جو بڑے پائے کے مورخ اور محدث ہیں، اور نورالدین زنگیؒ کے ہم عصر ہیں انہوں نے اپنی تاریخ میں نورالدین زنگیؒ کے عہدِ حکومت پر جو مجموعی تبصرہ کیا ہے، وہ یہاں نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا، علامہ ابنِ اثیرؒ لکھتے ہیں:۔

"میں نے اسلامی عہد کے پہلے کے فرماں رواؤں سے لے کر اس وقت تک تمام بادشاہوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا، مگر خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیزؒ

کے سوا نور الدین سے بہتر فرماں روا میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس نے عدل وانصاف کی اشاعت، جہاد، اور ظلم وجور کے استیصال عبادت و ریاضت اور احسان وکرم کو مقصدِ زندگی بنا لیا تھا۔ اسی میں اس کے لیل ونہار بسر ہوتے تھے، اگر کسی پوری قوم میں بھی اس کے اور اس کے باپ کے جیسے دو فرماں روا گذرے ہوتے تو بھی اس قوم کے فخر کے یے کافی تھا۔ نہ کہ ایک گھرانے میں خدا نے دو فرماں روا پیدا کر دیئے ..... ممالکِ محروسہ میں جس قدر ناجائز ٹیکس تھے سب موقوف کر دیئے تھے ..... وہ مظلوم کے ساتھ خواہ وہ کسی درجے کا ہو، پورا انصاف کرتا تھا، مظلوموں کی شکایتیں براہِ راست سُنتا تھا۔"

"ایک مرتبہ ایک شخص نے کسی زمین کے بارے میں اس پر دعویٰ دائر کیا، عدالت کا چپراسی عین اُس وقت جبکہ سلطان گوے وچوگان کھیل رہا تھا، پہنچا۔ سلطان فوراً اس کے ہمراہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہو گیا ... تحقیقات سے جائداد مدعی کے بجائے نورالدین کی ثابت ہوئی، اس لیے قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس فیصلہ کے بعد نورالدین نے متنازعہ جائداد اپنی طرف سے مدعی کو ھبہ کر دی۔"[1]

اقتدار کی کُرسی پر ہزارہا افراد آئے اور چلے گئے، لیکن بہت کم لوگ ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اس کُرسی کو اپنی آخرت کی تیاری کے لیے استعمال کیا ہو، اور اپنے کارناموں کی بنا پر زندۂ جاوید ہو گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نورالدین زنگیؒ کی رُوح پر اپنی غیر محدود رحمتیں نازل فرمائے، وہ ایسے ہی صاحبِ اقتدار تھے۔ اُن کے مزار پر حاضری کے وقت عقیدت ومحبت کے جذبات لفظ وبیان سے ماوراء تھے۔

---

[1] کامل ابن اثیر، ماخوذ از تاریخِ اسلام مولانا معین الدین ندوی ص ۲۵۲، ۲۵۳، ج ۴

سُلطان صلاح الدّین ایُوبی :

یہیں جامعِ اموی کے قریب دوسرا مقبرہ سلطان صلاح الدین ایُوبی ؒ کا ہے، وہاں بھی حاضری ہوئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی ؒ سے مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے، وہ نورالدین زنگی ؒ کے قابل ترین جرنیلوں میں سے تھے، نورالدین ؒ نے انہیں ان کے چچا شیرکوہ کے ساتھ ایک جنگی مہم پر مصر روانہ کیا تھا، وہاں انہوں نے اپنی بہترین جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ فرنگیوں کے متعدد حملے انہوں نے پسپا کیے، بالآخر وہ نورالدین زنگی کی طرف سے مصر کے حکمران بن گئے، اور انہی کی کوششوں کے نتیجے میں مصر سے فاطمی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ نورالدین زنگی ؒ (جن کا پایۂ تخت شام تھا) کی وفات کے بعد اہلِ شام نے انہیں شام کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی، اور اس طرح وہ بیک وقت مصر اور شام دونوں کے حکمران بن گئے۔

اپنے عہدِ حکومت کے دوران انہوں نے ایک طرف بیشمار تعمیری خدمات انجام دیں اور دوسری طرف یہی وہ دور تھا جب عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کی پے درپے مہمات شروع کر رکھی تھیں، سلطان صلاح الدین ایوبی ؒ نے ان جنگوں میں یورپ کی طاقتوں کے دانت کھٹے کیے، اسی زمانے میں بیت المقدس پر عیسائی قابض تھے سلطان صلاح الدین ایوبی ؒ نے ۵۸۳ھ میں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل اُن کے تسلط سے چھڑا کر وہاں اسلام کا پرچم لہرایا۔ اور شام کے جتنے علاقوں پر اہلِ صلیب قابض ہو گئے تھے، وہ سب اُن سے آزاد کرائے۔

ان کی بھی ساری زندگی میدانِ جہاد میں گذری، وہ بھی عدل و انصاف اور صلاح و تقویٰ میں نورالدین زنگی ؒ کے سچے جانشین تھے، انہوں نے مصر میں ۲۴ سال اور شام میں ۱۹ سال حکومت کی، لیکن جب ۵۸۹ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے ترکے میں نہ کوئی زمین جائداد تھی، نہ کوئی نقدی یا سونا[1] رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

[1] الاعلام للزرکلی ص ۲۹۲ ج ۹ و وفیات الاعیان ص ۳۷۶ ج ۲

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو دُنیا سے رخصت ہوئے آٹھ سو سال سے زائد ہو چکے ہیں، آج پھر مسلمانوں کا قبلۂ اوّل اُن سے چھین لیا گیا ہے، اور آج پھر امتِ مسلمہ کسی صلاح الدین کے انتظار میں ہے، اور پورا عالمِ اسلام زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں، بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں، بیا

---

(۱۰)

بازار حمیدیہ میں:

جامع دمشق اور سلطان زنگیؒ اور سلطان ایوبیؒ کے ملحقہ مزارات سے فارغ ہونے کے بعد ہم ذرا آگے چلے تو سُوق الحمیدیہ سامنے تھا۔ یہ دمشق کا قدیم ترین بازار ہے جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ عہدِ صحابہؓ سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو اسے عہدِ اسلام سے بھی پہلے بازنطینی دور کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ دُنیا کے اُن چند بازاروں میں سے ہے جو صدیوں سے اپنی قدیم جگہ پر قائم ہیں، اور ان کے محلِ وقوع میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ اس پر قدامت کے آثار اب بھی محسوس ہوتے ہیں، دُکانوں نے جدید تمدن کی تھوڑی بہت ادائیں ضرور سیکھ لی ہیں، لیکن انداز وہی پُرانا ہے۔ ایک مستطیل اور مسقّف بازار جس کے دونوں طرف انواع و اقسام کی دُکانوں کا طویل سلسلہ ہے، سڑک قدیم زمانے کے لحاظ سے خاصی کشادہ ہے۔ لیکن جتنی دونوں طرف دُکانیں ہیں، اتنے ہی دُکانوں کے سامنے تھڑے لگے ہوئے ہیں، نتیجہ یہ کہ سڑک پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ شام کی ٹھیٹھ اور ٹکسالی چیزیں خریدنی ہوں تو وہ اسی بازار اور اس کی ملحقہ گلیوں میں دستیاب ہوں گی جہاں سے گذرتے ہوئے عہدِ گذشتہ کی بُوباس قدم قدم پر مشامِ جان کو متاثر کرتی ہے، اور جس کے در و دیوار پر تاریخی واقعات کے اَن دیکھے سائے منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

سردی کا موسم تھا، اور شام اور ترکی کے بنے ہوئے سویٹر یہاں بہت اچھے اور بڑے سستے مل رہے تھے۔ شامی روپیہ لیرا کہلاتا ہے، اور قیمت کے لحاظ سے ہمارے پاکستانی روپے کے تقریباً برابر ہے، تمام ساتھیوں نے یہاں سے سویٹرز خریدے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ شام کے مزاج میں نفاست اور لطافت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ان کی ہر چیز میں خوش مذاقی واضح نظر آتی ہے۔ سادگی کے ساتھ حُسن ان کی فطرت میں داخل ہے۔ چنانچہ شام کی مصنوعات میں بھی یہ خوش مذاقی پورے طور پر نمایاں ہے۔

ہماری گاڑی سوق الحمیدیہ کے پیچھے ایک گلی میں کھڑی تھی، بازار سے گذر کر وہاں پہنچے۔ وہاں سے ہمارے رہنما عنایت صاحب ہمیں جبل قاسیون لے جانا چاہتے تھے، تاکہ وہاں سے رات کے وقت دمشق کا نظارہ کرا سکیں۔ لیکن راستے سے گذرتے ہوئے ایک جگہ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ جگہ "باب الجابی" کہلاتی ہے، میں یہ نام سُن کر ٹھٹھک گیا، اور وہاں گاڑی رُکوائی، دراصل یہ قدیم دمشق کا مشہور مغربی دروازہ تھا جس کا نام "تاریخوں میں" باب الجابیہ" مذکور ہے۔

بابُ الجابیہ :

دراصل "جابیہ" دمشق کی ایک مضافاتی بستی کا نام ہے جو دمشق کے مغرب میں جُولان کی سطح مرتفع کے قریب واقع ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے، تو انہوں نے دمشق میں داخل ہونے کے بجائے "جابیہ" میں قیام فرمایا تھا، اور وہاں ایک بڑا معرکۃ الآرا خطبہ بھی دیا تھا جو "خطبۃ الجابیہ" کے نام سے مشہور ہے، اس خطبے کے بہت سے اقتباسات حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں آتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اگر کوئی شخص دمشق سے "جابیہ" جانا چاہتا تو اُسے شہر کے اس مغربی دروازے سے نکلنا پڑتا تھا، اس لیے اس مغربی دروازے کا نام "باب الجابیہ" رکھ دیا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اپنی چوکی باب الجابیہ کے سامنے قائم فرمائی تھی، حضرت خالد بن ولیدؓ

اس کے مقابل دمشق کے "الباب الشرقی" کے سامنے فروکش تھے۔ محاصرہ کئی مہینے جاری رہا۔ مصالحت کی گفتگو بھی کئی بار چلی اور ناکام ہوئی۔ بالآخر حضرت خالد بن ولید رضؓ نے مشرقی جانب سے یلغار کی اور شہر میں داخل ہو گئے، حضرت ابو عبیدہ رضؓ کو حضرت خالد رضؓ کے حملے کا پتہ نہ چل سکا، اور باب الجابیہ کے لوگوں نے حضرت ابو عبیدہ رضؓ سے مصالحت کر کے یہ دروازہ حضرت ابو عبیدہ رضؓ کے لیے کھول دیا، اور حضرت ابو عبیدہ رضؓ اسی دروازے سے صلح کی بنیاد پر شہر میں داخل ہوئے، اُدھر سے حضرت خالد رضؓ بزورِ شمشیر آگے بڑھ رہے تھے، اور ادھر سے حضرت ابو عبیدہ رضؓ پُرامن طور پر تشریف لا رہے تھے، شہر کے بیچوں بیچ دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حضرت خالد رضؓ نے فرمایا کہ میں نے شہر کا نصف حصہ تلوار کے زور سے فتح کیا ہے، لہٰذا اس شہر کے لوگوں کے ساتھ مفتوحہ شہروں کا سلوک ہونا چاہیئے۔ لیکن حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے فرمایا کہ میں صلح کی بنیاد پر اہلِ شہر کو امان دے چکا ہوں، اور جب آدھا شہر صلحاً فتح ہوا ہے تو ہمیں پورے شہر کے ساتھ مصالحت کا سلوک کرنا چاہیئے۔ چنانچہ صحابۂ کرام رضؓ نے باتفاق یہی فیصلہ فرمایا کہ ہمارا مقصد خونریزی نہیں۔ اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے، اس لیے ہم اس شہر کو صلح سے حاصل شدہ شہر تصور کرینگے[1]

آج اس جگہ دروازہ نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ بلکہ یہ وسطِ شہر کی ایک معروف سڑک ہے جس کے دونوں طرف گنجان آبادی ہے، لیکن وہ جگہ ابھی محفوظ ہے جہاں کبھی باب الجابیہ نامی دروازہ ہوا کرتا تھا۔ یہ امینِ امت حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کی وہ گذرگاہ تھی جہاں سے وہ دمشق میں فاتحانہ داخل ہوتے تھے، اُن کے ہاتھوں اس تاریخی شہر سے قیصرِ روم کے جاہ و جلال کا پرچم ایک مرتبہ اُترا تو دوبارہ نہ لہرا سکا، اُن کے اور ان کے مبارک رفقاء کے ہاتھوں میں ایمان و یقین کی جو قندیلیں تھیں انہوں نے اس علاقے کو رشد و ہدایت سے منور کر دیا، اور ان نفوسِ قدسیہ کے پھیلائے ہوئے نور کے اثرات اہلِ شام میں آج چودہ سو برس گذرنے کے بعد بھی محسوس ہوتے ہیں۔ کفر و الحاد نے

---

[1] تاریخ ابن عساکر، ص ۱۴۸ ج ۱

اس نور کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا، یہاں تک کہ اب تو زمامِ اقتدار بھی اسی نے سنبھال لی، لیکن الحمد للہ عوام کے سینوں میں ایمان کی جو شمعیں آج بھی فروزاں ہیں انہیں بالکلیہ بجھانے پر ابھی تک قادر نہیں ہُوا۔

جبلِ قاسیون پر:

چند لمحے باب الجابیہ پر ماضی کے تصورات میں محو رہنے کے بعد ہم قاسیون کی طرف روانہ ہوگئے، یہ پہاڑ شہر دمشق پر ٹھیک اس طرح سایہ کئے ہوئے ہے جیسے اسلام آباد پر مرگلہ۔ اب دمشق کی آبادی بڑھتے بڑھتے اس پہاڑ کے مختلف حصوں تک پھیل گئی ہے چنانچہ مختلف آبادیوں سے گذرتے ہوئے ہم اس سڑک پر پہنچے جو بل کھاتی ہوئی قاسیون کی چوٹی تک جاتی ہے۔ سڑک سطح زمین سے بتدریج بلند ہوتی گئی، اور تھوڑی دیر میں ہم پہاڑ کے اُوپر پہنچ گئے۔

تاریخی اور اسرائیلی روایات کی رُو سے قاسیون انبیاء علیہم السلام کا مرکز رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو یہیں پر قتل کیا تھا، پہاڑ پر ایک غار بنا ہوا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں خون کا نشان بھی ہے، عوام میں مشہور ہے کہ یہ حضرت ہابیل کے خون کا نشان ہے۔

اس پہاڑ پر ایک مسجد "مسجد ابراہیم" کہلاتی ہے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے، اسی مسجد کے باہر پہاڑ میں ایک دراڑ ہے، اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کا جو واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے پہلے ستارے، پھر چاند اور پھر سورج کو (فرضی طور پر) خدا قرار دے کر پھر ان سب خیالات سے برأت کا اظہار فرمایا، اور عقیدۂ توحید کی اس لطیف پیرائے میں تبلیغ فرمائی، وہ واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت الیاس علیہ السلام اپنے بادشاہ وقت کے مظالم سے تنگ آکر اسی پہاڑ میں رُوپوش رہے تھے[1]

---

[1] مختصر تاریخ دمشق لابن منظور، ص ۲۷۷ تا ۲۸۰، ج ۱

یہ تمام روایات اسنادی حیثیت سے کمزور ہیں اور ان میں سے بعض تاریخی اعتبار سے بے بنیاد اور غلط بھی ہیں، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ یہ پورا علاقہ انبیاء علیہم السلام کا مرکز رہا ہے، اور جبلِ قاسیون اس علاقے کا نمایاں ترین پہاڑ ہے، اس لیے اگر مختلف انبیاء علیہم السلام نے اسے اپنا مستقر بنایا ہو تو کچھ بعید نہیں۔

ہماری گاڑی جس جگہ جاکر رُکی، وہ اس پہاڑ کا ایک تفریحی مقام ہے۔ گاڑی سے اُترے تو ایک ایسا دلفریب منظر سامنے تھا جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ کو تنگ دامنی کا احساس ہوتا ہے۔ سامنے تینوں اطراف میں حدِ نظر تک شہر دمشق کی روشنیاں پھیلی پڑی تھیں، رنگ برنگے قمقموں کا ایک جہان آباد تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زمین نے تاروں بھرے آسمان کی صورت اختیار کرلی ہے ؎

زمیں پہ جیسے کوئی کہکشاں اُتر آئی

یہاں کچھ ریسٹورنٹ بنے ہوئے ہیں، کچھ بچوں کے کھیلنے کے مراکز ہیں۔ غالباً سخت سردی کی وجہ سے یہاں کوئی چہل پہل نہیں تھی، ہم کچھ دیر یہاں کے حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد واپس روانہ ہوگئے۔

شیخ محی الدین ابن عربی[1] رحمۃ اللہ علیہ

جبل قاسیون سے اُتر کر ہم دمشق کے نئے علاقے میں پہنچے جو "دمشق الجدید" کہلاتا ہے، اور اپنی کشادہ سڑکوں، وسیع عمارتوں اور خوبصورت بنگلوں کے اعتبار سے جدید تمدن کا بہترین نمونہ ہے۔ عنایت صاحب یہاں سے ہمیں پھر دمشق کے قدیم علاقے کے اس محلے میں لے گئے جو شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہیں پر اُن کا مزار واقع ہے، اُس وقت مزار کا دروازہ چونکہ بند ہوچکا تھا اس لیے

---

[1] عام طور سے اہلِ علم قاضی ابوبکر ابن العربی کو "ابن العربی" (الف لام کے ساتھ) اور انکو "ابن عربی" الف لام کے بغیر لکھتے ہیں، لیکن شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے "طبقات" میں لکھا ہے کہ انکی صحیح کنیت "ابن العربی" ہی ہے، واللہ اعلم

اندر تو حاضری نہ ہو سکی، لیکن باہر ہی سے فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ صوفیاء کرام میں جس مقام بلند کے حامل ہیں، وہ کسی پڑھے لکھے شخص سے مخفی نہیں۔ آپ ۵۶۰ھ میں اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے تھے، پھر وہاں سے اشبیلیہ منتقل ہوئے۔ وہاں آپ کسی بادشاہ کے یہاں منشی کا کام کرتے تھے، لیکن پھر زہد کا غلبہ ہوا، اور تمام دُنیوی مشاغل چھوڑ کر یادِ خدا میں مصروف ہو گئے۔ بادشاہ نے ان کو ایک گھر تحفے میں دیا تھا جس کی قیمت اُس وقت ایک لاکھ درہم تھی؛ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی سائل آگیا، اُسے دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا، چنانچہ وہ گھر اُسے صدقہ کر دیا[1]۔

اشبیلیہ سے شیخؒ نے رختِ سفر باندھا تو حج کے لیے حرمین شریفین حاضر ہوئے، مصر، عراق اور شام کا سفر کیا، مصر میں کافی عرصہ مقیم رہے، اور بہت سی کتابیں تالیف فرمائیں۔ چونکہ ان کی تصانیف میں بہت سی شطحیات بھی موجود ہیں، اس لیے مصر کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے، اسی سلسلے میں قید بھی ہوئے، اور لوگ قتل تک کے درپے ہو گئے، بالآخر علی بن فتح البجائی نے ان کی خلاصی کرائی، اور انہوں نے آخر میں دمشق کو اپنا مستقر بنا لیا اور وہیں پر ۶۳۸ھ میں وفات پائی[2]۔

حضرت شیخ ابن عربیؒ کی شخصیت اہلِ علم میں متنازعہ رہی ہے، ان کی کتابوں میں جو شطحیات پائی جاتی ہیں ان کی بنا پر بہت سے محدثین اور فقہاء ان سے نالاں اور برگشتہ رہے، لیکن دوسرے حضرات نے انہیں معذور قرار دے کر ان کی برأت میں کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ان کی برأت پر ایک مستقل رسالہ "تنبیہ الغبی بتبرئۃ ابن عربی" کے نام سے لکھا ہے، اس میں علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

"والقول الفیصل فی ابن عربی اعتقاد ولایتہ وتحریم النظر

---

[1] فوات الوفیات للکتبی، ص ۴۳۶، ج ۳۔

[2] الاعلام للزرکلی، ص ۱۷۰، ج ۷۔

فی کتبہ، فقد نقل عنہ أنہ قال: نحن قوم یحرم النظر فی کتبنا...... وذلك لأن الصوفیة تواضعوا علی ألفاظ اصطلحوا علیها وأرادوا بها معان غیر المعانی المتعارفة منها، فمن حمل ألفاظهم علی معانیها المتعارفة بین أهل العلم الظاهر کفر؛ نص علی ذلك الغزالی فی بعض کتبہ"۔[1]

علامہ ابنِ عربی رحؒ کے بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ ان کے بارے میں ولی ہونے کا اعتقاد رکھا جائے لیکن ان کی کتابیں دیکھنے کو ناجائز قرار دیا جائے، کیونکہ خود انہی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ "ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہماری کتابیں دیکھنا (مذاق ناشناس لوگوں کے لیے) ناجائز ہے .... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیا رکرام نے بعض ایسی اصطلاحات مقرر کر رکھی ہیں جن سے وہ ان کے معروف معانی کے سوا کچھ اور معنیٰ مراد لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کے الفاظ کو معروف معنی پہنائے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ یہ بات امام غزالی رحؒ نے بھی اپنی بعض کتابوں میں لکھی ہے"۔

یہ شیخ ابن عربیؒ کے بارے میں بڑا معتدل فیصلہ کیا ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے علامہ ابنِ عربیؒ کی برارت میں ایک رسالہ لکھا ہے جو "تنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربیؒ" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں بھی حضرتؒ نے تقریباً یہی موقف اختیار فرمایا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ صوفیا رکرام پر جو حالات وکیفیات طاری ہوتی ہیں انہیں کوئی دوسرا شخص جو ان احوال سے نہ گذرا ہو، سمجھ نہیں سکتا، لہٰذا ہم جیسوں پر تو یہی بات صادق آتی ہے کہ

تو نہ دیدی گہے سلیماں را
چہ شناسی زبانِ مرغاں را

---

[1] شذرات الذہب لابن العماد ص ۱۹۱، ج ۵،

لہٰذا نہ ان حضرات کے بارے میں کسی بدگمانی کی کوئی گنجائش ہے، کیونکہ ان کی مجموعی زندگی اتباعِ سنّت میں ڈھلی ہوئی تھی، اور نہ ان کی ایسی کتابوں کے مطالعے کی کوئی ضرورت ہے، انسان کی اپنی اصلاح کے لیے شریعت و سنّت پر مشتمل کتابیں کافی ہیں۔ انہی کا حق ادا کردے تو بہت ہے، اس خاردار کوچے میں داخل ہی کیوں ہو؟

کُتب خانے:

شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے مزار سے ہم واپس ہوٹل آگئے، اور دن بھر کی تھکن کے بعد جلد ہی نیند آگئی۔

اگلا دن میں نے کتب خانوں کی سیاحت کے لیے مخصوص رکھا تھا، دوسرے رفقاء اپنی دوسری ضروریات کے لیے چلے گئے، اور میں دمشق کے مختلف تجارتی کُتب خانوں میں گھومتا رہا، یہاں کے کتب خانے واقعۃً کتابوں سے مالامال ہیں۔ بیروت کے قرب کی وجہ سے یہاں کتابوں کا بہترین ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ بیروت عربی کتابوں کی طباعت کا مرکز ہے، اور سالہا سال سے خانہ جنگی کی تباہ کاریوں کا شکار ہونے کے باوجود وہاں اشاعتِ کتب کا کام روز افزوں ہے۔ گولے بھی دن رات پھٹتے رہتے ہیں، اور نئی سے نئی کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بیروت یہاں سے بہت قریب ہے، اس لیے کتابیں بڑی تعداد میں آتی رہتی ہیں، بلکہ بیروت کے بہت سے ناشروں نے اپنا ایک ایک شوروم دمشق میں بھی قائم کر رکھا ہے، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں شامی لیرا قیمت میں پاکستانی روپے کے قریب قریب ہے، اس لیے یہاں ہم پاکستانیوں کو یہ کتابیں کافی سستی پڑتی ہیں، مصر، عراق اور اردن وغیرہ میں نہ کتابوں کا اتنا ذخیرہ ہے، اور نہ وہ ہمارے لیے اتنی ارزاں پڑتی ہیں، لہٰذا تجربہ یہی ہوا کہ خریدِ کتب کے لیے عرب ممالک میں یہ جگہ سب سے بہترین ہے۔

چنانچہ دن بھر الماریوں کی خاک چھاننے کے بعد شام تک اپنے مطلب کی کتابوں کا خاصا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا جو کئی بڑے بڑے کارٹونوں میں سمایا، اور اس طرح بفضلہٖ تعالیٰ سفر کی محنت وصول ہوگئی۔

عشاء سے کچھ پہلے ہوٹل واپسی ہوئی تو وہاں ہمارے دوست شیخ عبداللطیف الفرفور کو منتظر پایا، یہ شام کے ایک مشہور عالم شیخ صالح الفرفور کے صاحبزادے ہیں، خود بھی عالم ہیں علمی ذوق بھی رکھتے ہیں، اور دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں بھی خاصے فعال ہیں، جدہ کی مجمع الفقہ الاسلامی میں شام کی نمائندگی کرتے ہیں، اور سعودی عرب اور الجزائر وغیرہ میں ان کے ساتھ کافی رفاقت رہی ہے۔ کلیۃ الشریعہ کے بعض حضرات نے انہیں احقر کی آمد کی خبر دی تو وہ ہوٹل پہنچ گئے، اور کافی دیر سے وہاں منتظر تھے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بدھ کے روز اپنے یہاں کھانے پر مدعو بھی کیا۔

وہ رخصت ہوئے تو پاکستان کے قونصل جنرل جناب توحید صاحب تشریف لے آئے اور دمشق کی بعض اہم شخصیات سے ملاقات کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ احقر نے رفقاء سے کہہ دیا تھا کہ واپسی شاید دیر میں ہو، اس لیے وہ کھانے پر انتظار نہ کریں۔ توحید صاحب کے ساتھ واقعۃً خاصی دیر ہوگئی، لیکن جب ہم فارغ ہوئے تو توحید صاحب نے کہا کہ یہاں قریب میں ایک بڑا اچھا ریسٹورنٹ "مطعم ابوکمال" کے نام سے ہے، یہاں کے کھانے مشہور ہیں، کھانا یہاں کھالیا جائے، چنانچہ ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے، وہاں دیکھا تو ہمارے رفقاء قاری بشیر احمد صاحب، مولوی امین اشرف سلمہٗ اور مولوی عطاء الرحمٰن سلمہٗ پہلے سے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں حسنِ اتفاق سے یہ اچانک ملاقات خوب رہی —— شامی کھانے اپنی لذت و لطافت کے لحاظ سے سارے عرب ممالک میں مشہور ہیں، واقعۃً بڑے لذیذ بھی تھے، اور ریسٹورنٹ بھی بڑے پُرمنظر مقام پہ واقع تھا، یہاں سے رات گئے واپسی ہوئی۔

داریا میں:

اگلی صبح ہم دمشق کی ایک مضافاتی بستی داریا گئے، یہ بھی شام کا ایک تاریخی قصبہ ہے جو دمشق کے مغرب میں واقع ہے، یہ قصبہ بھی انبیاء کرامؑ، صحابہؓ اور علماء و اولیاء کا مرکز رہا ہے، اور یہاں سے بڑی جلیل القدر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں جو لوگ دمشق کی

سیاحت کے لیے آتے، وہ داریا کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے یہاں بھی جایا کرتے تھے۔[1]

انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت حزقیل علیہ السلام کا مزار یہیں بنایا جاتا ہے، حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا ایک قابلِ ذکر حصہ اسی بستی میں گذارا اور علامہ حموی نے ان علماء و اولیاء کی ایک طویل فہرست ذکر کی ہے جو داریا میں پیدا یا مدفون ہوئے۔[2]

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، سادہ مگر خوبصورت اور سرسبز، ہمارے رہنما نے گاڑی کو مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گذار کر ایک کشادہ گلی میں ایک خوبصورت مسجد کے سامنے رُکوایا، یہ مشہور ولی اللہ حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تھا۔

حضرت ابو سُلیمان دارانیؒ:

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ (جن کا نام عبدالرحمٰن بن احمد بن عطیۃ العبسی) ہے، تبع تابعین میں سے ہیں، محدث بھی ہیں اور اُونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے بھی ہیں، ولادت شام میں ہوئی تھی، پھر کچھ عرصے کے لیے عراق تشریف لے گئے، بعد میں پھر شام میں قیام فرمایا، اور یہیں وفات ہوئی۔ آپ اکثر اوقات ذکر و فکر میں مصروف رہتے تھے، دعوت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، امام ابو نعیم اصفہانیؒ نے آپ کا تذکرہ چھبیس صفحات میں کیا ہے، اور اس میں آپ کے بہت سے ملفوظات ذکر فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) فرمایا کہ: "دُنیا اپنے سے بھاگنے والے کا پیچھا کرتی ہے، اگر وہ بھاگنے والے کو پکڑ لے تو زخمی کر کے چھوڑتی ہے، اور اگر طالبِ دُنیا اُسے پکڑ لے تو اسے قتل ہی کر ڈالتی ہے۔"

(۲) فرمایا کہ: "وسوسوں اور خوابوں کی کثرت کمزور آدمی کو ہوتی ہے۔ اگر مکمل اخلاص پیدا ہو جائے تو خواب اور وسوسے دونوں بند ہو جاتے ہیں۔" پھر اپنے بارے میں فرمایا کہ "بعض اوقات مجھے کئی کئی سال گذر جاتے ہیں، اور کوئی خواب نہیں آتا۔"

---

[1] ملاحظہ ہو الانساب للسمعانی ص ۲۷۱، ج ۵،

[2] معجم البلدان ص ۴۳۱ و ۴۳۲، ج ۲،

(۳) فرمایا کہ: "اگر تم سے کبھی کوئی نفل عبادت فوت ہو جائے تو اس کو بھی قضا کر لیا کرو، اس سے امید ہے کہ وہ آئندہ تم سے نہیں چھوٹے گی۔"

(۴) فرمایا کہ: "بعض اوقات مجھے قرآن کریم کی صرف ایک آیت پر غور کرتے ہوئے پانچ پانچ راتیں گذر جاتی ہیں، اگر میں خود سے اس پر سوچنا نہ چھوڑوں تو اس سے آگے نہ بڑھ سکوں۔"

(۵) ایک شاگرد نے ایک مرتبہ آپ سے کہا کہ "مجھے بنی اسرائیل پر رشک آتا ہے کہ ان کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں، اور وہ اتنی عبادت کرتے تھے کہ ان کی کھالیں سکڑ کر پرانے مشکیزے کی طرح ہو جاتی تھیں۔" حضرت دارانیؒ نے فرمایا: "خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں چاہتے کہ ہماری کھالیں ہڈیوں پر خشک ہو جائیں، اللہ تعالیٰ ہم سے صدقِ نیت کے سوا کچھ نہیں چاہتے، اگر ہم میں سے کوئی شخص دس ہی دن میں یہ صدق پیدا کرلے تو اسے وہ درجہ مل سکتا ہے جو بنی اسرائیل کے کسی شخص نے پوری عمر میں حاصل کیا ہو۔"

(۶) فرمایا کہ "عبادت یہ نہیں ہے کہ تم تو قدم جوڑے نماز میں کھڑے رہو، اور کوئی دوسرا شخص تمہارے لیے روٹیاں بناتا رہے، بلکہ پہلے اپنی دو روٹی کا انتظام کرلو، پھر عبادت کرو۔"[1]

مسجد میں داخل ہونے کے بعد مسجد کے ایک جانب حضرت دارانیؒ کا مزار تھا، وہاں حاضری ہوئی، انہی کے پہلو میں آپ کی اہلیہ اور آپ کے مشہور شاگرد احمد بن ابی الحواریؒ مدفون ہیں۔ احمد بن ابی الحواریؒ آپ کے وہ خاص شاگرد ہیں جنہوں نے آپ کے بیشتر ملفوظات روایت کئے ہیں، محدثین میں بھی ان کا مقام بلند ہے، امام ابوداؤدؒ اور امام ابنِ ماجہؒ ان کے شاگرد ہیں۔[2]

---

[1] حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ص ۲۵۴ تا ۲۷۴ ج ۹

[2] تہذیب التہذیب ص ۴۹ ج ۱

حضرت ابو ثعلبۃ الخشنی رضؓ:

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ کے مقبرے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جہاں دس بارہ قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان قبروں میں سے ایک قبر مشہور صحابی حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ قبیلہ بنو خشین سے تعلق رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے جانے کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت یہ آپ کی خدمت میں آکر مسلمان ہوئے، اور غزوۂ خیبر میں شامل ہوئے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں بھی شامل تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی باہمی لڑائی میں یکسو رہے اور کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ داریا میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ آخر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ موت کے وقت گلا گھٹنے کی جو تکلیف ہوا کرتی ہے، وہ مجھے نہیں ہوگی۔ چنانچہ آپؓ ایک دن آخر شب میں نماز تہجد میں مشغول تھے کہ سجدے کی حالت میں ہی آپؓ کی رُوح پرواز کرگئی ان کی صاحبزادی اس وقت سو رہی تھیں، خواب میں دیکھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے، وہ گھبرا کر بیدار ہوئیں، اور آواز دی کہ "میرے والد کہاں ہیں؟ کسی نے کہا کہ نماز پڑھ رہے ہیں"۔ انہوں نے آپ کو آواز دی، جواب نہ ملا تو ان کے کمرے میں پہنچیں، دیکھا کہ وہ سجدے میں ہیں، انہوں نے ہلا جُلا کر دیکھا تو آپ گر پڑے۔ تب پتہ چلا کہ آپ کی وفات ہو چکی ہے[1]

---

(۱۱)

حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے مزار کے قریب ایک قبر پر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نام بھی لکھا ہوا ہے، ایک روایت بھی ہے کہ حضرت بلالؓ داریا کے قبرستان میں مدفون ہیں یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت بلالؓ داریا میں مقیم رہے ہیں، لیکن حافظ

---

[1] الاصابہ ص ۳۰ ج ۴

ابن عساکرؒ وغیرہ کا رُجحان اسی طرف ہے کہ ان کا مزار داریا میں نہیں، بلکہ دمشق کے "الباب الصغیر" کے قبرستان میں ہے[1] جس کا تذکرہ پیچھے کر چکا ہوں، اور اسی کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر بھی گذر چکا ہے۔

حضرت ابو مُسلم خولانیؓ

یہیں حضرت ابو مسلم خولانی رضی اللہ عنہ کا مزار بھی مشہور ہے، ان کا نام عبداللہ بن ثوبؓ اور یہ امتِ محمدیہ (علی صاحبہا السلام) کے وہ جلیل القدر بزرگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے آگ کو اسی طرح بے اثر فرما دیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آتشِ نمرود کو گلزار بنا دیا تھا۔ یہ یمن میں پیدا ہوئے تھے، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں اسلام لا چکے تھے، لیکن سرکارؐ کی خدمت میں حاضری کا موقع نہیں ملا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں یمن میں نبوت کا جھوٹا دعویدار اسود عنسی پیدا ہوا۔ جو لوگوں کو اپنی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے کے لیے مجبور کیا کرتا تھا۔

اسی دوران اُس نے حضرت ابو مُسلم خولانیؓ کو پیغام بھیج کر اپنے پاس بلایا، اور اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی، حضرت ابو مُسلمؓ نے انکار کیا، پھر اس نے پوچھا کہ کیا تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہو؟ حضرت ابو مُسلمؓ نے فرمایا "ہاں"۔

اس پر اسودِ عنسی نے ایک خوفناک آگ دہکائی، اور حضرت ابو مُسلمؓ کو اس آگ میں ڈال دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے آگ کو بے اثر فرما دیا، اور وہ اس سے صحیح سلامت نکل آئے۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ اسودِ عنسی اور اس کے رفقاء پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ اور اسود کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ ان کو جلاوطن کردو، ورنہ خطرہ ہے کہ ان کی وجہ سے تمہارے پیرووں کے ایمان میں تزلزل نہ آجائے۔ چنانچہ انہیں یمن سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یمن سے نکل کر ایک ہی جائے پناہ تھی، یعنی مدینہ منورہ، چنانچہ یہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۲۰۵، ج ۱۔

کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چلے۔ لیکن جب مدینہ منورہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ آفتابِ رسالتؐ روپوش ہو چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما چکے تھے۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن چکے تھے۔ انہوں نے اپنی اونٹنی مسجد نبویؐ کے دروازے کے پاس بٹھائی، اور اندر آکر ایک ستون کے پیچھے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ وہاں حضرت عمرؓ موجود تھے۔ انہوں نے ایک اجنبی مسافر کو نماز پڑھتے دیکھا تو ان کے پاس آئے، اور جب وہ نماز سے فارغ ہو گئے تو ان سے پوچھا:

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"یمن سے!" حضرت ابومسلمؒ نے جواب دیا۔

حضرت عمرؓ نے فوراً پوچھا: "اللہ کے دشمن (اسود عنسی) نے ہمارے ایک دوست کو آگ میں ڈال دیا تھا، اور آگ نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ بعد میں اُن صاحب کے ساتھ اسود نے کیا معاملہ کیا؟"

حضرت ابومسلمؒ نے فرمایا: "ان کا نام عبداللہ بن ثوب ہے۔"

اتنی دیر میں حضرت عمرؓ کی فراست اپنا کام کر چکی تھی، انہوں نے فوراً فرمایا:

"میں آپ کو قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا آپ ہی وہ صاحب ہیں؟"

حضرت ابومسلم خولانی رحؒ نے جواب دیا: "جی ہاں!"

حضرت عمرؓ نے یہ سنکر فرطِ مسرت و محبت سے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور انہیں لیکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے، انہیں صدیق اکبرؓ کے اور اپنے درمیان بٹھایا، اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے موت سے پہلے امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس شخص کی زیارت کرا دی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسا معاملہ فرمایا تھا۔"[1]

حضرت ابومسلم خولانیؒ عبادت و زہد میں اپنی مثال آپ تھے، خود انہی کا یہ مقولہ ہے کہ:

---

[1] حلیۃ الاولیاء لابی نعیمؒ ص ۱۲۹ ج ۲، وتہذیب تاریخ ابن عساکر ص ۳۱۵ ج ۷

"اگر میں جنت کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لوں تب بھی میرے پاس مزید کرنے کے لیے کوئی عمل نہیں، اور اگر جہنم کو کھلی آنکھوں دیکھ لوں تب بھی۔"[1] جہاد کا بھی بڑا شوق تھا، لیکن جہاد کے سفروں میں بھی روزے رکھتے تھے، کسی نے کہا کہ "سفر میں روزے رکھنے سے آپ بہت کمزور ہو جائیں گے۔" جواب میں آپ نے فرمایا: "وہی گھوڑے منزل کو پہنچتے ہیں جو چل چل کر دبلے ہوگئے ہوں۔"

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: "الحمد للہ! میں نے قضائے حاجت اور اہلیہ کے ساتھ خلوت کے سوا کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے بارے میں مجھے یہ فکر ہو کہ کہیں کوئی دوسرا نہ دیکھ لے۔"

حضرت ابومسلمؒ غلاموں کو بھی بہت آزاد کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے پاس صرف ایک کنیز رہ گئی تھی، ایک دن دیکھا کہ وہ رو رہی ہے، آپ نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ "آپ کے بیٹے نے مارا ہے۔" آپ نے بیٹے کو بلایا، اور کنیز سے پوچھا کہ: "اس نے تمہیں کس طرح مارا تھا؟" کنیز نے کہا کہ "تھپڑ مارا تھا۔" آپ نے فرمایا: "تم بھی اس کو تھپڑ لگا دو۔" کنیز بولی: "میں اپنے آقا کو نہیں مار سکتی۔" حضرت ابومسلمؒ نے پوچھا: "کیا تم نے اسے معاف کردیا؟" اس نے کہا: "جی ہاں!" آپ نے فرمایا: "دُنیا یا آخرت میں سے کہیں اپنا حق نہیں مانگو گی؟" کنیز نے اقرار کیا۔ حضرت ابومسلمؒ نے فرمایا کہ "دو گواہوں کے سامنے اقرار کرو۔" جب دو گواہ آگئے اور کنیز نے اقرار کر لیا تو آپ نے فرمایا: "میں بھی ان گواہوں کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ یہ کنیز اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے آزاد ہے۔" لوگوں نے کہا کہ "آپ نے صرف ایک تھپڑ کی وجہ سے کنیز کو آزاد کردیا، جبکہ آپ کے پاس کوئی دوسری خدمت گار بھی موجود نہیں ہے؟" آپ نے فرمایا: "چھوڑو بھی، کاش! کہ ہم برابر سرابر چھوٹ جائیں، نہ کسی کا حق ہم پر ہو، نہ ہمارا کسی پر۔"[2]

عمر کے آخری حصے میں آپ شام میں مقیم ہوگئے تھے، مستقل قیام یہیں داریا کی بستی میں تھا، لیکن اکثر جامع مسجد کی فضیلت کی خاطر نماز پڑھنے دمشق جایا کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ

---

[1] ابن عساکر، حوالہ مذکور   [2] ایضاً ص ۳۱۹

خلافت کا زمانہ تھا، آپ اکثر ان کے پاس پہنچ جاتے، اور انہیں نصیحت بھی فرماتے اور بعض اوقات بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ بھی، لیکن حضرت معاویہؓ ان کی ہر بات کی بیحد قدر فرماتے تھے، اور لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ "یہ جو کچھ کہیں انہیں ٹوکا مت کرو"

چونکہ آپ کا قیام داریا میں تھا، اس لیے ایک روایت یہ ہے کہ آپ کی قبر یہیں پر ہے، اور یہ قبر جو ہمارے سامنے تھی، اسی روایت کے مطابق ہے۔ لیکن ایک دوسری روایت یہ ہے کہ آپ رومیوں سے جہاد کی غرض سے رُوم کے علاقے میں تشریف لے گئے تھے، وہیں پر آپ کی وفات ہوئی۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

حضرت حزقیل علیہ السلام کا مزار:

داریا کے اس چھوٹے سے قبرستان سے کچھ دُور ایک مکان کے بیرونی چبوترے پر ایک الگ تھلگ قبر بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں یہاں مشہور ہے کہ یہ مشہور اسرائیلی پیغمبر حضرت حزقیل علیہ السلام کی قبر ہے۔ یہ قبر بھی حضرت شعیب اور حضرت یوشع علیہما السلام کی قبروں کی طرح معمول سے بہت لمبی ہے، یہاں بھی حاضری کا شرف حاصل ہُوا۔

تاریخی روایات کے مطابق حضرت حزقیل علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیسرے خلیفہ تھے، پہلے خلیفہ حضرت یوشع علیہ السلام تھے، دوسرے حضرت کالب بن یوحنّا اور تیسرے حضرت حزقیل علیہ السلام موجودہ بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں ایک صحیفہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا اسم گرامی مذکور نہیں ہے، لیکن قرآن کریم نے سورۃ البقرہ میں ایک واقعہ بیان فرمایا ہے جس کے بارے میں بعض تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ ہی سے متعلق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے بزرگوں سے یہ روایت منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت سے فرمایا کہ فلاں

---

[1] ابن عساکر، حوالہ مذکور، ص ۳۱۹

دشمن سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، تو وہ لوگ موت کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک دُور افتادہ وادی میں یہ سمجھ کر مقیم ہو گئے کہ اب ہم موت سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی، اور ان پر موت طاری کر دی گئی، وہ سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ایک ہفتے کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کا ان پر گذر ہُوا تو آپ نے ان کی اس حالت پر افسوس کا اظہار فرمایا، اور دُعا مانگی کہ الٰہ العالمین: ان کو موت کے عذاب سے نجات فرما دے، تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے عبرت اور بصیرت کا سامان بن جائے۔ آپ کی یہ دُعا قبول ہوئی، اور وہ لوگ زندہ ہو کر عبرت و بصیرت کا سامان بنے[1] قرآن کریم نے اس واقعے کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ، پھر ان کو زندہ کر دیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

مِزّہ میں:

داریا کے مختلف مقامات سے فارغ ہونے کے بعد ہم واپس دمشق کے لیے روانہ ہوئے، سردیوں کے دن تھے، اور نمازِ ظہر وہاں ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہو رہی تھی، اور عصر کی اذان ڈھائی بجے کے قریب۔ چنانچہ دمشق میں داخل ہونے کے بعد ہم نے ایک جگہ نمازِ ظہر ادا کی۔ معلوم ہُوا کہ اس محلّے کا نام مِزّہ[2] ہے۔ اب تو یہ دمشق شہر ہی کا ایک محلّہ

---

[1] قصص القرآن ص ۱۹ و ۲۰، ج ۲ بحوالہ ابنِ کثیر ص ۴ ۱۳، ج ۲ و روح المعانی ص ۱۳۰، ج ۲

[2] میم کے نیچے زیر ہے اور زے پر تشدید۔

ہے، لیکن ابتدا میں یہ دمشق سے باہر ایک مستقل بستی تھی جو اپنے حُسن و جمال اور شادابی کے لیے مشہور تھی۔ علامہ حموی لکھتے ہیں:

وهي قرية كبيرة غنّاء في وسط بساتين دمشق، بينها وبين دمشق نصف فرسخ [1]

یہ دمشق کے باغات کے بیچوں بیچ ایک بڑی بستی ہے جو گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے، اور دمشق سے آدھے کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس بستی میں بہت سے علماء پیدا ہوئے، جن میں سے حافظ ابوالحجاج مِزّی رحمۃ اللہ علیہ شاید سب سے زیادہ مشہور ہیں جن کی کتاب "تہذیب الکمال" صحاحِ ستہ کے اسماء الرجال پر اس وقت سب سے بڑے مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تلخیص کر کے پہلے "تہذیب التہذیب" پھر "تقریب التہذیب" تحریر فرمائی ہیں۔ انہی کی کتاب "تحفۃ الاشراف" اپنے دور میں صحاحِ ستہ کی جامع ترین انڈیکس ہے۔ حافظ مِزّیؒ بڑے بڑے مشہور علماء کے استاذ ہیں جن میں علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ذہبیؒ، حافظ سبکیؒ، حافظ برزالیؒ، علامہ ابن سیدالناسؒ اور حافظ ابن کثیرؒ جیسے حضرات داخل ہیں۔ اور حافظ ابن کثیرؒ تو ان کے داماد بھی تھے [2]

پھر مِزّہ کی بستی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی بستی کہلاتی تھی، اور یہیں پر ان کا مزار بھی واقع ہے، چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ ان کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔

حضرت دِحیہ کلبی رضؓ:

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن صحابۂ کرامؓ میں سے تھے جو اپنے حُسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت

---

[1] معجم البلدان للحموی، ص ۱۲۲، ج ۶۔

[2] البدایۃ والنہایۃ ص ۱۹۱ و ۱۹۲، ج ۱۴۔

جبرئیل علیہ السلام کے مُشابہ قرار دیا تھا۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام جب کبھی انسانی شکل میں آتے تو عموماً حضرت دِحیۂ کلبی رضی کی صورت اختیار فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی نے دیکھا کہ حضرت دِحیہ رضی ایک گھوڑے پر سوار ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس گھوڑے پر ہاتھ رکھ کر حضرت دِحیہ رضی سے باتیں کر رہے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی نے اس واقعے کا ذکر آپ ؐ سے کیا تو آپ ؐ نے فرمایا کہ "وہ تو جبرئیل ؑ تھے"[1]

ایک روایت میں ہے کہ آپ رضی اتنے حسین وجمیل تھے کہ جب کسی نئے علاقے میں جاتے تو نوجوان لڑکیاں آپ کو دیکھنے کے لیے باہر نکل آیا کرتی تھیں۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ رُوم کو جو تبلیغی مکتوب روانہ فرمایا، وہ آپ ہی کے ذریعے روانہ فرمایا تھا۔ اس طرح آپ رضی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایلچی بننے کی بھی سعادت حاصل ہے۔ جب آپ رضی قیصر کو خط پہنچا کر واپس مدینہ طیبہ آئے تو شام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ پستہ، کچھ اخروٹ اور کعک[3]، ایک اُونی جُبّہ اور دو چمڑے کے موزے بطور ھدیہ لے کر آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام تحفے قبول فرمائے۔ اور موزے تو اتنے پہنے کہ وہ پھٹ گئے۔[4]

حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصر کا کچھ باریک سُوتی کپڑا آیا جسے قبطیہ کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹکڑا حضرت دِحیہ رضی کو بھی دیا، اور فرمایا کہ اس کے دو حصے کر لینا، ایک میں اپنی قمیص بنا لینا، اور دوسرا حصہ اپنی اہلیہ کو دے دینا کہ وہ اپنی اوڑھنی بنا لیں۔ حضرت دِحیہ رضی کپڑا لے کر جانے لگے تو آپ ؐ نے انہیں دوبارہ

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۲۵۰، ج ۴ [2] المصباح المضیئ، لابن ابی حدیدہ، ص ۲۶۸، ج ۱

[3] "کعک" ایک خاص قسم کی خشک اور گول روٹی ہوتی تھی جس کے بیچ میں حلقے کی طرح خلا ہوتا تھا، شام کی یہ روٹی قدیم زمانے سے مشہور تھی، اور بسکٹ یا کیک کی طرح پسند کی جاتی تھی، اور لوگ اسے تحفہ میں دیا کرتے تھے۔ (تاج العروس ص ۱۷۲، ج ۷)

[4] المصباح المضیئ ص ۲۶۸، ج ۱

بُلا کر فرمایا: "اپنی اہلیہ سے کہنا کہ وہ اس کے نیچے کوئی استر لگالیں تاکہ کپڑے سے جسم نہ جھلکے۔"[1]

ان تمام واقعات سے آپ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس خصوصی شفقت کا پتہ چلتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

آپ غزوۂ بدر کے بعد تقریباً ہر جہاد میں شامل رہے، یرموک کے معرکے میں بھی شریک تھے، بعد میں مزّہ میں قیام اختیار فرمالیا تھا۔ اور وہیں پر وفات پائی۔

عُلماء کا اجتماع:

مزّہ سے ہم واپس اپنے ہوٹل آگئے۔ شام کو مجھے بعض کتب خانوں میں جانا تھا، چنانچہ عشاء تک میں مختلف کتب خانوں میں مصروف رہا۔ رات کو توحید صاحب (قونصل جنرل پاکستان) نے اپنے مکان پر احقر سے مُلاقات کرانے کے لیے دمشق کے معروف علماء کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ عشاء کے بعد ہم وہاں چلے گئے۔ جو اہلِ علم وہاں موجود تھے ان میں شیخ سعید رمضان البوطی، ڈاکٹر فتحی الدرینی، شیخ ابراہیم السلقینی، شیخ نورالدین عتر، ڈاکٹر مصطفےٰ الزحیلی (جو ڈاکٹر وھبہ الزحیلی کے بھائی ہیں) شیخ عبداللطیف الفرفور وغیرہ شامل ہیں۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ توحید صاحب نے (جو ماشاء اللہ دینی جذبے کے حامل افسر ہیں) یہاں کے تمام اہلِ علم سے بڑا اچھا ربط پیدا کیا ہوا ہے، ہمارے تمام بیرونی سفارت خانوں میں ایسے جذبے کے افسر ان پہنچ جائیں تو وہ عام شکایت دُور ہو جائے جو ہمارے سفارتخانوں کے بارے میں زباں زد ہو چکی ہے۔

بہرکیف! یہ بڑا پُرلطف اجتماع رہا، اس میں بہت سے علمی مسائل پر بھی گفتگو ہوئی یہ سب حضرات پاکستان کے حالات سُننے، بالخصوص یہاں نفاذِ شریعت کی کوششوں کا حال معلوم کرنے کے بیحد مشتاق تھے، چنانچہ احقر نے مختصراً قیامِ پاکستان کا پس منظر، نفاذِ شریعت کے لیے علماء کی جدوجہد اور اس کے نتائج کے روشن اور تاریک پہلو ان حضرات کے سامنے

---

[1] ابنِ عساکر ص ۲۱۹ ج ۵ بحوالہ ابوداؤد۔

بیان کیے جنہیں انہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا، اور اس تاثر کا اظہار تقریباً ہر شخص نے کیا کہ ہم سب کی نگاہیں پاکستان پر لگی رہتی ہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہی ایک ایسا ملک ہے جو نفاذِ شریعت کی مثال قائم کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے ـــــ کاش کہ ہم پاکستان کے باشندے باہر کے مسلمانوں کے ان جذبات کا پاس کر سکتے، کاش کہ ہمارے پاس ان کے لیے یہ جواب ہوتا کہ انشاء اللہ اہلِ پاکستان آپ کی ان امیدوں پر پورے اتریں گے۔ کاش کہ ہم اُن سے یہ کہنے کے قابل ہوتے کہ عالمِ اسلام جس روزِ سعید کے انتظار میں ہے اُس کی صبح پاکستان میں طلوع ہو رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف تمناؤں سے تلخ حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے، لہٰذا ایسے سوالات کے جواب میں روشن پہلوؤں کے ساتھ تلخ حقائق بھی بیان کرنے ہی پڑتے ہیں، اور خدا جانے کب تک بیان کرنے پڑیں گے۔

شام کی حالت دینی اعتبار سے جیسی کچھ ہے، وہ سبھی کو معلوم ہے، اس کا بھی تذکرہ آیا، لیکن یہ حضرات اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں، اور پاکستان کے موجودہ حالات کو بھی اپنے ملک کے لحاظ سے غنیمت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شام کے دینی حلقوں کو اس آزمائش سے بعافیت رہائی عطا فرمائیں۔ آمین

عشاء کے بعد سے رات ۱۱½ بجے تک یہ مجلس جاری رہی۔ اس کے بعد ہم ہوٹل واپس آئے۔

دمشق کا عجائب گھر:

اگلا دن دمشق میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا۔ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہم نے دمشق کے عجائب گھر جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ یہ عجائب گھر ہوٹل کے قریب ہی واقع تھا، اس لیے ہم پیدل ہی روانہ ہوئے۔ وکٹوریہ کی مرکزی شاہراہ سے ذرا ہٹ کر ایک گلی سے گذر ہوا۔ یہ گلی اس وقت ہاتھ کے بنے ہوئے فرنیچر اور دستکاری کا مرکز تھی۔ اسی گلی کے بیچ میں ایک ترکی دور کی بنی ہوئی قدیم عمارت ہے۔ معلوم ہوا کہ ترکی خلافت کے دور میں یہ ایک بڑا مدرسہ تھا، عمارت اگرچہ پرانی ہو چکی ہے، لیکن اس کا حسن اور شکوہ ابھی تک

برقرار ہے۔ اس کے صدر دروازے سے داخل ہوں تو سامنے ایک وسیع صحن ہے اور اس کے دونوں طرف برآمدے اور برآمدے کے اندر کمروں کی قطاریں ہیں۔ اندازہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمرے طلبہ کی رہائش کے لیے استعمال ہوتے ہوں گے۔ پھر صحن کو عبور کر کے کئی بڑے بڑے ہال ہیں جو شاید درس گاہوں کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے۔

آج یہ عمارت ویران پڑی ہے، کسی کسی کمرے میں فرنیچر والوں نے اپنا گودام بنا رکھا ہے، لیکن اس کے در و دیوار سے علم کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ خدا جانے یہاں کتنے عرصے تک کیسے کیسے اہلِ علم کے فیوض جاری رہے ہیں، لیکن آج کوئی اس مدرسے کا نام اور اس کی تاریخ بتانے والا بھی موجود نہیں ہے۔ ماعندکم ینفد وما عند اللہ باق۔

اس مدرسے سے نکل کر ہم پھر مرکزی سڑک پر آگئے۔ قریب ہی عجائب گھر کی شاندار عمارت تھی۔ خیال یہ تھا کہ دمشق انتہائی قدیم شہر ہے، لہٰذا یہاں کا عجائب گھر یقیناً قدیم تاریخی اشیاء سے مالامال ہوگا۔ لیکن اندر جا کر اندازہ ہوا کہ یہ عام شہروں کے روایتی عجائب گھروں سے مختلف نہیں ہے۔ بنو امیہ کے بعض خلفاء (عبدالملک بن مروان اور ہشام بن عبدالملک) کی زرہوں اور تلواروں کے سوا یہاں کوئی خاص دلچسپی کی چیز موجود نہیں تھی۔ عجائب گھر زیادہ تر بازنطینی دور کی یادگاروں سے بھرا ہوا تھا جن سے ہمیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

اس روز دوپہر کو ہمارے دوست شیخ عبداللطیف الفرفور صاحب نے دوپہر کے کھانے پر ہمیں مدعو کیا ہوا تھا، اور دس بجے کے قریب ہی اپنے ایک شاگرد کو ہمارے پاس بھیج دیا تھا، تاکہ وہ شہر کے کاموں میں ہماری مدد بھی کریں، اور بعد میں ہمیں کھانے کی جگہ پر بھی لے جائیں۔

حضرت معاویہؓ کے مزار پر:

چنانچہ اُن کی معیت میں پہلے ہم نے جامع دمشق اور سوق الحمیدیہ کے آس پاس کچھ خریداری کی۔ شام کی قدیم طرز کی مٹھائیاں یہاں کی خاص چیزیں ہیں جو خشک میوے سے مختلف طریقوں سے بنائی جاتی ہیں، وہ لی گئیں۔ اسی دوران ہمارے رہنما نے بتایا کہ حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ کا مزار بھی اسی علاقے میں ایک مکان کے اندر واقع ہے، چنانچہ وہ ہمیں کئی پیچ در پیچ گلیوں سے گذارتے ہوئے ایک پرانے طرز کے بوسیدہ مکان کے پاس لے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک عمر رسیدہ خاتون نے جواب دیا ہمارے رہنما نے ان سے کہا کہ پاکستان سے کچھ لوگ آئے ہیں اور مزار کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن خاتون نے جواب دیا کہ اس کے لیے محکمۂ اوقاف سے اجازت نامہ لانا ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ اس مزار کو حکومت نے عام زیارت کے لیے بند کر رکھا ہے، اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بعض روافض یہاں آکر شرارت اور مزار کی بے حرمتی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لہٰذا محکمۂ اوقاف نے یہ پابندی لگا دی ہے کہ اجازت نامے کے بغیر کسی کو اندر نہ بھیجا جائے۔

لیکن ہمارے ساتھ پاکستانی سفارت خانے کے عنایت صاحب بھی تھے انہوں نے اور ہمارے رہنما نے مل کر خاتون کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور احقر کا تعارف کرایا، اس پر خاتون نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

یہ ایک پرانے طرز کا مکان تھا جس کے لمبوترے صحن سے گذر کر ایک بڑا سا کمرہ نظر آیا جس میں چند قبریں بنی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک قبر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھی بتائی جاتی ہے۔ یہاں سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا سیاسی موقف چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تھا، اور جمہور اہل سنت کے نزدیک حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اس لیے ان کے مخالفین بالخصوص روافض کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کا موقع مل گیا، اور ان کے خلاف الزامات و اتہامات کا ایک طومار لگا دیا گیا جس میں ان کے فضائل و مناقب چھپ کر رہ گئے۔ ورنہ وہ ایک جلیل القدر صحابی، کاتبِ وحی، اور ایسے اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے کہ آج ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے جب حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ سے پوچھا گیا کہ "حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا عمر بن عبد العزیزؒ" تو آپ نے جواب دیا کہ: "حضرت معاویہؓ کی ناک کی خاک بھی عمر بن عبد العزیزؒ سے افضل ہے۔" احقر نے ان کے خلاف لگائے گئے الزامات

پر اپنی کتاب "حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق" میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور میرے برادرزادہ عزیز و گرامی مولانا محمود اشرف عثمانی نے حضرت معاویہؓ کی سیرت اور مناقب پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے جو اسی کتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ :

دمشق کے قیام میں جتنے کام پیشِ نظر تھے، بحمداللہ وہ تقریباً سب پورے ہو چکے تھے، البتہ ایک خواہش ابھی باقی تھی۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ سے ہم طالب علموں کا تعلق خاطر محتاجِ بیان نہیں ہو سکتا، ان کی کتاب "ردّ المحتار" اس وقت حنفی مفتیوں کا سب سے بڑا ماخذ ہے جس سے دن رات استفادے کی نوبت آتی رہتی ہے، خواہش تھی کہ ان کے مزار پر بھی حاضری ہو، لیکن عنایت صاحب جو اب تک ہماری رہنمائی کرتے رہے تھے ان کے مزار کے محل وقوع سے واقف نہ تھے۔ اب شیخ فرفور کے یہ شاگرد جو آج میسر آئے انہوں نے بتایا کہ وہ مزار سے واقف ہیں۔

چنانچہ سوق الحمیدیہ سے ہم ایک مرتبہ پھر "الباب الصغیر" کے قبرستان کی طرف گئے، وہاں قبرستان کے مرکزی دروازے کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا احاطہ بنا ہوا ہے جس کا دروازہ بھی الگ ہے اسی میں علامہ شامیؒ اور ان کے اہلِ خاندان آرام فرما ہیں۔

سب سے پہلے علامہ شامیؒ کے مزار پر حاضری ہوئی۔ اور محبت و عقیدت کے جذبات کے ساتھ سلام عرض کرنے اور ایصالِ ثواب کا موقع ملا۔

علامہ شامیؒ کا نام محمد امین ابن عابدینؒ ہے اور ۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، آپ کے والد تاجر تھے، اور بچپن میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، حفظ کے بعد والد نے ان کو تجارت کی تربیت کے لیے دکان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ یہ وہاں بیٹھ کر بلند آواز سے تلاوت کرتے رہتے تھے۔ ایک دن بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے کہ ایک اجنبی وہاں سے گزرے، انہیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے کہا کہ تمہارا اس طرح پڑھنا دو وجہ سے جائز نہیں ہے، اوّل تو اس لیے کہ یہ بازار ہے، اور لوگ یہاں آپ کی تلاوت نہیں سن سکتے، اور آپ کی وجہ سے

گناہگار ہوں گے جس کا گناہ آپ کو ہوگا، اور دوسرے اس لیے کہ آپ کی تلاوت میں غلطیاں کافی ہیں۔

بس علامہ شامیؒ اسی وقت دکان سے اُٹھے اور اپنے زمانے کے شیخ القراء شیخ سعید الحمویؒ کے پاس پہنچ گئے، اور ان سے قرات و تجوید سیکھنے کی درخواست کی انہوں نے پڑھانا منظور فرمالیا، اور انہوں نے نابالغی ہی میں قرات و تجوید کی اہم کتابیں میدانیہ جزریہ اور شاطبیہ زبانی یاد کرلیں، اور قرات و تجوید میں ماہر ہو گئے۔

اس واقعے سے علم کا چسکا تو لگ چکا تھا، چنانچہ بعد میں تمام دینی علوم وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے حاصل کئے، اور اس کے بعد تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، اور بہت سی کتابیں تالیف فرمائیں۔ آپ کا خصوصی موضوع فقہِ حنفی تھا، اس لیے آپ کی زیادہ تر کتابیں فقہِ حنفی پر ہیں۔ جن میں سے "الدر المختار کی شرح" رد المحتار جو فتاویٰ شامی کے نام سے مشہور ہے۔ سب سے زیادہ جامع اور مفصل کتاب ہے، اور بارھویں صدی ہجری کے بعد تو حنفی مسلک کے مفتیوں کا سب سے بڑا ماخذ بن گئی، اس لیے کہ فقہِ حنفی کی تنقیح و تحقیق میں یہ کتاب بے نظیر ہے، اور اس میں علامہ شامیؒ نے ایک ایک مسئلے کی تحقیق میں بیسیوں کتابوں کی ورق گردانی فرمائی ہے، اور محض متاخرین کی نقل پر اعتماد کرنے کے بجائے اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے ہر مسئلے کی تحقیق کی ہے۔

فقہ و فتویٰ میں تو علامہ شامیؒ اپنے دور کے شاید سب سے بڑے مرجع تھے ہی، عبادات و طاعات اور حسنِ اخلاق میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتے تھے، رمضان شریف میں ہر رات ایک قرآن کریم ختم کرنے کا معمول تھا۔ اپنی تجارت اپنے ایک شریک کے سپرد کر رکھی تھی، وہی آپ کا ذریعۂ آمدنی تھا، اور خود علمی اور عملی کاموں میں مصروف رہتے تھے، صدقات و خیرات میں بہت حصہ لیتے رہتے تھے۔ آپ کے علمی رعب سے حکام وقت بھی متأثر تھے، اگر کوئی قاضی خلاف شرع فیصلہ کر دیتا اور علامہ شامیؒ اپنے فتوے میں اس فیصلے کو خلافِ شرع قرار دے دیتے تو قاضی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑتا تھا۔

علامہ شامیؒ نے کل چوّن سال عمر پائی، اور ۱۲۵۲ھ میں وفات ہوئی۔ وفات سے تقریباً

بیس دن پہلے انہوں نے اپنی قبر کی جگہ خود منتخب کر لی تھی، کیونکہ اس جگہ "درمختار" کے مؤلف علامہ حصکفیؒ مدفون تھے۔ علامہ شامیؒ انہی کے قریب دفن ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق وہیں پر آپ کو دفن کیا گیا۔

آپ کی والدہ آپ کی وفات کے وقت زندہ تھیں اور دو سال مزید زندہ رہیں۔ وہ نہایت خدا رسیدہ خاتون تھیں جن کا سلسلۂ نسب مشہور محدث علامہ داؤدیؒ سے ملتا ہے۔ اپنے لائق بیٹے کے انتقال پر عام عورتوں کی طرح انہوں نے جزع فزع بالکل نہیں کیا، لیکن جب تک زندہ رہیں ہر ہفتے ایک لاکھ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر اپنے محبوب بیٹے کو ایصالِ ثواب کرتی رہیں[1]

علامہ شامیؒ کے پوتے مفتی ابوالیسر ابھی چند سال پہلے تک حیات تھے، اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ جب دمشق تشریف لے گئے تھے تو ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔

علامہ شامیؒ کے برابر میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الدر المختار" کے مصنف علامہ محمد علاء الدین حصکفی[2] رحمہ اللہ کا مزار ہے جن کی کتاب کی شرح علامہ شامی نے فرمائی ہے، ان کی وفات ۱۰۸۸ھ میں ہوئی تھی۔

انہی کے قریب علامہ شامیؒ کے فاضل صاحبزادے علامہ علاء الدین ابن عابدینؒ کا مزار ہے۔ جو فقہ حنفی میں اپنے والد کے صحیح وارث تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی کتاب "رد المحتار" کا تکملہ بھی لکھا ہے، اور ترکی کی خلافتِ عثمانیہ نے جب عدالتوں کیلئے فقہ حنفی کی بنیاد پر اسلامی قانون کی تدوین کا کام شروع کیا تو علامہ علاء الدینؒ کی سرکردگی میں اس غرض کے لیے علماء کی ایک جماعت بنائی تھی جس نے یہ قانون "مجلۃ الاحکام العدلیۃ" کے نام سے مدون کیا، یہ قانون نہ صرف ترکی، بلکہ بہت سے اسلامی ملکوں میں سالہا سال

---

[1] علامہ شامیؒ کے یہ تمام حالات ان کے صاحبزادے علامہ علاء الدینؒ نے تکملہ رد المحتار کے شروع میں بیان فرمائے ہیں۔

[2] "حصن کیفا" کی طرف نسبت ہے۔

نافذ رہا۔ کویت اور اردن وغیرہ میں چند سال پہلے تک دیوانی قانون کے طور پر یہی "مجلّہ" نافذ تھا۔

علامہ علاء الدینؒ طرابلس (لبنان) کے قاضی بھی رہے، اور دمشق کی مجلس المعارف کے صدر بھی۔ ان کی تالیفات میں نور الایضاح کی ایک شرح معراج النجاح بھی داخل ہے[1]۔

ان تینوں بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم شیخ عبداللطیف الفرفور کے یہاں کھانے پر حاضر ہوئے۔ عرب ممالک میں اہل شام کا ذوق کھانوں کے معاملے میں سب سے بہتر ہے، اور یہاں کے کھانے پورے عرب ممالک میں مشہور اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ فرفور نے شامی کھانوں کا بہترین انتخاب جمع کیا ہوا تھا۔ یہاں کھانے کی محفل بھی بڑی دلچسپ رہی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے عصر ہو گئی، اور عصر کے بعد ہم ہوٹل پہنچے۔

ہوٹل پہنچے تو جامعۃ دمشق کے اساتذہ میں سے شیخ نور الدین عتر اور شیخ ابراہیم السلقینی کو اپنا منتظر پایا۔ وہ الوداعی ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے، اور دونوں حضرات اپنی بعض تصانیف بطور ہدیہ بھی لے کر آئے تھے۔ مغرب تک ان کے ساتھ گفتگو رہی۔

میں نے رات بارہ بجے دمشق سے کراچی کے لیے ہوائی جہاز کی نشست مخصوص کرا رکھی تھی، دوسرے رفقاء (قاری بشیر احمد صاحب، مولوی امین اشرف صاحب اور مولوی عطاء الرحمن صاحب) کو واپس بذریعہ کار مدینہ طیبہ جانا تھا۔ لیکن عشاء کے بعد معلوم ہوا کہ جہاز لیٹ ہے، اور متعین وقت رات گئے تک معلوم نہ ہو سکا۔ اس دوران پاکستانی سفارت خانے کے ڈیفنس اتاچی جو ہمارے دوران قیام کسی کام سے دمشق گئے ہوئے تھے، واپس آ گئے، اور ہوٹل ملنے کے لیے تشریف لائے اور بڑے اصرار سے رات کے کھانے کے لیے اپنے گھر لے گئے، وہاں توحید صاحب بھی موجود تھے۔ رات کے گیارہ بجے وہاں

---

[1] الأعلام للزرکلی ص ۱۵۲ ج ۷۔

سے واپسی ہوئی، بارہ بجے کے قریب پتہ چلا کہ جہاز صبح ۵ بجے جائے گا۔ چنانچہ وہ رات تقریباً جاگتے ہی گذری، صبح ۳ بجے کے قریب عنایت صاحب لینے کے لیے آگئے اور ہم دمشق ایئر پورٹ پہنچے، صبح ہوتے جہاز روانہ ہوا، اور عمّان کے راستے تقریباً ۵ گھنٹے میں الحمد للہ بخیر و عافیت وطن واپسی ہو گئی۔

مجموعی تأثر:

جبلِ اُحد سے جبلِ قاسیون تک کا یہ سفر میرے انتہائی یادگار سفروں میں سے ہے جس کا ہر مرحلہ دلچسپ، مفید اور بابرکت ثابت ہوا، اور جس کے ذریعے انبیاءؑ و صحابہؓ کی اس سرزمین کی زیارت کا شوق پورا ہوا۔

شام علمی اور دینی اعتبار سے عالمِ اسلام کا اہم ترین خطہ رہا ہے، یہاں علم اور دین کی روایات اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم اور باقی رہی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا حُسنِ اخلاق اسلامی اخلاق کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، ان کی ہر بات میں لطافت و نظافت اور دلکشی تھی۔ یہاں تک کہ استعمار کے دنوں میں بھی شام کی یہ روایات بڑی حد تک باقی رہیں، لیکن جب سے یہاں بعث پارٹی کی ―― اور بالخصوص حافظ الاسد کی ―― حکومت آئی، اس نے یہاں کے دینی حلقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ حافظ الاسد عقیدۃً نُصیری ہیں جو روافض کا انتہائی غالی فرقہ ہے، اور سیاسی و معاشی نظریات میں کمیونزم کو اپنا آیڈیل سمجھتے ہیں۔ اس حکومت نے پورے ملک کو ایک وسیع جیل خانے میں تبدیل کر کے یہاں کے نہایت مقتدر علماء اور مسلمان زعماء کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد کو جلا وطن ہونا پڑا۔ اور آج شام کی بہت سی اہم شخصیتیں مختلف مسلمان ملکوں میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہی ہیں، تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد حکومت کو دینی حلقوں کا صفایا کرنے کے لیے ایک دورہ سا پڑتا ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل یا اذیتوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ حمص کے شہر میں علماء کا جس طرح قتلِ عام ہوا، اس کے تذکرے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

ان حالات میں جبکہ سالہا سال سے دینی حلقوں کے گلے گھٹے ہوئے ہیں، اور معاندِ اسلام قوتیں پوری طاقت سے سرگرم عمل ہیں، یہاں کی عام دینی فضا کو بہت متاثر ہونا چاہیئے تھا، لیکن یہ اسلام ہی کا معجزہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود دلوں سے ایمان کو کھرچا نہیں جا سکا، اب بھی ماشاء اللہ مسجدیں آباد نظر آتی ہیں، لوگوں میں نماز روزے ہی کا نہیں، دین کی باتیں سننے اور دینی حلقوں میں بیٹھنے کا ذوق خاصا ہے حکومت کی طرف سے عورتوں کے دوپٹے زبردستی اُتارنے کی تحریک شروع کی گئی لیکن بڑی حد تک ناکام رہی، اب بھی دمشق کی سڑکوں پر صرف دوپٹے نہیں، باقاعدہ روایتی برقعے بھی خاصی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

جو علماء اب شام میں مقیم ہیں، ان کی حکمتِ عمل یہ ہے کہ وہ سیاست سے بالکل الگ ہو کر خالصۃً تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہیں، اور ان حالات میں یہی وہ حکمتِ عملی ہے جس کے ذریعے یہاں مسلمانوں کے دین و ایمان کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ قدیم دینی مدارس سب ختم کر دیئے گئے، اور باقاعدہ دینی تعلیم صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ اسلامی علوم میں حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن اول تو ان اداروں میں بعض اساتذہ بڑے متصلب اور قوی الاستعداد موجود ہیں، دوسرے مختلف علماء نے اپنی مساجد میں یا گھروں پر انفرادی طور سے دینی تعلیم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے، اس لیے اسلامی علوم کا چرچا بالکلیہ ختم نہیں ہو سکا۔ علماء دینی موضوعات پر کتابیں بھی لکھ رہے ہیں، اور وہ بڑی حد تک آزادی سے چھپ رہی ہیں۔

لہٰذا بحیثیتِ مجموعی حالات افسوسناک ضرور ہیں مگر مایوس کُن نہیں، باطل کی زور زبردستی ایک نہ ایک دن انشاء اللہ ختم ہوگی، اور عالمِ اسلام کا یہ جنّت نظیر حصہ انشاء اللہ پھر سے اپنی گمشدہ آب و تاب حاصل کرے گا۔

سلطان محمد فاتح

کے شہر میں

(استنبول، ترکی)

رجب ۱۴۰۶ھ مارچ ۱۹۸۶ء

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدئ اُمّت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صُورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ ہے
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تُربتِ ایوّب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مُسلماں! ملّتِ اسلام کا دِل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

(۴)

سُلطان محمدؐ فاتح

کے شہر میں

مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ترکی کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی بھی پڑھے لکھے شخص سے مخفی نہیں۔ ترکوں کی شجاعت کی داستانیں ہماری تاریخ کا وہ سنہرا باب ہیں جن پر ہر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہ علاقہ صدیوں تک پورے عالم اسلام کا پایۂ تخت اور اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے علماء و فقہا اور اولیاء نے دنیا نے آنے والوں کے لیے اپنے نقوشِ زندگی کا بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔

کم از کم میرا معاملہ تو یہ رہا ہے، اور شاید دوسرے مسلمانوں کا بھی ہوگا کہ ترکی اور اس کی خلافت کا نام آتے ہی دل میں عقیدت و محبت کے جذبات اُمڈ آتے ہیں، نہ صرف اس لیے کہ ترکی خلافت کی اسلام کے ساتھ شغف کی تاریخ بڑی تابناک ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ آخر کے گئے گذرے دور میں بھی ترکی خلافت مسلمانوں کے اس مرکزِ وحدت کا کام کر رہی تھی جس نے ساری دُنیا کے مسلمانوں کا شیرازہ کسی نہ کسی حد تک مجتمع کر رکھا تھا، اور اس خلافت کا الغاء ہمارے موجودہ سیاسی انحطاط کا نقطۂ آغاز تھا جس کے بعد ابھی تک امتِ مسلمہ پنپ نہیں سکی۔ اقبالؔ مرحوم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

لہٰذا ترکی کے ساتھ ایک قلبی وابستگی شروع سے تھی، اور طبعی طور پر اُسے دیکھنے کی آرزو بھی۔ لیکن کبھی وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ میں ایک روز میں دارالعلوم کی دورۂ حدیث کی درسگاہ میں جامع ترمذی کا درس دے رہا تھا کہ ایک ڈاکیہ نے ایک تار مجھے پہنچایا۔ یہ تار مسلم ممالک کی تنظیم منظمۃ المؤتمر الاسلامی (آرگنائیزیشن آف اسلامک کانفرنس) کے سیکریٹری جنرل جناب شریف الدین پیرزادہ کے ایک پیغام پر مشتمل تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ لیبیا کی مجلس الدعوۃ الاسلامی اور ترکی کے اسلامی ثقافتی مرکز کے اشتراک سے استنبول میں "قرآن کریم کے تراجم" کے موضوع پر ایک عالمی مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے آپ کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

مذاکرے میں شرکت سے زیادہ استنبول دیکھنے کے شوق نے بلا تامل اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں مجمع الفقہ الاسلامی کی ایک ذیلی کمیٹی کا ایک اجلاس جدہ میں ہونے والا تھا جس میں مجھے شرکت کرنی تھی۔ میں نے وہیں سے ترکی جانے کا پروگرام بنا لیا۔

جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی کے اجلاس سے فارغ ہو کر میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا، اور تین دن وہاں قیام کرنے کے بعد ۸ رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو مغرب کے بعد جدہ کے لیے روانہ ہوا، رات جدہ میں گذاری۔ اور صبح ۷ بجے ائیرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔

۹ رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۰ مارچ کو نو بجے سعودی ائیر لائنز کے طیارے میں سوار ہوا جو ایتھنز کے راستے استنبول جا رہا تھا۔ یہ پوری پرواز تقریباً چھ سات گھنٹے کی تھی، جہاز بحرِ احمر کو عبور کر کے مصر میں داخل ہوا، جہاز کی بلندی سے نہر سویز کا منظر بڑا حسین تھا، پھر قاہرہ شہر پر بھی پرواز ہوئی جو حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا، اور اس کے مغربی سرے پر تینوں اہرامِ مصر بچوں کے کھلونوں کی نظر آرہے تھے۔ قاہرہ اور اہرامِ مصر کا تذکرہ میں مصر کے سفرنامے میں کر چکا ہوں۔

ایتھنز:

تقریباً ۱½ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز یونان کے دارالحکومت ایتھنز (ATHENS)

کے ہوائی اڈے پر اُترا جسے عربی میں "اثینا" کہتے ہیں۔ یہ بھی بڑا قدیم شہر ہے، اور زمانۂ ماقبل تاریخ سے آباد چلا آتا ہے، یہ یونانی فلسفے اور فنون کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں یکے بعد دیگرے یونانی، رُومی، بازنطینی اور لاطینی شہنشاہیاں قائم رہی ہیں، اور پندرہویں صدی عیسوی میں اسے مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا، جن کی حکومت یہاں تقریباً چار سو سال رہی۔ انیسویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ مُسلمانوں کے قبضے سے نکلا، اور یونان کی جدید بادشاہت قائم ہوئی، کچھ عرصہ یہ جرمنی کے زیرِ نگیں بھی رہا، اور اب یہاں "جمہوریہ یونان" کے نام سے ایک مُستقل حکومت قائم ہے۔ لیکن مقامِ حسرت یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے تقریباً چار سو سال حکومت کی، وہاں آج پورے شہر میں ایک بھی باقاعدہ مسجد موجود نہیں ہے، سُنا ہے کہ کسی ہوٹل میں ایک نماز گاہ بنائی گئی ہے۔

میں ایک مرتبہ پہلے بھی امریکہ سے واپسی میں اس ایئرپورٹ سے گذرا ہوں، اندر جانے کا تو اتفاق نہیں ہوا، لیکن دونوں مرتبہ جہاز نے پورے شہر کا اُوپر ہی سے تفصیلی نظارہ کرا دیا، پہلی بار جب میں نے جہاز سے اس شہر کو دیکھا تھا تو اس کا یہ تاثر آج تک ذہن پر باقی ہے کہ شہر کی تمام عمارتیں سفید ہیں، مجھے اُس وقت کوئی بھی عمارت کسی دوسرے رنگ کی نظر نہیں آئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے منتظمین نے پورے شہر کو سفید رکھنے کا خاص اہتمام کیا ہے، اور اس اہتمام سے شہر میں ایک اچھوتا حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ دیکھا تو بہت سی عمارتیں دوسرے رنگوں میں بھی نظر آئیں، اور اب وہ اہتمام باقی نہیں رہا۔

یونان کسی زمانے میں دُنیا کا دماغ کہلاتا تھا، دُنیا کے وہ بڑے بڑے فلسفی اور سائنسدان جن کی تحقیقات سے آج کی ترقی یافتہ سائنس بھی مستغنی نہیں ہے، یہیں پیدا ہوئے تھے، ارسطو، افلاطون، سقراط، اور ان سے بھی پہلے حساب کا موجد ارشمیدس، جیومیٹری کا مُوجد اقلیدس، جدید فلکیات کا بانی فیثاغورس سب یہیں کی پیداوار تھے، اور اس وقت یونان کی حدودِ مملکت بھی آج کے مقابلے میں بہت وسیع تھیں، لیکن آج یونان کا دُنیا کے علوم و فنون میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں ہے،

اس دُنیا میں کوئی بڑی سے بڑی تہذیب کبھی ہمیشہ سلامت نہیں رہتی، اس تماشا گاہ

ہیں نہ جانے کتنی کرّ و فر کی تہذیبیں اُبھر چکی ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنے وقت میں دُنیا پہ چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لیکن عمرِ طبعی کو پہنچنے کے بعد وہ صفحۂ ہستی سے ایسی مٹیں کہ انہیں تاریخ میں تلاش کرنے کے لیے بھی محنت کرنی پڑتی ہے، کلّ من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربّک ذو الجلال والاکرام۔

ایتھنز سے دوبارہ پرواز کرنے کے بعد بمشکل ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ جہاز ترکی کی حدود میں داخل ہو گیا، سامنے سرسبز و شاداب جزیروں اور ان کے ساتھ آنکھ مچولی کرتی ہوئی سمندری خلیجوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ جہاز کی بلندی بہ تدریج کم ہوتی گئی دُور سے چھوٹے نظر آنے والے جزیرے رفتہ رفتہ پھیلتے گئے، اُن میں چھپی ہوئی قدرتی رعنائیاں نمایاں ہونے لگیں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بچھا ہوا سطح سبز رنگ اب اُبھری ہوئی جھاڑیوں اور دیو قامت درختوں میں تبدیل ہونے لگا، اور ان کے درمیان بہتے ہوئے آبشار اور چشمے آنکھوں کی رسائی میں آ گئے۔ ابھی قلب و نظر اسی حسین منظر میں محو تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے جہاز استنبول کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔

یہ ایک جدید انداز کا خوبصورت اور فیشن ایبل ایئرپورٹ تھا، جہاز سے اُتر کر امیگریشن اور کسٹم کے مراحل سے فارغ ہونے میں کچھ وقت لگا، اور جب میں کسٹم سے باہر نکلا تو نکلتے ہی ایک نوجوان نظر آیا، جو ایک بڑے سے کارڈ پر انگریزی حروف میں میرا نام لیے کھڑا تھا۔ یہ کانفرنس کے منتظمین کا فرستادہ تھا، اُس نے بڑی محبت اور تپاک سے استقبال کیا، اور پھر ہم کار میں سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

استنبول کا آدھا حصّہ ایشیا میں اور آدھا حصّہ یورپ میں واقع ہے، اور یہ دُنیا کا وہ واحد شہر ہے جو دو بڑے برِّ اعظموں کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ دونوں حصّوں کے درمیان آبنائے باسفورس بہتی ہے۔ ایئرپورٹ اس کے یورپی حصّے میں ہے، اور شہر یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے۔ کچھ دُور تک سرسبز وادیوں سے گذرنے کے بعد شہر کی آبادی شروع ہو گئی، ہمارے قیام کا انتظام شہر کے بالکل آخری سرے پر آبنائے باسفورس کے کنارے "طرابیہ ہوٹل" میں کیا گیا تھا، چنانچہ وہاں تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا۔ گاڑی شہر کے

جدید و قدیم علاقوں سے گذرتی رہی، اور بالآخر گنجان آبادی کے علاقے ختم ہونے لگے تو ایک ایسی سڑک آگئی جس کے دونوں طرف انجیر کے درختوں کی قطاریں تھیں اور جو بتدریج سطح سمندر کی طرف جھکتی چلی گئی تھی، یہاں تک کہ آبنائے باسفورس کا پانی نظر آنے لگا۔ باسفورس کے یورپی ساحل کی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ اس میں تقریباً ہر فرلانگ دو فرلانگ کے فاصلے پر ہلالی شکل کے کٹاؤ پائے جاتے ہیں، جن میں سمندر کا پانی داخل ہو کر چھوٹی چھوٹی خلیجوں کا منظر پیش کرتا ہے۔ ان خلیجوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں پڑی رہتی ہیں، جو تفریحی کشتی رانی کے علاوہ شہر کے ایشیائی حصے تک جانے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں، ایک ایسی ہی خلیج (خلیج طرابیہ) کے بائیں بازو پر طرابیہ ہوٹل واقع تھا۔ جو یہاں کا مشہور فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔

جس کمرے میں میرا قیام ہوا اس کی مشرقی دیوار شیشے کی تھی، جہاں سے آبنائے باسفورس کا نیلگوں سمندر اور اس کے پس منظر میں ایشیائی کنارے کی سبز پوش پہاڑیاں ہر وقت نظروں کے سامنے تھیں، —— ایک ایسا ناقابلِ فراموش حسین منظر جس کی یاد ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔!

نماز عصر کے بعد میں نے چاہا کہ ہوٹل سے نیچے اُتر کر باسفورس کے کنارے کچھ چہل قدمی کر لی جائے۔ لیکن جب ہوٹل سے باہر نکلا تو شدید برفانی ہوا کے تھپیڑوں نے استقبال کیا، یہ مارچ کا مہینہ تھا، پاکستان اور سعودی عرب میں اچھی خاصی گرمی تھی جہاں ٹھنڈی شیروانی بھی بار معلوم ہو رہی تھی، اس لیے اتفاق سے میں نے گرم کپڑے اپنے ساتھ نہیں رکھے تھے، ایک ہلکی سی ٹھنڈی شیروانی کے سوا سردی سے بچاؤ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا، یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ مارچ میں بھی یہاں اتنی سردی ہو گی، ہمت کر کے سمندر کے کنارے پچاس ساٹھ گز چلا ہوں گا کہ برفانی ہوا نے مزید آگے بڑھنا ناممکن بنا دیا، یہاں تک کہ واپسی کے پچاس ساٹھ گز بھی بمشکل قطع ہو سکے۔ اندازہ ہوا کہ یہاں گرم کپڑوں کے بغیر گذارہ ممکن نہیں، اور جب تک ان کا انتظام نہ ہو، کمرے کے اندر رہنے میں عافیت ہے، چنانچہ وہ رات میں نے ہوٹل ہی میں گذاری اور ندا کرے کے دوسرے شرکاء سے ملاقات اور فون

پر بعض احباب سے گفتگو پہ اکتفا کیا۔

اگلا دن جمعہ تھا، اور اس دن استنبول کے بہت سے تاریخی مقامات کی سیاحت کا موقع ملا، لیکن ان مقامات کے تذکرے کے لیے پہلے استنبول کا مختصر تعارف اور اس کی تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر قارئین اس تذکرے سے ٹھیک لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔

استنبول شہر کا تعارف:

استنبول اپنے جغرافیائی محلِ وقوع اور اپنی تہہ در تہہ تاریخ کے لحاظ سے دنیا کا ایک منفرد شہر ہے، جو بہت سی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس شہر کے نام بھی مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، اور شاید دنیا کے کسی اور شہر کے نام نہ رہے ہوں جتنے اس شہر کے رہے ہیں، شاید اس کا سب سے قدیم نام زار غراد تھا، پھر میکلا غارد (Myclagard) ہوا۔ یونانی اور رومی دور کی ابتدا میں اسے بزنطیہ (Byzantia) کہا گیا، پھر جب تیسری صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اس کا نام قسطنطنیہ (Constantinople) ہو گیا۔ اسی کو "روم جدید" بھی کہتے تھے، اور عربی تواریخ میں اسی کو "مدینۃ الروم" بھی کہا جاتا ہے، بازنطینی لوگ اسے "ھی پولس He Polis" بھی کہتے تھے جس کے معنی "شہر" کے ہیں، اور غالباً "مدینۃ الروم" اسی کا ترجمہ تھا۔ جب یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو بعض لوگ اسے "استانبول" کہنے لگے، جسے مسلمانوں نے بدل کر "اسلامبول" بنا دیا، اور خلافتِ عثمانیہ کے بعض کاغذات پر "اسلامبول" بھی لکھا گیا، لیکن باقاعدہ سرکاری نام قسطنطنیہ ہی رہا۔ خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں اسے "الآستانۃ"، "دار السعادۃ" اور "الباب العالی" کے نام بھی دیئے گئے۔ یہاں تک کہ جب خلافت ختم ہوئی تو ۱۹۳۰ء میں اس کا باقاعدہ سرکاری نام "استنبول" ہو گیا۔ اور اب یہ شہر اسی نام سے معروف ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس شہر کو جو اہمیت حاصل رہی ہے، کہا جاتا ہے کہ روم اور

ایتھنز کے سوا کوئی دوسرا شہر اس میں استنبول کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ یہ شہر گیارہ سو سال تک سلطنتِ روما کا پایۂ تخت رہا ہے جو اپنے عہدِ عروج میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی تھی، اور اس کی تہذیب دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ عیسائیوں کے مشرقی کلیسا کا مرکزی شہر بھی یہی تھا جس کے سربراہ کو بطریرک (Patriarch) کہا جاتا تھا، لہٰذا عیسائی مذہب کی تاریخ میں بھی اس کو بڑی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ سلطنتِ روما کے زوال کے بعد جب یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو خلافتِ عثمانیہ کا دارالحکومت بھی یہی بنا، اور تقریباً پانچ سو سال تک اسے پورے عالم اسلام میں مرکزیت کا مقام حاصل رہا۔

قسطنطنیہ پر حملے:

جب سے رُومی بادشاہ قسطنطین نے تیسری صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کر کے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، اُس وقت سے اس کا نام "قسطنطنیہ" ہوگیا تھا، اور یہ بیک وقت بازنطینی سلطنت اور عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا، اور اس کی یہی اہمیت تھی جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر پر جہاد کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت دی تھی۔

حضرت انسؓ کی خالہ اُمِّ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی رشتہ دار تھیں، ایک روز آپؐ اُن کے گھر میں دوپہر کے وقت سوئے ہوئے تھے کہ اچانک بیدار ہوئے تو آپؐ کے چہرۂ مبارک پر تبسم تھا، حضرت اُم حرامؓ نے تبسم کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ "خواب میں مجھے اپنی اُمت کے لوگ دکھائے گئے جو جہاد کے لیے سمندر کی موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت پر بادشاہ بیٹھے ہوں" حضرت اُمِّ حرامؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی شامل فرمالے۔" آپؐ نے دُعا فرما دی، اور دوبارہ خوابِ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر بیدار ہوئے تو دوبارہ چہرۂ مبارک تبسم سے کھلا ہوا تھا، حضرت اُمِّ حرامؓ نے دوبارہ وجہ پوچھی

تو آپؐ نے فرمایا کہ "میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر (روم) کے شہر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے گا، اس کی مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔" حضرت ام حرامؓ نے دوبارہ دُعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ اس لشکر میں مجھے بھی شامل فرمائے۔ لیکن اس مرتبہ آپؐ نے جواب دیا کہ "نہیں! تم پہلے لشکر میں شامل ہو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں بشارتیں اس طرح پوری ہوئیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت معاویہؓ نے قبرص پر حملہ کیا، یہ تاریخ اسلام میں پہلی بحری مُہم تھی، اور اس میں حضرت ام حرامؓ اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ لشکر میں شامل ہوئیں۔ یہ جنگی مہم اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اہلِ قبرص نے مسلمانوں سے صلح کر لی، اور جب واپس ہونے لگے تو حضرت ام حرامؓ ایک گھوڑے پر سوار ہونا چاہتی تھیں کہ اچانک گھوڑا بدک گیا، اور اس نے آپ کو زمین پر گرا دیا، آپ اس زخم سے جانبر نہیں ہو سکیں، اور وہیں پر جامِ شہادت نوش کیا۔[1]

اس کے بعد جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو آپ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کیا۔ اس حملے میں بہت سے جلیل القدر صحابۂ کرامؓ شامل تھے جن میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی داخل ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے قسطنطنیہ کا پہلا محاصرہ تھا جو کافی مدت جاری رہا؛ اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ اسی محاصرے کے دوران بیمار ہو کر وفات پا گئے، اور قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے مدفون ہوئے جس کا واقعہ انشاء اللہ آگے ذکر کروں گا۔ بہرصورت! اس محاصرے میں قسطنطنیہ فتح نہ ہو سکا، اور لشکر واپس آگیا۔

اس کے علاوہ حضرت بشر بن سحیم رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے کہ:[2]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب فضل من یصرع فی سبیل اللہ، حدیث نمبر ۲۷۹۹ و باب ما قیل فی قتال الروم حدیث نمبر ۲۹۲۴۔ [2] مسند امام احمد ص ۳۳۵، ج ۴۔ احادیث بشر بن سحیمؓ۔

لتفتحن القسطنطنية، فلنعم الامیر امیرها ولنعم الجیش ذلک الجیش۔

تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرلوگے، پس بہتر امیر اس کا امیر ہوگا، اور بہتر لشکر وہ لشکر ہوگا۔

چنانچہ اس حدیث میں بیان کردہ سعادت کے حصول کے لیے بہت سے مسلمان حکمرانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، جن میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، ہشام بن عبد الملک، مہدی عباسیؒ، ہارون رشید، وغیرہ شامل ہیں۔

بعض محاصروں میں شہر کے گرد باقاعدہ مکانات بھی تعمیر کر لیے گئے، لیکن شہر فتح نہ ہوسکا۔ اوّل تو اس شہر کا محلِّ وقوع ایسا تھا کہ اس کے گرد سمندری خلیجوں نے حصار سا قائم کیا ہوا تھا۔ دوسرے یہ پہاڑی علاقہ تھا جس میں سردیوں کا موسم خاص طور پر عرب کے صحرانشینوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتا تھا، تیسرے اس شہر کے گرد یکے بعد دیگرے تین فصیلیں تھیں، جن میں ایک سو سو فٹ کے فاصلے سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے، ہر فصیل انتہائی مستحکم تھی، اور پہلی اور دوسری فصیل کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خندق بنی ہوئی تھی جو ساٹھ فٹ چوڑی اور سو فٹ گہری تھی، اور اس لحاظ سے یہ قلعہ دُنیا کا سب سے مستحکم اور ناقابلِ تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ چوتھے عیسائی دُنیا میں قسطنطنیہ کو جو سیاسی اور مذہبی مقام حاصل تھا، اس کے پیشِ نظر اس پر آنچ آتی دیکھ کر پوری عیسائی دُنیا اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہوجاتی تھی۔

ان وجوہ سے مسلمانوں کے یہ بیشتر محاصرے شہر کو فتح نہ کرسکے، بعض سلاطین کے زمانے میں اہلِ قسطنطنیہ خراج دینے پر آمادہ ہوگئے، لیکن شہر فتح نہ ہُوا۔

سلجوقی ترکوں کے زوال کے بعد جب سلطنت عثمانیہ[1] قائم ہوئی، اور اس نے

---

[1] خلافتِ عثمانیہ سلطان غازی عثمان کی طرف منسوب ہے، جو خلافت کا بانی ہے، اس کے والد ارطغرل خوارزم کے باشندے تھے، اور خوارزم پر چنگیزی حملے کے بعد (باقی اگلے صفحہ پر)

یونان اور ایشیائے کوچک کے بہت سے علاقے زیرنگیں کر لیے تو عثمانی سلاطین نے
یورپ اور بالخصوص قسطنطنیہ کی طرف توجہ کی۔ سلاطین آل عثمان میں سے سب سے
پہلے بایزید یلدرم نے آس پاس کی متعدد جنگی مہمات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد
۱۴۰۲ء میں قسطنطنیہ کا پوری قوت کے ساتھ محاصرہ کیا۔ بایزید اپنی شجاعت وبسالت
اور جنگی تدبیروں کی وجہ سے یورپ کے لیے ایک صاعقہ آسمانی سے کم نہ تھا، اور اسی
وجہ سے اس کا لقب "یلدرم" مشہور ہوگیا تھا جس کے معنی "بجلی" کے ہیں، چنانچہ اُس میں
ظاہری اسباب کے لحاظ سے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی پوری صلاحیت موجود تھی اور قریب
تھا کہ وہ اس مہم میں کامیاب ہو جائے، لیکن بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر پیچھے سے تیمور لنگ
نے اُس کے علاقے پر حملہ کر دیا، اور ایک بیٹے کو بھی قتل کر ڈالا، اس لیے بایزید یلدرم
کو قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھا کر واپس آنا پڑا، اور یہ ایک المیہ ہے کہ رُومیوں سے ایک
فیصلہ کن جنگ لڑنے کے بجائے اُسے انقرہ کے مقام پر تیمور لنگ کے ساتھ ایک
زبردست معرکہ پیش آگیا، اس معرکے میں تیمور کو فتح ہوئی، اس نے بایزید یلدرم کو گرفتار
کر لیا، اور اسے ایک آہنی سلاخوں والی پالکی میں قید کر کے لے گیا۔ اور اسی قید میں
اس کی وفات ہوگئی، اور اس طرح فتحِ قسطنطنیہ تقریباً پچاس سال پیچھے چلی گئی۔

بایزید کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں نے بھی اپنے اپنے دَور میں قسطنطنیہ
کا محاصرہ کیا، لیکن ان کو بھی عین محاصرے کے دوران عقبی بغاوتوں سے سابقہ پیش آیا،

بقیہ گذشتہ سے پیوستہ، وہاں سے ہجرت کر کے دربدر پھر رہے تھے، اتفاق سے وہ اناطولیہ کے علاقے
میں ایک ایسی جگہ آنکلے جہاں سلجوقی سلطان علاؤالدین اپنے کسی مدمقابل سے برسرپیکار تھا، ارطغرل نے
بہادری سے سلجوقی سلطان کا ساتھ دیا، جس کے نتیجے میں وہ غالب آگیا۔ اس کارنامے کے صلے میں
سلجوقی سلطان نے اس کو ایک خطۂ زمین بطور جاگیر عطا کر دیا، جس کا وہ سردار اور نواب سمجھا جاتا تھا،
غازی عثمان خان اسی کا وارث ہوا، اسے رُوم کے عیسائیوں سے جہاد کا شوق تھا، اور اسی شوق
نے اس سے سلجوقی سلطنت کے خاتمے پر خلافتِ عثمانیہ کی بنیاد رکھوائی۔

جن کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

سُلطان محمّد فاتح :

بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح قسطنطنیہ کی سعادت خاندان آلِ عثمان کے ساتویں نوجوان خلیفہ سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھی تھی، اس نوعمر شہزادے نے ۲۲ سال کی عمر میں خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تھی، لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں سے وہ بہت جلد اپنے پیش رووں پر سبقت لے گیا۔ اُس نے بڑی باریک بینی سے اُن اسباب کا جائزہ لیا جو اب تک قسطنطنیہ کی فتح میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور اپنے تدبر، شجاعت اور اولوالعزمی کے ذریعے جنگ کا ایسا نقشہ تیار کیا جو بالآخر فتح پر منتج ہوا۔

اہلِ قسطنطنیہ کو لڑائی کے وقت عموماً دوسرے اہلِ یورپ سے جو امداد ملتی تھی، وہ بحیرۂ اسود سے آبنائے باسفورس میں داخل ہو کر قسطنطنیہ پہنچتی تھی، لہٰذا قسطنطنیہ کو اس کے حلیفوں سے کاٹنے کے لیے باسفورس پر مکمل قبضہ ضروری تھا۔ اس غرض کے لیے بایزید یلدرم نے باسفورس کے مشرقی (ایشیائی) ساحل پر ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، جو اناضول حصار کے نام سے مشہور ہے، اور اب تک موجود ہے۔ لیکن سلطان محمد فاتح نے محسوس کیا کہ صرف ایک کنارے پر واقع یہ قلعہ باسفورس پر مکمل کنٹرول کے لیے کافی نہیں، لہٰذا اُس نے اس قلعے کے بالمقابل یورپی ساحل پہ ایک زبردست قلعہ تعمیر کیا جو "رومیلی حصار" کہلاتا ہے، اور جس کا قدرے تفصیلی تذکرہ میں انشاء اللہ آگے کروں گا۔ اس قلعے کی تعمیر کے بعد باسفورس سے گذرنے والا ہر جہاز عثمانیوں کی دو طرفہ توپوں کی زد میں آگیا۔

قسطنطنیہ کی دیواریں توڑنے کے لیے معمولی توپیں کافی نہ تھیں، اس لیے محمد فاتح نے پیتل کی ایک ایسی توپ تیار کی جس کے برابر اس وقت روئے زمین پر کوئی توپ موجود نہ تھی، جس کے ذریعے ڈھائی فٹ قطر کا آٹھ من وزنی گولہ ایک میل تک پھینکا جا سکتا تھا۔ جب اس توپ کا پہلا تجربہ کیا گیا تو گولہ ایک میل دور

گر کر زمین میں چھ فٹ نیچے دھنس گیا۔[1]

قسطنطنیہ چونکہ باسفورس، بحیرۂ مرمرا اور شاخِ زریں (گولڈن ہارن) نامی
سمندروں سے گھرا ہوا ہے، اور اس کے صرف مشرقی جانب خشکی ہے، اس لیے اس
پر کامیاب حملے کے لیے ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی ضروری تھا، چنانچہ محمد فاتح نے
ایک سو چالیس جنگی کشتیوں پر مشتمل ایک بیڑہ بھی تیار کر لیا۔

ان تیاریوں کے بعد سلطان نے قسطنطنیہ کا اس طرح محاصرہ کیا کہ بری فوج شہر
کی مشرقی فصیل کے سامنے پہنچ گئی، اور بحری بیڑہ آبنائے باسفورس میں پھیل گیا۔ قسطنطنیہ
کا محلِ وقوع کچھ ایسا ہے کہ باسفورس کی ایک پتلی سی شاخ ایک سینگ کی شکل میں مشرق کی
طرف جاتی ہے۔ جو شاخِ زریں (گولڈن ہارن[2]) کہلاتی ہے۔ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اسی
گولڈن ہارن میں واقع تھی، لہٰذا باسفورس سے بندرگاہ یا شہر کی جنوبی دیوار کے سامنے
پہنچنے کے لیے گولڈن ہارن سے گذرنا ضروری تھا۔ لیکن اہلِ قسطنطنیہ نے اس گولڈن ہارن
کے اُس دہانے پر جو باسفورس میں گرتا ہے، لوہے کا ایک بڑا زنجیر باندھ دیا تھا جس
کی وجہ سے کوئی جہاز باسفورس سے گولڈن ہارن میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا محمد فاتح
کے جہاز باسفورس میں محدود ہو گئے تھے، اور جہازوں کے ذریعہ بندرگاہ کا محاصرہ
کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ فصیل پر حملہ صرف مشرق کے خشکی کے راستے سے
ممکن تھا اور اہلِ شہر نے بحری سمت کو مکمل محفوظ سمجھ کر اپنی ساری طاقت مشرق کی فصیل
پر لگا دی تھی۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے قسطنطنیہ اور گرد و پیش کا ایک سرسری سا نقشہ ذہن

---

[1] تاریخ خاندان عثمانیہ از انشاء اللہ ص ۳۲ و تاریخ دولتِ عثمانیہ از محمد عزیز ص ۱۰۷، ۱۰۸ ج ۱
[2] "گولڈن ہارن" کے معنی ہیں "سنہرا سینگ" یہ شاخ چونکہ سینگ کی شکل کی ہے، اور
دھوپ پڑنے سے اس کا رنگ سنہرا ہو جاتا ہے، اس لیے اس کا نام "گولڈن ہارن"
مشہور ہو گیا، اور آج بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

ہیں رکھنا ضروری ہے ۔
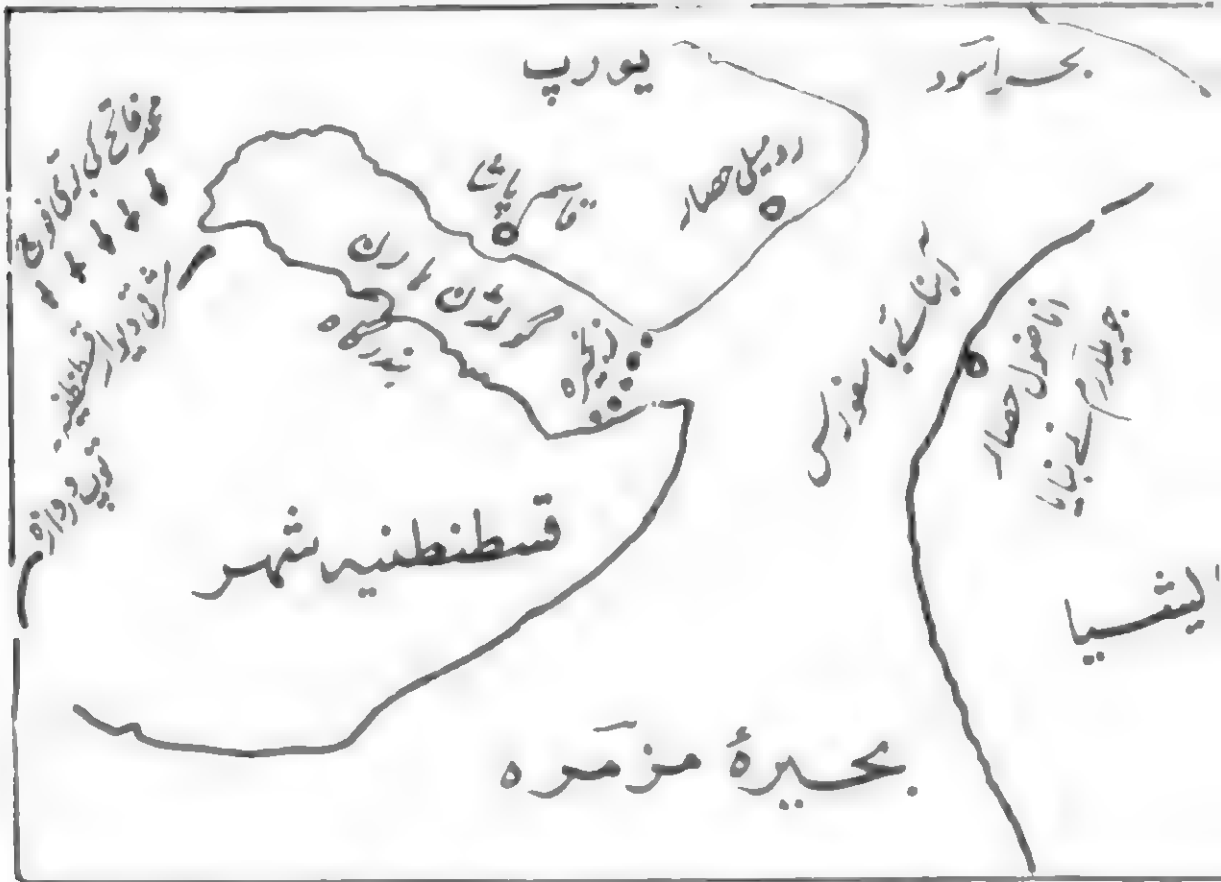
سلطان محمد فاتح کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کے کچھ جہاز آبنائے باسفورس سے گولڈن ہارن میں داخل ہو جائیں، تاکہ بندرگاہ کی سمت سے بھی شہر پر حملہ کیا جا سکے، لیکن گولڈن ہارن کے دہانے پر لوہے کا زنجیرہ بھی نصب تھا، اور اس کے آس پاس توپیں بھی گولہ باری کے لیے موجود تھیں، اور بڑے بڑے بازنطینی جہاز بھی گولڈن ہارن کے اندر سے زنجیرے کی مدافعت کے لیے کھڑے رہتے تھے، اس لیے اس راستے سے کامیابی ممکن نظر نہیں آتی تھی، بہت دن گذر گئے، لیکن گولڈن ہارن میں پہنچنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔

خشکی پر جہاز :

بالآخر ایک دن سلطان محمد فاتح نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو دنیا کی تاریخ میں اس کی منفرد اور محیرالعقول یادگار بن کر رہ گیا۔ اُس کا فیصلہ یہ تھا کہ جہازوں کو گولڈن ہارن میں پہنچانے کے لیے اُنہیں دس میل خشکی پر چلا کر لے جایا جائے گا۔ اور اس غرض کے لیے

باسفورس کے مغربی ساحل سے جہاز خشکی پر چڑھا کر انہیں ایک ترچھے راستے سے گولڈن ہارن کے بالائی جنوبی کنارے تک پہنچایا جائے گا۔ (جو آجکل قاسم پاشا کہلاتا ہے) اور وہاں سے انہیں گولڈن ہارن میں ڈال دیا جائے گا خشکی کا یہ درمیانی علاقہ گبن کے بیان کے مطابق تقریباً دس میل لمبا اور سخت ناہموار اور پہاڑی اتار چڑھاؤ سے معمور تھا، لیکن محمد فاتح کی اولوالعزمی نے یہ محیرالعقول عجوبہ صرف ایک رات میں کر دکھایا اُس نے خشکی کے اُس راستے پر لکڑی کے تختے بچھوائے۔ اُنہیں چکنا کرنے کے لیے اُن پر چربی ملوائی، پھر ستر جہاز نما کشتیوں کو یکے بعد دیگرے باسفورس سے ان تختوں پر چڑھا دیا۔ ہر کشتی میں دو ملاح سوار تھے، اور ہوا کی مدد لینے کے لیے بادبان بھی کھول دیے گئے تھے، ان کشتیوں کو بیل اور آدمی کھینچتے ہوئے دس میل کی یہ پہاڑی مسافت طے کر کے گولڈن ہارن تک لے گئے۔

ستر کشتیوں کا یہ جلوس رات بھر مشعلوں کی روشنی میں محوِ سفر رہا۔ بازنطینی فوج قسطنطنیہ کی فصیل سے باسفورس کے مغربی ساحل پر مشعلوں کی چہل پہل دیکھتی رہی۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بالآخر جب صبح کے اُجالے نے راز سے پردہ اُٹھایا تو محمد فاتح کی ستر کشتیاں اور بھاری توپ خانہ گولڈن ہارن کے بالائی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔

دس میل خشکی پر جہاز چلانے کا یہ کارنامہ جو محمد فاتح سے پہلے کسی کے تصوّر میں بھی نہ آیا ہوگا اس قدر حیرت انگیز ہے کہ مغرب کے متعصب مؤرخین بھی اس پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ایڈورڈ گبن جیسے مؤرخ نے بھی اس کو ایک معجزہ (Miracle) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے[۱]

گولڈن ہارن میں عثمانی کشتیوں کے پہنچنے میں ایک فائدہ یہ تھا کہ یہاں سمندر کا پانی اُتھلا تھا، اور زیادہ گہرائی نہ ہونے کی وجہ سے بازنطینیوں کے بڑے جہاز اس میں آزادی سے

---

[۱] The Decline and Fall of the Roman Empire (abridged) P 689,690

نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے، اس کے برعکس عثمانی کشتیاں نسبتاً چھوٹی تھیں، اس لیے ان کے لیے حسبِ منشار آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ چنانچہ یہاں کی بحری لڑائی میں عثمانی کشتیوں کو غالب آنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، اور بندرگاہ کی جانب سے بھی شہر کا بحری محاصرہ مکمل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی محمد فاتح نے گولڈن ہارن پر ایک پُل تعمیر کیا، اور اس پر اپنا بھاری توپ خانہ نصب کرا دیا۔

مشرق اور جنوب دونوں طرف سے محاصرے کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد عثمانی توپوں نے دونوں طرف سے شہر کی فصیلوں پر زبردست گولہ باری شروع کی اور سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات سے بڑے بڑے شگاف نمودار ہو گئے، اور گبن کے الفاظ میں: "وہ فصیلیں جو صدیوں سے ہر دشمن کے تشدد کا مقابلہ کر رہی تھیں، عثمانی توپوں نے ہر طرف سے ان کا حلیہ بگاڑ دیا، ان میں بہت سے شگاف پڑ گئے، اور سینٹ رومانوس کے دروازے (جو بعد میں توپ دروازہ یا توپ کاپے کے نام سے مشہور ہوا) کے قریب چار مینار زمین کی سطح کے برابر ہو گئے۔"

اب سلطان محمد فاتح کو آخری حملے کی کامیابی کا یقین ہو چکا تھا، لیکن اس نے حملے سے پہلے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۴۵۳ء کو بازنطینی بادشاہ قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال کر شہر سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، اور موریا کا علاقہ اُسے دے دیا جائے گا، لیکن قسطنطین نے یہ پیشکش منظور نہ کی، اور اس طرح پانچ دن بعد سلطان محمد نے آخری اور فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کر لیا۔

آخری حملہ اور فتح:

چنانچہ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کی رات عثمانی فوجوں نے ذکر و تسبیح اور دعاؤں میں گذاری، نمازِ فجر کے بعد محمد فاتح نے عام حملہ کا حکم دے دیا، اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہم انشاء اللہ ظہر کی نماز آیا صوفیا کے کلیسا میں ادا کریں گے۔

حملہ مختلف سمتوں سے جاری رہا، لیکن زیادہ زور سینٹ رومانس کے دروازے پر تھا۔ (جواب توپ کاپے کہلاتا ہے) کیونکہ یہاں کی دیوار بہت مجروح ہو چکی تھی خندق کو اُوپر اُوپر سے عبور کرنے کے لیے سیڑھیاں اور کمندیں ڈال دی گئی تھیں، دوپہر تک دونوں طرف سے آگ اور خون کا زبردست معرکہ جاری رہا۔ بازنطینی بھی اُس روز غیر معمولی شجاعت کے ساتھ لڑے، دوپہر تک کوئی ایک سپاہی شہر میں داخل نہ ہو سکا، بالآخر سُلطان محمد فاتح خود اپنی خصوصی فوج ینی چری کو لے کر سینٹ رومانس کے دروازے کی طرف بڑھا، اور ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس جانباز ساتھیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا۔ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً فصیل سے گرا دیئے گئے، اور انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا، لیکن بارہ ساتھی دیوار پر جمنے میں کامیاب ہو گئے، اور اس کے بعد دوسرے عثمانی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے، اور اس طرح دیوار قسطنطنیہ پر سُرخ ہلالی پرچم لہرا دیا گیا۔

بازنطینی بادشاہ قسطنطین جواب تک بے جگری سے حالات کا مقابلہ کر رہا تھا، اپنے بعض انتہائی بہادر ساتھیوں کے حوصلہ چھوڑ دینے کے بعد مایوس ہو گیا، اور اُس نے پکار کر کہا کہ "کیا کوئی عیسائی نہیں ہے جو مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے؟" لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے شاہان روم (قیاصرہ) کی خاص پوشاک اُتار کر پھینک دی اور عثمانی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں گھس کر ایک سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتا ہُوا مارا گیا، اور اس کی موت پر اُس گیارہ سو سال کی بازنطینی سلطنتِ روما کا خاتمہ ہو گیا جس کی ابتدا بھی قسطنطین سے ہوئی تھی اور انتہا بھی قسطنطین پر ہوئی۔ اور اس کے بعد "قیصر" کا لقب ہی ایک تاریخی داستان بن کر رہ گیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد پورا ہُوا کہ :

اِذا هلك قيصر فلا قيصر بعده

جب قیصر ہلاک ہو گیا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہیں ہو گا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح اپنے وزراء اور سرداروں کے جلو میں شہر کے

سینٹ رومانس کے دروازے سے داخل ہوا، اور سب سے پہلے قسطنطنیہ کے شہرۂ آفاق کلیسا آیا صوفیا کے دروازے پر پہنچ کر گھوڑے سے اُترا۔ کلیسا کی دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں، اُنہیں ہٹا کر دھویا گیا، سلطان کی ہدایت پر یہاں مؤذن نے اذان کہی، اور شرک و کفر کے اِس مرکز میں پہلی بار "اَشھد اَن لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ" "اَشھد اَن محمّداً رسول اللّٰہ" کی زمزمہ بار صدا گونجی۔ سلطان نے نمازِ ظہر یہیں ادا کی، اور اُس وقت سے اس کلیسا کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس کے بعد سلطان شاہی محلات میں داخل ہوا۔ یہ زرق برق محلات جو صدیوں سے قیاصرہ کی شان و شوکت اور ان کے طمطراق کے منظہر تھے، آج ویران پڑے ہوئے تھے، سلطان محمد فاتح کے دل پر اس عبرتناک منظر کا ایسا اثر ہوا کہ بیساختہ فردوسی کا یہ شعر اس کی زبان پر آگیا ؎

پردہ داری می کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بُوم نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

یہ تھا فتحِ قسطنطنیہ کا وہ واقعہ جس کے بعد قسطنطنیہ (استنبول) خلافتِ عثمانیہ کا مرکز بنا، اور صدیوں تک اُسے عالمِ اسلام میں نمایاں مرکزیت حاصل رہی۔

افسوس یہ ہے کہ اس وقت سلاطینِ آلِ عثمان کی تاریخ کے اہم ترین مآخذ انگریزی میں ہیں، اور اِس موضوع کی اور بیشتر کتابیں اُن مغربی مؤرخین کی لکھی ہوئی ہیں جن کی تحریریں تعصب کی چھاپ سے خالی نہیں ہوتیں۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخیں یا تو انہی انگریزی مآخذ سے ماخوذ ہیں، یا پھر وہ ترکی زبان میں ہیں جن سے ترکی کے باہر کے مسلمان مستفید نہیں ہو سکتے۔ اس لیے نہ جانے کتنے حقائق ابھی تک پردۂ راز میں ہوں گے جن تک رسائی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

بہر صورت! یہ ساری تاریخ جو اُوپر بیان ہوئی، انہی مغربی مآخذ اور ان پر مبنی اُردو تواریخ کا خلاصہ ہے۔ اس خلاصے کے بعد میں اب اپنے اصل موضوع یعنی سفرنامے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

---

(۲)

مذاکرے کا افتتاح

اگلا دن (۲۱ مارچ) جمعہ تھا، اور دس بجے صبح مذاکرے کا افتتاح ہونے والا تھا، چنانچہ ہم ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد اجتماع گاہ میں چلے گئے۔ یہ افتتاحی اجتماع استنبول کے ایک مصروف وسطی علاقے میں ایک مشہور آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔

یہ مذاکرہ دو عالمی تنظیموں کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تنظیم لیبیا کی جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (ورلڈ اسلامک کال سوسائٹی) ہے۔ یہ جمعیت لیبیا کے موجودہ سربراہ کرنل معمر القذافی نے ۱۹۶۹ء میں اپنے برسراقتدار آنے کے بعد قائم کی تھی۔ اُس وقت کرنل قذافی اسلام کے نفاذ، اس کی دعوت و تبلیغ اور خدمت کے لیے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس جمعیت کا قیام بھی اسی جوش و خروش کا ایک حصہ تھا، چنانچہ اس جمعیت کے ذریعے دُنیا کے مختلف حصّوں میں مساجد کی تعمیر، مدارس اور شفاخانوں کے قیام وغیرہ کے بہت سے کام انجام دیئے گئے۔ پھر ۱۹۸۲ء میں اس جمعیت کو عالمی تنظیم کی حیثیت دے دی گئی۔ اس کی ایک بین الاقوامی کونسل ہے جو مختلف ممالک کے چھتیس ارکان پر مشتمل ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں وہ تمام باتیں درج ہیں جو ایک تبلیغی ادارے کے اغراض و مقاصد میں ممکن ہو سکتی ہیں۔ اسی جمعیت کے تحت طرابلس میں ایک "کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ" بھی ۱۹۷۴ء سے قائم ہے، اس کی ایک شاخ دمشق میں بھی ہے، اس میں مختلف ملکوں کے مسلمان طلباء "دعوتِ اسلامی" میں گریجویشن کرتے ہیں۔ اور اب ماسٹر ڈگری شروع کرنا بھی پیشِ نظر ہے۔ اس کے علاوہ اسی جمعیت نے لندن میں بھی ایک "دعوتِ اسلامی کالج" قائم کیا ہے جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو دعوتِ اسلامی کے لیے تیار کرنا پیشِ نظر ہے۔ اسی جمعیت کے تحت مختلف مسلمان ملکوں میں "جمعیات الاخوۃ" بھی قائم ہیں۔

جن میں پاکستان کا "پاک لیبیا دوستی کا مرکز" بھی شامل ہے۔

دوسری تنظیم استنبول کا "مرکز الأبحاث للتاریخ والثقافة والفنون الاسلامیة" ہے، جس کا انگریزی نام "سنٹر آف ریسرچ آن اسلامک ہسٹری کلچر اینڈ آرٹس" ہے۔ یہ مرکز مسلمان ملکوں کی تنظیم "منظمة المؤتمر الاسلامی" (او، آئی، سی) کے تحت استنبول میں قائم ہے، اور ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوگلو کی زیرِ قیادت خاصی سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔

ان دونوں تنظیموں کے اشتراک سے ایک مفید کام حال ہی میں یہ ہوا ہے کہ قرآنِ کریم کے جتنے تراجم دنیا کی جس کسی زبان میں ہوئے ہیں، ان کی ایک مکمل فہرست (Bibliography) تیار کر کے شائع کی گئی ہے۔ یہ فہرست استنبول کے مرکز الأبحاث کے محققین نے تیار کی ہے، اور اسے لیبیا کی جمعیۃ الدعوۃ کے خرچ پر شائع کیا گیا ہے، اور بلاشبہ یہ کتاب اب تک تراجمِ قرآن کریم کی سب سے جامع فہرست ہے۔

اس کتاب کی اشاعت ان دونوں تنظیموں کے بیان کے مطابق ایک بڑے منصوبے کا نقطۂ آغاز ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآنِ کریم کے جو ترجمے ہوئے ہیں، (بالخصوص غیر مسلم ممالک کی زبانوں میں) اُن پر مستشرقین کے تراجم کی گہری چھاپ موجود ہے، مستشرقین کے تراجم میں غلطیاں اور مبالغہ انگیزیاں کوئی راز نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے تراجم پر جو دوسرے تراجم مبنی ہیں، اُن کی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ان دونوں تنظیموں کے پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ ان تمام تراجم کا جائزہ لے کر ان کی غلطیوں کی نشان دہی کریں، اور پھر ہر زبان میں صحیح ترجمہ شائع کرنے کی کوشش کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ کام جتنا مفید اور ضروری ہے، اتنا ہی مشکل اور وقت طلب بھی ہے۔ اور اس کے لیے موزوں رجالِ کار، ہر زبان کے ماہرین اور قرآن کریم کا علم رکھنے والے حضرات کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہے، اور وسائل بھی بہت درکار ہیں۔ چنانچہ دونوں تنظیموں نے مل کر یہ مذاکرہ اس غرض کے لیے رکھا تھا کہ اس میں اس "فہرستِ تراجم" کا تعارف ہو، اور آئندہ کام کے لیے خطوط متعین کیے جائیں۔ چنانچہ مذاکرے میں مختلف ملکوں سے ایسے حضرات کو مدعو کیا گیا تھا جو کسی زبان میں قرآن کریم

کے ترجمے کا کام کر چکے ہیں، یا کر رہے ہیں۔

مذاکرے کا یہ افتتاحی اجلاس رسمی نوعیت کا تھا، اس میں ترکی کے وزیر اطلاعات کو بطورِ مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا تھا، جناب شریف الدین پیرزادہ، جمعیۃ الدعوۃ الإسلامیۃ کے صدر ڈاکٹر محمد شریف اور استنبول کے مرکز الأبحاث کے سربراہ ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوگلو نے اپنی تقاریر میں مذاکرے کے مقاصد بیان کئے، اور اس اعلان کے ساتھ یہ افتتاحی اجلاس ختم ہو گیا کہ مذاکرے کے عملی اجلاس کل سے قصرِ یلدز میں منعقد ہوں گے۔

اجلاس کے بعد شرکاء سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں جب سعودی عرب سے ترکی کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو میرے محترم بزرگ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ مدظلہم نے استنبول کے دو صاحبان کا تعارف کرایا تھا کہ ان دونوں سے ضرور ملوں، کیونکہ وہ بڑی حد تک ہم مذاق ہونے کی وجہ سے اس سفر میں معاون ہوں گے۔ ان میں سے ایک شیخ امین سراج صاحب تھے اور دوسرے ڈاکٹر یوسف قلیچ۔ احقر نے استنبول پہنچ کر ان حضرات کو فون کر دیا تھا، اور انہوں نے بتایا تھا کہ مذاکرے کے افتتاحی اجلاس میں وہ بھی تشریف لائیں گے، چنانچہ یہاں ان سے بھی ملاقات ہوئی، دونوں حضرات بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے، اور ترکی کے قیام کے دوران اُن سے بہت استفادہ ہوا۔

سلطان احمد کی مسجد میں:

افتتاحی اجلاس کے بعد پروگرام یہ تھا کہ تمام مندوبین استنبول کی شاندار مسجد "سلطان احمد" میں نماز جمعہ ادا کریں گے، چنانچہ یہاں سے ہم سب مسجد کی طرف روانہ ہو گئے، شیخ امین سراج اور ڈاکٹر یوسف قلیچ بھی اس خیال سے ساتھ ہو گئے کہ احقر کو مسجد اور دوسرے تاریخی مقامات دکھلانے میں مدد دے سکیں۔ چنانچہ ہم زوالِ آفتاب کے وقت سلطان احمد پہنچ گئے۔

یہ مسجد کیا ہے؟ ترکی فنِ تعمیر کا ایک عجوبہ ہے، اس میں داخل ہوتے ہی انسان اُس کے شکوہ، جاہ وجلال اور حُسن وجمال میں محو ہو جاتا ہے۔ اپنے شکوہ، حُسن اور میناکاری کے لحاظ سے یہ مسجد اس قدر عظیم الشان ہے کہ میں نے دُنیا میں ایسی کوئی اور مسجد نہیں دیکھی۔ یہ مسجد سترھویں صدی (۱۶۱۶ء) میں سلطان احمد نے تعمیر کرائی تھی! اس علاقے میں سب سے نمایاں عمارت عیسائیوں کا مشہور کلیسا "آیا صوفیا" تھی، سلطان احمد نے حکم دیا کہ اس عمارت کے بالمقابل ایک ایسی مسجد تعمیر کی جائے جو آیا صوفیا سے زیادہ بلند اور پُرشکوہ ہو، چنانچہ اس مسجد کی عمارت نے واقعۃً "آیا صوفیا" کی عمارت کو گرد کر دیا ہے، اور اب استنبول کے اس حصّے میں نمایاں ترین تعمیر اسی مسجد کی ہے۔ اور اس کے چھ مینار بحیرۂ مرمرہ سے بھی استنبول کی بنیادی علامت کے طور پر نظر آتے ہیں۔

بلکہ روایت یہ مشہور ہے۔ خدا جانے کہاں تک صحیح ہے۔ کہ سلطان احمد نے اس مسجد کے معمار سے کہا تھا کہ میں اس مسجد کو ہر لحاظ سے "آیا صوفیا" سے کہیں بہتر دیکھنا چاہتا ہوں، اس لیے اس کے مینار سونے کے بنائے جائیں۔ معمار نے بہت سوچا لیکن سونے کے مینار کی تعمیر کرنا اُسے ناممکن معلوم ہُوا، دوسری طرف سلطان کی بات کو رَد کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ آخر اس کے ذہن میں بادشاہ کی ناراضی سے بچنے کی ایک تدبیر آ گئی۔ ترکی زبان میں سونے کو "اَلطِن" کہتے ہیں، اسی سے ملتا جلتا ایک لفظ "اَلطی" ہے، جس کے معنی ہیں "چھ" اُس مسجد کے چھ مینار اس خیال سے تعمیر کر دیئے کہ اگر سلطان نے سونے کی بات پوچھی تو یہ جواب دے دوں گا کہ میں نے آپ سے "اَلطِن" (سونے) کے بجائے "الطی" (چھ) کا لفظ سُنا تھا، اس لیے چھ مینار تعمیر کر دیئے — یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اُس وقت تک حرم شریف کے سوا کسی مسجد کے مینار چھ نہیں تھے، چنانچہ شریف مکہ نے سلطان احمد کی مسجد میں چھ مینار ہونے پر اعتراض کیا جس کے جواب میں سلطان احمد نے حرم شریف میں ایک مزید مینار تعمیر کر کے حرم شریف کے میناروں کی تعداد سات کر دی۔ واللہ اعلم۔

مسجد کی عمارت ایک طویل و عریض کرسی دے کر تعمیر کی گئی ہے اُس کا اندرونی

ہال چونسٹھ میٹر لمبا اور بہتر میٹر چوڑا ہے، اور چھت کم از کم چار منزل کے برابر بلند ہے۔ پوری چھت خوبصورت گنبدوں سے بھری ہوئی ہے، جنہیں اس ترتیب سے بنایا گیا ہے کہ منبر پر کھڑے ہوئے خطیب کی آواز مسجد کے ہر حصے میں واضح طور پر سُنی جاتی ہے۔ چاروں طرف کی دیواروں اور چھتوں پر چینی کے سبز اور نیلے ٹکڑوں سے اسقدر نفیس مینا کاری کی گئی ہے کہ نظر اُس پر بے ساختہ جم کر رہ جاتی ہے۔ روشنی کے لیے اس ہال میں دو سو ساٹھ روشن دان اور کھڑکیاں رکھی گئی ہیں۔ بلندی کی غالباً کوئی سطح ایسی نہیں ہے جس پر کہیں نہ کہیں کوئی روشندان یا کھڑکی موجود نہ ہو، لیکن ان کے درمیان تناسب ایسا ہے کہ موزونیت میں کہیں کوئی فرق نہیں آتا۔ چھت چار سنگِ مرمر کے ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ستون کی گولائی ۳۲ فیٹ ہے، اور وہ ایک گز چوڑی اور چار گز لمبی مرمر کی سلوں سے بنا ہُوا ہے۔

ہم مسجد میں داخل ہوئے تو اس کے کچھ دیر بعد اذان ہوئی، دیوارِ قبلہ میں محراب کے ساتھ جو منبر بنا ہُوا ہے، وہ بھی ایک منزل بلند ہے، تھوڑی دیر میں خطیب صاحب نمودار ہوئے، اور اس ایک منزلہ منبر کی بلند ترین سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ مؤذن نے نچلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر فصیح و بلیغ عربی میں طویل خطبہ دیا۔ پہلا خطبہ زیادہ طویل تھا، اذان کی خوش الحانی حرم شریف کی قدیم اذانیں یاد دلا رہی تھی، خطبہ بھی بامعنی تھا تھا، اور نماز میں تلاوت بھی تجوید اور لہجے دونوں کے اعتبار سے نہایت عمدہ۔

سنتوں کے بعد ہم نے مسجد کے مختلف حصے دیکھے۔ مسجد کے باہر مدرسوں اور خانقاہوں کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں، اور بائیں باغ میں سلطان احمد اوّل، عثمان ثانی اور مراد رابع کے مزارات بھی واقع ہیں، پوری مسجد میں جو فنِ تعمیر کے ہر شعبے کی اعلیٰ ترین کاریگری کے دلکش نمونے، بلکہ عجوبے نظر سے گذرے۔ سول انجینئرنگ کی ترقی کے اِس دَور میں بھی اِس معیار کی تعمیر کے تصوّر سے یقیناً بڑے بڑے فن کاروں کو پسینہ آ جاتے گا۔

ات میدان:

مسجد سے باہر نکلے تو سردی عروج پر تھی، ہلکے ہلکے بادلوں کی وجہ سے دھوپ بھی مرجھائی ہوئی تھی، اور برفانی ہواؤں سے پورا ماحول ٹھٹھر رہا تھا، لیکن اس وقت تک میں ایک اوورکوٹ کا انتظام کرچکا تھا، اس لیے یہ شدید سردی تکلیف دہ ہونے کے بجائے خوشگوار معلوم ہونے لگی تھی، مسجد سلطان احمد کے بالکل سامنے ایک خوبصورت پارک نما میدان ہے، جو ۰۷،۳ میٹر لمبا اور ۱۸۰ میٹر چوڑا ہے، یہ جگہ بازنطینی حکومت کے دور میں گھڑ دوڑ کے میدان کے طور پر استعمال ہوتی تھی، اور "ھپوڈروم" کہلاتی تھی۔ یہ صرف گھڑ دوڑ کا میدان ہی نہ تھا، بلکہ یہیں پر نئے بادشاہوں کی تاج پوشی کا اعلان ہوتا یہیں پر فتح مند جرنیل فتح کا جشن مناتے، یہیں پر مجرموں کو پھانسی دی جاتی، اور منحرف عیسائی فرقوں کو زندہ جلایا جاتا، وحشی جانوروں کی نمائش اور جسمانی کرتب کے تماشے منعقد ہوتے۔ تاریخ میں کئی بار حکومت کے خلاف بغاوتیں بھی اسی میدان سے شروع ہوئیں، اور یہ میدان نہ جانے کتنی مرتبہ انسانوں کے خون سے لالہ زار ہوا، ترکوں کے زمانے میں اس کا نام "ھپوڈروم" سے بدل کر "ات میدان" کر دیا گیا، اور ترکی کی معاشی اور سیاسی تاریخ میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔ اس میں تین ستون بھی نصب ہیں۔ ایک ستون چوتھی صدی قبل مسیح کا بیان کیا جاتا ہے، دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اور تیسرا دسویں صدی عیسوی کا۔ یہ ستون تین مختلف بادشاہوں نے اپنی یادگار کے طور پر تعمیر کیے تھے، جن میں سے دو آج تک محفوظ چلے آرہے ہیں۔ فتح قسطنطنیہ کے وقت چھوٹے ستون پر پتھر کے تراشے ہوئے تین اژدھے لپٹے ہوئے تھے۔ جب سلطان محمد فاتح آیا صوفیا سے نکل کر یہاں پہنچا تو اس نے اپنی بھاری جنگی تبر سے ان اژدہوں کے سر اڑا دیئے تھے، اس لیے اس ستون کو "سرپنٹ کالم" کہتے ہیں (یعنی اژدہوں والا ستون)

یہاں سے "آیا صوفیا" پیدل کی مسافت پر ہے، لیکن ہمارے رہنماؤں نے اس سے پہلے ترکی کے شہرۂ آفاق عجائب گھر "توپ کاپے" لے جانے کا پروگرام بنایا، کیونکہ اسے

دیکھنے کے لیے زیادہ وقت درکار تھا، اور کچھ دیر بعد اس کے بند ہو جانے کا بھی خطرہ تھا۔

چنانچہ ہم یہاں سے گاڑیوں میں سوار ہو کر "توپ کاپے" کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ بھی یہاں سے قریب ہی تھا، اس لیے چند منٹ میں اس کے دروازے پر پہنچ گئے۔

توپ کاپے سرائے اور اس کے نوادرات:

ترکی زبان میں "سرائے" محل کو کہتے ہیں اور "کاپے" دروازے کو۔ لہٰذا "توپ کاپے سرائے" کے معنی ہیں: "توپ دروازہ محل" اسی لیے اسے عربی میں "قصر باب المدفع" بھی کہتے ہیں۔ دراصل بازنطینی دور میں یہاں قسطنطنیہ میں داخل ہونے کا ایک دروازہ تھا جو "سینٹ رُومانوس دروازہ" کہلاتا تھا، جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے اپنی ایک بھاری توپ اسی دروازے کے سامنے نصب کی تھی اور مسلمانوں کی گولہ باری سے سب سے زیادہ نقصان اسی دروازے کو پہنچا تھا، پھر فتح کے بعد سلطان محمد فاتح اسی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ اسی بنا پر اس دروازے کا نام "توپ کاپے" (توپ دروازہ) مشہور ہو گیا۔ بعد میں یہاں ایک محل بھی تعمیر کر دیا گیا، جو سلاطین آلِ عثمان کے دور میں (سلطان محمد فاتح سے سلطان عبدالمجید تک) سلاطین کی رہائش وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اس محل کا نام "توپ کاپے سرائے" رکھا گیا۔ یعنی "توپ دروازہ محل"۔ آجکل اس محل کو ایک تاریخی یادگار کے علاوہ ایک عجائب گھر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جو اپنے بیش قیمت نوادر کے لحاظ سے دُنیا کے بہترین اور امیر ترین عجائب گھروں میں شمار ہوتا ہے۔

اس محل کے مرکزی دروازے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ایک کشادہ صحن سے گذر کر "قصر محمد الفاتح" کے نام سے ایک عمارت نظر آتی ہے جس کے سامنے ایک برآمدہ ہے۔ اس برآمدے کے سامنے صحن کے بیچوں بیچ فرش پر ایک بڑا سا سوراخ ہے، یہ اُس دَور میں جھنڈا گاڑنے کی جگہ تھی جہاں صدیوں تک خلافتِ عثمانیہ کا سُرخ ہلالی پرچم لہراتا رہا ہے، وہ پرچم جس نے سالہا سال تک یورپ کی طاقتوں کو اپنے آگے سرنگوں

رکھا، جو صدیوں تک عالم اسلام کے اتحاد کی علامت بنا رہا، اور جو آلِ عثمان کے دَور میں دُنیا کے تین براعظموں پر مسلمانوں کی شوکت کے نشان کے طور پہ لہرایا ـــــ آج اُس کی یادگار کے طور پر صرف یہ سُوراخ باقی رہ گیا ہے جس کا خلا اُس پرچم کے اُکھڑنے کے بعد آج تک بھرا نہیں جاسکا۔

یہ برآمدہ جس کے آگے علم گاڑنے کی جگہ تھی، "بابُ السعادۃ" کہلاتا تھا، اور یہ وہ جگہ ہے جہاں سلطنتِ عثمانیہ کا ہر نیا سربراہ اپنی خلافت کے لیے بیعت لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد "قصر محمد الفاتح" شروع ہوتا ہے۔ "قصر" اور "محل" کے لفظ سے عموماً ایک زرق برق اور پُرتکلف عمارت کا تصور آتا ہے، لیکن یہ "قصر" اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اس میں قدم قدم پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بنانے والوں نے اُسے سادگی کے ساتھ بنایا ہے، اور بے ضرورت تعمیرات سے پرہیز کیا ہے۔ بس اس کی حیثیت پُرانے زمانے کے ایک وسیع مکان سی ہے جس کے طول و عرض اور اُونچائی میں محلاتی انداز نہیں ہے۔

اندر داخل ہو کر سب سے پہلے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں سلطان عبد المجید کے افسر مہمانداری (پروٹوکول آفیسر) کا دفتر تھا، اس کے بعد ایک نسبتہً بڑا کمرہ ہے جو سلطان کی ملاقات کے کمرے کے طور پہ استعمال ہوتا تھا، اسی سے متصل ایک اور کمرہ ہے جس میں ایک پُرانے طرز کی مسہری بچھی ہوئی ہے یہ اُس مسہری کا نمونہ ہے جو اُس دَور میں شاہی استعمال میں رہتی تھی، اور کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان کی خوابگاہ تھی۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سلطان کی یہ خوابگاہ بھی چھوٹی سی ہے اور کم از کم اس کے اندازِ تعمیر میں ٹھاٹھ باٹھ کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔

"توپ کاپے سرائے" بہت بڑا قلعہ ہے جس کے بہت سے حصّے ہیں اور تمام حصّوں کو ڈیڑھ دو گھنٹے کے وقت میں دیکھنا ممکن نہیں ہے، اس لیے ہم اس کے چند منتخب حصّے ہی دیکھ سکے جو اس عجائب گھر میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

تبرّکات :

چنانچہ ہم سب سے پہلے اس کمرے میں پہنچے جہاں سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تبرکات محفوظ کیے گئے ہیں، یوں تو دُنیا کے مختلف حصّوں میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسُوب تبرکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ استنبول میں محفوظ یہ تبرکات زیادہ مُستند ہیں۔ ان میں سرورِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جُبّہ مبارک، آپؐ کی دو تلواریں، آپؐ کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقس شاہِ مصر کے نام آپؐ کا مکتوبِ گرامی اور آپؐ کی مہر مبارک شامل ہیں۔

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبرکات بنوعباس کے خلفاء کے پاس موجود تھے، چنانچہ یہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل کے حصّے میں بھی آئے تھے، وہ آخر میں مصر کے اندر مملوک سلاطین کے زیرِ سایہ زندگی بسر کر رہا تھا، اقتدار و اختیار میں اس کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جب حجاز اور مصر کے علاقوں نے عثمانی سلطان سلیم اوّل کی سلطنت تسلیم کر لی، اور اسے "خادم الحرمین الشریفین" کا منصب عطا کیا گیا تو عباسی خلیفہ المتوکل نے "خلافت" کا منصب بھی سلطان سلیم کو سونپ دیا، اور مقاماتِ مقدسہ حرمین شریفین کی کنجیاں اور یہ تبرکات بھی بطورِ سندِ خلافت اُن کے حوالے کر دیئے۔ اسی کے بعد سے سلاطین عثمان کو "خلیفہ" اور "امیر المومنین" کا لقب مل گیا، اور پوری دُنیائے اسلام نے اُن کی یہ حیثیت کسی اختلاف کے بغیر تسلیم کر لی۔

اس طرح سلطان سلیم دسویں صدی ہجری میں یہ تبرکات مصر سے استنبول لے کر آئے، اور یہ اہتمام کیا کہ "توپ کاپے سرائے" میں ان کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک مستقل کمرہ تعمیر کیا۔ سلطان کی طرف سے ان تبرکات کی قدردانی اور ان سے عشق و محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک سلطان سلیم زندہ رہے استنبول میں مقیم رہنے کے دوران اس کمرے میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ اس کمرے میں انہوں نے حُفّاظِ قرآن کو مقرر کیا کہ وہ چوبیس گھنٹے یہاں تلاوت کرتے رہیں، حُفّاظ کی ڈیوٹیاں مقرر تھیں، اور ایک جماعت کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت آکر تلاوت شروع کر دیتی تھی۔ اس طرح یہ سلسلہ بعد کے خلفاء نے بھی جاری رکھا۔ اس طرح دُنیا میں شاید یہ واحد جگہ ہے جہاں چار سو سال تک مسلسل تلاوتِ قرآن ہوتی رہی ہے، اور اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی بند نہیں ہوئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہُوا۔

ان تبرکات کو انتہائی نفیس لکڑی کے صندوقوں میں رکھا گیا ہے، اور سال بھر میں صرف ایک بار رمضان کی ستائیسویں شب میں انہیں باہر نکال کر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے، عام دنوں میں یہ تبرکات صندوقوں میں بند رہتے ہیں، اور صرف صندوق ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان تبرکات کی زیارت نہ کر سکے۔ صرف صندوق دُور سے نظر آئے۔ یہ گنہگار آنکھیں یقیناً ان تبرکات کے لائق نہ تھیں، ان کے لیے اُس طرف کی زیارت بھی ایک نعمتِ عظمیٰ تھی جسے ان کی صحبت و مساس کا شرف حاصل ہے۔

درجۂ استناد کے لحاظ سے ان تبرکات کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن ایک اُمتی کے لیے اس نسبت کی سچائی کا احتمال، اور صرف احتمال بھی کیا کم ہے۔

اسی کمرے میں کچھ اور تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں جو شو کیسوں میں محفوظ ہیں، اور شفاف شیشوں کے واسطے سے ان کی زیارت کی جا سکتی ہے۔ ان میں ایک تلوار حضرت داؤد علیہ السّلام کی طرف منسوب ہے، چار تلواریں چاروں خلفائے راشدینؓ کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت ابو الحسینؓ کی طرف منسوب تلواریں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ایک حصّے میں کعبہ شریف کے دروازے کا ایک ٹکڑا، کعبہ شریف کا قفل اور چابیاں، میزابِ رحمت کے دو ٹکڑے، اور وہ تھیلا بھی محفوظ ہے جس میں کسی زمانے میں حجرِ اسود رکھا گیا تھا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی مٹی بھی موجود ہے۔ لیکن محققین کا کہنا ہے کہ تلواروں کی نسبت مشکوک ہے۔

دُوسرے تاریخی نوادر:

تبرّکات کے کمرے سے نکل کر ایک اور قصر میں داخل ہوئے جو بہت سے کمروں پر مشتمل تھا، ہر کمرہ بیش قیمت نوادر سے بھرا ہُوا تھا۔ ایک کمرے میں مختلف سلاطین کے لباس اور اسلحہ محفوظ ہیں، ان لباسوں میں خاص طور پر سلطان محمد فاتح کی ایک عبا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ سلطان مصطفےٰ سوم کا فولادی لباس جس پر سونا چڑھا ہُوا ہے، اور سلطان مراد کا بیش قیمت اسلحہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔

مَیں نے حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم العالی کے سفرنامۂ ترکی میں پڑھا تھا کہ:

> "بعض واقفین کا کہنا ہے کہ اگر ترکی کسی زمانے میں دیوالیہ ہو جائے تو اس عجائب خانے (توپ کاپے) کا سونا کچھ مدّت تک پورے ملک کا خرچ چلا سکتا ہے۔
>
> (دو ہفتے ترکی میں۔ ص ۵۷)

یہ پڑھتے وقت بادی النظر میں یوں معلوم ہُوا کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے، شاید انہوں نے ضرورت سے زیادہ مبالغہ کر دیا ہے، لیکن "توپ کاپے" کا یہ حصّہ دیکھ کر جو شاہی نوادر پر مشتمل ہے، واقعۃً اپنی غلطی کا احساس ہُوا، اور خیال یہ ہُوا کہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ غالباً سونے، چاندی، جواہرات، مرصّع ظروف اور بیش قیمت اشیاء کا اتنا نادر، اتنا قیمتی اور اتنا بڑا ذخیرہ دُنیا کے کسی عجائب گھر میں نہیں ہو گا۔

دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول حضرت مولانا ندوی مدظلہم سلاطینِ آلِ عثمان نے صدیوں متمدن دُنیا کے غالباً سب سے بڑے حصّے پر حکومت کی ہے، بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے سلاطین ان کے باج گذار اور زیرِ اثر رہے ہیں، اور وہ سب سلاطینِ آلِ عثمان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تملّق کی حد تک سلاطینِ آلِ عثمان کو بیش قیمت تحفے بھیجتے رہے ہیں، یہ تمام تحفے اور خود سلاطینِ آلِ عثمان نے اپنے شوق

سے اپنے اور اپنی بیگمات کے لیے جو قیمتی چیزیں تیار کیں، وہ سب یہاں محفوظ ہیں۔

سلطان سلیم نے ایران کے شیعہ بادشاہ اسماعیل صفوی کو شکست دی تھی، اور اس کا شاہی تخت ایران سے استنبول لے آیا تھا۔ یہ تخت بھی یہاں محفوظ ہے تخت کیا ہے؟ ہیرے جواہرات کا خزانہ ہے۔ اس تخت کے بارے میں لکھا ہے کہ دنیا بھر میں اس کی کوئی نظیر آج بھی موجود نہیں ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انسانی صنعت کا یہ شاہکار کمرے میں داخل ہوتے ہی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتا ہے، اور میں نے فرنیچر کے قبیل سے کوئی انسانی صنعت اتنی حسین نہیں دیکھی۔ عموماً ہیرے جواہرات سے مرصع اشیاء اتنی بوجھل ہو جاتی ہیں کہ ان کا حسن محفوظ نہیں رہتا، لیکن باوجودیکہ اس تخت میں شاید کوئی انچ جگہ بھی جواہر سے خالی نہیں ہے، لیکن انہیں اس نزاکت اور خوبصورتی سے تراشا گیا ہے کہ بس انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔

سلطان عبدالمجید کے زمانے کا ایک فوارہ نظر آیا۔ جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے میں ۴۸ کیلو خالص سونا خرچ ہوا ہے، گویا پورے فوارے میں چھیانوے کیلو گرام سونا موجود ہے، اور اس کے مختلف حصوں میں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ہیرے جڑے ہوئے ہیں![1]

خالص سونے کے بنے ہوئے کئی بڑے بڑے شمع دان نظر آئے جن میں سے ایک ایک پر کم از کم بیس بیس سیر سونا صرف ہوا ہو گا۔

الماس اور ہیرے کا اس سے پہلے نام ہی سنا تھا، لیکن کبھی اصیل ہیرا دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی، یہاں ایک بہت بڑا، حسین اور تاریخی ہیرا بھی دیکھا جو چمچے کی طرح مخروطی گولائی لیے ہوئے ہے، اور "کشک چہ الماسی" کہلاتا ہے، یہ ۸۶ قیراط کا ہے،

---

[1] درحقیقت تعیش اور اسراف کا یہی وہ انداز ہے جو قوموں اور خاص طور پر مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ سلطان عبدالمجید ترکی کے اس دور کے سلطان تھے جب ترکی اپنے انحطاط کے آخری دور میں تھا، اور "مردِ بیمار" بن چکا تھا۔ اس دور میں بھی تعیش کا یہ شوق مکمل تباہی پر منتج نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

اور اس کے گرد سونے کا نہایت حسین فریم ہے۔ یہ ہیرا اس قدر تابدار ہے کہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک چینی کے انتہائی شفاف گلوب میں کوئی نظر نہ آنے والا بلب روشن ہو، اس کی چمک کا عالم یہ ہے کہ اگر اس کی شعاعوں کو سیدھے زاویے پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھا جائے تو آنکھ خیرہ ہو جائے۔

یہ ہیرا کسی ہندوستانی مہاراجہ کا تھا۔ ایک فرانسیسی جرنیل اسے خرید کر فرانس لے گیا، وہاں اس سے مشہور فرانسیسی فاتح نپولین بوناپاٹ کی ماں نے خرید لیا۔ نپولین اس وقت جلاوطنی کی زندگی گذار رہا تھا، اور اسے اس مصیبت سے چھڑانے کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی، لہٰذا نپولین کی ماں نے یہ ہیرا ایک ترکی جرنیل علی پاشا کو ڈیڑھ سو ملین (پندرہ کروڑ) میں بیچ دیا۔ وہاں سے یہ عثمانی خزانے میں آیا، اور بالآخر اس عجائب گھر کی زینت بنا۔

سلطان محمد کا ایک خنجر بھی دیکھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دُنیا کا سب سے قیمتی خنجر ہے یہ بھی ہیرے جواہرات سے مرصّع ہے، اس میں تین زمرد بھی لگے ہوئے ہیں اور اس کے قبضے کے اُوپر ایک ڈھکن دار گھڑی بنی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک کمرہ اُن شاہی تحفوں اور تمغوں کے لیے وقف ہے، جو وقتاً فوقتاً یورپ کی مختلف سلطنتیں عثمانی خلفاء کو بطور ہدیہ بھیجتی رہیں۔ ان میں اکثر اشیاء بھی سونے اور جواہر سے مرصّع ہیں۔ ان میں بیش قیمت تمغے، سنگھار دان، شمع دان، اسلحہ، ڈبے، برتن، زیورات وغیرہ شامل ہیں۔

صفوی تخت کے علاوہ جس کا اُوپر ذکر ہوا۔ اور بھی بہت سے بادشاہوں کے تخت یہاں موجود ہیں جن میں نادر شاہ، سلطان احمد اوّل وغیرہ کے تخت بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مکمل سونے سے ڈھلے ہوئے ہیں اور جواہرات سے مرصّع ہیں۔

غرض اس عجائب گھر میں واقعۃً ایسے نوادر جمع ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا تعارف ایک مستقل مضمون چاہتا ہے۔ اور اس لحاظ سے جس کسی نے یہ کہا تھا کہ ترکی دیوالیہ ہونے پر کچھ عرصے توپ کاپے کے نوادر سے کام چلا سکتا ہے، اُس نے بظاہر غلط نہیں کہا تھا۔

یہ عجائب گھر بیشک سیاحوں اور تاریخ دانوں کے لیے ایک دلچسپ تماشا گاہ ہے، لیکن اس سے زیادہ ایک عظیم عبرت گاہ بھی ہے، وہ مال و دولت اور شان و شکوہ جس کے لیے تاریخ میں انسان، انسان کے گلے کاٹتا رہا، جس کے لیے اس کی ساری توانائیاں وقف رہیں، جس کی خاطر اس نے بڑائی جھگڑے مول لیے، اُن میں سے کوئی چیز اُس کے ساتھ نہ جا سکی، وہ جب دُنیا سے گیا تو خالی ہاتھ تھا، دُنیا کی یہ ساری چمک دمک دوسروں کے ہاتھ آئی، اور بالآخر سیاحوں کی تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔ یہ وہ ناقابلِ فراموش حقیقت ہے جسے انسان ہمیشہ فراموش کرجاتا ہے، اور اگر زندگی کے منصوبے بناتے وقت انسان یہ سامنے کی حقیقت یاد رکھ لیا کرے تو یہ دُنیا جو جھگڑوں اور ناانصافیوں کا جہنم بنی ہوئی ہے، امن و عافیت اور سکون و اطمینان سے گُل و گلزار ہو جائے۔

انہی تصوّرات کے ساتھ دُنیا کے اس منفرد عجائب گھر سے واپسی ہوئی۔ ہماری اگلی منزل آیا صوفیا تھی، چنانچہ چند منٹوں میں ہماری گاڑی اس تاریخی عبادت گاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

---

(۳)

آیا صوفیا:

آیا صوفیا سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کے فتح ہونے تک عیسائیوں کا دُوسرا بڑا مذہبی مرکز بنا رہا ہے۔ تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے عیسائی دُنیا دو بڑی سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی تھی، ایک سلطنت مشرق میں تھی جس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، اور اس میں بلقان، یونان، ایشیائے کوچک، شام، مصر اور حبشہ وغیرہ کے علاقے شامل تھے، اور وہاں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بطریرک (Patriarch) کہلاتا تھا۔

اور دوسری سلطنت مغرب میں تھی جس کا مرکز رُوم (اٹلی) تھا۔ یورپ کا بیشتر علاقہ اسی کے زیرِ نگیں تھا، اور یہاں کا مذہبی پیشوا پوپ یا پاپا کہلاتا تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ سیاسی اختلافات کے علاوہ مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات جاری رہے، مغربی سلطنت جس کا مرکز روم تھا، رومن کیتھولک فرقے کی تھی اور ان کا کلیسا رومن کیتھولک چرچ کہلاتا تھا، اور مشرقی سلطنت کے کلیسا کو "دی ہولی آرتھوڈوکس چرچ" کہا جاتا تھا۔ "آیا صوفیا" کا یہ کلیسا آرتھوڈوکس چرچ کا عالمی مرکز تھا، اور اس چرچ کا سربراہ جو بطریرک یا "پیٹریارک" کہلاتا تھا، یہیں پر مقیم تھا۔ لہٰذا آدھی عیسائی دُنیا اس کلیسا کو اپنی مقدس ترین عبادت گاہ سمجھا کرتی تھی۔

روم اور قسطنطنیہ کے ان دونوں کلیساؤں میں "آیا صوفیا" اس لحاظ سے رُوم کے کلیسا پر فائق تھا کہ یہ روم کے کلیسا کے مقابلے میں زیادہ قدیم تھا۔ اس کی بُنیاد تیسری صدی عیسوی میں اُسی رُومی بادشاہ قسطنطین نے ڈالی تھی جو روم کا پہلا عیسائی بادشاہ تھا۔ اور جس کے نام پر اس شہر کا نام بیزنطیہ سے قسطنطنیہ رکھا گیا۔

قسطنطین نے اس جگہ ۳۶۰ء میں ایک لکڑی کا بنا ہُوا کلیسا تعمیر کیا تھا۔ چھٹی صدی میں یہ کلیسا جل گیا تو اسی جگہ قیصر جسٹینین نے ۵۳۲ء میں اسے پختہ تعمیر کرنا شروع کیا، اور اس کی تعمیر پانچ سال دس مہینے میں مکمل ہوئی۔ دس ہزار معمار اس کی تعمیر میں مصروف رہے، اور اس پر دس لاکھ پونڈ خرچ آیا۔ اس کی تعمیر میں قیصر نے دُنیا کے متنوع سنگِ مرمر استعمال کیے، چنانچہ فریجیا کا سفید، لکونیا کا سبز، لبیا کا نیلا، سلٹک کا سیاہ اور باسفورس کا سیاہ دھاری والا سنگِ مرمر، مصر کا سنگ ستارہ اور سنگ سماق منگوا کر اس میں استعمال کیا۔ تعمیر میں دُنیا کے خاص مسالے استعمال کیے گئے۔ دُنیا بھر کے کلیساؤں نے اس کی تعمیر میں بہت سے نوادر نذرانے کے طور پر پیش کیے، اور روایت ہے کہ جب جسٹینین اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس میں داخل ہُوا تو اس نے کہا کہ: "سلیمان! میں تم پر سبقت لے گیا"۔[1]

---

[1] حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس تعمیر کیا تھا، اس گستاخانہ جملے میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، گویا "آیا صوفیا" اپنی شان میں (معاذ اللہ) بیت المقدس سے بھی بازی لے گیا۔

تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمارت کلیسا کے طور پر ہی نہیں، بلکہ پورے عالم عیسائیت کے مذہبی اور رُوحانی مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کلیسا کبھی عیسائیوں کے قبضے سے نہیں نکلے گا، اور اس کے ساتھ عیسائیوں کی جذباتی وابستگی کا عالم یہ ہے کہ اس کو ان کے قبضے سے نکلے ہُوئے اب صدیاں گذر گئی ہیں، لیکن "آرتھوڈوکس چرچ" کا سربراہ اب تک اپنے نام کے ساتھ "سربراہِ کلیسائے قسطنطنیہ"

(The Head of the Church of the Constantinople)

لکھتا آیا ہے۔

جب سلطان محمد فاتح کی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہونے لگیں، اور فوجی اعتبار سے بازنطینیوں کو شکست ہو گئی تو شہر کے مذہبی رہنماؤں اور راسخ العقیدہ عیسائیوں نے اسی کلیسا میں اس خیال سے پناہ لے لی تھی کہ کم از کم اس عمارت پر دشمن قبضہ نہیں جما سکتا، مشہور انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن اس منظر کی نقشہ کشی کرتے ہُوئے لکھتا ہے:

> "گرجا کی تمام زمینی اور بالائی گیلریاں باپوں، شوہروں، عورتوں، بچّوں، پادریوں، راہبوں اور کنواری ننوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھیں، کلیسا کے دروازوں کے اندر اتنا ہجوم تھا کہ ان میں داخلہ ممکن نہ رہا تھا۔ یہ سب لوگ اُس "مقدس گنبد" کے سائے میں تحفظ تلاش کر رہے تھے جسے وہ زمانۂ دراز سے ایک ملاءِ اعلیٰ کی لاہوتی عمارت سمجھتے آئے تھے، اُن کے اس اعتقاد کی بنیاد ایک جوشیلے یا افتراپرداز عیسائی کے ایک الہام پر تھی جس نے یہ بشارت دی تھی کہ ایک دن تُرک قوم کے لوگ قسطنطنیہ میں داخل ہو جائینگے اور رومیوں کا تعاقب کرتے کرتے سینٹ صوفیا کے گرجا کے سامنے اس ستون تک پہنچ جائیں گے جو شاہ قسطنطین کے نام سے منسوب ہے، لیکن بس یہی ان کے مصائب کا نقطۂ آغاز ہو گا، کیونکہ اس موقع پر آسمان سے ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لیے نازل ہو گا، اور اس آسمانی ہتھیار کے ذریعے سلطنت ایک ایسے غریب آدمی کے حوالے کر دے گا جو اس

وقت اس ستون کے پاس بیٹھا ہوگا، فرشتہ اس شخص سے کہے گا :
"یہ تلوار پکڑو، اور اس سے اللہ والوں کا انتقام لو" بس اسی
حیات آفریں جملے کو سنتے ہی ترک فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور
رومی فتحیاب ہو کر ترکوں کو مغرب اور اناطولیہ سے ایران کی سرحدوں
تک بھگا دیں گے"[1]

لیکن ترک اس ستون سے بھی آگے بڑھ کر سینٹ صوفیا کے دروازے تک پہنچ گئے، نہ کوئی فرشتہ آسمان سے نازل ہوا، اور نہ رومیوں کی شکست فتح میں تبدیل ہوئی۔ کلیسا میں جمع عیسائیوں کا ہجوم آخر وقت تک کسی غیبی امداد کا منتظر رہا، یہاں تک کہ اس کلیسا کے بارے میں یہ طلسماتی یا اعتقادی توہمات سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے خاک میں مل گئے۔

فتح کے دن فجر کے بعد سلطان محمد فاتح نے یہ اعلان کیا تھا کہ "انشاء اللہ ہم ظہر کی نماز آیا صوفیا میں ادا کریں گے"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس اعلان کی لاج رکھی اور اس سرزمین پر پہلی نماز ظہر اسی عمارت میں ادا کی گئی، اور اس کے بعد پہلا جمعہ بھی یہیں پڑھا گیا۔

سلطان محمد فاتح نے اس کلیسا کو مسجد بنا دیا تھا[2]۔ اس کی دیواروں سے تصویریں مٹا دی گئی تھیں اور محراب قبلہ رخ کر دی گئی تھی۔ سلطان نے اس کے میناروں میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ مسجد "جامع آیا صوفیا" کے نام سے مشہور ہو گئی تھی، اور اس میں تقریباً پانچ سو سال تک پنجوقتہ جماعت ہوتی رہی۔ لیکن خلافت کے خاتمے

---

[1] The Decline and Fall of the Roman Empire (abridged) P 696,697

[2] قسطنطنیہ چونکہ سلطان کی طرف سے صلح کی پیشکش کے باوجود بزور شمشیر فتح ہوا تھا، اس لیے مسلمان ان کلیساؤں کو باقی رکھنے کے پابند نہ تھے، خاص طور سے آیا صوفیا کے ساتھ جو باطل مذہبی توہمات وابستہ تھے انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے بھی سلطان نے یہ اقدام کیا ہوگا۔

کے بعد جب مصطفیٰ کمال پاشا کا زمانہ آیا تو اُس نے اِس مسجد میں نماز بند کر کے اُسے ایک میوزیم (عجائب گھر) بنا دیا۔ اور یہ بھی استنبول کے کمالی دَور کا ایک المیہ ہے کہ آج تک یہ مسجد ایک میوزیم بنی ہوئی ہے۔ جہاں ہر وقت غیر ملکی سیاح گھومتے رہتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آیا صوفیا کے سامنے ایک خوبصورت چمن ہے، ہم اس سے گذر کر اس کے مرکزی دروازے پر پہنچے، دروازے کے دونوں طرف وہ پتھر نصب ہیں جہاں پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ صدیوں تک ہمہ وقت دو مسلح افراد کے کھڑے ہونے سے ان پتھروں کے بیچ میں گڑھے پڑے ہوئے ہیں جو واضح نظر آتے ہیں۔

اندر داخل ہوئے تو ایک وسیع و عریض ہال نظر آیا جو تقریباً مربع شکل کا ہے، اس کی وسعت غلام گردش اور محراب کو چھوڑ کر جنوباً شمالاً ۲۳۵ فیٹ ہے۔ بیچ کے گنبد کا قطر ۱۰۷ فیٹ اور چھت کی اُونچائی ۱۸۵ فیٹ ہے۔ پوری عمارت میں ۷۰ استون ہیں۔ چاروں کونوں پر مسلمانوں نے چھ ڈھالوں پر اللہ، محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ نہایت خوشخط لکھ کر لگایا ہُوا ہے۔ مسجدوں میں ان اسماء گرامی کی تختیاں آویزاں کرنے کا طریقہ ترکی کی بیشتر مساجد میں نظر آتا ہے۔

اس عمارت میں داخل ہو کر یہ تاثر دل و دماغ پر محیط رہا کہ اس خاک پر نہ جانے کتنے مسلمان صدیوں تک اپنے مالک کو سجدے کرتے رہے ہیں ؎

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

کمال اتاترک نے اپنے مزعومہ "اصلاحی اقدامات" کے ذریعے اس مسجد کو نہ صرف محض ایک سیرگاہ بنا کر چھوڑا، بلکہ یہاں نماز پڑھنا قانوناً ممنوع کر دیا۔ اگرچہ اتاترک کے وقت سے یہاں سیاحوں کو انفرادی نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، لیکن اب یہ پابندی رفتہ رفتہ ڈھیلی ہو رہی ہے، چنانچہ ہم نے عصر کی نماز یہیں پر ادا کی اور ہمیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔

آیا صوفیا سے باہر نکل کر ہم واپس ہوٹل لوٹ آئے۔

آبنائے باسفورس اور طرابیہ:

اگلی صبح نمازِ فجر کے بعد میں ہوٹل سے اُتر کر آبنائے باسفورس کے کنارے چہل قدمی کے لیے نکل گیا، یہ انتہائی دلفریب منظر تھا۔ آبنائے باسفورس کا نام بچپن سے سُنتے آئے تھے، اُس کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت بھی کتابوں میں پڑھی تھی، اور تصور میں اُس کا جو نقشہ تھا، حقیقت میں اُس سے کہیں حسین پایا۔ یہ آبنائے شمالاً جنوباً بحرِ اسود اور بحیرۂ مرمر کو ملاتی ہے۔ اور شرقاً غرباً یورپ اور ایشیا کے دو برِ اعظموں کے درمیان حدِ فاصل کا کام کرتی ہے۔ دو سرسبز ساحلوں کے درمیان نیلگوں سمندر کی یہ دلکش پٹی ۱۸ میل لمبی ہے، اور اس کی سب سے زیادہ چوڑائی اس کے شمالی دہانے پر ہے۔ جہاں اس کا پاٹ پونے تین میل ہے، اور سب سے کم چوڑائی رومیلی حصار کے سامنے ہے، جہاں اس کا پاٹ کُل ۸۰۰ گز رہ گیا ہے۔ اس کی گہرائی مختلف جگہوں پر ۵۰ سے لے کر ۱۲۲ گز تک ہے۔

شروع میں باسفورس کے ایشیائی ساحل کے پار علاقہ جو "اناطولیہ" کہلاتا تھا، قسطنطنیہ سے بالکل الگ تھا، لیکن اب شہر استنبول بڑھتے بڑھتے ایشیائی ساحل پر دُور تک پھیل گیا ہے، اور یہ حصہ "اسکودار" کہلاتا ہے، اور اس طرح استنبول وہ واحد شہر ہے جو آدھا یورپ اور آدھا ایشیا میں واقع ہے، شہر کے دونوں حصوں کو ایک انتہائی پُرشکوہ اور حسین پُل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے جس کا تذکرہ میں انشاء اللہ آگے کروں گا۔

یہ چونکہ دُنیا کی اہم ترین بحری گذرگاہ ہے، اس لیے یہاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے چھوٹے بڑے جہاز گذرتے رہتے ہیں۔ میں باسفورس کے یورپی ساحل پر تھا، سامنے باسفورس کی موجیں شمال سے جنوب کی طرف محوِ خرام تھیں، جن کے یہاں چھوٹی کشتیاں اور درمیانے حجم کے جہاز رواں دواں تھے، اور ان سب کے پیچھے ایشیائی ساحل پر سبزپوش پہاڑیاں اور ان پر بنی ہوئی خوبصورت عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔

اس چھوٹی سی آبی گذرگاہ نے تاریخ کے کیسے کیسے انقلابات دیکھے ہیں، تصور میں سامنے کے ایشائی ساحل پر کسریٰ کی وہ عظیم فوج خیمہ زن نظر آئی جس نے قیصر روم کو مسلسل شکستیں دے کر قسطنطنیہ میں محصور کر دیا تھا، لیکن پھر اچانک قرآنِ کریم کی وہ حیرت انگیز پیشین گوئی پوری ہوئی کہ "رُومی عنقریب اپنے مغلوب ہونے کے بعد غالب آجائیں گے"۔ اور کسریٰ کی فوجوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ کبھی باسفورس کے پار ترک مجاہدین کے گھوڑے دوڑتے دکھائی دیے، کبھی سلطان محمد فاتح کی تر لتا زیاں نخاہوں کے سامنے آئیں، کبھی باسفورس کے پانی میں عثمانی بحری بیڑہ حرکت کرتا نظر آیا، کبھی یہاں آگ اور دھوئیں کے بادل اُٹھتے محسوس ہوئے، غرض تصورات کی رَو تھی جو یہاں چلتے ہوئے باسفورس کے ساتھ ساتھ بہتی رہی یہاں تک کہ وہ خلیجِ طرابیہ جس کے کنارے میرا ہوٹل واقع تھا، اُس کا موڑ آ گیا۔

یہ خلیج طرابیہ عثمانی عہد سے بیرونِ ملک کے سُفراء کی آبادی تھی، اور یہاں غیر ملکی سفارت خانے ہُوا کرتے تھے۔ لیکن آج یہ استنبول کا ایک مضافاتی محلہ ہے جس میں زیادہ تر ہوٹل، ریستوران اور چھوٹے چھوٹے تفریحی مقامات بنے ہوئے ہیں، خلیج میں بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں پڑی رہتی ہیں جو باسفورس عبور کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

---

(۴)

قصرِ یلدز میں:

ناشتے کے بعد مذاکرے کا پہلا عملی اجلاس تھا، یہ اجلاس سلطان عبد الحمید کے محل میں منعقد ہونے والا تھا جو قصرِ یلدز کے نام سے مشہور رہا ہے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یہ محل کافی عرصے تک بند رہا، لیکن اب اس محل میں اسی "مرکز الابحاث" کا مستقر بنا دیا گیا

ہے جس کے زیرِ اہتمام یہ مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے۔

یہاں کئی گھنٹے مذاکرے میں مصروفیت رہی، بعد میں منتظمین نے "مرکز" کے مختلف دفاتر کا دورہ کرایا، مرکز کے سربراہ ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوگلو ایک علمی ذوق کے ترک نژاد نوجوان ہیں جو عربی اور انگریزی بہت بے تکلف بولتے ہیں، انہوں نے اس مرکز اور خاص طور پر اس کے کتب خانے کو بڑی خوش مذاقی سے ترتیب دیا ہے۔ اسلامی علوم کی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ نظر آیا، اور مختلف موضوعات پر بہت سے مصنفین کام کرتے نظر آئے۔

مرکز کے معائنے کے بعد قصرِ یلدز کے مختلف حصّے بھی دکھائے گئے، یہ ایک سادہ سا محل ہے جس میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا کوئی انداز نظر نہیں آتا۔ سلطان عبدالحمید جو آخری دورِ خلافتِ عثمانیہ کے بڑے معتنم خلیفہ تھے، یہیں رہا کرتے تھے، ان کے دفاتر بھی اسی عمارت میں تھے، تمام عمارتیں بہت سادہ ہیں، اور تکلّف و تصنّع کا نام نہیں ہے۔

یہ محل استنبول کے وسطی علاقے میں ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے استنبول شہر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اب محل سے باہر اس پہاڑی پر ایک تفریحی پارک بنا ہوا ہے۔ محل کے دروازے سے بالکل متّصل ایک مسجد ہے جو سلطان عبدالحمید ہی نے تعمیر کی تھی، اور وہ اسی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے، ہم مذاکرے کے اجلاسات کے دوران اسی مسجد میں نمازیں پڑھتے رہے۔ یہ ایک خوبصورت مسجد ہے، اور ترکی کی مساجد کا مشترک سانچہ یہاں بھی جلوہ گر ہے۔ چونکہ یہ مسجد سلطان عبدالحمید کی یادگار ہے، اس لیے اس میں کئی یادگاریں بھی محفوظ ہیں۔ جن میں سب سے جلیل القدر یادگار سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک ہے لیکن اس کی زیارت بھی ہر وقت نہیں ہو سکتی، اس کے لیے خاص تاریخیں مقرر ہیں۔

مسجد کے امام صاحب سے اس دوران اچھا خاصا تعارف ہو گیا تھا، ہم نے ان کی کافی منتیں کیں کہ وہ شرکاءِ مذاکرہ کو اس مقدس تبرک کی زیارت کرا دیں، لیکن وہ قواعد و ضوابط کی وجہ سے مجبور اور معذور تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود خواہشمند ہیں کہ ہمیں اس سعادت سے بہرہ ور کریں، لیکن کر نہیں سکتے۔

اسی مسجد میں قرآن کریم کا ایک نہایت قدیم قلمی نسخہ بھی ہے جو خطِ کوفی میں لکھا ہُوا ہے، اس پر لکھی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری صدی ہجری میں لکھا گیا، اور ایک کونے پر "بخط حضرت علیؓ" بھی لکھا ہُوا ہے۔ واللہ اعلم

منبر پر صنوبر کی بنی ہوئی ایک نفیس رحل رکھی ہوئی ہے جس پر ہاتھی دانت کا کام ہے۔ امام صاحب نے بتایا کہ یہ سلطان عبدالحمید کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔ سلطان عبدالحمید کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا، اور مسجد کے لیے لکڑی کی کئی چیزیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں۔

عام طور سے بادشاہ اور سربراہانِ مملکت مسجدیں محل کے اندر بنوایا کرتے تھے، لیکن یہ مسجد محل کے دروازے سے باہر ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سلطان عبدالحمید نے ایسی مسجد میں نماز پڑھنا پسند نہ کیا ہو جس میں عام لوگ داخل نہ ہو سکیں، اسی لیے اس مسجد کو باہر رکھا ہو۔ واللہ اعلم

اس محل میں تین دن مذاکرہ جاری رہا۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید مذاکرہ تھا۔ دُنیا کی مختلف زبانوں میں قرآنِ کریم کے جو ترجمے ہوئے ہیں، اُن پر مختلف ملکوں کے شرکا نے مفصل تنقیدی مقالے لکھے تھے جو مذاکرے کی مختلف نشستوں میں پیش کئے گئے۔ ہر مقالے کے بعد اس پر مُناقشے کا موقع دیا گیا جس میں ترجمۂ قرآن کریم کے بارے میں بہت سے اصولی مسائل بھی زیرِ بحث آئے۔ مُناقشے کے دوران مختلف مسائل پر احقر کو بھی اظہارِ خیال کا موقع ملا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس مذاکرے میں شرکت کے بعد پہلی بار اس کوتاہی کا نہایت شدت سے احساس ہُوا کہ ہم مسلمانوں نے قرآن کریم کے ترجمے کا انتہائی اہم اور نازک کام کس طرح غیر مسلموں کے حوالے کر رکھا ہے، اور وہ اس میدان پر قابض ہو کر کس طرح اسلام کی تحریف اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات کی آبیاری کر رہے ہیں۔ جو زبانیں دُنیا میں زیادہ بولی جاتی ہیں، ان میں تو بحمد اللہ مسلمانوں کے ترجمے بھی منظرِ عام پر ہیں، لیکن کم بولی جانے والی زبانوں میں زیادہ تر غیر مسلموں کے تراجم ہی چھپے ہوتے ہیں۔ یہ تحقیق و تصنیف کے لیے ایک ایسا افق ہے جس کی طرف ابھی تک کسی مسلمان تنظیم یا ادارے نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی، اور اس بات کی شدید ضرورت

ہے کہ کوئی بین الاقوامی ادارہ اس کام کا بیڑہ اُٹھا کر استقامت کے ساتھ یہ فرض کفایہ انجام دے۔ اس مذاکرے کا یہ فائدہ ضرور ہُوا کہ اس عظیم کام کی اہمیت و ضرورت سامنے آئی، اور حاضرین کے دل میں اس کام کا ایک جذبہ پیدا ہُوا۔

مذاکرے کے اختتامی اجلاس میں ڈاکٹر اوکلو کی فرمائش پر مندوبین کی طرف سے "کلمۃ الوفود" کے طور پر احقر نے تقریر کی جس میں اس اہم اور ضروری کام کی تکمیل کے لیے کچھ مثبت تجاویز بھی پیش کیں جو مذاکرے کی سفارشات کا ایک حصّہ بنیں۔ طے یہ ہُوا کہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے "مرکز الابحاث" اور "جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ" مسلمانوں کی بڑی بین الاقوامی تنظیموں مثلاً "منظمۃ المؤتمر الاسلامی" اور "رابطۃ العالم الاسلامی" وغیرہ سے بات چیت کر کے اسے ایک منظم شکل دینے کی کوشش کریں گے۔

باربروسا:

مذاکرے کے دوران مختلف اداروں کی طرف سے شرکاءِ مذاکرہ کی دعوتیں بھی ہوتی رہیں جن کی وجہ سے شہر کے مختلف حصّوں میں جانا ہُوا، ایک دعوت ایک ایسے ہوٹل میں تھی جو باسفورس کے کنارے واقع تھا اور اس کے قریب سمندر کے ساحل پر ایک پلیٹ فارم جیسا بنا ہُوا ہے، اور اسی کے بازو میں ایک مزار بھی ہے۔ رہنماؤں نے بتایا کہ یہ مزار مشہور ترک بحری مجاہد خیر الدین باربروسا کا ہے، اور یہ پلیٹ فارم ان کے زمانے میں بندرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خیر الدین باربروسا تاریخِ اسلام کے مشہور جہاز راں ہیں جن کے بحری بیڑے نے سقوطِ اندلس کے بعد وہاں کے ستم رسیدہ مسلمانوں کو اندلس سے نکال کر مراکش اور الجزائر پہنچانے میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ بحرِ روم ان کی ترکتازیوں کا مرکز تھا اور ان کی وجہ سے بحری مہمات کی تاریخ میں باربروسا کا نام زندۂ جاوید ہوگیا۔

اقبال مرحوم نے غالباً "انہی کے دَور کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

تاریخِ اسلام کے اس مایۂ ناز مجاہد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

متفرق مصروفیات :

دارالعلوم کے ایک ترکی طالب علم کے بھائی خیر اللہ دمرسی استنبول میں مقیم ہیں اور تجارت کے علاوہ تبلیغی خدمات بھی انجام دیتے رہتے ہیں، وہ احقر کی آمد کی خبر سُن کر تقریباً روزانہ ہوٹل آتے رہے، اُن کی خواہش تھی کہ کسی وقت کھانا ان کے یہاں کھایا جائے۔ چنانچہ مذاکرے کے دوران ہی ایک روز دوپہر کا کھانا ان کے یہاں کھایا۔ یہ استنبول کا ایک اوسط درجے کا محلہ تھا، یہاں عام ترکی مسلمانوں سے ملاقات کا موقع ملا، ان سب کے دل اسلام کی محبت سے معمور دکھائی دیئے، اس محلے میں زیادہ تر خواتین باپردہ نظر آئیں۔ صفائی ستھرائی اور اندازِ زندگی کا سلیقہ ترکی قوم کا امتیاز ہے جو ان سب میں بدرجۂ اتم محسوس ہُوا۔

خیر اللہ دمرسی صاحب نے ترکی کھانوں کی خاص خاص چیزیں پکوانے کا اہتمام کیا تھا اور قدیم ترکی انداز سے کھلانے کا بھی، فرش پر ایک بڑا سا تھال رکھ دیا گیا، اس میں مختلف انواع کے کھانے تھے، اس تھال کے اردگرد بڑے بڑے پیالے رکھے ہوئے تھے جن میں حسبِ منشا کھانا نکال کر کھایا جاتا، کھانے سب بہت اچھے بنے ہوئے تھے، لیکن اُن کے نام یاد رکھنے کے لیے خاصی ریاضت درکار تھی جس کا موقع نہ مل سکا۔

سُنا کرتے تھے کہ عربی کتابوں کے ساتھ کمال اتاترک کی دراز دستیوں کے باوجود استنبول میں عربی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ عربی کتب سے پابندی اُٹھنے کے بعد جگہ جگہ نادر کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت ہُوا کرتی تھیں، سالہا سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اور دوسرے ملکوں کے اصحابِ ذوق یہاں سے جھولیاں بھر بھر کر کتابیں لے جاتے رہے، اب رفتہ رفتہ وہ بہتات تو ختم ہوگئی ہے، لیکن کتابوں کے کباڑیوں کے پاس اب بھی بڑے کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ چنانچہ مَیں نے خیر اللہ دمرسی صاحب سے درخواست کہ وہ مجھے کسی قدیم کتب فروش کے پاس لے جائیں۔

اس طرح ہم استنبول کے قدیم بازاروں میں پہنچے، یہ بازار قسطنطنیہ کی اس قدیم

فصیل کے اندر واقع ہے جس کا ذکر میں فتح قسطنطنیہ کے ذیل میں کر چکا ہوں، یہاں ایک بازار کی مسجد میں نمازِ عصر ادا کی، اور اس کے باہر کتابوں کی مختلف دکانوں میں گئے، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ عربی کتابوں کی بہتات کا وہ دور گذر چکا، اب کسی کسی کتب خانے میں کچھ پرانی کتابیں موجود ہیں، وہ بھی غیر اہم قسم کی۔ لہٰذا تقریباً گھنٹہ بھر کی تلاش کے بعد چار پانچ کتابوں سے زیادہ نہ خرید سکا۔

یہیں پر ایک چوک میں بنے ہوئے ایک مجسّمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خیر اللہ صاحب نے بتایا کہ یہ ابراہیم متفرقہ کا مجسّمہ ہے، اور یہ وہ شخص ہے جس نے ۱۱۴۵ھ میں (بارھویں صدی ہجری) میں پہلی بار پریس بنایا تھا۔

جامع ابو ایوب انصاری رضؓ:

مذاکرے کے اختتام کے بعد اگلے دن منتظمین نے استنبول کے مختلف مقامات کی سیر کے لیے ایک اجتماعی پروگرام ترتیب دیا تھا۔ لیکن خیر اللہ دمرسی صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ میں مقید ہونے کے بجائے اُن کے ساتھ دو دن گذاروں، کیونکہ بہت سے مقامات ایسے ہیں جو اس کے بغیر نہ دیکھے جا سکیں گے۔ چنانچہ وہ ۱۴ رجب کی صبح اپنے ایک رفیق کے ساتھ ہوٹل پہنچ گئے۔ ڈاکٹر یوسف قلیچ بھی اپنی محبت کی بنا پر میرے ساتھ چلنے کے لیے ہوٹل آگئے، جب ہم چلنے لگے تو ہوٹل کی لابی میں ڈاکٹر اِرونگ (Irving) سے ملاقات ہوگئی۔ یہ مشہور امریکی نژاد نومسلم ہیں جنہوں نے انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، اور اب احادیث کی کتابوں کا بھی ترجمہ کر رہے ہیں، مذاکرے میں بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، پاکستان بھی کئی بار آتے ہیں۔ انہوں نے جب ہمارے علیحدہ پروگرام کے بارے میں سُنا تو دوسرے لوگوں کے ساتھ جانے کے بجائے ہمارے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی، اس طرح ہم پانچ افراد ہو گئے۔

سب سے پہلے ہم جامع ابو ایوب انصاری رضؓ جانا چاہتے تھے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقدس میزبان کا مزار بھی واقع ہے۔ کیونکہ استنبول میں سب سے زیادہ اشتیاق وہیں جانے

ہونے کا تھا۔ یہ مقام ہمارے ہوٹل سے بہت دُور تھا، کیونکہ ہم باسفورس کے کنارے پر تھے، اور یہ مزار استنبول کے انتہائی جنوب مشرقی حصّے میں واقع ہے۔ وہاں جاتے ہوئے راستے میں قسطنطنیہ کی وہ قدیم فصیلیں بھی قریب سے دیکھیں جو ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھیں اور اب اُن کے کھنڈر ہی ان کے ماضی کے شان و شکوہ کی داستان سُناتے ہیں۔ بالآخر خاصے طویل سفر کے بعد ہم جامع ابوایوبؓ پہنچ گئے، اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کسی مسلمان کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ آپ کا نام خالد بن زیدؓ تھا۔ آپ مدینہ طیبہ کے قبیلۂ بنو خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ بالکل ابتدا میں مسلمان ہوگئے تھے، اور آپ ہی وہ خوش نصیب صحابی ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک مہینے تک آپؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ قصواء آپ ہی کے مکان پر آکر رُکی تھی۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق انہوں نے آپؐ کو نچلی منزل میں ٹھہرایا تھا، اور خود اپنی اہلیہ کے ساتھ اوپر کے کمرے میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ اُوپر کے کمرے میں پانی گر گیا، آپ کو یہ خطرہ ہُوا کہ یہ پانی کہیں ٹپک کر سرکارؐ کو تکلیف نہ پہنچائے، اس لیے آپ اور آپ کی اہلیہ چادر لے کر پانی کو جذب کرتے رہے۔

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہے۔ حضرت علیؓ نے آپ کو مدینہ منورہ کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ لیکن پھر شوقِ جہاد میں آپ انہی کے پاس پہنچ گئے۔ اور خوارج کے خلاف جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہوئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں جو پہلا لشکر قسطنطنیہ پر حملے کے لیے روانہ کیا، اس میں آپ بھی شامل تھے، جس کا تذکرہ شروع میں کر چکا ہوں۔ یہاں محاصرہ طویل ہُوا تو آپ بیمار ہوگئے، یزید آپ کی بیمار پُرسی کے لیے حاضر ہوئے، اور آپ سے پوچھا کہ کوئی خدمت بتایئے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "بس میری ایک خواہش ہے، اور وہ یہ کہ جب میرا انتقال ہوجائے تو میری لاش کو گھوڑے پر رکھ کر دشمن کی سرزمین

میں جتنی دُور تک لے جانا ممکن ہو لے جانا، اور وہاں لے جا کر دفن کرنا" ـــ اس کے بعد آپ کی
وفات ہوگئی تو یزید نے آپ کی وصیت پر عمل کیا اور قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب آپ کو دفن کیا گیا[1]
تاریخ میں ہے کہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد اہتمام کے ساتھ حضرت
ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کی تلاش شروع کی، اور ایک بزرگ کی نشاندہی پر
اس جگہ وہ دستیاب ہوگئی۔ سلطان محمد فاتح نے "جامع ابو ایوب" کے نام سے یہاں مسجد تعمیر کی[2]
اور اس وقت سے یہ جگہ زیارت گاہِ خاص و عام ہے، یہ پورا محلہ "ابو ایوب" ہی کہلاتا ہے۔
مزار مبارک پر لوگ اکثر بیٹھے ہوئے تلاوت کرتے رہتے ہیں۔

یہ مقدس صحابی جنہیں اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف بخشا
تھا، اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور اللہ تعالیٰ کے دین کا پیغام لیے ہوئے اس دیارِ غربت
میں راہیِ آخرت ہوئے اور زندگی کے آخری لمحوں میں بھی خواہش تھی تو یہ کہ اس کلمے کو لیے ہوئے
دشمن کی سرزمین میں جتنی دُور تک جا سکوں چلا جاؤں۔ وفات کے بعد صدیوں تک کسی کو آپ
کی آخری آرام گاہ کا علم بھی نہ تھا، لیکن دیکھا جائے تو قسطنطنیہ کے اصل فاتح آپ ہی ہیں آپ
ہی کے ذریعے اس سرزمین پر پہلی بار اسلام کا کلمہ پہنچا، اور آپ ہی کے وسیلے سے اس
خاک کو ایک صحابیِ رسول ﷺ کا مدفن بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

جامع ابوایوب رضی اللہ عنہ کو سلاطینِ آلِ عثمان نے ہمیشہ استنبول کا مقدس ترین مقام سمجھا اور
ہمیشہ یہ طریقہ جاری کیا کہ ہر نئے سلطان کی تاج پوشی اسی مسجد میں ہوا کرتی تھی جس کے لیے
یہاں ایک مخصوص جگہ بنی ہوئی ہے۔ تاج پوشی کی رسم تاج پہننے کے بجائے سلطان عثمان خان
کی تلوار نئے سلطان کی کمر میں باندھ کر ادا کی جاتی تھی۔

جامع ابوایوب رضی اللہ عنہ سے باہر نکلیں تو ایک وسیع صحن ہے جس میں کبوتر بہت کثرت سے
پائے جاتے ہیں، اور لوگ ان کو دانہ ڈالتے رہتے ہیں، اس میدان کے دائیں جانب ایک

---

[1] الاصابہ ص ۴۰۵ ج ۱
[2] تاریخ دولت عثمانیہ از ڈاکٹر محمد عزیر ص ۱۲۱ ج ۱۔

چبوترے پر چنار کے دو بہت بڑے درخت ہیں جو دیکھنے ہی سے بہت قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ درخت صحابہ کرامؓ کے زمانے کے ہیں۔ واللہ اعلم

فاتح نماز گاھی:

جامع ابو ایوبؓ سے ہمیں خیر اللہ صاحب استنبول کے ایک اور قدیم علاقے میں لے گئے۔ یہ جگہ غیر آبادسی ہے جس میں کچھ کھنڈر نظر آتے ہیں، کچھ بوسیدہ مکانات بھی ہیں جن میں کچھ لوگ رہتے ہیں۔ اس جگہ کو "فاتح نماز گاھی" کہا جاتا ہے، اور مشہور یہ ہے کہ فتح قسطنطنیہ کے دن سلطان محمد فاتح نے اس جگہ دو رکعت نماز پڑھ کر آخری اور فیصلہ کن حملہ کیا تھا۔ یہاں ایک پرانا ستون بنا ہوا ہے جس پر کچھ عبارت بھی لکھی ہوئی ہے، مگر پڑھی نہیں جاتی۔ کہتے ہیں کہ یہ سلطان محمد فاتح کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ایک مسجد بنا دی گئی تھی جو اب ٹوٹ پھوٹ گئی اور غیر آباد پڑی ہے۔

خشکی پر جہاز چلانے کی جگہ۔ قاسم پاشا:

یہاں سے ہم قاسم پاشا گئے، یہ گولڈن ہارن کا وہ کنارہ ہے جہاں سے سلطان محمد فاتح نے اپنے جہاز خشکی سے گذار کر سمندر میں اُتارے تھے۔ یہ جگہ آج بھی کشتیوں کی چھوٹی بندرگاہ کے طور پر استعمال ہو رہی ہے اور یہاں ترکی بحریہ کی ایک چوکی بھی ہے۔ یہاں ہم گاڑی سے اُترے اور اُس سمت نظر ڈالی جہاں سے یہ جہاز لا کر سمندر میں ڈالے گئے تھے۔ یہ واقعہ تاریخ میں تو بارہا پڑھا تھا، اور اس پر تعجب بھی ہوا تھا، لیکن یہاں پہنچ کر تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس لیے کہ یہاں کھڑے ہو کر باسفورس کی اس سمت دیکھیں جہاں سے یہ جہاز لائے گئے تھے تو بیچ میں کئی بلند پہاڑ نظر آتے ہیں جو عرض میں دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مسطح خشکی پر سے جہاز لے جانا بھی بذاتِ خود بہت حیرت انگیز تھا، لیکن ان پہاڑوں پر جہازوں کو چڑھا کر اتارنا تو اس قدر محیّر العقول ہے کہ اگر کوئی شخص اس علاقے کو دیکھ کر اس کا تصور کرے تو پسینہ آجائے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان پہاڑوں کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص یہ ارادہ ہی

کیسے کر سکتا ہے کہ وہ ان پر جہاز چڑھا کرلے جائے گا۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اس کو عزم و ہمت بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ دس میل کے اس انتہائی ناہموار پہاڑی علاقے پر جہاز لے جانے کی تجویز کا ذہن میں آنا، اُس پر عملدر آمد کا حوصلہ پیدا ہونا، اور ایک رات میں اس منصوبے کو پورا کر لینا یقیناً سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ایک اُمتی کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا۔

یہیں سے "گولڈن ہارن" کا بھی قریب سے نظارہ کیا، یہ ایک مستطیل خلیج ہے، جو باسفورس سے مشرق میں خشکی کی طرف نکل آئی ہے۔ اور اس کی شکل "سینگ" کے مشابہ ہے کسی نے قسطنطنیہ کی فصیل سے طلوعِ آفتاب کے وقت اُسے دیکھا تو سورج کی کرنوں کی وجہ سے اس کا رنگ سُنہرا نظر آرہا تھا، اس لیے اس نے کہا کہ یہ ایک "سُنہرا سینگ" ہے، اس وقت سے اس کا نام "گولڈن ہارن" (سنہرا سینگ) مشہور ہو گیا جسے عربی میں "القرن الذھبی" اور فارسی میں "شاخِ زریں" بھی کہا جاتا ہے۔ استنبول کی بندرگاہ بھی اسی خلیج میں واقع ہے، اور یہ شہر کے شمالی اور جنوبی حصوں کے درمیان حدِ فاصل ہے، اور ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے اس پر کئی پل بنے ہوئے ہیں جن پر ہر وقت ٹریفک کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔

برجِ غلاطہ :

یہاں سے ہم لوگ استنبول کے قدیم ترین برج "غلاطہ" گئے۔ یہ ایک نہایت قدیم ٹاور ہے، جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ ۵۰۷ء میں (یعنی تقریباً ۱۴۸۰ سال پہلے) رُومی حکومت نے جہازوں کی رہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس کے طور پر تعمیر کیا تھا، اور شاید اپنے زمانے میں بلند ترین ٹاور سمجھا جاتا تھا، بعد میں اس کی توسیع و مرمت ہوتی رہتی ہے۔ اب بھی باہر سے اس پر قدامت کے آثار نمایاں ہیں، لیکن ابھی تک یہ پوری طرح قابلِ استعمال ہے۔ یہ ٹاور مسلمانوں کی فتحِ قسطنطنیہ سے پہلے شہر سے باہر گولڈن ہارن کے شمالی ساحل پر واقع تھا۔ اور یہاں یورپ کے تجار آباد تھے۔ اس بستی کا نام غلاطہ (Galata) تھا۔ اسی کے نام پر یہ بُرج موسوم ہے۔

یہ دس منزلہ برج ہے۔ اب اُوپر جانے کے لیے اس میں لفٹ لگی ہوئی ہے جو ساتویں منزل تک جاتی ہے، اس کے بعد تین منزلیں زینے کے ذریعے طے کی جاتی ہیں یہاں سے استنبول کا نظارہ بڑا دلکش ہے جس جگہ لفٹ جا کر ختم ہوتی ہے، وہاں ایک متوسط سائز کا کمرہ ہے جس میں کچھ آثارِ قدیمہ محفوظ ہیں۔ اسی کمرے کی ایک دیوار پر چمڑے کے بنے ہوئے دو پر لٹکے ہوئے ہیں، اور ان کا تعارف کراتے ہوئے برابر میں ترکی اور انگریزی زبان میں ایک عبارت لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پر اُس مسلمان مہم جُو ہذار فین احمد کے بنائے ہوئے ہیں جس نے ان پَروں کے ذریعے سترھویں صدی عیسوی میں فضا میں اُڑنے کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ اس شخص نے سلطان مراد چہارم کے زمانے (۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء) میں برج غلاطہ سے ان پروں کے ذریعے باسفورس پر پرواز کی تھی۔ اور باسفورس کے ایشیائی ساحل اسکودار سے ہوتا ہوا ایک مقام اسکوتاری تک چلا گیا تھا، گویا تقریباً آٹھ میل کا فاصلہ اُس نے اُڑ کر طے کیا تھا۔[1]

جامع سُلیمانیہ:

یہاں سے ہم استنبول کی مشہور تاریخی مسجد "جامع سلیمانیہ" دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے استنبول کی سب سے بڑی مسجد ہے اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے دنیا کی چوٹی کی مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ یہ مشہور عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم کے دور میں تعمیر ہوئی تھی جو ترکی خلافت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اُس دور کے شہرۂ آفاق معمار "زینان" نے اس کی تعمیر میں اپنے فن کی تمام صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔ یہ وہی زینان ہے جس کا نام سول انجینئرنگ کے میدان میں آج بھی مشہور و معروف ہے۔ سلیمانِ اعظم کے حکم پر زینان نے یہ مسجد دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں تعمیر کی تھی، اور اس کا سنگِ بنیاد شیخ الاسلام ابوالسعود آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا تھا۔

---

[1] تاریخ میں انسان نے پر لگا کر ہوا میں اُڑنے کے بہت سے تجربے کیے ہیں۔ غالباً سب سے پہلا تجربہ عربی کے مشہور لغوی اسمٰعیل بن حمّاد جوہری نے کیا تھا، لیکن یہ تجربہ ناکام رہا، اور وہ اسی تجربے میں ہلاک ہوئے۔

مسجد کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی دائیں جانب وضو کا بہترین انتظام ہے۔ نمازِ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے یہیں پہ وضو کیا، اور نمازِ ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔

دُنیا بھر کے بیشمار اقسام کے پتھروں سے مزین یہ مسجد ایک وسیع ہال پر مشتمل ہے جس کی ہر جانب ہی فنکاری کے دلآویز نمونے جلوہ گر ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو پتھر اس مسجد میں استعمال کیے گئے ہیں، انہیں یہاں تک لانے کے لیے باربرداری کا خرچ اُن کی اصل قیمت سے زیادہ ہوتا تھا۔ اکثر پتھر ۵۰۰ کیلو گرام کے ہوتے تھے، جو بیل گاڑیوں میں لائے جاتے تھے، اور بعض اوقات زیادہ وزنی پتھروں کو منتقل کرنے کے لیے بیلوں کی دس دس جوڑیوں پر مشتمل گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

مسجد کے منبر اور محراب مسجد سلطان احمد کی طرح انتہائی پُرشکوہ ہیں۔ یہ ہال ۶۹ میٹر لمبا اور ۶۳ میٹر چوڑا ہے، اور اس میں ۲۸ اکھڑکیاں ہیں۔ ہال میں جگہ جگہ ایسی شمعیں آج بھی نصب ہیں جو کم از کم ۱۰-۱۰ فیٹ اونچی اور ۲-۲ فیٹ موٹی ہیں، رات کے وقت ان شمعوں سے روشنی کی جاتی تھی۔ لیکن اس بات کا اندیشہ تھا کہ شمعوں سے اُٹھنے والا دھواں دیوار دل کو خراب کر دے گا، اس لیے شمعوں کے اوپر خوبصورت چمنیاں بنائی گئی تھیں جو سارا دُھواں اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں، اور اس میں بھی اس بات کا اہتمام تھا کہ چمنیوں کے اندر کا یہ دھواں بھی بیکار نہ جائے، چنانچہ اس دھوئیں سے جو سیاہی پیدا ہوتی تھی اس سے لکھنے کیلئے روشنائی تیار کی جاتی تھی۔

تاریخ میں ہے کہ جس زمانے میں اس مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی، اس زمانے میں کسی وقت کسی مجبوری سے کچھ دن کے لیے تعمیر کا کام روکنا پڑا۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ کو اطلاع ہوئی تو اُس نے اپنے ایک ایلچی کے ذریعے سلیمانِ اعظم کے پاس بہت بھاری رقم اور کچھ قیمتی جواہر ارسال کئے، اور پیغام بھیجا کہ اس مسجد کی تعمیر میں ہم بھی حصہ لینا چاہتے ہیں، اسلیے یہ رقم اور جواہر فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد میں لگالی جائے۔

جب ایلچی سلیمان اعظم کے پاس پہنچا تو اُس نے وہ رقم فقراء مساکین کو تقسیم کرنے کیلیے اپنے کسی آدمی کے حوالے کی اور سفیر سے کہا کہ: "تم لوگ نماز تو پڑھتے نہیں ہو، پھر تمہاری رقم مسجد میں کیسے لگائی جائے؟" اور جواہر کے بارے میں حکم دیا کہ "ہم نے مسجد کے میناروں میں

انواع واقسام کے پتھر استعمال کیے ہیں، یہ جواہر مینار کے پتھروں کے طور پر استعمال کیے جا ئیں" سفیر یہ سُنکر بھونچکا رہ گیا، لیکن سُلیمان اعظم نے اپنے اسی فیصلے پر عمل کیا۔

ہمارے رہنما خیراللہ درسی صاحب نے اسی دَور کا ایک اور عجیب واقعہ سنایا۔ اور وہ یہ کہ جامع سلیمانیہ کی تعمیر کے دوران یورپ کے کسی ملک (غالباً اٹلی) کے ایک کلیسا نے اپنے ملک کے سُرخ سنگِ مرمر کی ایک بہترین سل تحفے میں بھیجی، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ سل اس مسجد کی محراب میں لگائی جائے۔ جب سل پہنچی تو زینانؔ معمار نے سلیمانِ اعظم سے کہا کہ میں یہ سل محراب میں لگانا مناسب نہیں سمجھتا، اگر آپ فرمائیں تو اسے مسجد کے ایک دروازے کی دہلیز میں لگا دیا جائے، سُلیمان اعظم نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہ پتھر دہلیز میں لگا دیا گیا۔

زینانؔ کو یہ شبہ بھی تھا کہ ان اہلِ کلیسا نے اس پتھر میں کوئی شرارت نہ کی ہو چنانچہ اس نے ایک روز امتحاناً اس پتھر کو کسی خاص مسالے سے گھس کر دیکھا کہ اس کے اندر کیا ہے؟ گھسنے کے بعد اسی پتھر کے اندر سیاہ رنگ کی ایک صلیب بنی ہوئی نمودار ہوئی۔ یہ پتھر آج بھی دروازے کی دہلیز میں نصب ہے، اور اس میں صلیب کا نشان آج بھی نظر آتا ہے، جو اب قدرے دُھندلا گیا ہے، لیکن پھر بھی خاصا واضح ہے، جو اُن اہلِ کلیسا کے مکر و فریب اور مسجد کے معماروں کی فراست و بصیرت کی گواہی دے رہا ہے۔

مسجد کے باہر ایک احاطے میں بہت سی قبریں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے ایک قبر سلیمانِ اعظم کی بھی ہے۔ ان کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔

---

(۵)

سُلیمانِ اعظم :

سلیمانِ اعظم کا دَورِ سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ کا سب سے درخشاں دَور ہے، یہ خلافتِ عثمانیہ کے اُسی عروج کا زمانہ ہے جس کی سرحدیں زوال سے جا ملا کرتی ہیں، سلیمانِ اعظم

نے ۹۲۶ھ سے ۹۷۴ھ تک اڑتالیس سال جس جاہ و جلال اور دبدبے کی حکومت کی، اُس کی نظیریں تاریخ اسلام، بلکہ تاریخ عالم میں بھی شاذ و نادر ہیں۔ اس زمانے میں خلافتِ عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوشحالی میں اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی، اور شاید تاریخ اسلام میں اتنی وسیع حکومت کسی اور کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں کے بڑے بڑے خطے اس کے زیرِ نگیں تھے، اور ہنگری سے لے کر بحرِ ہند تک اُس کی شوکت و عظمت کا پرچم لہراتا تھا۔

سلیمان اعظم بذاتِ خود بڑا عادل اور انصاف پسند انسان تھا، اس کے عہد میں (ایک دو افسوسناک واقعات کے سوا) عدل و انصاف کا دور دورہ تھا، اُس نے (شاید پہلی بار) اپنی سلطنت کے لیے ایک باقاعدہ قانون مدوّن کیا تھا۔ اور اسی لیے اس کو "سلیمان قانونی" بھی کہا جاتا ہے۔ اُس کے عدل و انصاف کی وجہ سے مسیحی علاقوں کے باشندے ترکِ وطن کر کر کے اُس کے علاقے میں آباد ہوتے تھے۔ سلطنت کے انتظام اور عدل و انصاف کے معاملے میں وہ اتنا سخت تھا کہ اُس نے خود اپنے داماد فرہاد پاشا کو رشوت اور ظلم کی بنا پر ایک صوبے کی حکومت سے معزول کیا، پھر فرہاد پاشا کی بیوی اور سلیمان کی والدہ نے بڑی التجاؤں کے بعد اُسے دوبارہ مقرر کرا دیا، لیکن جب اُس نے دوبارہ بدعنوانیاں شروع کیں تو اُسے معزول کر کے قتل کرا دیا۔

زینان معمار:

سلیمان اعظم کے مزار کے قریب ہی جامع سلیمانیہ کے معمار زینان کی قبر بھی بنی ہوئی ہے، یہ تاریخ کا وہ مشہور معمار ہے جس کو فنِ تعمیر کا امام مانا گیا ہے۔ تاریخ میں ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں ایک سو چھتیس مسجدیں، ستاون مدرسے، سات مکتب، بائیس مقبرے، بائیس طعام خانے، تین ہسپتال، چودہ پُل، بیس مسافر خانے، پینتیس محل، اکتالیس حمام اور آٹھ گودام تعمیر کیے۔ اس طرح ترکی میں اس کی تین سو ساٹھ یادگاریں اس کے مرنے کے بعد محفوظ ہیں[1]۔

---

[1] جامع السلیمانیہ۔ انشاؤہ و خصائصہ از سلیمان ملا ابراہیم اُغلو ص ۱۲

ان یادگاروں میں جامع سُلیمانیہ اس کا سب سے بڑا شاہکار ہے، جس کے بارے میں برنارڈ لوئس لکھتا ہے:

> "جامع سلیمانیہ زینان کا حسین ترین فنی شہ پارہ ہے، اور زینان باتفاق مؤرخین سب سے بڑا معمار تھا۔"[1]

کتب خانہ سلیمانیہ:

جامع مسجد کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک وسیع عمارت اور ہے جو خلافت عثمانیہ کے دَور میں ایک بڑے دار العلوم کے طور پر استعمال ہوتی تھی، اور اب اسے ایک کتب خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ کتب خانہ استنبول کے عظیم ترین کتب خانوں میں سے ہے۔ استنبول چونکہ صدیوں عالم اسلام کا مرکز رہا ہے، اس لیے اس کے کتب خانے بھی عالم اسلام کے عظیم کتب خانے شمار ہوتے ہیں، اور اب کتب خانۂ سلیمانیہ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے کتب خانوں کو ضم بھی کر دیا گیا ہے، اور اس طرح اس کی ثروت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔

ہم نے اس کتب خانے کی بھی سیر کی، لیکن اس مہلت کے ساتھ کہ اس سے استفادے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں ایسی کتابوں کے نادر مخطوطات کی بہت بڑی تعداد محفوظ ہے جن کا ہم نے صرف نام ہی سُنا تھا، کبھی زیارت کی نوبت نہیں آتی تھی، اور بہت سے ایسے مخطوطات بھی نظر سے گذرے جن کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ ایک طالب علم کے لیے یہ جگہ ایک آدھ گھنٹہ سیر کرنے کی نہیں، مہینے گذارنے کی ہے۔ میں چونکہ صحیح مسلمؒ کی شرح لکھ رہا ہوں، اس لیے صحیح مسلمؒ کی غیر مطبوعہ شروح جو یہاں موجود تھیں، ان کی فوٹو کاپی لینے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوا کہ غیر ملکیوں کے لیے اس کا ایک طویل طریق کار ہے جس پر عمل اس وقت ممکن نہ تھا، لہٰذا میں نے ڈاکٹر یوسف قلیچ سے درخواست کی کہ وہ بعد میں ان کی تصویر کرا کر مجھے

---

[1] استنبول وحضارۃ الخلافۃ الاسلامیۃ۔ بترجمہ الدکتور سید رضوان علی ص ۱۲۷

بھجوادیں، چنانچہ وہ ان میں سے کئی کتب رفتہ رفتہ احقر کو بھجوا رہے ہیں۔

بند بازار (قبالی جارشی) :

جامع سلیمانیہ سے ہم واپس ہوٹل آگئے، عصر کے بعد خیراللہ دمرسی صاحب مجھے استنبول کے مشہور قدیم بازار قبالی جارشی لے گئے۔ یہ ایک خوبصورت مسقّف بازار ہے جو سلطان محمد فاتح نے تعمیر کیا تھا۔ اس پورے بازار پر خوبصورت اور منقش محرابوں کی شکل میں پختہ چھت پڑی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے یہ "بند بازار" کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے میں مسقّف بازاروں کا جو رواج تھا، ان میں سے پاکستان، ہندوستان کے علاوہ سعودی عرب، شام اور مصر وغیرہ کے بازار میں نے دیکھے ہیں، لیکن اپنے نظم و ضبط، پختگی اور عمارتی حسن کے لحاظ سے یہ بازار ان سب پر فائق ہے۔ اس کا ایک مرکزی دروازہ ہے جس میں داخل ہونے کے بعد دور تک محرابی چھتوں کا سلسلہ اور دو رویہ منظم دکانیں بڑا خوشنما منظر پیش کرتی ہیں۔ اس بازار میں ۴۲۰۰ دکانیں، چھ غسل خانے، پانچ مسجدیں اور ٦۵ گلیاں ہیں۔ اور ہر قسم کی ضروریات یہاں مل جاتی ہیں۔ یہ ترکی مصنوعات کا اہم مرکز ہے۔ قیمتوں کا معیار بھی مناسب ہے، اور یہاں سے کچھ مختصر سی خریداری خاصی دلچسپ رہی۔

مدرسہ تحفیظُ القرآن :

اسی روز عشاء کے بعد شیخ امین سراج صاحب کے ساتھ استنبول کے ایک مدرسے میں جانے کا پروگرام تھا، رات کا کھانا بھی وہیں کھانا تھا، اور مختصر سی تقریر بھی کرنی تھی، چنانچہ عشاء کی نماز میں نے شیخ امین سراج صاحب کے ساتھ پڑھی اور ان کے ہمراہ اس مدرسے میں حاضری ہوئی۔ "تحفیظ قرآن" کے مدرسے کے نام سے ایک چھوٹے سے مکتب کا تصور اُبھرتا ہے، لیکن اس مدرسے کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ مدرسہ ایک پانچ منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ پانچوں منزلیں درسگاہوں اور طلبہ کے دارالاقامہ میں مشغول ہیں، چھ سو طلباء اس میں مقیم ہیں، اور باہر سے آنے والے اس کے علاوہ ہیں

حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ اس میں ابتدائی عربی اور دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے تمام اساتذہ کی وضع و قطع سے لے کر انداز و ادا تک ہر چیز سے اتباعِ سنّت کا رنگ جھلکتا تھا۔ ان حضرات سے عربی میں گفتگو رہی، یہ سب عربی میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے پر قادر تھے اور ان کی گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خالص دینی اور تبلیغی جذبے کے ساتھ اس مدرسے کی خدمت کر رہے ہیں۔

معیارِ تعلیم بھی ماشاء اللہ بہت اچھا معلوم ہوا۔ ہمیں ایک کشادہ ہال میں لیجایا گیا جہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا، اور تقریباً سو بچے (جو ۱۰ سال سے ۱۷ سال تک کی عمر کے ہوں گے) فرش پر خوبصورت تپائیاں لیے ہوئے بڑے نظم و ضبط اور سلیقے سے بیٹھے ہوئے قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ایک استاذ مرکزی مسند پر تشریف فرما تھے۔ اُستاذ نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا، بچے بدستور تلاوت میں مصروف رہے۔ ہم جا کر بیٹھے تو اُستاذ نے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ بتایا کہ یہ وہ بچے ہیں جو حفظِ قرآن کی تکمیل کر چکے ہیں، اور دور کر رہے ہیں۔ آپ ان میں سے جس بچے سے چاہیں، اور قرآن کریم کے جس حصے سے چاہیں، قرآن کریم سُن لیجئے۔

مَیں نے ان سو بچوں میں سے مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے تقریباً بیس بچوں سے قرآن کریم کی مختلف جگہوں سے تلاوت کی فرمائش کی۔ اور اُن سب سے تلاوتِ قرآن سُن کر مَیں حیران ہی نہیں، مسرت سے سرشار ہو گیا۔ ان بیس بچوں میں سے ہر جگہ کا انتخاب مَیں نے خود کیا تھا، ہر ایک نے کم سے کم ایک رکوع سُنایا۔ اور کسی ایک کی تلاوت میں ایک غلطی بھی نہیں آئی۔ اِدھر میں نے کسی آیت کے ابتدائی دو تین الفاظ پڑھے، اور اُدھر اُس نے تلاوت شروع کر دی۔ یادداشت کی غلطی تو درکنار، کسی بچے کے مخارج اور قواعدِ تجوید میں بھی کوئی غلطی میں نہیں پکڑ سکا۔ اور لہجہ تو اس قدر دلکش کہ دل چاہتا تھا کہ یہ تلاوت رات بھر جاری رہے۔

طلبہ کے امتحان کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو اُستاذ کی فرمائش پر تمام بچوں نے مل کر قرآن کریم کی تعریف میں ایک عمدہ ترانہ بڑے دلکش انداز میں سُنایا۔ اس ترانے کا یہ ٹیپ کا بند اُن

بچوں کی مسحور کُن آوازیں آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے :-

غَرِّدُ یَا شِبْلَ الْإِیْمَانْ غَرِّدُ وَاصْدَعْ بِالْقُرْآن٥

فِیْهِ الْحَقُّ وَفِیْهِ النُّوْر فِیْهِ اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَان

معلوم ہُوا کہ مدرسہ دینی مدارس کے ایک منظم پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ صرف استنبول شہر میں اس قسم کے چھوٹے بڑے دو سو دس مدارس ہیں اور پورے ترکی میں پانچ ہزار۔ ان پانچ ہزار مدارس میں رجسٹرڈ طلبہ کی تعداد چھ لاکھ ہے، اور صرف استنبول کے مدارس میں دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد چھ ہزار ہے، اور اس طرح یہ مدارس نئی نسل کو قرآنِ کریم اور ابتدائی دینیات سے رُوشناس کرنے کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں یہ تمام مدارس سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں، اور محکمہ تعلیم سے ان پر انسپکٹر بھی مقرر ہیں۔

میں یہ مدرسہ دیکھتا اور اس کی تفصیلات سُنتا رہا، اور سوچتا رہا کہ یہ وہی ملک ہے۔ جہاں کبھی کمال اتاترک نے قرآنِ کریم کا نسخہ شیخ الاسلام کے سر پر مار دیا تھا، اور جہاں عربی زبان تو کجا، قرآنِ کریم کی تعلیم اور عربی زبان کی اذان تک ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ کمال اتاترک نے "ہیٹ وار" کے دوران یہ سمجھا تھا کہ ترکی ٹوپی کی جگہ اس قوم کو ہیٹ پہنا کر اس کا دماغ بھی تبدیل کر دے گا۔ لیکن آج اسی قوم کی نئی نسل کے چھ لاکھ بچے عربی ٹوپیاں پہنے ہوئے اپنے سینوں میں قرآنِ کریم محفوظ کر رہے ہیں، اس کی تعریف میں عربی ترانے گا رہے ہیں، اور انہوں نے اپنا پورا وجود اللہ کی اس مقدس کتاب کے لیے وقف کیا ہُوا ہے۔

ترکی میں ابھی کوئی اسلامی علوم کا مکمل مدرسہ تو موجود نہیں ہے لیکن حفظِ قرآن کے یہ مدارس جو عربی سے بھی اچھا خاصا مُس پیدا کر دیتے ہیں، بڑی زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں، اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش علماء کی طرف سے بڑی حکمت اور تدبّر کے ساتھ جاری ہے۔

کھانے پر شہر کے دُوسرے متعدد علماء بھی مدعو تھے، اُن سے دیر تک ترکی کے دینی حالات، حال اور مستقبل پر گفتگو ہوتی رہی ــــ اب تک استنبول شہر کے ماڈرن علاقوں

جدید ترکی کا ایک ہی رُخ زیادہ سامنے آیا تھا، جو مغربیت میں ڈوبا ہُوا ہے۔ میں یہ دوسرا دینی رُخ جو ترک قوم کی اکثریت کا اصل رُخ ہے اور جو اس کے ماضی و حال میں رچا ہُوا ہے اور ہزار کوششوں کے باوجود اُسے فنا نہیں کیا جا سکا، آج اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ سامنے آیا، اور اس کا سُرور دیر تک دل و دماغ پر محیط رہا۔

آخری دن :

اگلا دن استنبول میں میرے قیام کا آخری دن تھا۔ شام کو مغرب کے وقت مجھے واپس کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اور آج بھی خیر اللہ دمرسی صاحب کے ہمراہ کئی جگہوں پر جانے کا پروگرام تھا۔ استنبول کے ایشیائی حصے میں ابھی تک جانا نہیں ہُوا تھا، وہاں خاص طور پر مرمرہ یونیورسٹی بھی جانا تھا۔

چنانچہ خیر اللہ دمرسی صاحب اپنے ایک دوست کے ہمراہ صبح نو بجے کے قریب میرے ہوٹل پہنچ گئے، اور ہم اُن کے ساتھ دوبارہ روانہ ہوئے۔

ایمرگان پارک :

خیر اللہ صاحب ہمیں پہلے استنبول کے ایک قدیم خوبصورت پارک میں لے گئے جو ایمرگان پارک کہلاتا ہے، اور روایت یہ ہے کہ یہ پارک سلطان محمد فاتح کی بیٹی نے بنوایا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے زمانے میں یہ شہر کی بہترین تفریح گاہ تھی۔ یہ پارک باسفورس کے یورپی ساحل پر ایک بتدریج بلند ہوتی ہوئی پہاڑی کے اُوپر واقع ہے۔ اُوپر کھڑے ہو کر باسفورس کی طرف دیکھیں تو باغ کے کئی تختے تھوڑے تھوڑے نشیبی فاصلے سے طویل و عریض سیڑھیوں کی طرح سمندر میں اُترتے دکھائی دیتے ہیں۔ استنبول کی زمین اور اس کی پہاڑیاں یوں بھی بہت سرسبز و شاداب ہیں۔ لیکن اس پارک میں یہ سبزہ و گُل جس نظم و ضبط کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں اُس نے ان کی رعنائی میں چار چاند لگا دیئے ہیں، یہ مہینہ اگرچہ مارچ کا تھا، لیکن ابھی سردی کافی تھی، اور سبزہ ابھی خزاں کے شکنجے سے نہیں نکلا تھا، ورنہ رہنماؤں کا بیان تھا

کہ موسم بہار میں یہاں سبزہ پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ پارک میں طویل روشیں، جگہ جگہ خوبصورت تالاب اور درختوں کے سائے میں بیٹھنے کے خوش منظر مقامات بنے ہوئے ہیں، اور ہر جگہ سے سامنے بہتی ہوئی باسفورس اور اس کے پس منظر میں ایشیائی ساحل کی پہاڑیاں دیدۂ دل کو شاداب کرتی رہتی ہیں۔

پارک کے بیچوں بیچ ایک شاندار قدیم عمارت بنی ہوئی ہے جو "قصرِ اصفر" کہلاتی ہے۔ یہ عثمانی عہد کے ایک جرنیل اسماعیل خدیو پاشا کا محل ہے جو اب اس تفریح گاہ کے ریستوران کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

بہرکیف! یہ پارک عثمانیوں کی جمالیاتی حس کا آئینہ دار اور ان کی خوش مذاقی کی بہترین یادگار ہے۔

رومیلی حصار:

یہاں سے ہم سلطان محمد فاتح کے بنائے ہوئے قلعے "رومیلی حصار" کو دیکھنے گئے۔ جسے دیکھنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ میں فتح قسطنطنیہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ بایزید یلدرم نے آبنائے باسفورس کو کنٹرول کرنے کے لیے اس کے ایشیائی ساحل پر اُس جگہ ایک قلعہ تعمیر کیا تھا جہاں باسفورس کی چوڑائی سب سے کم ہے۔ بایزید یلدرم کے بنائے ہوئے اس قلعے کا نام "اناضول حصار" ہے۔ لیکن سلطان محمد فاتح نے محسوس کیا کہ باسفورس پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے صرف "اناضول حصار" کافی نہیں ہے۔ اسلیے اُس نے "اناضول حصار" کے بالکل سامنے یوروپی ساحل پر ایک اور قلعہ تعمیر کیا۔ اسی قلعے کا نام "رومیلی حصار" ہے۔

اس قلعے کی تعمیر بھی سلطان محمد فاتح کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ ہے۔ یہ تاریخی عمارت جس کا نقشہ سلطان محمد فاتح کے ایک انجینئر مصلح الدین آغا نے تیار کیا تھا، تین ہزار مربع میٹر کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، اور سترہ برجوں پر مشتمل ہے۔ اس قلعے کا نقشہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز سے اُسے دیکھے تو "محمد" لکھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سترہ برجوں

ں سے تین بُرج بہت بُلند ترین بُرج جو "سروکا" کہلاتا ہے، منزل (تقریباً نوّے فیٹ) بلند ہے جس کی دیوار نو میٹر آثار کی ہے۔ فصیل کی دیواریں پانچ سے پندرہ میٹر تک بلند ہیں۔

اس تفصیل کے بعد جو بات محیّر العقول حد تک عجیب ہے وہ یہ کہ یہ پورا قلعہ صرف چار مہینے چار دن میں تیار ہُوا تھا۔ اس کی تعمیر ۲۴ اپریل ۱۴۵۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۸ اگست ۱۴۵۲ء کو مکمل ہوگئی۔ آج جبکہ فنِ تعمیر کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے، شاید ایسے قلعے کا نقشہ بھی چار مہینے میں تیار نہ کیا جا سکے۔

آجکل اس قلعے کا کچھ حصّہ تو شاید فوجی چوکی کے طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے لیکن بیشتر حصّہ ایک تاریخی یادگار کے طور پر سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ قلعے کے پُرشکوہ دروازے سے اندر داخل ہوں تو ایک طویل صحن میں کچھ تاریخی اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سلطان محمد فاتح کی ایک توپ ہے۔ جو قسطنطنیہ کی فتح میں استعمال ہوئی تھی، اسی کے ساتھ ایک توپ سلطان عبد الحمید کی طرف منسوب ہے۔ اور یہیں فرش پر اُس زنجیرے کے چار حلقے پڑے ہوئے ہیں جو رومیوں نے گولڈن ہارن کے دہانے پر باندھا تھا تاکہ عثمانیوں کے جہاز گولڈن ہارن میں داخل نہ ہو سکیں۔ یہی وہ زنجیرہ تھا جس کی وجہ سے سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں خشکی پر جہاز چلانے کا عجوبہ ظہور میں آیا۔

بہرکیف! یہ قلعہ، جس کا تذکرہ کہیں بچپن میں پڑھا، اور تصوّر نے اس کے زمانے کتنے خاکے بنائے تھے، آج اُسے دیکھنے کا شوق پُورا ہُوا۔

باسفورس کا پُل اور ایشیائی استنبول:

یہاں سے ہماری منزل استنبول کا ایشیائی حصّہ تھا جو "اسکودار" کہلاتا ہے۔ باسفورس عبور کرنے کے لیے استنبول کے مختلف حصّوں سے کشتیاں بھی چلتی ہیں، لیکن اب باسفورس پر ایک نہایت عالیشان نیا پل بنا دیا گیا ہے جس نے یورپ اور ایشیا کو سڑک کے راستے سے باہم ملا دیا ہے۔ یہ پُل ۱۹۷۳ء میں گاڑیوں کے لیے کھولا گیا تھا۔ یہ ایک معلّق پل ہے جس کے

صرف کناروں پر دو دو آہنی ستون ہیں۔ دو ستون ایشیا میں اور دو یورپ میں۔ اور بیچ میں سمندر پر کوئی ستون نہیں ہے۔ اس کے بجائے پُل کو اُوپر سے ہلالی شکل میں لٹکے ہوئے دو لوہے کے مضبوط رسّوں نے سنبھالا ہوا ہے، اس پل کی لمبائی ایک ہزار چوہتر میٹر ہے، اور چوڑائی ۴۰ء۳۳ میٹر، یہ سمندر سے ۶۴ میٹر بلند ہے، اور اس کے دونوں کناروں پہ کھڑے ہوئے ستون ۱۶۵ میٹر اُونچے ہیں۔ اگر سمندر کے کنارے پہ کھڑے ہو کر دیکھیں تو پُل پر چلتی ہوئی کاریں کافی چھوٹی دکھائی دیتی ہیں، اور اتنی بلندی اسلئے رکھی گئی ہے تاکہ باسفورس سے ہمہ وقت گذرتے ہوئے جہازوں کے لیے یہ رکاوٹ نہ بنے، اور جہاز اس کے نیچے سے گذر جائیں۔ اور اس طرح یہ انتہائی خوبصورت، پرشکوہ اور معروف پُل ہے جس پر سے روزانہ اوسطاً دو لاکھ گاڑیاں آبنائے باسفورس کو عبور کرتی ہیں، اور کوئی وقت ایسا نہیں ہے جس میں گاڑیوں کا ایک ریلا اس پر رواں دواں نظر نہ آتا ہو۔

ہم نے اسی پُل کے ذریعے باسفورس کو عبور کیا، استنبول کا ایشیائی حصہ "اسکودار" کہلاتا ہے، اور ترکی کے اُس پورے خطے کو جو ایشیا میں واقع ہے "اناطولیہ" کہتے ہیں۔ پُل پار کر کے ہم "اسکودار" میں داخل ہو گئے۔ شہر کا یہ ایشیائی حصہ بھی بڑا خوبصورت اور بہت وسیع و عریض ہے۔ ہم اس کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے "مرمرا یونی ورسٹی" پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر یوسف قلیچ جو اس کے علوم اسلامیہ کے شعبے میں اُستاذ ہیں ہمارے منتظر تھے۔ ہمارے ترک دوست ڈاکٹر صالح طوغ اس یونی ورسٹی میں کلیۃ الٰہیات کے ڈین ہیں، وہ اس پورے عرصے میں استنبول سے باہر تھے، اس لیے اب تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، اب ڈاکٹر قلیچ کے ہمراہ اُن کے کمرے میں پہنچے تو وہ جا چکے تھے۔ اس لیے یہاں بھی ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ بعد میں ڈاکٹر قلیچ نے یونیورسٹی کے مختلف شعبے دکھائے۔ یہ ترکی کی مشہور یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس کا شعبۂ ادیان اور "علوم اسلامیہ" کا شعبہ ترکی میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ لیکن دوسری سرکاری یونیورسٹیوں کی طرح یہاں بھی "علوم اسلامیہ" کا مضمون ایک نظریہ اور فلسفے کی حد تک پڑھا

اور پڑھایا جاتا ہے، درسگاہ کے ماحول میں علانِ علوم کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔
فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی۔

یونیورسٹی میں نمازِ ظہر پڑھنے کے بعد خیراللہ مرتسی صاحب ہمیں باسفورس کے ایشیائی ساحل پر عثمانی عہد کے بنے ہوئے ایک اور خوبصورت باغ میں لے گئے، وہیں پر انہوں نے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کیا ہوا تھا۔ اس سرسبز و شاداب اور پُرسکون فضا میں ترکی احباب کے ساتھ یہ ظہرانہ بڑا پُرلطف رہا۔

یہاں سے ہم ہوٹل واپس ہوگئے، اور نمازِ عصر کے فوراً بعد ایئرپورٹ کے لیے روانگی ہوگئی۔ کانفرنس کے پروٹوکول آفیسر کے علاوہ ڈاکٹر یوسف قلیج بھی ایئرپورٹ تک آئے۔ نماز مغرب پڑھتے ہی میں ٹرکش ایئرویز کے جہاز میں سوار ہوا۔ ترکی کے قیام کی خوشگوار یادیں سارے راستے ہم سفر رہیں۔ یقیناً استنبول میں گذرے ہوئے یہ چند روز بڑے یادگار، بڑے نشاط انگیز اور بڑے معلومات افزا تھے جن کے نقوش عرصے تک دھندلا نہیں سکتے۔

واپسی کا سفر:

استنبول کے یہ احباب جن سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی، لیکن چند ہی دنوں میں ان سے بہت اُنس پیدا ہوگیا تھا، اُن کا کہنا تھا کہ مجھے چند روز مزید ٹھہرنا چاہیئے، اور ترکی کے دوسرے مشہور شہروں بالخصوص قونیہ، انقرہ، بورصہ اور ازمیر ضرور جانا چاہیئے، عقلی طور پر میں بھی یہ سوچتا تھا کہ خدا جانے پھر کبھی یہاں آنا ہو یا نہ ہو، اس لیے چند روز ٹھہرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، پی آئی اے کی پرواز بھی تین دن بعد تھی، اور پی آئی اے سے جانا میرے لیے زیادہ آسان تھا۔ طبعی طور پر ترکی میں دل بھی لگ رہا تھا، لیکن قلب پر ایک انجانی سی وحشت طاری ہونے لگی، جو عقل و طبیعت کے ان تمام تقاضوں پر اس درجہ غالب آتی گئی کہ میں نے بالآخر آج ہی ٹرکش ایئرویز سے کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اس کے لیے سیٹ بھی بُک کرالی، میرے پاس اُس انجانی سی وحشت کے سوا اپنے اس فیصلے کی کوئی معقول دلیل موجود نہیں تھی جو میں احباب کے اصرار کے جواب میں پیش کرسکتا۔ بس میں نے ان کو

یہ کہہ کر چُپ کر دیا کہ مجھے بعض وجوہ سے فوراً کراچی پہنچنا ضروری ہے۔

مَیں خود حیران تھا کہ ترکی میں دلچسپی اور دل بستگی کے اتنے سامان کے باوجود میں اتنی جلدی کیوں واپس جا رہا ہوں؟ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں، کوئی وقتی مجبوری بھی بظاہر سام نہیں تھی۔ لیکن جب میں کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تو لاؤنج ہی میں میرے خسر مکرم جناب شرافت حسین صاحب اور میرے معاونِ خصوصی مولوی عبداللہ میمن صاحب نے بتایا کہ احقر کے شیخ و مربی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی قدس سرہٗ کئی روز سے صاحبِ فراش ہیں، اور آج انہیں ہسپتال لے جانے کی رائے ہو رہی ہے۔ بس یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنک گیا، گھر میں سامان رکھنے کے بعد مَیں سیدھا حضرتؒ کے مکان پر پہنچا معلوم ہُوا کہ حضرتؒ ہسپتال جا چکے ہیں، وہاں حاضری ہوئی۔ حضرتؒ بسترِ علالت پر کافی کرب میں تھے، بات کرنا دُشوار ہو رہا تھا، لیکن احقر کو دیکھ کر حسبِ معمول مسرت کا اظہار فرمای "بھائی، اچھا ہُوا تم آ گئے، ہماری طبیعت بہت خراب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر ہمیشہ راضی رہنا چاہیئے۔"

اس قسم کی چند باتیں ارشاد فرمائیں، اور اگلے دن اذانِ فجر کے وقت یہ آفتابِ ہدایت دُنیا سے روپوش ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یہ تمام واقعات اس قدر آناً فاناً پیش آئے کہ تشویش اور صدمے کی رَو میں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ بعد میں سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ استنبول سے فوراً وا کا وہ شدید داعیہ اور قلب کی وہ انجانی سی وحشت کیوں پیدا ہوئی تھی؟ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ میں اس انجانے سے داعیے پر عمل کرتے ہوئے فوراً لوٹ آیا، اگر ایک دن کی بھی مزید تاخیر ہو جاتی تو حضرت والاؒ کا دیدار نصیب نہ ہو سکتا، اور عمر بھر اس کا جو صدمہ رہتا اس کی تلافی کا کوئی راستہ نہ تھا۔

جزیروں کا مُلک

سنگاپور، انڈونیشیا

شعبان سنہ ۱۴۰۲ھ جون سنہ ۱۹۸۲ء

(۵)

جزیروں کا ملک

پچھلے دنوں حکومت انڈونیشیا نے حکومت پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے وزیر مذہبی امور اور پاکستان کے علماء پر مشتمل ایک وفد انڈونیشیا بھیجے تاکہ یہ وفد انڈونیشیا کے دینی اداروں اور وہاں کے دینی ماحول کا مشاہدہ کرے۔ یہ ایک خیر سگالی نوعیت کا دورہ تھا۔ جس کی تاریخوں میں کئی ماہ تک رد و بدل ہوتا رہا۔ بالآخر اس کے لیے جون کا پہلا ہفتہ مقرر ہوا۔

وفد میں پاکستان کے وزیر مذہبی امور الحاج محمد عباس خاں عباسی صاحب کے علاوہ جسٹس مولانا پیر محمد کرم شاہ صاحب جج وفاقی شرعی عدالت، میاں فضل حق صاحب مہتمم جامعہ سلفیہ فیصل آباد و رکن مجلس شوریٰ، مولانا شبیہ الحسنین محمدی مہتمم مدرسۃ الواعظین لاہور اور وزارت مذہبی امور کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر امین اللہ وثیر صاحب اور راقم الحروف شامل تھے۔

یکم جون کی صبح کو پونے دس بجے کراچی سے پی آئی اے کے طیارے کے ذریعہ سنگاپور کے لیے روانہ ہوئے۔ کراچی سے کوالالمپور تک تقریباً چھ گھنٹے کی مسلسل اور طویل پرواز میں طیارے نے ہندوستان کو عرضاً طے کیا۔ اور مدراس کی سمت سے خلیج بنگال میں داخل ہو کر تقریباً تین گھنٹے سمندر پر پرواز کی۔ اور بالآخر پاکستانی وقت کے مطابق تقریباً ساڑھے تین بجے شام ملائیشیا کی حدود میں داخل ہو گیا۔ طیارے کی بلندی سے ملائیشیا کا حسین جزیرہ انتہائی دلکش محسوس ہو رہا تھا۔ اور خوشنما سبزے کی مخملیں فرش کے درمیان بل کھا کر سمندر میں گرتے ہوئے دریا انتہائی خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے کوالالمپور کا شہر نظر آنے لگا۔ اور چند ہی لمحوں میں طیارہ ہوائی اڈے پر اتر گیا۔

یہاں کا وقت پاکستان سے تین گھنٹے مقدم ہے۔ اس لیے یہاں اس وقت تقریباً ساڑھے چھ بجے تھے اور آفتاب غروب ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ شہر کے اندر جانے کا تو نہ پروگرام تھا نہ وقت، لیکن ہوائی اڈہ پر ہی ایک گھنٹہ گزارا۔ امریکی طرز کا الٹرا ماڈرن ایئرپورٹ تھا۔ نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت، جدید طرز کی مرصع دکانیں، ریسٹورنٹ، سب کچھ ایک نئے اسلامی ملک کو پہلی بار دیکھ کر دل میں محبت کے جذبات موجزن تھے۔ ملائیشیا کے مسلمانوں کے بارے میں تجربہ بھی ہوا اور مشہور بھی ہے کہ وہ بڑے سادہ دل اور نیک نفس لوگ ہوتے ہیں لیکن کم از کم ایئرپورٹ پر کوئی ایسے آثار نظر نہیں آئے جو ملک کی اسلامیت پر دلالت کرتے ہوں کاش کہ ہمارے مسلم ممالک کو اپنا اسلامی تشخص نمایاں کرنے اور اس پر فخر کرنے کا احساس ہو۔ ایئرپورٹ کسی ملک یا شہر کا دروازہ ہوتا ہے۔ اس دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک انسان کو محسوس ہونا چاہیے کہ وہ کسی مسلمان ملک میں آیا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ وہاں کوئی موزوں جگہ سرسری تلاش سے نظر نہ آئی، جہاز کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے واپس جہاز ہی میں آ کر نماز ادا کی۔

طیارے کی اگلی منزل سنگاپور تھی۔ اور کوالالمپور سے وہاں تک کا فاصلہ تقریباً پچاس منٹ میں طے ہو گیا۔ سنگاپور دراصل ملائیشیا ہی کا ایک حصہ تھا لیکن مغربی استعمار نے اس خطے کو آزادی دیتے وقت اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ بڑا حصہ ملایا یا ملائیشیا کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ لیکن ایک چھوٹا سا جزیرہ سنگاپور کے نام سے ایک مستقل ریاست بن گیا جس پر غیر مسلموں کی حکومت ہے اور یہاں کے باشندوں کی اکثریت چینی نژاد ہے۔

سنگاپور کے پاس بذات خود نہ زراعت ہے۔ نہ صنعت، لیکن فری پورٹ ہونے کی بنا پر وہ تجارت کا عظیم الشان مرکز ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ اپنے تمدنی حسن اور خوش انتظامی کے اعتبار سے یورپ کا کوئی ترقی یافتہ شہر معلوم ہوتا ہے۔ ایشیا کے جتنے شہر میں نے دیکھے ہیں۔ تمدنی آب و تاب کے لحاظ سے یہ ان سب پر فائق معلوم ہوتا ہے۔ پورا شہر خوبصورت سر بفلک عمارتوں سے آباد ہے۔ سڑکیں آئینے کی طرح شفاف، ٹریفک نہایت باقاعدہ اور منظم

آبادی گنجان اور گنجلک ہونے کی بجائے وسیع اور کشادہ، بحرِ ہند کا پانی شہر میں جگہ جگہ وسیع دریاؤں کی سی شکل میں گھس آیا ہے لیکن اس پہ کئی کئی منزلہ پلوں نے راستوں کو نہ صرف آسان بلکہ نہایت حسین بنا دیا ہے۔

یہ رات سنگاپور میں بسر ہوئی اور اگلی صبح پونے بارہ بجے سنگاپور ایر لائنز کے طیارے سے جکارتہ روانہ ہوئے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا بیشتر سفر سمندر پر ہوا اور کچھ دیر بعد انڈونیشیا کے چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ جاوا کا وسیع جزیرہ شروع ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جکارتہ کی آبادی نظر آنے لگی۔

جکارتہ کے ہوائی اڈہ پہ انڈونیشیا کے وزیر مذہبی امور اور دوسرے اعلیٰ احکام، سفیر پاکستان، سفارت خانہ کے دوسرے علے اور انڈونیشیا میں مقیم پاکستانیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے بڑی محبت اور گرمجوشی سے استقبال کیا۔ جکارتہ شہر میں داخل ہوتے وقت ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ڈھاکہ میں داخل ہو رہے ہوں۔ یہاں کی سرزمین، مکانات کا انداز، سرسبزی و شادابی، موسم لوگوں کے طرزِ بود و باش میں بنگال کی کافی شباہت ہے۔ فرق یہ ہے رئیس اور دوسرے وسائل نے جکارتہ کو تمدنی ترقی میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ برِصغیر کے کسی بھی شہر کو یہ بات میسر نہیں۔

انڈونیشیا بحرِ ہند کے جنوب مشرق اور آسٹریلیا کے شمال مغرب میں دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر ہے جو تقریباً تیرہ ہزار چھوٹے بڑے جزیروں پہ مشتمل ہے اور بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد دُنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس کا قدیم نام "نوسانشترا" (درمیانی جزیرہ) تھا، پہلی اور دوسری صدی عیسوی سے یہاں ہندو اور بدھ مذہب کے تاجروں کی آبادی تھی۔ جنہوں نے مختلف جزیروں میں اپنی ریاستیں قائم کی ہوئی تھیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد تقریباً چوتھی صدی سے سب سے پہلے جزیرہ سماٹرا اور پھر جاوا میں اسلام آیا۔ ہندوستان کی طرح ان دُور اُفتادہ جزائر میں بھی اسلام کی تبلیغ کرنے والے کچھ صوفیائے کرام تھے جنہوں نے اپنی خاموش اور پُرامن جدوجہد سے اس علاقے کو نہ صرف اسلام کا حلقہ بگوش بنایا بلکہ بالآخر یہاں مسلمانوں

کی حکومت قائم کی۔ ان حضرات میں شیخ عبداللہ عارفؒ ۔ حضرت مولانا ابراہیمؒ، حضرت رادن رحمتؒ، مخدوم ابراہیمؒ، شیخ فتح اللہؒ وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں ولندیزی تاجر اس علاقے میں پہنچے اور رفتہ رفتہ اپنی روایتی چالبازیوں سے اس علاقے کو اپنے استعمار کا نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ یہ تمام جزائر ایک ایک کرکے ان کے زیرِ نگیں آگئے۔ ولندیزی اقتدار کے زمانہ میں ان جزائر کو "جزائر شرق الہند" یا "ولندیزی شرق الہند" کہتے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں ایک جرمن ماہر نسلیات نے اسے "انڈونیشیا" کا نام دیا ہے۔ اس کی اصل یونانی زبان کا ایک مرکب لفظ ( ) ہے جس کے معنی ہیں "سمندر اور جزائر" چنانچہ ۱۹۲۱ء میں حریت پسندوں نے ایک قرارداد کے ذریعے "ولندیزی شرق الہند" کے بجائے "انڈونیشیا" کا نام اختیار کیا۔ اور آزادی کے بعد ملک کا یہی سرکاری نام قرار پایا۔

انڈونیشیا کے بے شمار جزائر میں سے جاوا، سماٹرا، مادورا، بنکا، بورنیو، سلاویسی، مالوکا، سونڈا وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ اور دار الحکومت جکارتہ، جزیرہ جاوا کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ چونکہ یہ جزائر خطِ استوا سے قریب ہیں۔ اس لیے یہاں گرمی اور بارشوں کی کثرت ہے۔ سردی کے موسم سے یہ خطہ ناآشنا ہے۔ یہاں گرمی اور برسات کے علاوہ کوئی تیسرا موسم نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں پنکھوں کا استعمال بہت کم ہے۔ جہاں ہم جیسے لوگ گرمی سے عرق عرق ہوجاتے۔ وہاں مقامی حضرات اطمینان سے بغیر پنکھوں کے بیٹھے رہتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کے عادی ہو جانے کے بعد ان حضرات کو پسینہ زیادہ نہیں آتا۔

انڈونیشیا بڑا سرسبز و شاداب اور زرخیز ملک ہے۔ تیل کے علاوہ ربر، ٹن، چائے، کافی، ساگوان اور انواع و اقسام کے پھل (جن میں سے بہت سے ہم جیسوں کے لیے بالکل نئے ہیں۔) یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ لوگ عام طور پر نرم خو، خوش اخلاق، متحمل مزاج اور بردبار ہیں۔ ایک ہفتے کے قیام کے دوران ہم نے کہیں دو آدمیوں کو لڑتے جھگڑتے یا مشتعل ہوتے نہیں دیکھا۔

انڈونیشیا کی تقریباً نوّے فیصد آبادی مسلمان ہے۔ اور باقی دس فیصد آبادی میں عیسائی، ہندو، بدھ، چین وغیرہ ہیں۔ لیکن جب ولندیزی استعمار کے خلاف یہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں ان تمام اقوام نے مشترک جدوجہد کی۔ اس وقت مسلم اور غیر مسلم آبادی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے پانچ اصول طے کیے گئے جو "پنچاشیلا" کے نام سے معروف ہیں۔ ان اصولوں کا بنیادی نکتہ باہمی مذہبی رواداری ہے۔ لیکن آزادی کے بعد "پنچاشیلا" کے اصولوں کو غیر مسلموں نے یہاں سیکولر حکومت قائم کرنے کے لیے استعمال کیا اور اس طرح یہاں اسلامی حکومت کی داعی اور سیکولرزم کی علمبردار جماعتوں میں آویزش شروع ہو گئی۔ مسجومی پارٹی نہضۃ العلماء اور الجماعۃ المحمدیہ یہاں کی مشہور دینی جماعتیں ہیں جو یہاں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ مسجومی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر ناصر کچھ عرصہ وزیر اعظم بھی رہے۔ لیکن صدر سوئیکارنو کے عہدِ حکومت میں جب کمیونسٹ پارٹی نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی تو جنرل سوہارتو کے زیر قیادت کمیونسٹ تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔ اس کے بعد جنرل سوہارتو نے زمام حکومت سنبھالی اور اب تک وہی ملک کے صدر ہیں۔

موجودہ حکومت نے کمیونسٹوں کے مقابلے کے لیے تو اسلامی جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کیا لیکن جب کمیونسٹوں پر قابو پا لیا تو اس کے بعد ملک میں خالص سیکولر حکومت قائم کی۔ اس وقت سے اسلامی جماعتوں اور موجودہ حکومت کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس وقت پارلیمنٹ کے ایوان میں نو سو سے زائد نشستیں ہیں جن میں صرف تین سو سے کچھ اُوپر نمائندے انتخابات کے ذریعہ ایوان میں آتے ہیں۔ اور باقی تقریباً چھ سو افراد نامزد ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت انتخابات میں سو فیصد کامیابی حاصل کرے۔ تب بھی وہ ایوان میں اکثریت حاصل نہیں کر سکتی۔ ابھی ابھی وہاں انتخابات ہوئے تو مسجومی پارٹی، نہضۃ العلماء، جماعتِ محمدیہ اور دینی جماعتوں کے حضرات نے متحدہ محاذ بنا کر انتخابات میں حصہ لیا۔ اس کے نتیجے میں اس متحدہ محاذ کو کل تراسی نشستیں حاصل ہوئیں؛ ان کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں زور زبردستی اور دھاندلی سے بھی برتے

پیمانے پر کام لیا گیا۔

اس صورتِ حال کی وجہ سے سیاسی سطح پر دینی جدوجہد انتہائی کمزور پڑ گئی ہے اور اس کے راستے بظاہر مسدود نظر آتے ہیں۔ اب دینی جماعتیں زیادہ تر تعلیم و تبلیغ کے کاموں میں مصروف ہیں۔

ہمارے ملک کی طرح انڈونیشیا میں بھی قدیم طرز کے دینی مدارس بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن ان کی اکثریت دیہات میں ہے۔ اور ہمیں کوشش کے باوجود انہیں دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہمارے دورے کا انتظام انڈونیشیا کی وزارتِ مذہبی امور نے کیا تھا۔ اور ایک ہفتے کے مختصر پروگرام میں زیادہ تر وہ انہی اداروں کا معائنہ کرا سکی جو حکومت کے زیرِ انتظام چل رہے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں وزارت مذہبی امور کے مختلف شعبے دکھائے گئے۔ اور بلاشبہ اس وزارت کا انتظامی معیار بڑا قابلِ تعریف ہے۔ خاص طور پر حج کا انتظام دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ یہاں حجاج کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر سال حکومت کی طرف سے حج کے اخراجات کی رقم کا اعلان ہوتا ہے۔ اور جو شخص بھی اتنے اخراجات برداشت کر سکے وہ حج کی درخواست دے سکتا ہے۔ اور اس کی درخواست لازماً منظور ہوتی ہے۔

وزارت کی طرف سے حجاج کے گروپ بنائے جاتے ہیں اور تمام حجاج کا سامان تک یکساں ہوتا ہے۔ جکارتہ میں "حج ہاسٹل" کے نام سے "حاجی کیمپ" جیسی شاندار عمارت قائم ہے جہاں اطراف ملک سے آئے ہوئے عازمینِ حج کے قیام کا انتظام ہے۔ اس عمارت کا ظاہری حسن، صفائی، ستھرائی اور انتظام نہایت معیاری ہے اور یہاں حجاج کے مختلف گروپوں کو تین دن تک مناسکِ حج کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والی دو اسلامی یونیورسٹیاں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے ایک جکارتہ میں ہے اور دوسری سورابایا میں، دونوں یونیورسٹیوں کا علمی معیار اچھا خاصا معلوم ہوا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ افسوس ہوا کہ دونوں جگہ نظامِ تعلیم مخلوط ہے۔ اس صورتِ حال سے خود یونیورسٹی کے بعض اساتذہ بھی ناخوش معلوم ہوتے تھے لیکن

اپنی اس رنجیدگی کا کوئی علاج فی الحال ان کے بس میں نہیں۔ ان اسلامی یونیورسٹیوں کو ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو یہ کہ یہاں طالبات کا لباس کافی ستر پوشش ہے۔ جبکہ عام تعلیمی اداروں میں طالبات کا عام لباس اسکرٹ ہے۔ لیکن جب احقر نے ایک یونیورسٹی کے ذمہ دار ترین فرد سے پوچھا کہ "اسلامی یونیورسٹی" میں مخلوط تعلیم کا کیا جواز ہے؟ تو انہوں نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ "یہ انڈونیشی اسلام ہے۔"

مشرقی جاوا کا صدر مقام سوارابایا ہے جو جاوا کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اور انڈونیشیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ ہمیں وہاں بھی لے جایا گیا، یہاں "نہضۃ العلماء" کے زیر اہتمام "خدیجہ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک لڑکیوں کی دینی تعلیم کا ادارہ قائم ہے۔ اس ادارے میں صرف طالبات پڑھتی ہیں۔ اور ان کے لیے دینی تعلیم کا خاصا معیاری نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔ یہاں طالبات کی بہت بڑی تعداد زیرِ تعلیم ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ "نہضۃ العلماء" کے زیرِ اہتمام چلنے والے اس ادارے میں بھی علمی دینی رنگ کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔

انڈونیشیا میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے باوجود اس وقت ایک سیکولر حکومت قائم ہے جس میں ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ضرور ہے لیکن حکومت کی سطح پر عوام کو اپنی زندگیاں اسلامی احکام کے مطابق ڈھالنے کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی تحریک نہیں بلکہ اس قسم کی تحریکات کو مملکت کے بنیادی اصول "پنچہ شیلا" کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے دینی اعتبار سے مملکت کی فضا حوصلہ افزا نہیں بلکہ حوصلہ شکن ہے۔ عیسائی مشنریوں کا کام اپنے عروج پر ہے۔ اور ملک کے بعض کلیدی مناصب عیسائیوں کے زیرِ اقتدار ہیں۔ تجارت میں چینی باشندوں کا تسلط ہے اور دینی، سیاسی جماعتیں مغلوب و بے دست و پا ہیں۔

ان تمام حوصلہ شکن حالات میں امید کی جو تابناک کرن نظر آتی ہے وہ یہاں کے عوام اور بالخصوص نوجوانوں کا دینی جذبہ ہے ایسے نامساعد حالات میں بھی مسجدوں کے اندر ایک

بڑی تعداد کمسن نوجوانوں کی نظر آتی ہے۔ اور اسے قدرت کا ایک غیبی کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ ملک کی ہر مسجد میں "شبان المسجد" کے نام سے نوجوانوں کی ایک دینی تنظیم قائم ہے جو نوجوانوں میں دین کا پیغام پھیلانے کے لیے بڑا مفید کردار انجام دے رہی ہے، حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس تنظیم کا کوئی مرکز یا صدر دفتر نہیں ہے نہ ملک گیر سطح پر اس کی کوئی مرکزی تنظیم ہے۔ اور بسا اوقات ایک مسجد کے "شبان" کا دوسری مسجد کے "شبان" سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوتا۔ بس ہر مسجد کے آس پاس بسنے والے اپنے محلے کی سطح تک خود بخود یہ تنظیم قائم کرلیتے ہیں۔ اور نمازوں کے بعد ان کے مختصر حلقے ہوتے ہیں جن میں دینی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ عموماً مسجد کے امام صاحب ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اور اس طرح یہ حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے۔ سابق مسجومی پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر ناصر نے ہماری آمد کی خبر سنی تو وہ خود ملاقات کے لیے ہمارے ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ "شبان المسجد" کی غیبی طاقت اس وقت ہماری امیدوں کا بڑا مرکز ہے۔ اس تنظیم کا کسی بھی ملک گیر جماعت سے کوئی رابطہ نہیں۔ اور ہمارے لیے اس بات کی توجیہ بہت مشکل ہے کہ مرکزیت کے فقدان کے باوجود ہر مسجد میں یہ حلقہ کس طرح قائم ہوگیا ہے؟ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ حلقہ ہر مسجد میں موجود ہے اور اس کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔

انڈونیشیا کے قیام کے دوران یہ بات بھی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی کہ قادیانی جماعت یہاں خاصی سرگرم ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی تبلیغ کالعدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام تو عوام بعض خواص کو بھی قادیانیوں کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اسلامی یونیورسٹی کی لائبریری میں قادیانی مصنفین کی کتابیں رکھی ہوئی نظر آئیں جن کے بارے میں لائبریرین کا کہنا یہ تھا کہ یہ لائبریری کو مفت فراہم کی گئی ہیں۔ لیکن قادیانیت کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ یہ مسلم تبلیغی جماعتوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ انگریزی زبان میں قادیانیوں کی حقیقت واضح کرنے والا لٹریچر انڈونیشیا پہنچایا جائے۔

جکارتہ کے علاوہ سورآبایا اور اس کے قریب ایک پہاڑی مقام باتو میں بھی جانا ہُوا لیکن مختصر سفر میں جاوا کے علاوہ انڈونیشیا کے کسی اور جزیرے میں جانے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ پانچ روز کے قیام کے بعد ہم ۷ جون کی شام کو جکارتہ سے سنگاپور روانہ ہوئے اور تقریباً ۴۸ گھنٹے سنگاپور میں قیام رہا۔ جو در اصل ملآیا کا ایک حصّہ تھا لیکن پھر ایک معاہدہ کے تحت وہ ملآیا سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اب خطِ استوا کے بالکل نیچے وہ ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست ہے۔ جس نے مختصر عرصہ میں معاشی طور پر حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ تجارتی اعتبار سے وہ ایشیا کی مصروف ترین بندرگاہ ہے۔ اور تمدنی حُسن کے لحاظ سے وہ یورپ اور امریکہ کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ اسّی فیصد باشندے چینی نژاد ہیں۔ تاہم مسلمانوں کی مساجد اور عبادات کا انتظام اچھا ہے۔ شہر کے وسط میں بنی ہوئی "سلطان مسجد" اپنے جمال، شکوہ اور صفائی ستھرائی کے انتظام میں بڑی معیاری مسجد ہے جسے دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ معلوم ہُوا کہ یہاں مساجد کے لیے چندہ نہیں کیا جاتا بلکہ مُسلمان سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے ایک معمولی حصّہ وضع کر کے اس سے سرکاری طور پر ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ سے مساجد کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔

آٹھ روز کے اس سفر میں جو تاثر احقر کے دل و دماغ پر محیط رہا وہ یہ تھا کہ دُنیا کے بہت سے مسلم ممالک ایسے ہیں جو مغربیت کے سیلاب میں اس بُری طرح بہہ چکے ہیں۔ کہ اب ان کے لیے واپسی سخت مشکل ہو گئی ہے۔ اور انہیں واپس لانے کے لیے پیغمبرانہ دعوت و عزیمت کا حوصلہ درکار ہے۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ اس برّصغیر میں دین کے جانثار خادموں کی جدّوجہد کا ثمرہ ہے کہ یہاں ابھی حالات حد سے نہیں گزرے۔ ہم اگر اخلاص، للّٰہیت، محنت اور دُوراندیشی سے کام لیں تو یہاں ابھی اس طوفان کو آسانی سے روکا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضرورت ہے دین کے ایسے مخلص اور جاں نثار خادموں کی جو اپنے آپ کو دعوت و تبلیغ کے لیے وقف کر دیں جن کے پیشِ نظر مال و دولت، جاہ و منصب شہرت یا اقتدار کا حصول نہ ہو بلکہ ان کی زندگی کا واحد مقصد عوام کی دینی تربیت ہو۔

تشویشناک یہ بات ہے کہ اس ضرورت کی طرف سے ہماری توجہ ہٹتی جارہی ہے اور اسی نسبت سے وہ بند رفتہ رفتہ ٹوٹ رہے ہیں جو ہمارے اکابر و اسلاف نے مغربیت کے سیلاب سے بچاؤ کے لیے لگائے تھے۔ اور جو اب تک واقعتاً اس طوفان کو روکے رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ہم نے اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ دے کر اپنی کوششوں کا رُخ صحیح نہ کیا تو خطرہ ہے کہ یہاں بھی وہ مناظر نظر نہ آنے لگیں جو بہت سے مسلم ممالک میں عام ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ روز بد نہ دکھائے۔ اور صدق و اخلاص للہیت اور ایثار کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔

بنگلہ دیش
میں چند دن

اگست سنہ ۱۹۸۰ء

(٦)

بنگلہ دیش میں چند دن

پچھلے مہینے مدرسہ قاسم العلوم سلہٹ کی دعوت پر ایک ہفتے کے لیے بنگلہ دیش جانا ہوا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اُس علاقے میں یہ احقر کا پہلا سفر تھا جو چودہ سال بعد پیش آیا۔ اس سفر کے لیے پاسپورٹ ویزے کے مراحل طے کرتے ہوئے اور پھر ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اُتر کر امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کی کارروائی انجام دیتے وقت دل پر جو کچھ گزری اس کے اظہار کے لیے الفاظ ملنے مشکل ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ایک مدت تک آمد و رفت کے امکانات مسدود رہنے کے بعد اب کم از کم اتنا تو ہو گیا ہے کہ اِدھر کے لوگ اُدھر کی صورتیں دیکھ سکیں۔

ڈھاکہ پہنچنے کے بعد دُنیا ہی بدلی ہوئی تھی، دس سال کے عرصے میں اِس خطے پر کیا کیا قیامتیں گزر گئیں، مصائب و آفات کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ گئے! اور کیا کیا انقلابات رُونما ہو گئے۔ بہت سی وہ بزرگ شخصیتیں بھی رخصت ہو چکی تھیں جن کی زیارت کا تصور بنگال کے سفر کو دلکش بنا دیتا تھا، جن لوگوں کو بچپن کی حالت میں دیکھا تھا وہ اب جوان نظر آئے۔ جو لوگ جوان اور چاق و چوبند نظر آتے تھے، وہ ضعف اور بڑھاپے کی سرحد پر دکھائی دیئے۔ پہلے مدارس کے ماحول میں ہر شخص یہ کہتا نظر آتا تھا کہ "میں آپ کے والد صاحب کا شاگرد ہوں" اور اب بیشتر حضرات یہ کہتے سنائی دیئے کہ ہم فلاں سن میں آپ کے ہم سبق رہے تھے یا آپ سے پڑھا تھا۔"

قیامِ بنگلہ دیش کے دوران مختلف حضرات سے ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد کی جو بے شمار

لرزہ خیز داستانیں سننے میں آئیں وہ اس تصور سے کہیں زائد تھیں جو اب تک ہم نے اس دور کے بارے میں قائم کیا ہوا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس سرزمین پر ظلم و ستم کے عفریت کا ننگا ناچ اتنے مختلف راستوں اور مختلف محرکات کے تحت ہوا ہے، اور اتنی مدت تک جاری رہا ہے کہ اس کی داستان انتہائی پیچ در پیچ ہے۔ اور اس کی ذمہ داری اتنے مختلف عناصر پر عائد ہوتی ہے کہ شاید اس دور کی صحیح تاریخ کبھی مرتب نہ ہو سکے، کیونکہ برصغیر کے کسی بھی ملک میں غیر جانبداری کے ساتھ ان واقعات کا جائزہ لینے کا حوصلہ نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ بنگال کے چپے چپے پر ظلم و جور کے اتنے ان گنت نقوش ثبت ہیں کہ ان کا احاطہ کسی کے بس کی بات نہیں، اور بس وہاں کے چشم دید واقعات و حالات سننے کے بعد یہ یقین اور مستحکم ہو گیا کہ وہاں جو قیامت ٹوٹی ہے وہ ہماری بداعمالیوں کی سزا تھی۔ اور نوّے ہزار مسلح افواج کی یہ ہزیمت جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، قدرت کی طرف سے ایک تازیانۂ عبرت کے سوا کچھ نہ تھی۔

۱۹۷۰ء کے انقلاب کے بعد ایک مدت تک یہ خطہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اب بفضلہ تعالیٰ سنبھل گیا ہے، ملک کی سیاسی اور معاشی ابتری اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ اور صدر ضیاء الرحمن کی حکومت کے بعد حالات میں کافی سدھار پیدا ہوا ہے، جنگ کے دوران اور اس کے بعد جو ہمہ گیر تباہی مچی تھی اس کے اثرات اب ختم ہو چکے ہیں۔ وہ قیامت خیز گرانی اب باقی نہیں رہی جس نے اچھے اچھوں کی کمر توڑ دی تھی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھ جیسے نووارد کے لیے حیرت و عبرت کے اب بھی بے شمار سامان موجود ہیں۔ گرانی اب بھی پاکستان کے مقابلے میں ہوش رُبا حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ احقر کو جن ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے ان میں بنگلہ دیش واحد ملک ہے جہاں پہنچ کر پاکستانی کرنسی کی قیمت بڑھی ہوئی نظر آئی، جب عام بازار میں بنگلہ دیشی روپے کی قیمت پاکستانی روپے کے مقابلے میں تقریباً نصف ہو تو گرانی کا اندازہ خود بخود کیا جا سکتا ہے۔ نظم و ضبط اور امن و امان کی صورت حال سقوط ڈھاکہ کے بعد کئی سال تو بالکل مفقود رہی اب بحمد اللہ وہ کیفیت نہیں ہے، لیکن اس معاملے میں اب بھی لوگ دس سال پہلے کے دور کو یاد کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۷۱ء کے بعد کئی سال تک تو یہ کیفیت رہی کہ علی الاعلان دین کی کوئی بات کرنا ناممکن سا تھا لیکن اب بحمد اللہ وہ صورتِ حال مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے، دینی حلقے از سرِ نو سرگرم ہو گئے ہیں۔ بلکہ اب رفتہ رفتہ ملک میں نفاذِ شریعت کے مطالبات بھی آزادی کے ساتھ اُٹھنے لگے ہیں؛ دینی مدارس ایک عرصے تک ویران رہنے کے بعد پھر آباد ہو چکے ہیں اور حسبِ سابق اُن کی رونق بحال ہو چکی ہے، جگہ جگہ پہلے کی طرح دینی اجتماعات ہوتے ہیں اور ان میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہے۔ تجارت کے معاملے میں ہندوستان پر انحصار قریب قریب ختم ہو چکا ہے، اور دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارتی روابط بھارت کے مقابلے میں زیادہ ہو گئے ہیں۔

یہ تمام تبدیلیاں بحمد اللہ خوش آئند ہیں؛ اور ملک کو سیاسی استحکام نصیب رہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ ان شاء اللہ رفتہ رفتہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو سکے گا۔

سرکاری سطح پر دینی سرگرمیاں اگرچہ ابھی برائے نام ہی ہیں، لیکن قیامِ بنگلہ دیش کے ابتدائی دَور کے مقابلے میں صورتِ حال بہت غنیمت ہے، حکومت کی طرف سے ایک اشاعتی ادارہ "اسلامک فاؤنڈیشن" کے نام سے قائم ہے جس کا مرکزی دفتر ڈھاکہ میں مسجد بیت المکرم کے قریب واقع ہے، اور شاخیں مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ادارہ پاکستان کے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن گزشتہ ایک سال کے دوران اس نے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اشاعتی کام کیا ہے، صرف اس ایک سال میں اس ادارے نے اسلامی موضوعات پر چار سو سے زائد کتابیں بنگلہ اور انگریزی میں شائع کی ہیں، جو سرکاری اداروں کی عام رفتارِ کار کے لحاظ سے محیرّ العقول تعداد ہے۔

اسی ادارے نے ایک گراں قدر کام یہ کیا ہے کہ معارف القرآن کا بنگلہ ترجمہ شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے محترم دوست اور بھائی مولانا محی الدین خاں صاحب ایڈیٹر "مدینہ"

بڑی لگن اور محنت، مستعدی، اور قابلیت کے ساتھ یہ ترجمہ کر رہے ہیں، اور اس کراماتی رفتار سے کر رہے ہیں کہ سال بھر کی مختصر مدت میں پانچ جلدوں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے، ان میں ایک جلد چھپ کر تیار ہو چکی ہے، اور دوسری جلد زیرِ طبع ہے، ڈھاکہ ایرپورٹ پر اترنے کے بعد پہلا تحفہ جو احقر کو ملا وہ بنگلہ معارف القرآن کی پہلی جلد تھی۔

اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل بڑے جذبے کے پُرجوش مسلمان ہیں، انہوں نے احقر کے قیام ڈھاکہ کے دوران اسلامک فاؤنڈیشن کے ہال میں بنگلہ معارف القرآن جلدِ اوّل کی تقریبِ رُونمائی منعقد کی، اس تقریب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سراج الحق صاحب کو بطورِ صدر اور احقر کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا، شہر کے علماء، دانشور اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب خاصی تعداد میں موجود تھے، سات، آٹھ مقررین نے معارف القرآن کے تعارف میں تقریریں کیں، جن میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سراج الحق صاحب، مدرسہ عالیہ کے حضرت مولانا عُبید الحق صاحب اور دُوسرے اہلِ علم و فکر شامل تھے، احقر نے بھی تقریباً ایک گھنٹہ اس محفل سے خطاب کیا، اس تقریر کا کچھ حصّہ ڈھاکہ ریڈیو سے بھی نشر ہُوا۔ اور بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد شاید یہ پہلی اُردو تقریر تھی جو ڈھاکہ ریڈیو سے نشر ہوئی۔ واللہ اعلم

ترجمے کے بارے میں اہلِ علم و دانش کا مجموعی تأثر یہ تھا کہ وہ اپنی صحت اور سلاست کے اعتبار سے معیاری ترجمہ ہے، اور اس نے بنگلہ زبان کے ایک بڑے خلا کو پُر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مترجم موصوف کو مزید توفیق سے نوازیں اور تفسیر کی باقی ماندہ جلدیں بھی جلد منظرِ عام پر آجائیں۔ آمین!

بنگلہ دیش کے اس سفر کے پانچ دن سلہٹ میں اور تین دن ڈھاکہ میں گذرے۔ چاٹگام اور بعض دُوسرے مقامات کے حضرات کی طرف سے بھی اصرار تھا کہ وہاں حاضری ہو، لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف انہی دو شہروں میں جانا ہو سکا۔ اس دوران تقریباً بیس پچیس چھوٹے بڑے اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا، سلہٹ کا مدرسہ قاسم العلوم اس سفر کا اصل داعی تھا۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر سلہٹ

تشریف لے جایا کرتے تھے اور وہاں حضرت شاہ جلال صاحب مجرد یمنی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے قریب جو مسجد درگاہ مسجد کے نام سے معروف ہے، اُس کے امام حضرت مولانا اکبر علی صاحب مدظلہم نے حضرت والد صاحبؒ ہی کی فرمائش پر چند سال پہلے یہاں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی، شروع میں یہ ایک چھوٹا سا مکتب تھا، لیکن رفتہ رفتہ بفضلہ تعالیٰ اس نے ایک بڑے مدرسے کی شکل اختیار کر لی اور یہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دُعاؤں اور حضرت مولانا اکبر علی صاحب کے خلوص اور جدو جہد کی برکت ہے کہ آج یہ مدرسہ بنگلہ دیش کے ممتاز دینی مدارس میں شمار ہوتا ہے، حضرت مولانا اکبر علی صاحب ان بزرگوں میں سے ہیں، جن کی بغایت سادہ، متواضع، فنا فی اللہ، مگر شگفتہ و معصوم شخصیت کی مثالیں اس دور میں خال خال ہی ملیں گی، اُن کے سوز دروں نے اس مدرسے کو مختصر مدت میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اس مدرسے میں متعدد خصوصی اجتماعات اور ایک عام جلسے سے خطاب کا موقع ملا۔ سلہٹ کے ایک اور مدرسے میں بھی حاضری ہوئی اور وہاں بھی کچھ معروضات پیش کی گئیں۔

اس کے علاوہ سلہٹ کی بار کونسل، میڈیکل کالج ہوسٹل اور اسلامک فاؤنڈیشن میں بھی خطابات کا موقع ملا۔ سلہٹ کافی عرصے سے بزرگوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ اسے اوّل تو حضرت شاہ جلال صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی برکات حاصل ہیں جو اس علاقے کے صوری اور معنوی فاتح ہیں، پھر یہاں کے حضرات کے دینی ذوق و شوق نے ہمیشہ بزرگوں کیلئے اس خطے میں کشش رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد سہول صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مدت تک یہاں مقیم رہے، جس کے اثرات محسوس ہوتے ہیں، پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ مدتِ دراز تک رمضان المبارک یہیں گذارتے رہے۔ آپ کے فیوض یہاں چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب قدس سرہ تقریباً ہر سال یہاں تشریف لاتے اور طویل عرصے تک مقیم رہتے۔ آپ کے پھیلائے ہوئے فیوض و انوار بھی یہاں محسوس و مُشاہَد ہیں۔ اب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم یہاں تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ان تمام بزرگوں کی خصوصی

توجہات کا یہ اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے شہروں کے مقابلے میں تدین کا معیار بلند ہے، لوگوں میں دین کا خاص ذوق و شوق پایا جاتا ہے، بے پردگی عریانی اور بے دینی کے دوسرے اثرات بہت کم پائے جاتے ہیں، قدرت نے اس علاقے کو اس معنوی حسن کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی نوازا ہے۔ پورا شہر دریائے سُرما کے دونوں طرف سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے اور اکثر شہر میں چلتے وقت انسان یہ محسوس کرتا ہے جیسے کسی باغ میں چل رہا ہو، اس لیے سلہٹ کا قیام ہمیشہ احقر کے لیے بڑا پُر کیف اور پُر سکون رہا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہ کیف و سرور پوری طرح حاصل رہا البتہ یہ کسک دل سے کسی وقت نہیں گئی کہ پہلے یہاں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حاضری ہوتی تھی، اور اس مرتبہ تنہا ہوئی، اور پہلے یہاں ایک ملکی باشندے کی حیثیت سے آنا ہوتا تھا اور اب غیر ملکی ہونے کی حیثیت سے۔ لیکن کلمۂ طیبہ کے رشتے نے تمام مسلمانوں کو محبت و اُخوت کے جس رشتے میں منسلک کیا ہوا ہے، سچی بات یہ ہے کہ اس نے اس انقلاب کا احساس نہیں ہونے دیا، وہاں کے حضرات جس خلوص و محبت اور گرم جوشی کے ساتھ پیش آئے، وہ پہلے سے بھی زیادہ تھی۔

آخری تین دن ڈھاکہ میں گذرے اور وہاں جامعہ قرآنیہ لال باغ، مدرسہ نوریہ اور فرید آباد کے مدرسوں میں حاضری ہوئی، اسی دوران اسلامک فاؤنڈیشن کی تقریب منعقد ہوئی، انجینیرنگ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ بھی ایک خصوصی نشست رہی، بہت سے بچھڑے ہوئے احباب سالہا سال کے بعد ملے، اور قیام ڈھاکہ کی سب سے بڑی سعادت حضرت مولانا حافظ محمد اللہ صاحب مدظلہم کی زیارت و صحبت تھی، جو اب اس علاقے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے واحد خلیفہ ہیں اور بفضلہ تعالیٰ آپ کی دعوت و ارشاد فیض پورے بنگلہ دیش میں پھیل رہا ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک پُر فضا جزیرے کمرنگی چر میں آپ نے جو مدرسہ نوریہ قائم فرمایا ہے وہ رفتہ رفتہ ایک عظیم مرکزِ فیض بنتا جا رہا ہے۔ اس مدرسے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ساتھ ساتھ ایک آباد خانقاہ بھی ہے، اور اطرافِ ملک سے تشنگانِ معرفت اس میں حاضر

ہو کر فیضیاب ہوتے ہیں۔ آج کل اس مدرسے کے مہتمم حضرت مدظلہم کے صاحبزادے برادرِ عزیز و محترم مولانا حمید اللہ صاحب ہیں جو ایک مدت تک دارالعلوم کراچی میں زیرِ تعلیم رہے ہیں، اور اب ماشاء اللہ بڑی قابلیت کے ساتھ مدرسے کے تدریسی اور انتظامی اُمور سنبھالے ہوئے ہیں، زادہ اللہ علماً و عملاً و صلاحاً!

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے محترم بزرگ مولانا مفتی محی الدین صاحب مُفتی مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ کا ذکرِ خیر نہ کروں، آپ کی شفقت و عنایت کا حال یہ ہے کہ احقر کے ڈھاکہ ایرپورٹ پر اُترنے کے وقت سے لے کر واپسی تک ایک لمحے کے لیے بھی گھر تشریف نہیں لے گئے، اور مسلسل اِس ناکارہ کے ساتھ رہے۔ ان کی صحبت کو میں ایک عظیم نعمت سمجھتا ہوں جو بغیر کسی محنت کے اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو تا دیر بعافیت سلامت رکھے، اور ہمیں ان کے فیوض سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

قطر سیرت کانفرنس

محرّم سنہ ۱۴۰۰ھ نومبر سنہ ۱۹۷۹ء

(۷)

قطر سیرت کانفرنس

پچھلے مہینے قطر کے محکمہ اُمورِ مذہبی کی طرف سے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں راقم الحروف کو بھی شرکت کا اتفاق ہوا ــــ تقریباً چار سال قبل اِس نوعیت کی پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس حکومت پاکستان نے کراچی میں منعقد کی تھی، اس موقع پر اتفاقِ رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی تھی کہ ہر سال کوئی ایک اسلامی ملک سیرتِ طیبہ کے موضوع پر اسی نوعیت کا عالمی اجتماع منعقد کیا کرے۔ چنانچہ دوسرا اجتماع ترکی میں ہُوا تھا اور قطر کی یہ کانفرنس اس سلسلے کی تیسری کڑی تھی۔

جزیرۂ عرب کے نقشے پر نظر ڈالیں تو اس کے مشرقی کنارے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ نما خلیج فارس میں ٹنکا نظر آتا ہے، یہ جزیرہ نما قطر کے نام سے موسوم ہے اور جزیرہ عرب ہی کا ایک حصہ ہے جسے عہدِ رسالت میں حضرت علاء بن الحضرمی رضؓ نے اسلام کی روشنی سے منور کیا تھا اور یہ ان خوش نصیب خطوں میں سے ہے جسے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ نگیں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ دو لاکھ آبادی اور تقریباً بارہ ہزار مربع میل کی یہ ریاست ابتدائً سعودی عرب ہی کا ایک پس ماندہ حصہ تھی، لیکن تیل کی دریافت کے بعد اس نے مستقل حکومت کی شکل اختیار کر لی اور اب یہاں تیل کے "زرِ سیّال" کی بدولت جدید تمدن کے تمام مظاہر آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

تیسری عالمی سیرت کانفرنس اسی ریاست کے دار الحکومت دوحہ میں منعقد ہوئی جسے اُردو میں دوہا بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اِس کانفرنس میں دُنیا کے اکیاون (۵۱) ملکوں

سے دو سو مندوبین کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اور اس لحاظ سے یہ ایک مثالی کانفرنس تھی کہ بیشتر ملکوں سے وہاں کے چوٹی کے اہل علم و دانش نے اس میں حصہ لیا۔ دو سو مندوبین میں سے خاص طور پر جن حضرات کے اسمائے گرامی اس وقت یاد آرہے ہیں، اُن میں اُردن سے شیخ مصطفےٰ الزرقاء، سعودی عرب سے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ عبدالمحسن العباد، شیخ محمد المبارک، ڈاکٹر معروف الدوالیبی اور شیخ محمد علی الحرکان، کویت سے شیخ یوسف

القرضاوی، شیخ یوسف ہاشم الرفاعی، شیخ عبداللہ العلی المطوع، ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مراکش سے استاذ عمر بہاالامیری، شیخ عبداللہ بن کنون، ابوظبی سے شیخ عبدالعزیز المبارک، شام سے ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، مصر سے شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ محمد نجیب المطیعی، تیونس سے شیخ محمد الحبیب بلخوجہ اور استاذ مصطفےٰ کمال التارزی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شرکا کی ایک بڑی تعداد نے اپنے مقالوں کی تیاری میں محنت سے کام لیا اور بعض قابلِ قدر علمی تحقیقات پیش کیں، ورنہ آجکل کی کانفرنسوں میں یہ پہلو بھی کمزور ہونے لگا ہے۔ کانفرنس کا اصل موضوع اگرچہ سیرت طیبہ تھا، لیکن اس میں سنت و حدیث کی تشریعی حیثیت کو بھی شامل کر لیا گیا تھا چنانچہ اس موضوع پر اعلیٰ درجے کے علمی مقالے اس میں پیش کئے گئے، جو اس موضوع کے لٹریچر میں عمدہ اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کانفرنس کا حُسنِ انتظام بھی بلاشبہ قابلِ تعریف تھا، اور سارے ہی مندوبین کو اس پہلو سے رطب اللسان پایا گیا۔

لیکن اس قسم کی عالمی کانفرنسوں کا ایک پہلو جو ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، یہ ہے کہ ان میں علمی اعتبار سے خواہ کتنے بلند پایہ مقالے پڑھے جائیں اور کتنی زوردار قراردادیں منظور کی جائیں، عمل کی دُنیا میں ان کا کوئی اثر کبھی ظاہر نہیں ہوتا اور نہ حاضرین کو اس

کام کی طرف کوئی خاطرخواہ توجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم العالی نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ـــــ جو ولی عہد ریاست قطر کے زیرِصدارت منعقد ہو رہا تھا ـــــ وفود کی طرف سے جو اثر انگیز تقریر فرمائی، اُس میں نہایت دردمندی، دل سوزی، حکمت اور بلاغت کے ساتھ اس پہلو کی طرف توجہ دلائی جس نے تمام حاضرین کو بے حد متاثر کیا۔

احقر کو بھی اس کانفرنس میں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ" کے موضوع پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا تھا، اور میں نے اس موضوع پر ایک مقالہ تقریباً تیار کر بھی لیا تھا، لیکن طبیعت پر یہ پہلو اس قدر غالب ہوا کہ اس مقالے کو پیش کرنے کے بجائے احقر نے ایک اور مختصر تقریر تیار کر کے پیش کی۔ ذیل میں اِس تقریر کا متن اور ترجمہ پیشِ خدمت ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین، وعلی من تبعھم باحسان الی یوم الدین

وبعد، فایھا السادۃ الافاضل!

انی لا ارید ان اقرأ بحثاً، فان البحوث العلمیۃ قد کثرت ولا ان القی کلمۃ، فان الکلمات القیمۃ قد القیت، والحمد للہ۔ ونستطیع ان نقتبس من خلالھا ما یفیدنا فوائد و ینفعنا منافع علمیۃ۔

ولکنی ارید ان الفت الانظار الی نقطۃ ھامّۃ ربّما تغیب عن اعیننا رغم کونھا ظاھرۃ بدیھیۃ:

وذٰلک اننا نؤمن جمیعا، والحمد للہ، بانّ ھذہ الثورۃ الأمنۃ الاسلامیۃ التی احدثھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما حدث

باتباع سنته وسيرته عليه السلام فى عبادته وخلقه، ومعاملاته ومعاشرته، وفى سائر نواحى الحياة. ومما نتفق عليه ايضا اننا لا يمكن لنا اعادة ذلك الماضى المجيد من العزة والكرامة، والرقى والازدهار الا بالرجوع الى سيرته صلى الله عليه وسلم مرة اخرى.

فهذا ما نعتقده جميعا ونؤمن به. ولكن السؤال المهم ههنا: لماذا لا نقطف ثمرات هذا الايمان؟ مع ان الصحابة رضى الله عنهم بلغوا به ذروة المجد والكمال؟ فاذا درسنا هذا الموضوع فى حياة الصحابة رضى الله عنهم رأينا ان ايمانهم بهذه الحقيقة لم يكن ايمانا عقليا او نظريا فحسب، وانما كان ايمانا قلبيا وطبعيا يعضده حبهم العميق لله ولرسوله، فلم يكن يعجبهم الا هدى الرسول صلى الله عليه وسلم فى حياته ومعاشرته وخلقه وسيرته، وعبادته ومعاملته، حتى وفى صورته وزيه. وكانت ميزة اتباعهم لسنة الرسول صلى الله عليه وسلم انهم لم يخافوا فيه لومة لائم ولا انكار منكر، ولم يحتفلوا ابدا لسخرية الكفار واستهزاء الاجانب او استخفاف المشركين بل ثبتوا على السنة النبوية حبا لهم اياها. واعتقادا جازما منهم بانه لا خير فى غيرها، ولم يتركوها ارضاء للمشركين او مداراة للكفار او استمالة لقلوب الاجانب حتى وفى اشياء نعدها اليوم بسيطة جدا.

فقد اخرج ابن ابى شيبة وغيره عن اياس بن سلمة عن ابيه فى قصة طويلة انه لما خرج عثمان بن عفان رضى الله عنه رسولا الى اهل مكة يوم الحديبية جاء عسكرا لمشركين فعبثوا به واساءوا له القول، ثم اجاره ابان بن سعيد بن العاص ابن عمه وحمله على السرج وردفه، فلما قدم قال يا ابن عم! مالى اراك متخشعا؟

اسبل ربعني ازارك، وكان ازاره الى نصف ساقيه" — ولاشك انه كان فى هذه المشورة بعض المصلحة فى الظاهر، ولكن لم يرض بذلك عثمان رضى الله عنه وانما اجابهم بقوله: "هكذا ازارة صاحبنا" (صلى الله عليه وسلم) (كنز العمال ۸: ۵٦)

واخرج ابونعيم وابن منده عن جثامة بن مساحق الكنانى رضى الله عنه وكان عمرؓ قد بعثه رسولا الى هرقل، قال: جلست فلم ادرما تحتى؟ فاذا تحتى كرسى من ذهب، فلما رأيت نزلت عنه فضحك، فقال لى: لم نزلت عن هذا الذى اكرمناك به؟ فقلت: انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهى عن مثل هذا. (كنز العمال ۷: ۱۵ والاصابة ۱: ۲۲۸)

فالحديث عن مثل هذه الاخبار طويل، وتاريخنا مفعم بهذه النماذج الطيبة لاتباع النبى الكريم صلى الله عليه وسلم والذى يتحصل من امثال هذه القصص هو ان الصحابة رضى الله عنهم قد اتبعوا النبى الكريم صلى الله عليه وسلم اتباعا كاملا لامدخل فيه للهوى، ولا للتحريف، ولا للخوف من الاجانب، ولا للمبالاة باستهزاء الكفار والمشركين.

وأمّا نحن، فمع ايماننا بان سيرته صلى الله عليه وسلم خير سيرة نفرق بين سننه عليه السلام، فنختار منها ما نهواه، ونترك اخرى قائلين مرة بانها سنة عادية لايجب علينا اتباعها، كاننا وجدنا عادة خيرا من عادته صلى الله عليه وسلم فاتبعناها، والعياذ بالله، وتارة بانها سنة تخالف المصلحة فى ظروفنا الحاضرة، واخرى بانها كانت مشروعة فى وقته صلى الله عليه وسلم وليست مشروعة فى عهدنا.

فامثال هذه التاويلات التى نرتكبها فى حياتنا ليلا ونهارا، انما تدل على ان ايماننا لسنة الرسول صلى الله عليه وسلم ينقصه الحبّ وهذا هو الفرق العظيم البيّن بين ايماننا وايمان الصحابة رضى الله عنهم، فلو كنا نريد ان نلقى تلك العزة والكرامة وذلك الرقى والازدهار الذى صار نصيب المسلمين فى القرون الاولى بسبب اتباع السنة النبوية على صاحبها السلام، فلابدلنا ان نتبعه صلى الله عليه وسلم كما اتّبعه الصّحابة والتابعون من غير تحريف وتمويه، ومن غير ارضاء لما تهوى النفوس، ومن غير خوف من استهزاء الاجانب ـــ فوالله ليس العزّ فى الابنية الشامخة، ولا فى القصور العالية، ولا فى الملابس الفاخرة وانما العزّ فى اتباع النبى الكريم عليه الصلوات والسلام الذى كان يجوع يوما ويشبع يوما، والذى كان ينام على الحصير ويربط على بطنه الاحجار، ويحفر الخندق، ويحمل بيده الشريفة اللبنات لبناء المسجد، فلاعزّ لنا الا بالاصطباغ التام فى صبغته صلى الله عليه وسلم فى كل شئ.

وان هذا المؤتمر الحاشد المبارك الذى جمع اهل العلم والفكر من مشارق الارض ومغاربها، ليقتضى منا ان نحاسب انفسنا على هذا الطريق، وان نضع للمسلمين مخططا يغرس فى قلوبهم الحبّ العميق للسنة النبوية على صاحبها السّلام، حتى لاتغرهم الاهواء ولا النظريات الاجنبية الفاسدة.

فأقترح ان يتخذ هذا المؤتمر توصيات تالية بكل عزم واخلاص:

١ـ يوصى هذا المؤتمر جميع المسلمين عامة وجميع اهل العلم والفكر ودعاة الاسلام خاصة ان يهتمّوا اهتماما بالغا بالاتباع

التام للسيرة والسنة النبوية على صاحبها السلام فی حیاتهم ومعيشتهم بما يجعل حياتهم انموذجا عمليا صالحا للسنة النبوية۔

۲۔ یوصی هذا المؤتمر جميع المسلمين فی کل زمان ومکان ان يعين کل احدهم وقتا، ولو نصف ساعة، کل یوم لدراسة السيرة النبوية على صاحبها السلام، یدرسها بنفسه ویقرأها على اعضاء اسرته، ویحاسب نفسه کم عمل باحکامها؟

۳۔ یقترح هذا المؤتمر من الحکومات الاسلامية ان يجعلوا السيرة النبوية مادة اجبارية من مواد التعليم فی کل مرحلة من مراحل الدراسة فی المدارس والکليات والجامعات، وان يعينوا وقتاً صالحا تعلم فيه السيرة والسنة النبوية على الاذاعات کل یوم۔

٤۔ یوصی هذا المؤتمر اهل العلم والفکر ان يهتموا بنشر السيرة النبوية فيما بين الشعب والعامة بما يسهل لهم فهمها، سواء کان کتابة اوخطابة، وان لا يطبّقوا القرآن والسنة على النظريات الاجنبية الحديثة بما يؤدی الى التحریف بل يجعلوا السيرة النبوية کما هی، اسوة لحل مشاکل المسلمين فی جميع شئون الحياة۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حمد و صلوٰۃ کے بعد!

معزّز حضرات!

میں اس وقت کوئی مقالہ پڑھنا نہیں چاہتا، کیونکہ علمی مقالات بہت ہو چکے، نہ میں کوئی تقریر کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ بحمد اللہ گراں قدر تقریریں بھی کافی ہو چکیں۔ اور ہم انشاء اللہ ان مقالات اور تقریروں سے بہت سے علمی فوائد حاصل کر سکیں گے۔

اس کے بجائے میں صرف ایک اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ظاہر بلکہ بدیہی ہونے کے باوجود اکثر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی نادر علمی تحقیق نہیں ہے جو ممتاز علماء کے سامنے پیش کی جا رہی ہو، کیونکہ میں اس کا اہل ہی نہیں، بلکہ دراصل یہ ایک ایسی حقیقت کی یاد دہانی ہے جسے ہم اس جیسی کانفرنسوں کے موقع پر بعض اوقات فراموش کر دیتے ہیں۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ بحمد اللہ ہم سب کا اس بات پر ایمان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا میں جو پُر امن اسلامی انقلاب برپا کیا، وہ صرف اس طرح رُونما ہوسکا کہ لوگوں نے عبادات و اخلاق سے لے کر معاملات و معاشرت تک ہر شعبۂ زندگی میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سنّت کی پیروی کا اہتمام کیا۔ اسی طرح اس پر بھی ہم سب کا اتفاق ہے کہ ہمارے تابناک ماضی میں ہمیں جو عزّت و کرامت اور ترقی و خوشحالی نصیب ہوئی اُسے دوبارہ واپس لانے کا واحد طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم ایک بار پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی طرف رجوع کر کے اس کا حقیقی اتباع کریں۔

یہ وہ بات ہے جس پر ہم سب ایمان و اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن یہاں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس ایمان و اعتقاد کا کوئی پھل کیوں نہیں مل رہا؟ حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسی ایمان و اعتقاد کی بدولت عزّت و کرامت کے بامِ عروج تک پہنچ گئے تھے؟ جب ہم اس موضوع کا مطالعہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں کرتے ہیں تو

ہمیں نظر آتا ہے کہ دراصل اس حقیقت پر اُن کا یہ ایمان محض عقلی یا نظریاتی ایمان نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا طبعی ایمان تھا جس کی جڑیں ان کے دلوں میں مستحکم تھیں، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی گہری عقیدت و محبت اس ایمان کی آبیاری کرتی رہتی تھی، چنانچہ معیشت و معاشرت، سیرت و اخلاق عبادات و معاملات، یہاں تک کہ شکل و صورت اور لباس و وضع تک زندگی کے ہر شعبے میں انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریق کے سوا کوئی اور طریقہ بھاتا ہی نہیں تھا، ان کے اتباعِ سنّت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اس معاملے میں نہ کبھی کسی کی ملامت کی پروا کی، نہ کسی تردید و تنقید کو خاطر میں لائے، اور نہ کبھی غیروں کے تمسخر و استہزاء کا کوئی اثر قبول کیا۔ انھوں نے کبھی غیر مسلموں کو خوش کرنے یا اُن کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سنت کو بھی چھوڑنا گوارا نہیں کیا:۔

مصنّف ابن ابی شیبہؒ میں روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمانؓ بن عفان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی بن کر اہلِ مکہ کے پاس تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ کے ساتھ استہزاء اور بدکلامی کا معاملہ کیا، بعد میں حضرت عثمانؓ کے چچازاد بھائی ابان بن سعید نے انھیں پناہ دی اور اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر لے گئے۔ حضرت عثمانؓ کا زیر جامہ (سنت کے مطابق) آدھی پنڈلی تک تھا (جسے سرداران قریش معیوب سمجھتے تھے) چنانچہ ان کے چچازاد بھائی نے کہا کہ بھائی! آپ اتنے متواضع کیوں نظر آرہے ہیں؟ آپ اپنے زیر جامہ کو ذرا نیچا کر لیجئے (تاکہ سردارانِ قریش آپ کو حقیر نہ سمجھیں) —— بظاہر یہ مشورہ خیر خواہی اور مصلحت پر مبنی تھا لیکن حضرت عثمانؓ اس پر راضی نہ ہوئے، بلکہ جواب میں فرمایا —— "ہمارے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زیر جامہ ایسا ہی ہے" (لہٰذا میں اس طریقے کو چھوڑ نہیں سکتا)۔ (کنز العمال ۸: ۵۶)

اسی طرح حافظ ابو نعیمؒ اور حافظ ابن مندہؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت

جثامہ بن مساحق کنانی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمرؓ نے ہرقل شاہِ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تھا، وہ ہرقل کے دربار کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "میں بے خیالی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اور مجھے پتہ نہ چل سکا کہ میرے نیچے کیا چیز ہے؟ اچانک میں نے دیکھا کہ میں سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوں، جب میری نظر اُس پر پڑی تو میں اس سے اُتر گیا، ہرقل یہ دیکھ کر ہنسا اور کہنے لگا: "ہم نے تو اس کرسی پر بٹھا کر تمہارا اعزاز کیا تھا، تم اُتر کیوں گئے؟" میں نے جواب میں کہا کہ "میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ اس جیسی کرسی کے استعمال سے منع فرماتے تھے" کنز العمال ۷: ۱۵ - اور اصابہ ۱: ۲۲۷)

اِس قسم کے واقعات بے شمار ہیں اور ہماری تاریخ اتباعِ سنت کی ایسی پاکیزہ مثالوں سے لبریز ہے لیکن ان جیسے واقعات سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی مکمل پیروی کرکے دکھائی، جس میں نہ خواہشات کا کوئی دخل تھا، نہ تحریف و تاویل کا، نہ غیروں سے ڈرنے کی فکر تھی اور نہ کفار و مشرکین کے تمسخر و استہزاء کا کوئی خیال

اِس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ اگرچہ زبانی طور پر ہمارا ایمان یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ روئے زمین پر سب سے بہتر سیرت ہے لیکن عملاً ہم نے آپ کی سُنتوں میں یہ فرق شروع کر دیا ہے کہ جو سُنت طبیعت کے موافق ہو اُسے تو اختیار کر لیتے ہیں، لیکن جن سُنتوں پر عمل کرنے کے لیے طبیعت آمادہ نہ ہو انھیں کبھی یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ تو آپ کی سُنتِ عادیہ ہے جس کا اتباع ہم پر واجب نہیں، گویا معاذ اللہ ہمیں آپؐ کی عادت سے بہتر کوئی عادت مل گئی ہے، جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے، اور کبھی ترکِ سنت کے لیے یہ بہانہ بنا دیتے ہیں کہ فلاں سنت ہمارے موجودہ حالات کے لحاظ سے مصلحت کے مطابق نہیں ہے اور کبھی یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ سنت آپؐ کے عہدِ مبارک میں تو مشروع تھی، لیکن ہمارے زمانے میں مشروع نہیں ہے۔

ہماری یہ تاویلات، جن کا ارتکاب ہم صبح و شام کرتے رہتے ہیں، اس بات کی علامت ہیں کہ ہمارے ایمان میں دراصل محبت کی کمی ہے، اور یہی وہ عظیم اور واضح فرق ہے جو ہمارے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایمان کے درمیان پایا جاتا ہے۔

لہٰذا اگر ہم واقعتہً یہ چاہتے ہیں کہ اس عزت و کرامت اور اُس عروج و ترقی کے مستحق بنیں جو قرونِ اولیٰ میں حضراتِ صحابۂ کرامؓ کو اتباعِ سنت کی برکت سے حاصل ہُوا تو پھر یہ ناگزیر ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اسی طرح کریں جس طرح صحابۂ کرامؓ نے کر کے دکھائی تھی، اس اتباع میں نہ کسی تحریف و تاویل کا کوئی شائبہ ہو، نہ خواہشاتِ نفس کو راضی کرنے کا اور نہ غیروں کے استہزا سے خوف کا۔ اس لیے کہ خدا کی قسم! ہمارے لیے نہ یہ سر بفلک عمارتیں سرمایۂ عزت ہو سکتی ہیں، نہ یہ عالیشان محلات اور زرق برق لباس سامانِ افتخار بن سکتا ہے، ہمارے لیے عزت ہے تو اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹھیک ٹھیک پیروی میں ہے جو ایک دن کھاتا اور ایک دن بھوکا رہتا تھا، جو چٹائی پر سویا کرتا تھا، جو اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودتا تھا۔ اور جو تعمیرِ مسجد کے لیے اپنے مبارک ہاتھوں سے اینٹیں ڈھونے کی خدمت انجام دیتا تھا، جب تک ہم اس نبی اُمیّ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں اپنے آپ کو پوری طرح رنگنے کی کوشش نہیں کریں گے، اس وقت تک ہمیں کوئی عزت اور کوئی سرفرازی حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ عظیم اور مبارک کانفرنس جس میں سیرت و سُنت کے نام پر مشرق و مغرب کے ممتاز اہلِ علم و دانش جمع ہیں، ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اس طریقے پر اپنے آپ کا محاسبہ کریں اور پھر وہ طریقے سوچیں جن سے مسلمانوں کے دل میں اتباعِ سُنت کی ایسی محبت پیدا کی جائے جس کی موجودگی میں وہ اپنی خواہشاتِ نفس یا غیر اسلامی نظریات کے دھوکے میں نہ آسکیں۔

لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ کانفرنس پورے خلوص اور عزم کے ساتھ مندرجۂ ذیل

قرارداد یں منظور کرے :۔

۱۔ یہ کانفرنس تمام مسلمانوں سے عموماً اور اہلِ علم و دانش اور مبلغینِ اسلام سے خصوصاً یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی، اپنے طرزِ معیشت اور اپنے طرزِ معاشرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اتباع کریں، خود اہتمام کریں، تاکہ ان کی زندگیاں بذاتِ خود سنّتِ نبوی ؐ کا حسین عملی نمونہ ہوں۔

۲۔ یہ کانفرنس ہر زمانے اور ہر خطّے کے مسلمانوں سے یہ سفارش کرتی ہے کہ وہ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ تھوڑا سا وقت — خواہ وہ نصف گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو۔ سیرتِ طیّبہ کے مطالعے کے لیے وقف کریں اور اس وقت میں وہ خود بھی سیرت کا مطالعہ کریں اور اپنے گھر والوں کو بھی سنائیں اور روزانہ اس بات کا محاسبہ کریں کہ انھوں نے سیرت کے احکام پر کتنا عمل کیا ؟

۳۔ یہ کانفرنس تمام اسلامی ممالک کی حکومتوں سے اپیل کرتی ہے کہ سیرتِ نبویؐ کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کے ہر مرحلے میں لازمی مضمون کی حیثیت سے داخلِ نصاب کریں اور نشریاتی اداروں پر روزانہ سیرت و سنّت کی تعلیم کے لیے موزوں وقت مقرر کریں۔

۴۔ یہ کانفرنس تمام اہلِ دانش سے اپیل کرتی ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعے عوام میں آسان اور عام فہم انداز سے سیرت و سنّت کی نشر و اشاعت کریں، اور قرآن و سنّت میں تحریف کر کے انہیں جدید غیر اسلامی نظریات پر منطبق کرنے کی کوشش کی بجائے سیرت و سنّت کو اپنی صحیح اور اصلی صورت میں مسلمانوں کے مسائلِ حیات کے حل کے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

دَورۂ چین

نومبر ۱۹۸۵ء

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ دیکھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۸)

دورۂ چین

جب سے چین نے مذہب کے بارے میں اپنی سخت پالیسی کو نرم کر کے مسلمانوں کو کچھ مذہبی آزادی دی ہے، اُس وقت سے چینی مسلمانوں کا رابطہ عالمِ اسلام کے مختلف مراکز سے قائم ہونے لگا ہے، پاکستان کے توسط سے ہر سال چینی مسلمانوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد حج کو جانے لگی ہے اور امسال تو دو ہزار چینی مسلمانوں نے یہ مقدس فریضہ ادا کیا، اور پاکستان کو ان کے سفری انتظامات کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ مناسب ہی نہیں ضروری بھی ہے کہ اسلامی ملکوں سے مختلف وفود چین جائیں اور دینی معاملات میں وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کی راہیں تلاش کریں۔ اسی غرض سے حکومتِ پاکستان کئی مرتبہ علماء کے وفود چین بھیج چکی ہے، اور کئی بار چینی مسلمانوں کے وفود پاکستان آچکے ہیں۔

امسال حکومتِ پاکستان نے ایک مختصر وفد احقر کی قیادت میں بھیجنے کا ارادہ کیا، دوسرے اعضاءِ وفد میں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب (مہتمم جامعہ نعیمیہ لاہور) مولانا فخر الحسن کراروی (پشاور) اور وزارتِ مذہبی امور کے ڈپٹی سیکرٹری محفوظ احمد صاحب شامل تھے۔

اتوار ۳ نومبر کی صبح ۷ بجے ہم اسلام آباد ایئر پورٹ سے' پی آئی اے کے ذریعے روانہ ہوئے۔ اس سمت میں یہ میرا پہلا سفر تھا، اور قدرتی طور پر بڑے اشتیاق کے ساتھ اس سفر کا آغاز ہوا۔ اب اسلام آباد سے جانے والی پرواز پاکستان کے طویل شمالی

سلسلہ کوہ کو عبور کر کے سنکیانگ کے راستے پیکنگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسلام آباد کی مرگلہ پہاڑی عبور کرتے ہی حدِ نظر تک اس کوہستان کی برفانی چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ اور جہاز نے ان سے بلند ہونے کے لیے دوبارہ اسلام آباد کا چکر کاٹا۔ اس کے باوجود ان برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے اوپر پرواز کرتے ہوئے ان کا فاصلہ بہت کم معلوم ہوتا تھا تقریباً بیس پچیس منٹ کی پرواز کے بعد دائیں طرف ایک بہت اونچی چوٹی نظر آئی جو آس پاس کی تمام چوٹیوں میں ممتاز نظر آتی تھی۔ پائلٹ نے اعلان کیا کہ یہ ننگا پربت ہے جو سطح سمندر سے چھبیس ہزار فٹ بلند ہے اور دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں چھٹے نمبر پر ہے۔ جہاز اس کے بالکل قریب سے اسے تقریباً چھوتا ہوا گذر گیا۔ چند لمحوں بعد جہاز کے بائیں طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا گلگت شہر نظر آیا۔ اور اس کے چند ہی منٹ بعد پائلٹ نے اعلان کیا کہ اس وقت جہاز دنیا کی مشہور چوٹی کے۔ٹو کی بالکل محاذات سے گذر رہا ہے۔ جہاز کے مشرق میں دائیں جانب ایک مثلث سربفلک چوٹی نظر آئی جو پہاڑوں کے اس سمندر میں ایک سرافراز جزیرے کی طرح ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔ یہ کوہِ قراقرم کے سلسلے کی وہ چوٹی ہے جسے گڈون آسٹن بھی کہتے ہیں اور جو اٹھائیس ہزار فٹ بلند ہونے کی بنا پر ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔

پاکستان کے شمال میں اللہ تعالیٰ نے سربفلک پہاڑوں کی جو حسین فصیل بنائی ہے اسے اس طرح پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاز سے ان پہاڑوں اور ان پر حدِ نظر تک ڈھکی ہوئی برف کی سفید براق چادر کا منظر اس قدر دلکش تھا کہ روئیں روئیں سے فتبارک اللہ احسن الخالقین کی صدا آنے لگی۔ حُسن و جمال کے خزانے لٹانے کے علاوہ یہ پہاڑ ملک کی جو دفاعی خدمات انجام دیتے ہیں، اس کے پیشِ نظر اقبال مرحوم کے اشعار یاد آ گئے ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر — خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

تقریباً پچاس منٹ کی پرواز کے بعد اسی کوہستان کے عین درمیان پائلٹ نے اعلان کیا کہ اب ہم پاکستان اور چین کی درمیانی سرحد پر پہنچ چکے ہیں، اور اس کے فوراً بعد جہاز چین کے سب سے بڑے صوبے سنکیانگ (چینی ترکستان) میں داخل ہو گیا۔

چین رقبے کے لحاظ سے سوویت یونین اور کینیڈا کے بعد دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے جس کا مجموعی رقبہ ۹۶ لاکھ مربع کلومیٹر ہے، اور آبادی کے لحاظ سے تو دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے جس کی آبادی ایک ارب سے زائد ہے۔ اس کی سرحدیں مغرب میں پاکستان، افغانستان، بھارت، نیپال، سکم اور بھوٹان سے، جنوب میں برما، لاؤس اور ویت نام سے، مشرق میں کوریا سے، شمال میں منگولیا اور سوویت یونین سے ملتی ہیں۔ یہ پورا علاقہ بڑی متنوع اور رنگا رنگ جغرافیائی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں سر بفلک پہاڑوں کے طویل سلسلے بھی ہیں، لق و دق صحرا بھی، اور نظر افروز سبزہ زار بھی، چنانچہ پیکنگ تک سفر میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے یہ متنوع علاقے نظر آتے رہے۔ قراقرم کا سلسلۂ کوہ ختم ہوتے ہی ایسا بے آب و گیاہ ریگستان شروع ہو گیا جس میں حدِ نظر تک زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بعد پھر برف پوش پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ آگیا، اور نشیب و فراز کا یہ سلسلہ پیکنگ پہنچنے تک جاری رہا۔ غالباً اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ چین کو اگر مغرب سے اس طرح دیکھا جا سکے کہ مشرق کے ساحلی علاقوں تک پورا خطہ سامنے ہو تو ایک زینہ سا اترتا نظر آئے گا۔

تقریباً چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز بیجنگ[1] کے ہوائی اڈے پر اترا تو یہاں شام کے چار بجے تھے (چین کا وقت پاکستان سے تین گھنٹے آگے ہے۔) جہاز کے شوٹ سے

---

[1] اس شہر کا اصل چینی نام بیجنگ ہے۔ انگریزوں نے اسے "پیکنگ" کے نام سے مشہور کیا، اور انگریزی میں اس کے ہجے (Peking) کیے۔ بعد میں اہلِ چین نے اس کو اصل تلفظ کی طرف لوٹانے کے لیے اس کو "بیجنگ" ہی کہنا شروع کر دیا ہے، اور اب دنیا بھر میں اسے (Beijing) کہا جاتا ہے۔

نکلتے ہی لاؤنج میں پاکستانی سفارت خانے کے اعلیٰ افسران نے وفد کا استقبال کیا، اور ایک لاؤنج عبور کرنے کے بعد چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے عہدہ داران، اور چین کے محکمہ مذاہب کے نائب صدر استقبال کے لیے موجود تھے۔ چین میں ہماری میزبانی چونکہ چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کر رہی تھی، اس لیے وی آئی پی لاؤنج میں ان حضرات کے ساتھ کچھ دیر رسمی گفتگو رہی، اور نمازِ عصر وہیں ادا کرنے کے بعد ہم ہوائی اڈّے سے روانہ ہوئے۔ ہمارے قیام کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا جو یہاں "اقلیتی قومیتوں کے محل" کے نام سے مشہور ہے، اور اس کی دس منزلہ شاندار عمارت بیجنگ کے سب سے بڑے مین روڈ "چانگ این اسٹریٹ" پر واقع ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے مغرب ہو چکی تھی، نماز اور رات کے کھانے کے بعد چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے حضرات نے چین میں قیام کے دوران ہمارے پروگرام سے ہمیں آگاہ کیا۔ تھکن بہت تھی، اس لیے اس رات ہم جلد ہی اپنے بستروں پر پہنچ گئے۔ ساتویں منزل پر واقع اس کمرے کی کھڑکی سے پیکنگ کا عمومی منظر سامنے تھا۔ اُونچی اُونچی عمارتیں دُور تک نظر آتی تھیں لیکن ان پر روشنیوں کی وہ چمک دمک جس سے آجکل ہر ترقی یافتہ، بلکہ ترقی پذیر شہر بھی جگمگاتا نظر آتا ہے، یہاں اس کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ سارے شہر میں کہیں کوئی ایک نیون سائن بھی موجود نہیں تھا، آرائشی روشنیاں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آئیں، سڑکوں اور عمارتوں پر صرف بقدرِ ضرورت بلب روشن تھے، جو کراچی کی جگمگ کرتی ہوئی روشنیوں کے مقابلے میں کالعدم سے محسوس ہوئے، اور اس چکا چوند کی عادی نگاہوں کو بڑے اجنبی نظر آئے۔ لیکن عقل کا فیصلہ یہی تھا کہ جو ملک برقی طاقت کی کمی کا شکار ہو، اُسے اپنی تھوڑی سی بہت برقی طاقت کو نمائش و آرائش میں صرف کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ چین نے اگر عقل کے اس فیصلے کو جذبات پر مقدم رکھا ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں، قابلِ ستائش ہے، اور نظرِ ثانی کا محتاج ہے تو ہمارا طرزِ عمل، جو سال بھر لوڈ شیڈنگ اور وقتاً فوقتاً بجلی کی خرابی کو گوارا کر لیتے ہیں، لیکن نمائشی و آرائشی روشنیوں میں روزانہ اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

صبح ناشتے کے بعد ہمارے دورے کا آغاز ہماری میزبان تنظیم "چائنا اسلامک ایسوسی ایشن" کے مرکزی دفتر کے معائنے سے ہوا۔ یہ تنظیم ملک گیر سطح پر چینی مسلمانوں کی ایک کثیر المقاصد تنظیم ہے، جو سرکاری سرپرستی میں کام کرتی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل بیان کئے گئے ہیں:۔

(۱) مذہبی آزادی کے قیام میں حکومت کی مدد کرنا۔

(۲) بہترین اسلامی روایات کو قائم کرنا۔

(۳) اسلام کی روشنی میں جذبۂ حب الوطنی کو فروغ دینا۔

(۴) عالمی امن کے قیام کی جدوجہد۔

(۵) اسلامی علوم میں تحقیق کا کام سرانجام دینا، اور متعلقہ تاریخی مواد جمع کرنا۔

(۶) مسلمانانِ عالم کے ساتھ باہمی مفاہمت اور دوستی کو فروغ دینا۔

یہ تنظیم ۱۹۵۳ء میں قائم کی گئی تھی، اور اس کے اخراجات چینی حکومت کی مالی امداد کے علاوہ مسلمانوں کے باہمی چندے اور دنیائے اسلام کے مختلف اداروں کے عطیات سے پورے ہوتے ہیں۔

اس انجمن کے صدر الحاج محمد علی ژان جے ہیں، لیکن ان کے ضعف اور علالت کی بنا پر انجمن کے زیادہ تر عملی فرائض نائب صدر الحاج محمد ایاس انجام دیتے ہیں جن کا چینی نام شین زیازی ہے۔ اس انجمن کی مجلسِ شوریٰ، ۱۵۰ ارکان پر مشتمل ہے، جن میں سے ۴۰ منتخب ارکان مجلسِ عاملہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

اجتماعی سطح پر چینی مسلمانوں کی یہ واحد ملک گیر تنظیم ہے، جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کرتی ہے، چین میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ ۱۹۴۲ء میں چیانگ کائی شیک کے زمانے میں جو مردم شماری ہوئی تھی، اس کی رو سے یہاں کے مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ لیکن اشتراکی انقلاب کے بعد کی مردم شماریوں میں چونکہ مذہب کا کوئی الگ خانہ نہیں تھا، اس لئے مسلمانوں کی تعداد الگ شمار کرنے کا کوئی قابلِ اعتماد راستہ نہیں ہے، انقلاب کے بعد کی مردم شماریاں قومیتوں کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ چین میں

۵۶ قومیتیں پائی جاتی ہیں، جن میں اکثریتی قومیت ہان ہے، جو کل آبادی کا ۹۳،۳ فیصد بتائی جاتی ہے۔ اس قومیت میں بھی مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہے، لیکن زیادہ تر مسلمان اقلیتی قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور ویغور، قازق، تاجک، ازبک، ہوئی، تاتار، کرغیز، قونگ شیانگ، سالار اور پاؤآن قومیتوں میں مسلمانوں کی بھاری تعداد پائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض قومیتوں، مثلاً یغور، قازق اور تاجک وغیرہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

لہٰذا اشتراکی انقلاب کے بعد مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ان قومیتوں میں مسلمانوں کے تناسب سے لگایا گیا اور اب سرکاری طور پر عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ چین میں مسلمانوں کی کل تعداد ایک کروڑ چھیالیس لاکھ ہے۔

مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں یہ بیان یقینی طور پر ناقابل اعتماد اور انتہائی بعید از قیاس ہے، کیونکہ اگر ۱۹۴۲ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تھی اور چالیس سال سے زائد مدت گذرنے کے بعد اس تعداد سے ساڑھے تین کروڑ کم کیسے ہو سکتی ہے؟

چین میں اسلام کی ضیا بار کرنیں پہلی صدی ہجری ہی میں طلوع ہو گئی تھیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت ہی میں بعض مبلغین چین کے مشرقی ساحل تک پہنچ چکے تھے، بلکہ چین کے ایک مشرقی شہر کوانگچو میں ایک مزار ہے، صاحبِ مزار کا نام حضرت ابو وقاص رضؓ بتایا جاتا ہے، اور اس علاقے کے مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ یہ صحابی تھے۔ واللہ اعلم

اس کے بعد بھی ایران کے مسلمان تاجر کاشغر کے راستے اور عرب کے حضرات بحری راستے سے کوانگچو اور دوسرے جنوبی اور جنوب مشرقی بندرگاہوں تک آتے رہے، اور انہوں نے یہاں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے فوج کشی تو پہلی بار ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں قتیبہ بن مسلم باہلی کی سرکردگی میں ہوئی تھی، لیکن وہ چین کے جنوب مغرب میں بہت تھوڑے حصے تک جا سکے تھے کہ انہیں

واپس بلا لیا گیا۔ لہٰذا چین میں اسلام کی نشر و اشاعت تمام تر انہی مسلمان تاجروں اور مبلغوں کا کارنامہ ہے۔ جن کے جذبۂ دعوت و تبلیغ کی بدولت آج صدیوں بعد بھی یہاں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے۔

چین میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کے بعد یہاں "ثقافتی انقلاب" کے نام سے جو تحریک چلی، اس میں مذہب کے خلاف بڑی سختیاں کی گئیں، مسلمانوں کی مسجدیں بند کردی گئیں، تعلیمی ادارے ختم کردیئے گئے، اور اسلامی شعائر کو مٹانے کی پوری کوشش کی گئی۔ مسلمانوں پر یہ دور بڑا سخت گذرا، اور ظاہر ہے کہ اس زمانے میں "چائنا اسلامک ایسوسی ایشن" جیسی تنظیم کے لیے کسی قابلِ ذکر کام کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد چند سالوں سے (سنہ ۱۹۷۶ء کے بعد) حکومت نے اپنی پالیسی تبدیل کی، ملکی قوانین میں مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی، جو مسجدیں بند اور ویران پڑی تھیں انہیں نہ صرف کھولا گیا، بلکہ ان کی مرمت اور تعمیرِ نو کی گئی، تعلیمی اداروں کو فی الجملہ کام کرنے کی اجازت ملی، اس وقت سے یہ ایسوسی ایشن ملک میں دینی خدمات انجام دینے کے لیے خاصی سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔

انجمن کے صدر دفتر کی عمارت خاصی شاندار ہے۔ یہاں انجمن کے صدر، نائب صدر اور دوسرے عہدہ داروں نے ہمارے وفد کا استقبال کیا، اور چین میں مسلمانوں کے حالات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ بیجنگ میں ایک لاکھ اسی ہزار مسلمان آباد ہیں، اور شہر بھر میں چھیالیس مسجدیں ہیں، نئے قانون کے بعد مسلمان آزادی سے یہاں عبادات انجام دیتے ہیں، مسلمانوں کے ریستوران اور مذبح خانے علیحدہ ہیں، ہوائی جہازوں اور ریلوں میں بھی ان کے لیے حلال کھانے کا الگ انتظام ہوتا ہے، بلکہ بیجنگ سے کانسو جانے والی ایک ٹرین کے بارے میں تو صرف مسلمانوں ہی کا کھانا ملتا ہے۔ کیونکہ اس علاقے میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

انجمن کے حضرات نے ہمیں انجمن کی طرف سے شائع کی ہوئی دو کتابیں "تفسیر جلالین"

اور "شرح الوقایہ" کے نسخے بھی ھدیۃً پیش کیے، یہ کتابیں انجمن کے اپنے مدرسے میں پڑھانے کے لیے شائع کی ہیں۔ "تفسیر الجلالین" ایک مصری نسخے کا فوٹو ہے، اور "شرح الوقایہ" ہندوستانی نسخے کا جس پر حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی قدس سرہٗ کا حاشیہ "عمدۃ الرعایۃ" بھی ہے دونوں کتابیں نہایت نفیس کاغذ پر اونچے معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔

اس کے بعد ہم اسی عمارت کے اس حصے میں گئے جہاں مدرسہ قائم ہے، اس مدرسے میں پانچ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے، جس میں عربی زبان و ادب کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد اور اسلامی تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم مختلف جماعتوں میں گئے، ایک کمرے میں نحو کا درس ہو رہا تھا، اس میں تقریباً بیس پچیس طلبہ زیر تعلیم تھے، ہم نے طلبہ سے سوالات بھی کیے۔ اور جوابات سے اندازہ ہوا کہ تعلیم کا معیار اچھا خاصا ہے۔ ایک جماعت میں شرح الوقایہ میں کتاب الطلاق کا درس ہو رہا تھا، وہاں بھی بیس کے قریب طلبہ ہوں گے۔

چین جیسے ملک میں، جہاں ایک عرصے تک مذہب کو فنا کرنے کی کوشش کی گئی ہو، اور جہاں علم دین کے حامل افراد کے سامنے کوئی معاشی مستقبل نہ ہو، اتنے طلبہ کا ان مدرسوں کی طرف رجوع کرنا بھی لبا غنیمت ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ انجمن اپنے یہاں طلبہ کو دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں زیادہ وظائف دیتی ہے، کیونکہ اس وقت چینی مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ملک بھر کی ۲۳ ہزار مسجدوں کے موجودہ ائمہ زیادہ تر عمر رسیدہ ہو چکے ہیں، اور اب اُن کی جگہ لینے کے لیے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہے۔

اسی انجمن کے تحت اسی عمارت میں ایک دُکان بھی قائم ہے جس میں قرآنِ کریم کے نسخے، دینی کتابیں اور مسلمانوں کی دوسری دینی ضروریات مثلاً جانمازیں، ٹوپیاں، تسبیحیں، ہجری کیلنڈر، خواتین کی اوڑھنیاں اور اس طرح کی دوسری چیزیں فروخت ہوتی ہیں یہیں سے ایک ماہنامہ رسالہ "چینی مسلمان" کے نام سے چینی اور ریغور زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

بیجنگ کی نیوجے مسجد:

ایسوسی ایشن کے صدر دفتر کے بعد ہم نیوجے مسجد پہنچے، جو بیجنگ کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ جس محلّے میں آباد ہے اُسے نیوجے اسٹریٹ کہتے ہیں، اور یہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، بلکہ اس محلّے کا نام بھی نیوجے اس لیے پڑا کہ نیوجے چینی زبان میں گائے کو کہتے ہیں، اور مسلمان چونکہ زیادہ تر گائے کا گوشت کھاتے ہیں، اس لیے اس سڑک کا نام ہی نیوجے رکھ دیا گیا۔

مسجد کے امام صاحب نے مسجد کے متصل ایک ہال میں استقبال اور مہمانی کے بعد سب سے پہلے مسجد کا کتب خانہ دکھایا جس میں قرآن کریم اور دوسری عربی اور فارسی کتابوں کے نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔ قرآن کریم کا ایک نسخہ سات سو سال پرانا ہے، اور فقہ اور تصوف کی مختلف کتابوں کے مخطوطات ہیں، تصوّف کی بعض ایسی کتابوں کے قلمی نسخے بھی نظر آئے جو ابھی تک احقر نے مطبوعہ شکل میں نہیں دیکھے۔

اس کے بعد ہم مسجد میں پہنچے، کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد ایک ہزار سال پہلے تعمیر ہوئی تھی، بعد میں چین کے منگ خاندان کے زمانے میں اس کی توسیع اور از سرِ نو تعمیر ہوئی، مسجد کا موجودہ ڈھانچہ اُسی وقت سے چلا آتا ہے، اور یہ اُس دور کے مخصوص طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے، مسجد کا اندرونی ہال تمامتر لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ لکڑی پر نہایت شاندار اور دیرپا روغن ہے، اور اس پر سونے کے پانی کا کام ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کام میں ڈھائی کیلو گرام سونا خرچ ہوا تھا۔ یہ چوبی عمارت اس قدر پائیدار ہے کہ تقریباً پانچ سو سال گذرنے کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں فرق نہیں آیا، بلکہ اس دوران پتھر کی بنی ہوئی بہت سی عمارتیں شدید زلزلوں میں تباہ ہو گئیں، لیکن اس عمارت کو زلزلوں میں بھی نقصان نہیں پہنچا۔

چین کے ثقافتی انقلاب کے بعد اس مسجد کو بند کر دیا گیا، لیکن ۱۹۷۹ء میں ۴۰ لاکھ یوآن کے خرچ سے اس کی دوبارہ مرمّت کی گئی اور ۱۹۸۱ء میں اسے نمازیوں کے لیے کھول دیا گیا۔ امام صاحب کا کہنا ہے کہ یہاں پنج وقتہ نمازوں میں ۸۰ سے ۱۰۰ تک نمازی

ہوتے ہیں، جمعہ میں ۶۰۰ اور عیدین میں دو ہزار تک افراد نماز پڑھتے ہیں اور نمازیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

اسی مسجد کے احاطے میں دو بزرگوں کے مزارات ہیں۔ ایک مزار کے کتبے پر قدیم عربی رسم الخط میں لکھا ہے کہ یہ شیخ محمد بن محمد بن احمد البرسانی القزوینی کی قبر ہے جن کی وفات ۶۷۹ھ میں ہوئی، دوسرے صاحبِ مزار شیخ علی بن القاضی عماد الدین البخاریؒ ہیں جن کی وفات ۶۸۲ھ میں ہوئی۔ ان بزرگوں کے حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، لیکن ان مزارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ماوراء النہر کے علماء یہاں تبلیغ کے لیے مقیم رہے ہیں۔ اور یہ انہی حضرات کی محنتوں اور قربانیوں کا ثمر ہے کہ مراکزِ اسلام سے اس دُور افتادہ علاقے میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ابھی تک کلمۂ توحید سینوں میں بسائے ہر طرح کے مشکل حالات کا سامنا کرتی رہی ہے۔ رحمهم الله تعالیٰ وطیّب ثراهم۔

شام ۳½ بجے ہم چین میں پاکستانی سفارت خانے کی عمارت میں پہنچے۔ چین میں پاکستان کے سفیر جناب انور کمال صاحب سے مفید ملاقات ہوئی، وہ یہاں ساڑھے تین سال سے سفارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ وہ چین کے تقریباً ہر صوبے میں گئے ہیں، اور چین کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حالات سے وہ بہت باخبر ہیں۔ سفارت خانے کی عمارت بھی ماشاء اللہ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے جو ایک معاہدے کے تحت پاکستانی نقشے کے مطابق چینی حکومت نے اپنے خرچ پر تعمیر کی ہے۔ اس کے جواب میں پاکستان نے بھی اسلام آباد میں چینی سفارت خانہ اپنے خرچ پر بنایا ہے۔ سفارت خانے میں ایک مسجد بھی ہے۔ جس میں پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔

شام چار بجے مسلمانانِ چین کے ایک معمر رہنما جناب برہان شہیدی صاحب سے اُن کے مکان پر ملاقات ہوئی، یہ چین کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی ہیں، اور چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے اعزازی چیئرمین بھی، یہ نسلاً ایغور ہیں، اور ان سے بات چیت کے لیے پہلے ایغوری سے چینی پھر چینی سے اُردو میں ترجمانی کی ضرورت پڑی

البتہ چند معروف جملے انہوں نے عربی میں بھی کہے۔ ان کی عمر بانوے سال ہے اور نہ صرف یہاں کے مسلمان انہیں عزت و احترام کے ساتھ دیکھتے ہیں بلکہ پورے ملک کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے وائس چیئرمین ہونے کی بنا پر ملک میں ان کا سیاسی مقام بھی بہت بلند ہے۔

رات کو ہمارے ہوٹل ہی کے "اسلامی مطعم" میں میزبان ایسوسی ایشن نے وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا تھا۔ جس میں ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں اور بیجنگ کی مساجد کے ائمہ حضرات کے علاوہ سفیر پاکستان جناب انور بھٹی، سفارت خانے کے اعلیٰ افسران اور برہان شہیدی صاحب بھی شریک ہوئے۔

۶۔ نومبر کی صبح نو بجے ہم پہلے بیجنگ کے مشہور چوک "تھیان آن من" گئے، جو پیپلز اسکوائر کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے، اور دنیا کا سب سے بڑا چوک ہے۔ یہ بیجنگ کی مرکزی سڑک چانگ این اسٹریٹ پر واقع ہے، جو بذاتِ خود نہایت وسیع سڑک ہے، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے کسی شہر کے اندرونی حصے میں اتنی چوڑی سڑک نہیں دیکھی۔ اسی سڑک کا وہ چوراہا جو گریٹ ہال کے ساتھ واقع ہے، پیپلز اسکوائر کہلاتا ہے، اور یہاں پہنچ کر چانگ این اسٹریٹ سے مغرب کی جانب ایک اس سے بھی کئی گنا زائد پکا میدان ہے۔ جس کے مغربی سرے پر وہ عمارت ہے جس میں ماؤزے تنگ کا جسم رکھا گیا ہے، شمالی جانب گریٹ ہال ہے اور جنوب میں ایک میوزیم کی شاندار عمارت ہے، ان عمارتوں کے درمیان جو پکی جگہ خالی پڑی ہے۔ جس میں تین معروف سڑکیں بھی ہیں، تھیان آن من یا پیپلز اسکوائر کہلاتی ہے، اور اس میں بیک وقت دس لاکھ آدمیوں کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اہم قومی اجتماعات اسی چوک میں ہوتے ہیں، شمال کی جانب سنگ طرزِ تعمیر کی ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی ہے، جو ایسے اجتماعات میں اسٹیج کا کام دیتی ہے، یہ انتہائی پُرشکوہ چوک ہے۔ جو اپنی وسعت، خوبصورتی، صفائی، ستھرائی اور گنجائش کے اعتبار سے دنیا بھر میں منفرد اور بے نظیر ہے۔ یہاں ہر وقت سینکڑوں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے، لیکن

بدنظمی پیدا نہیں ہوتی اور چانگ ین اسٹریٹ سے گذرتے ہوئے یہ ہجوم بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔
اس چوک کو پیدل عبور کرنے کے لیے تو بڑا وقت درکار ہے۔ ہم نے اسے کار ہی سے عبور کیا، اور اس کے جنوبی سرے پر ماؤزے تنگ کی عمارت کے قریب اُترے؛ یہاں اندر جانے والوں کی ایک طویل قطار حدِ نظر تک بل کھاتی ہوئی رواں دواں تھی، ہم عمارت کے اندر داخل ہوئے تو اس کے ایک ہال میں ماؤزے تنگ کی لاش کو مسالوں کے ذریعے محفوظ کر کے ایک شفاف شوکیس میں رکھا ہوا ہے۔ جسم کا بیشتر حصہ چادر میں ڈھکا ہوا ہے، البتہ سینہ، گلا اور چہرہ کھلا ہوا ہے جو شوکیس سے صاف نظر آتا ہے۔ لوگ اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے بھی یہاں آتے ہیں کہ ایک شخص کی لاش ۱۹۷۶ء سے اب تک ممی کی شکل میں صحیح سالم نظر آتی ہے، اور بہرحال! یہ ہے بھی ایک عجوبہ، لیکن اس عجوبے کے لیے لاکھوں روپے کی رقم خرچ کرنے والوں کو یہ کون بتائے کہ ماؤزے تنگ اس گوشت پوست کا نام نہیں تھا جس شخص کا نام ماؤزے تنگ تھا، وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہے۔ بیش قیمتی مسالے اس گوشت پوست کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، لیکن اس کی رُوح کی حفاظت کے لیے آج تک کوئی سائنس ایسا مسالہ دریافت نہیں کر سکی جس کے پرواز کرنے کے بعد چلتا پھرتا انسان ایک بے جان پتھر بن کر رہ جاتا ہے۔
یہ مجسمۂ عبرت اگرچہ اب بھی بہت سے چینی لوگوں کے لیے عقیدت و احترام کا مرکز ہے، لیکن اب لوگوں کے دل میں ماؤزے تنگ کی عظمت اس درجے میں باقی نہیں رہی جس درجے میں اس کی زندگی میں تھی۔ پہلے وہ ایک ایسا معصوم رہنما تھا جس کے فکر و عمل پر کسی تنقید کا تصور مشکل تھا، لیکن اب اس کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی جارہی ہے، کمیونسٹ پارٹی کی گیارھویں کانگریس کے تیسرے مکمل اجلاس میں (جو ۱۹۷۸ء میں منعقد ہوا تھا، حکومت کی پالیسی میں بڑی انقلابی تبدیلیاں کی گئیں؛ جن کا ذکر انشاء اللہ میں آگے کروں گا) اس موقع پر یہ بات بڑی کشادہ دلی اور صراحت کے ساتھ تسلیم کی گئی کہ ثقافتی انقلاب کے دس سالوں میں چین کو بہت سے میدانوں میں

بڑا نقصان پہنچا ہے، اور اس ناقص پالیسی کی خاصی ذمہ داری ظاہر ہے کہ چیئرمین ماؤزے تنگ پر بھی عائد ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ بیجنگ کے اخبار "پیپلز ڈیلی" نے لکھا کہ "ماؤزے تنگ ایسا عظیم انسان تھا جس سے غلطیاں بھی بڑی عظیم سرزد ہوئیں۔" بہرحال! اس پہلو پر میں ان شاء اللہ سفرنامے کے آخر میں تبصرہ کروں گا۔

جامع مسجد دونگ سی:

اس کے بعد ہم بیجنگ کی ایک اور مشہور جامع مسجد دونگ سی (Dong Si) دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ مسجد ۶۲۷ھ (یعنی ساتویں صدی ہجری میں) تعمیر ہوئی تھی، آگے کی محراب پتھر کی بنی ہوئی ہے، اور تعمیر خاصی پرانی ہے۔ باقی ساری مسجد صنوبر کی لکڑی سے اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں ایک بھی لوہے کی میخ استعمال نہیں ہوئی طرز تعمیر ٹھیٹھ چینی انداز کا ہے۔ جو چینی بادشاہوں کے منگ خاندان کے زمانے میں رائج تھا۔ لکڑیوں کی مضبوطی اور اس پر آبِ زر سے بنائے ہوئے نقش و نگار بہت خوبصورت ہیں، اور تقریباً ۵۰۰ سال گذرنے کے باوجود ان کی آب و تاب سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ مسجد ابھی نیار ہوئی ہے۔

مسجد کے ساتھ ملحق دو کتب خانے ہیں جس میں مطبوعات اور مخطوطات کا ایک اچھا ذخیرہ موجود ہے، اس میں قرآن کریم کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ ہے۔ جو ۷۱۸ھ میں لکھا گیا تھا۔ لکھنے والے کا نام محمد بن احمد بن عبدالرحمن السرائی درج ہے۔ تقریباً سات سو سال گذرنے کے باوجود لکھائی اتنی صاف، واضح اور روشن ہے کہ آجکل مطبوعہ کتابوں میں بھی ایسی کتابت ملنی مشکل ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی عربی، فارسی اور چینی زبان کی دینی کتابوں کے بڑے نادر مخطوطات موجود ہیں، جن میں تفسیر جلالین، اشعۃ اللمعات، شرح عقائد، مقاماتِ حریری شرح جامی، شرحِ وقایہ، فصوص الحکم کے مخطوطات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے

علاوہ مطبوعات میں علامہ شامیؒ کی رد المحتار، البحر الرائق کے بھی کئی کئی نسخے نظر آئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انقلاب چین سے پہلے کوئی بڑا دار العلوم رہا ہو گا جس کی یہ کتابیں حوادثِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ بھی ہے جو ۱۹۸۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اس میں تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد اور تاریخ اسلام کا ویسا ہی پانچ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ جیسا چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھایا جاتا ہے۔ اگلے سال اس میں ایک نئی جماعت بھی شروع کرنے کا پروگرام ہے۔

مسجد کے امام شیخ صالح ایک معمر بزرگ ہیں جو بیجنگ کی مقامی اسلامک ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔ مسجد میں ہمارا خیر مقدم انہوں نے ہی کیا، اور اپنی تقریر میں بتایا کہ بیجنگ شہر میں ایک لاکھ اسی ہزار مسلمان آباد ہیں، اور مساجد کی تعداد ۴۶ ہے۔ بہت سی مسجدیں جو ثقافتی انقلاب کے دور میں بند کر دی گئی تھیں، اب کھول دی گئی ہیں، ان کی مرمت اور تعمیرِ نو کی گئی ہے، اور اب مسلمان اطمینان کے ساتھ اپنی عبادات انجام دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان ۴۶ بڑی مسجدوں کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی مسجدیں اور بھی ہیں۔

اس موقع پر بیجنگ کی متعدد مساجد کے ائمہ حضرات بھی موجود تھے، مدرسہ کے ایک طالب علم نے تجوید اور خوش الحانی کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت بھی کی۔ احقر کے سوال پر ائمہ نے بتایا کہ ۵ سالہ نصاب کے مدارس کے علاوہ متعدد مساجد میں مکتب بھی قائم ہیں، اور اب ان کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا ہے۔

مسلمان ممالک کے جو سربراہ یا وفود آتے ہیں، وہ عموماً نماز اسی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے بھی اپنے دورۂ چین کے موقع پر نماز جمعہ یہیں ادا کی تھی، ان کی طرف سے مسجد کو پیش کئے ہوئے تحائف، مثلاً قالین اور کتابت وغیرہ یہاں نمایاں مقامات پر رکھے ہوئے ہیں جو امام صاحب نے ہمیں بطور خاص دکھائے۔

شہرِ ممنوعہ کی سیر،

شام ۳ بجے میزبانوں نے "شہرِ ممنوعہ" کی سیر کا پروگرام رکھا تھا جو بیجنگ شہر کے تاریخی عجائب میں سے ہے۔ یہ دراصل چین کے منگ خاندان کے بادشاہوں کا بنایا ہوا ایک وسیع و عریض قلعہ ہے۔ جو عظیم الشان شاہی محلات پر مشتمل ہے، اور کہا جاتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس قلعے کے تمام چھوٹے بڑے کمروں کی مجموعی تعداد نو ہزار نو سو ننانوے (۹۹۹۹) ہے۔ اسے شہرِ ممنوعہ اس لیے کہتے ہیں کہ بادشاہوں کے زمانے میں یہاں عام آدمی کا داخلہ ممنوع تھا۔ قلعے کے گرد ایک زبردست فصیل ہے۔ اور اس کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے سولہ عالیشان محلات ہیں۔ ہر محل کے مرکزی حصے میں زمین سے تقریباً دو منزل کے برابر اونچی دیوار ایک پُرشکوہ اور خوبصورت ہال صنوبر کی لکڑی سے بنا ہوا ہے۔ اس کے سامنے سیڑھیوں اور فواروں کے بعد وسیع و عریض صحن ہے۔ اور دائیں بائیں جانب کمروں کی ایک طویل قطار ہے۔

ایک محل میں کھڑے ہو کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے کوئی اور محل بھی ہے۔ لیکن مرکزی ہال کے کسی گوشے سے ایک چھوٹا سا راستہ نکلتا ہے جو دوسرے محل میں پہنچا دیتا ہے۔

ان سولہ محلات میں سے ہر ایک کے مرکزی ہال کا ایک الگ نام منگ بادشاہوں نے رکھا ہوا تھا، اور اس کا کوئی مخصوص مقصد مقرر کیا ہوا تھا۔ مثلاً پہلا ہال "ایوانِ ہم آہنگی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سنہ ۱۴۲۰ء میں تعمیر ہوا تھا، یہ ساڑھے پینتیس میٹر اونچا ہے۔ اور ۲۳۷۷ مربع میٹر کے رقبے پر محیط ہے۔ یہاں منگ اور چنگ خاندان کے بادشاہ اہم تقریبات منعقد کرتے تھے۔ پوری عمارت صنوبر کی لکڑی کی بنی ہوئی ہے، اور چینی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔

ایک اور ہال "ایوانِ تحفظ" کے نام سے موسوم ہے، ۱۴۲۰ء میں ہی تعمیر ہوا تھا، اور ۲۹ میٹر بلند اور ۲۴۰۰ مربع میٹر عریض ہے۔ اِس ہال میں سفراء کا استقبال اور شہزادوں کی میزبانی کی جاتی تھی۔ یہیں ایک شاہی امتحان بھی ہوا کرتا تھا جو اس دَور میں اعلیٰ ترین تعلیم کی معراج سمجھی جاتی تھی۔

آجکل اس ہال میں ایک میوزیم ہے، جس میں عہدِ قدیم کے بہت سے برتن وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، ایک دیگچی اور چاقو آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہے، ایک نہایت خوبصورت منقش پیالہ جس کا حسن اور رونق آج بھی باقی ہے، گیارہویں صدی قبل مسیح کا ہے، درندوں کی ہڈی کی بنی ہوئی بعض آرائشی اشیاء سولہویں صدی قبل مسیح کی ہیں۔

محلات کے صحن میں لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے اگردان رکھے ہوئے ہیں جو بہترین صناعی کا نمونہ ہیں، جا بجا پیتل کے بڑے بڑے لگن آگ بجھانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ جگہ جگہ سنگ تراشی کے عجیب و غریب نمونے نظر آتے ہیں۔ اس طرح سولہ محلات کے بعد ایک خوبصورت پائیں باغ ہے جس میں انواع و اقسام کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ دو درخت چار پانچ فٹ کے فاصلے پر لگے ہیں، اور لگانے والے نے قدِ آدم بلندی پر ان دونوں کی آپس میں قلم اس طرح لگائی ہے کہ جڑ سے دونوں درخت جُدا ہیں، لیکن قدِ آدم بلندی پر دونوں کے تنے آپس میں مل کر یکجان ہو گئے ہیں۔ اور ان کے باہم ملنے سے ایک خوبصورت محراب بن گئی ہے۔

ایک اور ہال بادشاہ کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ کی کرسی اور اس کے سامنے کی تمام اشیاء اسی طرح سجی ہوئی ہیں جیسے وہ آج ہی یہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔

مَیں نے مختلف ملکوں میں بہت سے قلعے دیکھے ہیں، لیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ قلعہ اپنی نظیر آپ ہے، اور اس کی بیشتر خصوصیات آج بھی جوں کی توں محفوظ ہیں، اور اُسے دیکھ کر اس مقولے کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے کہ:

نزلت الحکمۃ ..... علی ایدی الصین

حکمت ...... چینیوں کے ہاتھ پر نازل ہوئی ہے۔

اسی روز رات کو پاکستان کے سفیر جناب انور کمال بھٹی صاحب نے وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا تھا جس میں اسلامک ایسوسی ایشن کے عہدہ داران کے علاوہ برہان شہیدی صاحب، چین کی وزارتِ مذہبی امور کے ڈائریکٹر اور وزارتِ خارجہ کے بعض اعلیٰ حکام بھی مدعو تھے، عشائیہ سفیر صاحب کے مکان پر تھا، یہ مکان بھی سفارتخانے کی طرح پاکستانی ماہرین کے نقشے کے مطابق بڑی خوبصورتی سے تیار کیا گیا ہے۔ اور اس میں پاکستانی طرزِ تعمیر کی جھلک موجود ہے۔ اس عشائیہ میں پُرلطف گفتگو رہی اور رات گیارہ بجے قیام گاہ واپسی ہوئی۔

دیوارِ چین

۶۔ نومبر کی صبح میزبانوں نے شہرہ آفاق دیوارِ چین کی سیر کا پروگرام رکھا تھا۔ اس تاریخی عجوبے کو دیکھنے کا اشتیاق ہمیں بھی تھا۔ چنانچہ صبح ۸ بجے ہم اپنی رہائش گاہ سے تین کاروں میں روانہ ہوئے۔ ارکانِ وفد کے علاوہ چائنا اسلامک ایسوسی ایشن کے نائب سیکرٹری جنرل شیخ سلیمان انجمن کے بعض دوسرے حضرات بھی ہم سفر تھے۔ پیکنگ یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاذ مسٹر خوبن جو ایک چینی غیر مسلم ہیں لیکن اُردو بڑی روانی سے بولتے ہیں۔ اور اُردو کے ٹھیٹھ محاوروں اور ادبی اسالیب سے بھی حیرتناک حد تک آگاہ ہیں اس پورے سفر میں ہماری ترجمانی اور رہنمائی کے لیے ہر وقت ہر لمحے ساتھ رہے اور انہوں نے سفر کے ہر مرحلے میں ہمیں آرام پہنچانے اور ہماری ضروریات پوری کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، وہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی ہمارے ساتھ تھے، اور ترجمانی اور رہنمائی کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے۔

دیوارِ چین کا جو حصہ عموماً سیاحت کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ درّہ نانکو کہلاتا ہے، اور ۵۰ - ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بیجنگ کے مضافات سے باہر نکلنے کے بعد یہ راستہ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گذرتا ہے

دیوارِ چین کو چینی زبان میں چہان چین Chang Chena کہا جاتا ہے۔ یہ دُنیا کی قدیم ترین اور طویل ترین فصیل ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز عہد قبل مسیح میں ہوا تھا۔ اس وقت چین میں طوائف الملوکی کا دور تھا اور مختلف بادشاہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں ان کے درمیان جنگ و پیکار کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ریاست کے سربراہوں نے اپنے اپنے علاقے کو دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے فصیلیں بنانی شروع کیں۔ یہ فصیل کسی ایک شہر کے گرد نہیں بلکہ پوری ریاست کے گرد یا اس کے اس حصے میں ہوتی تھی جس طرف سے دشمن کے حملے کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا۔ اس طرح چین کے مختلف حصوں میں کئی فصیلیں قائم ہوگئیں۔

۲۴۶ قبل مسیح میں چن شہ ہوانگ تی نے ان تمام ریاستوں کا ایک اتحاد قائم کیا، اس وقت چونکہ پورا ملک ایک ہو گیا، اس لیے ۲۲۹ قبل مسیح میں اس نے ان متفرق فصیلوں کو باہم ملا کر ایک طویل فصیل تعمیر کی جس کی تکمیل میں سالہا سال لگے، لیکن مکمل ہونے کے بعد یہ ایک ہزار پانچ سو میل لمبی فصیل بن گئی۔[1] جو دریائے زرد کے ساحل سے درۂ پیاڈا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب اس کے بہت سے حصے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں، بہت سے کھنڈر کی شکل میں باقی ہیں اور بہت سے سرے سے ختم ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی یہ چین کے متعدد صوبوں سے ٹوٹتی پھوٹتی گذرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعد میں چین کے منگ خاندان نے آج سے تقریباً ۵۰۰ سال پہلے اس کی مرمت کی، بہت سی جگہوں پر اسے دوبارہ تعمیر کیا۔

درۂ نانکو جہاں عموماً لوگ سیاحت کے لیے جاتے ہیں، پہنچنے سے کئی میل قبل ہی یہ دیوار پہاڑوں پر چڑھتی اترتی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن سیاحوں کے لیے منظر کے لحاظ سے قابلِ دید جگہ درۂ نانکو کی وہ وادی قرار دی گئی ہے۔ جو ہر طرف سے پہاڑوں میں گھری

---

[1] ہمارے رہنما نے دیوارِ چین کی لمبائی چھ ہزار کیلومیٹر بتائی تھی، لیکن یہ بیان مبالغہ آمیز ہے۔ عام طور سے کتابوں میں اس کا طول ۲۵۰۰ یا ۱۵۰۰ میل بیان کیا گیا ہے یعنی تقریباً ڈھائی ہزار کیلومیٹر۔ (دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۵ ص ۵۶۲ و ۵۴۲ (China, Chinese Architecture) مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

ہوئی ہے، اور یہاں دیوارِ چین کے راستے میں یکے بعد دیگرے پانچ چھ پہاڑ آتے ہیں۔ یہ دیوار ہر پہاڑ پر چڑھتی، پھر وہاں سے اُترتی ہے، اور پوری طرح محفوظ اور مستحکم ہے۔

دیوار ۱۳ فٹ چوڑی ہے اور زمین سے اس کی اونچائی اوسطاً ۲۰ فٹ ہے، اور نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اپنی اونچائی برقرار رکھتے ہوئے اُترتی چڑھتی گئی ہے، قلعوں کی فصیل کی طرح اس میں جابجا بُرج اور کمین گاہیں بنی ہوئی ہیں جو اس دور میں دفاعی چوکیوں اور دفاعی اطلاع رسانی کے مراکز کا کام کرتی تھیں اس دیوار کا اصل مقصد شمال مغرب کی جانب سے منگولیوں اور بعض دوسرے قبائل کے حملوں کو روکنا تھا۔ اگر کسی بُرج کے محافظوں کو اپنی جانب سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہوتا تو وہ یہاں آگ جلا کر دھواں پیدا کر دیتے، یہ دھواں دوسرے برج کے لوگوں کو نظر آتا تو وہ اپنے یہاں بھی دھواں سلگا کر اپنے سے اگلی چوکی کو خبردار کر دیتے تھے۔ رات کے وقت دھوئیں کا کام آگ سے لیا جاتا تھا۔

ہم نے سامنے کی تین پہاڑیوں کی اونچائی اس فصیل پر چلتے ہوئے طے کی، یہاں سردی شدید اور ہوا تیز تھی، جو دھوپ صاف ہونے کی بنا پر بحمداللہ قابلِ برداشت رہی اور سُنا گیا ہے کہ سردی کے موسم میں یہاں خون منجمد ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اس فصیل سے نہ صرف وادی کا، بلکہ بل کھاتی ہوئی فصیل کے دوسرے حصّوں کا منظر بھی بڑا خوشنما ہے۔ تیسری پہاڑی پر پہنچتے پہنچتے سانس جواب دینے لگتا ہے، اور واپسی پر اُترائی اُس سے زیادہ صبر آزما اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ ڈھلان پر زمین کی کشش کی شدت سے بعض اوقات چکر سا آنے لگتا ہے۔ اور جو لوگ فصیل کے کناروں پر لگے ہوئے لوہے کے سہارے کے بغیر اُترتے ہیں، وہ بعض اوقات توازن قائم نہ رکھنے کی بنا پر گر بھی جاتے ہیں۔

دیوار کی چوڑائی اور اونچائی کوئی ایسی غیر معمولی نہیں، قلعوں کی فصیلیں اس سے زیادہ بھی اُونچی اور چوڑی ہوتی ہیں، لیکن ڈیڑھ ہزار میل لمبی ہونے کی بنا پر یہ دُنیا کے عجائب میں شمار ہوتی ہے۔ پھر اگر یہ علاقہ میدانی اور ہموار ہوتا تو شاید اتنی قابلِ تعجب بات نہ ہوتی، حیرت ناک بات یہ ہے کہ چین کے بیشتر علاقوں کی طرح یہ سارا علاقہ بھی

پہاڑیوں سے معمور ہے۔

بہرکیف ! دُنیا کے اس مشہور عجوبے کی سیر بڑی پُر لُطف رہی۔

منگ مقبرے :

دیوارِ چین سے واپسی پر ہمارے میزبان ہمیں بیجنگ کی ایک اور تاریخی جگہ لے گئے، یہ علاقہ "منگ مقبرے" (Ming Tombs) کہلاتا ہے، اور اس میں چین کے منگ خاندان کے بارہ بادشاہوں کے وہ مقبرے ہیں جو ہر بادشاہ نے اپنے لیے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کئے تھے۔

اُس دَور کے بادشاہوں کو یہ خبط تھا کہ مرنے کے بعد بھی وہ بادشاہ ہی رہیں، اور ان کا مال و دولت اور حشم و خدم بھی ان کے ساتھ ہی مقبرے میں جائے۔ اس خبط کے نتیجے میں بعض شاہی خاندانوں میں یہاں تک رواج رہا کہ ان کے ساتھ ان کے محبوب غلام اور کنیزیں بھی تابوت میں دفن کردی جاتی تھیں، بعد میں یہ انسانیت سوز طریقہ تو ختم ہوا، لیکن بادشاہ کے ساتھ ڈھیروں سونا چاندی، جواہر، کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء، اور اس قسم کی دوسری چیزیں مقبرے ہی میں رکھ دی جاتی تھیں، ایک تابوت بادشاہ کا ہوتا تو دسیوں تابوت ان اشیاء کے ہوتے، اس کے علاوہ مقبرے میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر اور برتن بھی رکھے جاتے تھے، گویا بادشاہ کی حکومت اب زیرِ زمین چلی گئی ہے۔

لیکن اس طریقے میں خطرہ یہ تھا کہ یہ بیش قیمت سامان کوئی مقبرے سے اُٹھا کر نہ لے جائے، دوسرے خاندانی عداوتوں کی بنا پر یہ اندیشہ بھی رہتا تھا کہ کسی بادشاہ کی لاش کو کوئی دشمن اُٹھا نہ لے جائے، لہٰذا ہر بادشاہ اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ اس طرح تعمیر کرتا تھا کہ سطح زمین پر ایک عالیشان عمارت ہو، لیکن مقبرہ زیرِ زمین ہو جس میں اس کا تابوت رکھا جائے۔ اِس زیرِ زمین مقبرے کا راستہ سوائے اُس بادشاہ اور اُس کے چند ہمرازوں کے کسی اور کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب اس کا انتقال ہوتا تو اس کا تابوت، اور زر و جواہر وغیرہ کے تابوت اُس خفیہ راستے سے زیرِ زمین مقبرے میں پہنچا

دیئے جاتے، اِس کے بعد جو لوگ بادشاہ کی قبر پر آنا چاہتے وہ سطحِ زمین کی عمارت پر خراجِ عقیدت ادا کر کے چلے جاتے، اصل تابوت تک کسی کی رسائی نہ ہوتی۔

اس طریقِ کار کے تحت اس علاقے میں بارہ بادشاہوں کے مقبرے ہیں جنکی علامتی عمارتیں سطحِ زمین پر موجود ہیں، لیکن ان کے زیرِ زمین مقبروں کا راستہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ صرف ایک بادشاہ چوای چن (جس کا لقب وان لی ہے) کا زیرِ زمین مقبرہ اٹھائیس سال پہلے دریافت ہو سکا ہے۔

اور یہ دریافت بھی اس طرح ہوئی کہ وان لی کے مقبرے کی سطحی عمارت سے کافی فاصلے پر کچھ کھیت تھے۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کاشتکار کو ہل چلاتے ہوئے زمین میں کسی کتبے کی شکل کے پتھر کے آثار نظر آئے، اس کتبے پر زیرِ زمین مقبرے تک پہنچنے کے لیے ایک خاص سمت میں زمین کھودنے کی ہدایات تھیں، وہاں تک کھدائی کی گئی تو ایک اور کتبہ ملا۔ جس میں مزید ہدایات دی گئی تھیں، ان ہدایات کے مطابق کھدائی کرتے کرتے مقبرے کا دروازہ برآمد ہو گیا۔ اس دروازے کو کھولنے کا طریقہ بھی خفیہ نوعیت کا تھا، بہرصورت! یہ دروازہ کھلا تو اندر ایک عظیم الشان ہال نظر آیا جس میں بادشاہ کا تابوت رکھا ہوا تھا۔

ہم وان لی کے مقبرے کی سطحی عمارت سے کافی دور چل کر کھیتوں میں پہنچے تو وہاں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں اُترنا شروع کیا تو ۱۴-۱۴ سیڑھیوں کے ایک درجن کے قریب زینے طے کرنے پڑے۔ اِس کے بعد اندرونی مقبرے کا دروازہ نظر آیا۔ اس دروازے کے دونوں کواڑ ٹنوں وزنی پتھر کے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا کواڑ ایک ہی پتھر ہے، بہت سے آدمی مل کر بھی دروازے کو سرکا نہیں سکتے، ہاں اس میں کچھ عجیب و غریب قسم کی کلیں لگی ہوئی ہیں، جنہیں دروازہ کھولنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ دروازے میں داخل ہونے کے بعد ایک شاندار ہال سامنے آتا ہے جو ۱۷،۲۳۴ (ستاسی اعشاریہ چونتیس) میٹر لمبا ہے۔ ہال کا مجموعی رقبہ ۱۱۹۵ مربع میٹر ہے، اور یہ تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصے میں بادشاہ کا دیوہیکل تابوت اور اس کے اردگرد نسبتہً چھوٹے بہت سے تابوت رکھے ہیں جن میں زر و جواہر وغیرہ بھرے گئے

تھے، دوسرے حصے میں پتھر کی بنی ہوئی کرسیاں، تخت، بڑے بڑے لگن وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، اور تیسرا حصہ خالی ہے۔ یہاں ایک بورڈ نصب ہے جس پر لکھا ہے کہ اس ہال کی تعمیر کا آغاز ۱۵۸۴ء میں ہوا، یہ چھ سال میں مکمل ہوا، اور اس کی تعمیر میں ۴ لاکھ کیلوگرام چاندی خرچ ہوئی۔

ہال کے اس حصے کے ختم پر باہر نکلنے کے لیے سیڑھیاں بنائی ہوئی ہیں جو مقبرے کی سطحی عمارت پر جاکر ختم ہوتی ہیں، یہاں یہ سیڑھیاں داخلے کی سیڑھیوں سے کافی کم یعنی ۱۱۵ سیڑھیاں ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے یہ "منگ مقبرے" ایک تاریخی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن دیدۂ بینا ہو تو در اصل یہ عجیب و غریب عبرت گاہ ہے، جو لوگ تعمیر اور سنگتراشی میں اس حیرت انگیز ذہانت، دیدہ ریزی اور مہارت و صناعی کا ثبوت دے سکتے ہیں، وہ اتنی سامنے کی حقیقت تک سے جاہل تھے کہ مرنے کے بعد زر و جواہر کے یہ انبار مرنے والے کے لیے مٹی کے ڈھیلوں سے زیادہ بے قیمت ہیں۔ جو لوگ حملہ آوروں کے دفاع کے لیے دیوارِ چین اور شہرِ ممنوعہ تعمیر کر سکتے تھے، وہ موت کے حملے کو روکنے کے لیے کوئی دیوار کھڑی نہ کر سکے، اُن کی پُرشکوہ فصیلیں بھی ملک الموت کا راستہ نہ روک سکیں، انجام اُن کا بھی وہی ہوا جو ایک بے سر و سامان مزدور اور ایک بے وسیلہ کسان کا ہو سکتا تھا۔ اس حقیقت کے تصور سے اپنے ہی یہ اشعار یاد آ گئے ؎

جو مرکزِ اُلفت تھے، جو گلزارِ نظر تھے	سڑتے ہیں تہِ خاک وہ اجسامِ بُتاں آج
وہ دبدبہ جن کا تھا کبھی دشت و جبل میں	وہ تاجِ سکندر ہے، نہ وہ تختِ کیاں آج
وہ جن کے تہوّر سے دہلتی تھیں زمینیں	ڈھونڈے سے بھی اُن کا کہیں ملتا نہ نشاں آج
تھی جن کی جھلاجھل سے چکا چوند نگاہیں	عبرت کے کھنڈر ہیں وہ محلاتِ شہاں آج
جن باغوں کی نکہت سے معنبر تھیں فضائیں	ہے مرثیہ خواں اُن پہ ہبولوں کی زباں آج

گریٹ ہال میں ضیافت

اسی روز شام کو ۵ بجے چین کے وزیر اقلیتی اقوام مسٹر ابراہیم یان چینگ زین سے

گریٹ ہال میں ملاقات کا پروگرام تھا۔ یہ خود مسلمان ہیں اور صوبہ "کانسو" سے تعلق رکھتے ہیں، چین کی حکومت میں اُن کو بڑا سینئر مقام حاصل ہے، اقلیتی قومیتوں کے امور کے مرکزی وزیر ہونے کے علاوہ چین کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی ہیں۔

ٹھیک ۵ بجے ہم گریٹ ہال پہنچے، جو نئے چین کی تعمیرات میں مشہور اور ممتاز عمارت ہے، اور پیپلز اسکوائر (تھیان آن من) کے کنارے واقع ہے۔ یہ عمارت چین کا پارلیمنٹ ہاؤس بھی ہے، اس میں وزراء کے چیمبر بھی ہیں، ہر صوبے کے ارکان پارلیمنٹ کے لیے الگ الگ ہال بھی ہیں جس میں وہ باہم مشورے کرسکیں، غرض کمروں اور ہالوں کا ایک جہان ہے، اور مشہور یہ ہے کہ اس کا مرکزی ہال دُنیا کا سب سے بڑا ہال ہے جس کے بیچ میں کوئی ستون نہیں، اور اتنا بڑا ہے کہ اس میں فٹ بال کھیلی جاسکتی ہے۔

اسی عمارت کے ایک حصے میں مسٹر ابراہیم یان چینگ زین نے وفد کا استقبال کیا یہاں پاکستانی سفارت خانے کے منسٹر بھی ملاقات میں شامل ہونے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ مسٹر ابراہیم یان چینگ زین نے اس معاملے میں خاص طور پر حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے چینی حجاج کو حجازِ مقدس بھیجنے کا انتظام کیا ہے، اور اس کے ذریعہ امسال دو ہزار حجاج نے فریضۂ حج ادا کیا، اور اس دوران پاکستانی حکومت اور عوام نے چینی مسلمانوں کا بڑا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کی بہترین میزبانی کی۔ ان سے رسمی گفتگو کے بعد احقر نے چینی مسلمانوں کے ساتھ مزید تعاون کے لیے تین تجاویز پیش کیں۔

(۱) چینی مسلمان کچھ نوجوانوں کو تیار کرکے اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے پاکستان بھیجیں تو ہم اپنے دینی تعلیم کے معیاری اداروں میں ان کی مکمل تعلیم، قیام و طعام اور جملہ ضروریات کی کفالت کا انتظام کرسکتے ہیں۔ اس طرح چینی مسلمانوں میں اچھے معیار کے علماء تیار ہوسکیں گے جو اپنے علاقوں میں دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۲) دینی علوم کے پانچ سالہ نصاب کے جو چند مدارس بیجنگ، کانسو وغیرہ میں قائم ہیں اُن میں تدریس کے لیے پاکستان سے زائر اساتذہ (Visiting Lecturers)

کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) چین میں اسلامی علوم کی جن کتابوں کی ضرورت ہو، ہم پاکستان سے اپنے چینی مسلمان بھائیوں کے لیے انہیں بھیجنے کا انتظام بھی کر سکتے ہیں۔

جناب ابراہیم یان چینگ زین نے اس پیشکش کا شکریہ کے ساتھ خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان اُمور کی عملی تفصیلات کے لیے متعلقہ حکام آپ کے سفارت خانے کی وساطت سے آپ سے رابطہ پیدا کریں گے۔

مغرب کے بعد جناب ابراہیم نے گریٹ ہال ہی کے ایک حصّے میں وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ لیکن اُنہیں اچانک ایک دوسری سرکاری ملاقات کے لیے جانا پڑ گیا، اس لیے وہ محکمہ مذاہب کے ڈائریکٹر جنرل کو (جنہیں چین کا وزیر مذہبی امور کہنا چاہیئے) اپنی نمائندگی کے لیے چھوڑ کر خود چلے گئے۔ عشائیہ کے دوران ان سے مذکورہ امور کی عملی تفصیلات کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

---

(۲)

نائب صدر سپریم کورٹ کی طرف سے ظہرانہ:

۷۔ نومبر کی دوپہر بارہ بجے چینی سپریم کورٹ کے نائب صدر مسٹر رین جیانگزن (Ren Jianxin) نے وفد کے اعزاز میں ظہرانہ کا اہتمام کیا تھا۔ پاکستان کی طرح چین میں بھی سپریم کورٹ (جسے سپریم پیپلز کورٹ کہتے ہیں) ملک کی اعلیٰ ترین عدالت ہے، اور مسٹر رین جیانگزن اُس کے نائب صدر ہیں، جن کی حیثیت نائب چیف جسٹس کی ہے، اور وہ صدر سپریم کورٹ کے بعد عدالت کے سب سے بڑے سینئر جج ہیں۔

اس دعوت کا اہتمام مسٹر جیانگزن نے بیجنگ کے ایک ممتاز اسلامی ریسٹورنٹ میں کیا تھا۔ انہوں نے اپنی مختصر خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ چین اور پاکستان کے درمیان زندگی کے

مختلف شعبوں میں تعاون اور وفود کے تبادلوں کا سلسلہ جاری، بلکہ روز افزوں ہے۔ لیکن عدلیہ کی سطح پر باہمی ملاقاتوں اور وفود کے تبادلوں کی بہت کمی ہے، اس مرتبہ ہمیں خوشی ہے کہ علماء کے اس خیرسگالی وفد کی قیادت پاکستانی عدلیہ کے ایک رکن کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس ملاقات کا اہتمام کیا ہے، تاکہ دونوں ملکوں کی عدلیہ کے درمیان روابط کا ایک اچھا آغاز ہو۔

احقر کی مختصر جوابی تقریر کے بعد اُن سے چین کے نظامِ عدل کے بارے میں دلچسپ گفتگو رہی، چین کے عدالتی نظام کے متعلق جو قابلِ ذکر امور اُن سے معلوم ہوئے اُن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) چین میں عدالتوں کی چار سطحیں ہیں:

(الف) بنیادی عوامی عدالتیں (جو ہمارے ملک کے مجسٹریٹ کی عدالتوں کے مشابہ ہیں، لیکن براہِ راست عدلیہ کے ماتحت ہیں، انتظامیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں)۔ یہ عدالتیں کاؤنٹیوں، اور اضلاع کی سطح پر قائم ہیں۔

(ب) پریفیکچروں (ڈویژنوں) مرکزی حکومت کے تحت بلدیات کی انٹرمیڈیٹ عوامی عدالتیں۔ (جو ہمارے عدالتی نظام کی سول اور سیشن عدالتوں کے مشابہ ہیں)

(ج) صوبوں کی عدالت ہائے عالیہ

(د) سپریم پیپلز کورٹ

ان کے علاوہ کچھ خصوصی عدالتیں خاص قسم کے مقدمات کے تصفیہ کے لیے بھی قائم ہیں۔

(۲) عدالتِ عظمیٰ (سپریم پیپلز کورٹ) تمام مقامی اور خصوصی عدالتوں کی نگرانی کرتی ہے اور اپنا اصلی (original) اور اپیلیٹ (Applellate) اختیارِ سماعت بھی قانون کے مطابق استعمال کرتی ہے۔

(۳) دیوانی مقدمات میں چینی عدالتیں باقاعدہ مقدمے کی کارروائی سے قبل مصالحتی

کارروائیوں پر بہت زور دیتی ہیں۔ اس غرض کے لیے ملک بھر میں ۹ لاکھ ۲۹ ہزار سے زائد عوامی مصالحتی کمیٹیاں قائم ہیں۔ جن میں پینتالیس لاکھ چھہتر ہزار افراد ثالثی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ افراد کارخانوں، کانوں، دیہات اور مختلف محلوں میں تعینات ہیں، اور ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ تنازعے کو عدالت تک پہنچنے سے پہلے باہمی گفت وشنید سے ختم کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ عدالت بھی پہلے مرحلے میں فریقین کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرتی ہے، اس غرض کے لیے بسا اوقات جج کو کمرۂ عدالت سے باہر فریقین سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات جج خود فریقین کے رہائشی مقامات پر جا کر دوسرے عوام کی مدد سے فریقین کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں بسا اوقات مصالحت ہو جاتی ہے، اور تنازعہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن اگر مصالحت کی کارروائی ناکام ہو جائے تو پھر باقاعدہ مقدمے کی قانونی کارروائی کرکے فیصلہ کیا جاتا ہے۔

(۴) عدالتی کارروائی کا طریق کار دو فریقی نظام (adversary System) کے بجائے تفتیشی نظام (Enquisitorial System) سے قریب تر ہے، چنانچہ جج صرف فریقین کے بیانات اور دلائل سننے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ مقدمے کی کارروائی کو تحقیقِ واقعات کے لیے استعمال کرتا ہے، چنانچہ گواہوں سے واقعے کے بارے میں خود بھی بکثرت سوالات کرتا ہے، ضرورت کے مواقع پر اضافی شہادتیں (Additional Evidence) طلب کرکے ان کے بیانات ریکارڈ کرتا ہے، اور فوجداری مقدمات میں بوقتِ ضرورت جائے واردات پر جا کر اس کا معائنہ بھی کرتا ہے۔

(۵) احقر نے سوال کیا کہ یہاں اعلیٰ عدالتوں کو رٹ کا اختیارِ سماعت (Writ Jurisdiction) بھی حاصل ہے؟ اوّلاً ان حضرات نے "رٹ" کی اصطلاح سے ناواقفیت کا اظہار کیا، پھر جب احقر نے اس کی تشریح کی تو انہوں نے جزوی طور پر

ایسے اختیارِ سماعت کا اقرار کیا، لیکن ان کے جواب سے احقر کا تاثر یہی تھا کہ رٹ کا جو مفہوم اور طریقِ کار ہمارے ملک میں رائج ہے، وہاں اس تفصیل کے ساتھ اس کا تصور موجود نہیں ہے۔

(۶) ملک میں فوجداری مقدمات کی تعداد دیوانی مقدمات کے مقابلے میں زائد ہے، اور فوجداری مقدمات میں بھی چوری کے مقدمات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

مسٹر جیانگزن باوقار اور شگفتہ انسان ہیں، اور دوسرے جج صاحبان کی مدد سے ہمارے سوالات کا اطمینان، بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ جواب دیتے رہے، قانونی اصطلاحات کی وجہ سے ہمارے چینی ترجمان مسٹر خوین نے درخواست کی تھی کہ اگر آپ ان سے انگریزی میں گفتگو کریں تو زیادہ بہتر ہے، تاکہ ترجمانی کی مشکلات پیدا نہ ہوں، چنانچہ یہ گفتگو بیشتر انگریزی میں ہی ہوتی رہی، مسٹر جیانگزن کچھ دیر انگریزی میں جواب دیتے رہے، لیکن پھر انہوں نے عدالت کے ایک ترجمان کی مدد لی، جو انگریزی زیادہ روانی سے بول سکتا تھا، چنانچہ باقی گفتگو ان کی وساطت سے ہوئی۔

یہاں سے ہمیں صوبہ کانسو کے دورے کے لیے ڈیڑھ بجے ایئرپورٹ روانہ ہونا تھا، اس لیے میزبانوں نے بھی ہر کام میں وقت کے اختصار کا خاص خیال رکھا، اور ٹھیک ڈیڑھ بجے بڑے تپاک کے ساتھ ہمیں رخصت کر دیا۔

صُوبہ کانسو کا سفر:

چین میں سب سے زیادہ مسلمان صُوبہ سنکیانگ میں آباد ہے، اس لیے قدرتی طور پر ہمیں وہاں جانے کی خواہش تھی، لیکن چونکہ ہمارے قیامِ چین کی مدت مختصر تھی اس لیے ہماری میزبان تنظیم نے دو وجہ سے سنکیانگ کے بجائے صوبہ کانسو اور صوبہ چھینگ ہائی کا پروگرام رکھا، اوّل تو اس لیے کہ مسلم ممالک سے جو وفود آتے ہیں وہ بار بار سنکیانگ کا دورہ کر چکے ہیں، لیکن کانسو اور چھینگ ہائی میں اب تک کوئی باقاعدہ وفد نہیں گیا حالانکہ ان دونوں صوبوں میں بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ دوسرے اس لیے

کہ سنکیانگ میں شدید سردی شروع ہو چکی تھی، اور برف باری کی وجہ سے وہاں کی پروازیں بھی مشکوک ہو گئی تھیں، پچھلی مرتبہ ایک پاکستانی وفد سنکیانگ میں موسم کی خرابی کی بنا پر پھنسا رہا تھا۔

۴، نومبر کو سپریم کورٹ کی ضیافت سے فارغ ہو کر نکلے تو آسمان پر ابر تھا، اور ہلکی ہلکی بارش اور تیز ہواؤں کے سبب درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب پہنچا ہوا تھا ایئرپورٹ پہنچے تو موسم کی خرابی کی بنا پر تمام پروازیں معطل تھیں، اس لیے تقریباً دو گھنٹے وی آئی پی لاؤنج میں انتظار کرنا پڑا۔ اس سفر میں پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکریٹری مسٹر حسن جاوید بھی ہمارے وفد کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، جو ایک فعال اور باخبر نوجوان ہیں، اور چینی زبان بڑی روانی سے بولتے ہیں، نیز چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل جناب سلیمان بطور میزبان ہمارے ساتھ تھے۔

تقریباً ساڑھے چار بجے ہم چائنا ایئرلائنز کے ٹرانڈنٹ طیارے میں سوار ہوئے، اور تقریباً پونے دو گھنٹے کی پرواز کے بعد کانسو کے دارالحکومت لانچو پہنچے۔ اُترنے سے پہلے پائلٹ نے اعلان کیا کہ زمین پر درجۂ حرارت صفر سے ۴ سینٹی گریڈ کم ہے۔ طیارے سے باہر نکلے تو شدید برفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، لیکن ایپرن پر استقبال کرنے والے ہجوم کی گرمجوشی نے موسم کی شدت کو بھلا دیا۔ وی آئی پی لاؤنج میں مغرب کی نماز ادا کر کے ہم شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں شہر ایئرپورٹ سے ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، اس لیے شہر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ سے زائد وقت صرف ہوا۔

لانچو صوبہ کانسو کا دارالحکومت اور چین کا مشہور صنعتی شہر ہے، جو شہرۂ آفاق دریائے زرد کے دونوں طرف آباد ہے۔ دریائے زرد چین کا دوسرا طویل ترین دریا ہے۔ اس کی لمبائی پانچ ہزار چار سو تریسٹھ کیلومیٹر ہے، اور اس کے طاس کا رقبہ سات لاکھ چون ہزار چار سو تینتالیس مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ دریا صوبہ چھینگ ہائی میں کوہ بایان ہار کی شمالی سمت سے نکلتا ہے، اور متعدد صوبوں سے گذرتا ہوا شان تونگ کے علاقے میں بحیرۂ پوھائی کے اندر جا گرتا ہے، دریائے زرد کی وادی چین کی تہذیب وثقافت کا گہوارہ

رہی ہے، اس لیے اسے "گہوارۂ چین" کہا جاتا ہے۔

اس دریا کو دریائے زرد اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں دُنیا کے تمام دریاؤں کی نسبت زیادہ گاد ہوتی ہے۔ یہ ہر سال ایک ارب ساٹھ کروڑ ٹن گاد بہا کر زیریں وادی تک لاتا ہے، جہاں اس کا بہاؤ سُست ہو جاتا ہے، اور تہہ میں کیچڑ جمع ہوتی رہتی ہے، اس کیچڑ اور گاد کی وجہ سے دریا اتنا اُتھلا ہو گیا ہے کہ کناروں پہ اونچے اُونچے پُشتے تعمیر کیے گئے ہیں، اور یہ سطح زمین سے بلند دریا بن گیا ہے۔

دریائے زرد میں اکثر و بیشتر سیلاب آجاتا ہے جس کی بنا پر بڑی تباہی مچتی تھی، اور کہا جاتا ہے کہ اس دریا نے تاریخ میں چھبیس مرتبہ اپنا رُخ تبدیل کیا جس کے نتیجے میں چینی عوام کو بڑے مصائب اُٹھانے پڑے، یہاں تک کہ اس کا لقب "چین کا ناسور" مشہور ہو گیا۔ بالآخر حکومت نے اس کی بالائی اور وسطی وادیوں میں ذخیرِ آب کے بڑے بڑے منصُوبے تعمیر کیے ہیں، اور زیریں وادیوں میں پشتوں کو مستحکم کیا ہے، جس کے نتیجے میں اس دریا سے ہونے والی تباہ کاریاں بہت کم ہو گئی ہیں۔

صوبۂ کانسو کی کُل آبادی ایک کروڑ نوے لاکھ ہے، جس میں بارہ لاکھ مسلمان ہیں، اور پورے صوبے میں تقریباً بارہ سو مسجدیں ہیں۔ اور اس صوبے کے دارالحکومت لانچو کی آبادی بارہ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد ستر ہزار ہے۔ اور بڑی مسجدیں پچاس سے زائد ہیں، یہاں کی مرکزی مسجد میں جو دریائے زرد کے کنارے واقع ہے، دینی تعلیم اور ائمہ کی تربیت کا ایک مدرسہ بھی ہے جس میں وہی پانچ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے جو بیجنگ کے مدارس میں مروّج ہے، اس مسجد کے امام اور مدرسے کے سربراہ شیخ یونس یان سن ایک نورانی صورت بزرگ ہیں، تکلف کے ساتھ عربی بولتے ہیں اور وضع قطع سے لے کر انداز و ادا تک میں سلفِ صالحین کا نمونہ ہیں۔ وہ صوبۂ کانسو کی چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں، اور صوبہ کانسو کے پورے سفر میں ہمارے ساتھ بلکہ احقر ہی کی کار میں تشریف فرما رہے۔ اور راستہ بھر ان سے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں، وہ بہت سے فقہی مسائل پر بھی گفتگو کرتے رہے۔

انہوں نے بتایا کہ بفضلہ تعالیٰ اب چین میں مسلمانوں کی حالت بہت بہتر ہے، جس پر مسلمان بہت خوش ہیں۔ احقر کے بار بار کے سوالات کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ یہاں علماء کا اصل مسئلہ اسلامی کتب کی کمی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میرے پاس حدیث میں صرف "مشکوٰۃ" اور "اللؤلؤ والمرجان" ہے، اور حدیث کی کوئی شرح موجود نہیں، فقہ میں صرف شرح وقایہ اور "رد المحتار" ہے، کوئی اور کتاب موجود نہیں ہے۔

انہی سے یہ افسوسناک بات بھی معلوم ہوئی کہ یہاں مسلمانوں کے درمیان بعض نظریاتی فقہی اور کلامی مسائل میں فرقہ بندی اور تنازعہ بھی موجود ہے، مثلاً "استواء علی العرش" کی حقیقت، مسئلہ رفع یدین، مولود کا جواز اور عدمِ جواز وغیرہ، افسوس اس بات سے ہوا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمانوں کا اصل مسئلہ اپنے دین و ایمان کا تحفظ اور اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت ہے، وہاں اس قسم کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ مسائل حال ہی میں کسی نے اس علاقے میں کھڑے کئے ہیں، ورنہ یہاں کے مسلمان، جو سو فیصد حنفی ہیں، اس سے قبل سیدھے سادے طریقے سے اپنے دین پر عمل کرتے چلے آ رہے تھے۔ مسلمانوں کے درمیان ایسے مسائل کھڑے کر کے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے والوں کے حق میں دعائے ہدایت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ انہیں عقلِ سلیم اور فکرِ مستقیم عطا فرمائے۔ آمین۔

تقریباً آٹھ بجے رات ہم شہر لانچو میں داخل ہوئے، یہاں ایک مقامی ہوٹل میں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا، اسی ہوٹل کے کمرۂ ملاقات میں صوبۂ کانسو کے نائب گورنر جناب شریف نیا صاحب جو ایک مخلص مسلمان ہیں، وفد سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اُن سے تھوڑی دیر وہیں گفتگو رہی، اُس کے بعد اسی ہوٹل کے مطعم میں انہوں نے وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اس عشائیہ میں شہر کے دُوسرے معززین بھی شامل تھے، جن میں جناب حبیب اللہ ما سولین، شیخ یونس یان سن، اور لانچو کی مساجد کے ائمہ حضرات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

جناب شریف نیا صاحب (نائب گورنر صوبۂ کانسو) عشائیہ کے دوران بار بار

حکومتِ پاکستان کا شکریہ ادا کرتے رہے کہ اس نے چینی مسلمانوں کے حج کا انتظام کیا، انہوں نے آئندہ سال خود بھی حج کے لیے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ کھانے کے دوران صوبہ کانسو میں مسلمانوں کے حالات بیان کرتے رہے۔ رات گیارہ بجے کے قریب یہ دلچسپ نشست برخاست ہوئی۔

لن شا کا سفر:

صبح سویرے ہم صوبہ کانسو کے ایک اور شہر لن شا کے لیے روانہ ہوئے یہ اپنے پریفیکچر (ڈویژن) کا صدر مقام ہے، اور کاروں کے ذریعے لانچو سے اس شہر کا راستہ تقریباً پانچ گھنٹے کا ہے۔ لانچو سے شیخ یونس یاں سین (صدر صوبائی چائنا مسلم ایسوسی ایشن) اور جناب حبیب اللہ ماسولین (نائب صدر صوبائی سیاسی مشاورتی کمیٹی) اور ایک اور نائب صدر یوسف مائن بھی ساتھ ہو گئے، اس طرح پانچ کاروں اور ایک ویگن کا یہ قافلہ سڑک کے ذریعے لانچو سے روانہ ہوا۔ یہ راستہ زیادہ تر پہاڑی علاقوں سے گزرتا تھا، سردی شدید مگر خوشگوار تھی، درجہ حرارت صفر سے بھی کافی نیچے گرا ہوا تھا، اور جا بجا پہاڑوں پر اور وادیوں میں برف پڑی ہوئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم نے ایک دریا (دریائے تھاؤخہ) عبور کیا تو سامنے چند جیپیں اور ایک ہجوم کھڑا نظر آیا، جس نے اشارے سے ہماری گاڑیاں رکوائیں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لن شا شہر کے لوگ ہیں، چونکہ دریائے تھاؤخہ کے پار لن شا پریفیکچر (ڈویژن) کی سرحد شروع ہوتی ہیں، اس لیے یہ اپنے ڈویژن کی سرحد پر وفد کا استقبال کرنے آئے ہیں، ان لوگوں میں لن شا ڈویژن کے کمشنر، ڈپٹی کمشنر، محکمۂ مذاہب کے اعلیٰ افسران اور لن شا کی مساجد کے ائمہ و خطباء حضرات شامل تھے۔ یہاں سے لن شا شہر تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے، اور ان حضرات کے اس وقت یہاں موجود ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ طلوعِ فجر سے کافی پہلے سخت سردی میں جیپوں کے ذریعے سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ ان کی اس گرم جوش محبت نے بڑا

متاثر کیا۔ زبان نہ جاننے کی بنا پر ان حضرات سے براہِ راست گفتگو ممکن نہ تھی، لیکن ان کے چہروں سے جو محبت اور جو خلوص ہویدا تھا، وہ الفاظ کی ترجمانی سے ماورا تھا۔ کاروں سے اُتر کر ان حضرات سے بغلگیر ہونے اور زبانوں کے اختلاف کے باوجود گرمجوشی کے ساتھ "السلام علیکم" کا واحد مشترک جملہ ادا کرنے کا منظر بڑا پُرکیف تھا۔

یہاں سے ہمارے قافلے میں تین جیپوں کا اضافہ ہو گیا، اور اب آٹھ گاڑیوں کا یہ کارواں جس میں سب سے آگے ڈویژنل کمشنر کی گاڑی پائلٹ کے فرائض انجام دیتی ہوئی چل رہی تھی، جس بستی سے گزرتا وہاں عوام کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتی، اور ان عوام میں اکثر کے سروں پر گول ٹوپیاں اس بات کی علامت تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو پاکستانی وفد کی آمد کی اطلاع کسی طرح ہو چکی تھی، اس لیے جہاں سے ہمارا قافلہ گذرتا، لوگ کھڑے ہو ہو کر اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔

لن شا پریفیکچر صوبۂ کانسو کا وہ ڈویژن ہے جس میں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے، اس لیے اس ڈویژن کو "چین کا مکہ" کہا جاتا ہے، اِس ڈویژن میں کُل آبادی ۱۴٫۳ لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۵٫۷ لاکھ بتائی جاتی ہے، گویا ۵٫۲ ۵ فیصد مسلمان ہیں اور صرف اس ڈویژن میں مساجد کی تعداد ۱۷۱۵ ہے۔ لیکن احقر کا اندازہ یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر مردم شماری نہ ہونے کی وجہ سے یہ اعداد و شمار پوری طرح صحیح نہیں ہونگے۔ اور غالباً یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۲ فیصد سے کافی زیادہ ہوگا۔ اس لیے کہ راستے میں جتنے دیہات ہمارے سامنے آئے، اُن کی ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت نمایاں محسوس ہوئی۔

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے، ان میں مسلمانوں کی شناخت تو ٹوپی سے بآسانی ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ عورتوں میں مسلمانوں کی شناخت اس طرح ہوتی ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے سروں پہ اوڑھنیاں باندھتی ہیں۔ برقع اور نقاب وغیرہ کا تصور تو یہاں موجود نہیں ہے، لیکن دیہات میں سروں پہ اوڑھنیوں کی خاصی شدت سے پابندی کی

جاتی ہے، اور ان اوڑھنیوں میں بھی ان خواتین نے ایسی تقسیم کر رکھی ہے جو کسی اور خطے میں کبھی نظر نہیں آئی۔ یہاں قاعدہ یہ ہے کہ کنواری لڑکیاں سر پر سبز اوڑھنیاں باندھتی ہیں۔ شادی شدہ اور ادھیڑ عمر عورتیں سیاہ اوڑھنیاں استعمال کرتی ہیں اور بوڑھیاں سفید اوڑھنیاں۔ عموماً جب کسی عورت کے یہاں پوتا یا نواسہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ سیاہ اوڑھنی کی بجائے سفید اوڑھنی استعمال کرنا شروع کر دیتی ہے۔ سڑکوں پر سبز اوڑھنی والی لڑکیاں بہت کم نظر آئیں، زیادہ تر سیاہ اور سفید اوڑھنیاں دکھائی دیں، غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کو عام طور پر گھر سے باہر نہیں نکالا جاتا۔

بہرکیف! مردوں میں ٹوپیوں سے اور عورتوں میں اوڑھنیوں سے اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

راستے میں دیہات میں متعدد مسجدیں نظر آتی رہیں، لیکن میزبانوں نے راستے کی ایک بستی میں جو کھان لو کاؤنٹی کا ایک گاؤں تھا، تقریباً نصف گھنٹے ہمارے قیام کا پروگرام رکھا تھا۔ جونہی ہماری گاڑیاں اس گاؤں میں داخل ہوئیں، سڑک پر مسلمانوں کی دو رویہ کھڑی ہوئی قطاروں نے بیک آواز "السلام علیکم" کا نعرہ بلند کیا۔ یہاں سینکڑوں مسلمان نہ جانے کب سے اس قافلے کے منتظر کھڑے تھے، اور جب ہم کاروں سے اترے تو ہر شخص مصافحہ کرنے اور بغلگیر ہونے کے لیے دوسروں سے آگے بڑھ جانے کی فکر میں تھا۔ ان حضرات کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے، اور ان پر وہ بیتابی صاف پڑھی جاسکتی تھی جو اظہارِ محبت و مسرت کا مناسب طریقہ میسر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا پسماندہ اور دور افتادہ گاؤں تھا جس کی آبادی شاید آٹھ دس ہزار سے زائد نہ ہوگی، گاؤں کے بیشتر مکانات خستہ حال، راستے کچے اور جا بجا کیچڑ سے بھرے ہوئے، اور باشندے زیادہ تر غریب ہیں، لیکن اس میں دو بڑی خوبصورت اور کشادہ مسجدیں ہیں۔ پہلے یہ دونوں مسجدیں چھوٹی سی تھیں، ابھی ڈیڑھ دو سال کے دوران انہیں پختہ تعمیر کیا گیا ہے۔ امام صاحبان نے بتایا کہ یہاں چھوٹے مدرسے بھی قائم ہیں جن میں قرآن کریم اور ابتدائی دینیات کی تعلیم ہوتی ہے، نوجوان طلبہ میں سے بیشتر نے

سروں پر بڑے خوبصورت سفید عمامے باندھے ہوئے تھے۔

چونکہ یہ جمعہ کا دن تھا، اور ہمیں نماز لن شا شہر میں ادا کرنی تھی۔ اس لیے گاؤں میں مختصر قیام اور دونوں مسجدوں میں تھوڑی تھوڑی دیر رُکنے کے بعد ہم دوبارہ سفر پر روانہ ہو گئے۔

لن شا کی جامع مسجد میں جُمعہ :

برف پوش پہاڑیوں پر اُترتے چڑھتے ہم دوپہر کے ایک بجے سے ذرا پہلے لن شا شہر میں داخل ہوئے، یہاں قیام کا انتظام ایک صاف ستھرے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ وضو کرتے ہی ہم جامع مسجد میں نماز جُمعہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ جامع مسجد شہر کے بالکل مرکزی چوک کے کنارے واقع تھی۔ ہمارا قافلہ یہاں پہنچا تو لوگوں کے جوش و خروش کا عالم قابلِ دید تھا۔ مسجد کے کافی دُور سے مسلمانوں نے دو رویہ قطاریں بنائی ہوئی تھیں، بہت سے لوگ آس پاس کی دیواروں اور عمارتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ مسجد کا صحن، برآمدہ اور اندرونی ہال ماشاء اللہ نمازیوں سے بھرا ہوا تھا۔

جمعہ سے پہلے مسجد کے امام صاحب نے چینی زبان میں مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد احقر کی تقریر ہوئی جس کا چینی ترجمہ پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری مسٹر حسن جاوید نے کیا، جو بیجنگ سے سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ احقر نے منبر سے دیکھا تو مسجد ماشاء اللہ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، اور کہیں تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دروازوں اور سیڑھیوں پر بھی آدمی تھے، اور سامنے کی سڑک تک پھیلے ہوئے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق مجمع سات آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہوگا۔ احقر نے اپنی تقریر میں ان مسلمانوں کو اپنے دین و ایمان کے تحفظ اور اس دُور افتادہ علاقے میں شمعِ اسلام فروزاں رکھنے پر مبارکباد پیش کی، پاکستان کے عوام کی طرف سے اُنہیں پیغامِ محبت دیا، اور اس بات پر زور دیا کہ وہ ایمان کی اس مقدس امانت کو اپنی آئندہ نسلوں تک بحفاظت پہنچانے کے لیے دینی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

احقر کے بعد مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے بھی مختصر تقریر میں چینی مسلمانوں کے جذبے کو خراجِ تحسین پیش کیا، اور اپنے مشاہدات و تاثرات بیان فرمائے۔

اس کے بعد امام صاحب نے عربی میں خطبہ دیا، خطبہ فصیح عربی زبان میں تھا، اور امام صاحب کے انداز قرأت سے واضح تھا کہ وہ خطبے کا مفہوم سمجھ کر ادا کر رہے ہیں۔

احقر کو شیخ یونس یان سن نے بتایا تھا کہ اس علاقے کے مسلمان جمعہ کے بعد سنتوں کے علاوہ "احتیاط الظہر" کی چار رکعتیں پڑھنے کے عادی ہیں، چنانچہ جماعت کے بعد مسجد سے نکلنے میں خاصی دیر لگی، کیونکہ اکثر لوگ جماعت کے بعد دس دس رکعتیں پڑھ رہے تھے۔ احقر نے شیخ یونس سے عرض کیا تھا کہ شرعاً "احتیاط الظہر" کی رکعتیں پڑھنا پسندیدہ نہیں ہے، اور لوگوں کو حکمت و تدریج کے ساتھ اس طرح یہ مسئلہ بتلانے کی ضرورت ہے جس سے کوئی خلفشار یا فتنہ پیدا نہ ہو، شیخ یونس کی فرمائش پر احقر نے انہیں اس مسئلے کے متعلق فقہاء کرام کے حوالوں کی نشان دہی بھی کر دی تھی، جسے انہوں نے توجہ کے ساتھ سنا، اس کے مطابق عمل کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

نماز جمعہ کے بعد پھر لوگ مصافحے اور معانقے کے لیے جمع تھے، اور مسجد کی محراب سے گاڑیوں تک پہنچنے میں کافی وقت لگا۔ جس میں محبت اور اخلاص کے ساتھ یہ حضرات مصافحے کر رہے تھے اس کے پیشِ نظر ہر شخص سے ہاتھ ملانے کو خود دل چاہتا تھا۔ خدا جانے کس اللہ کے بندے کے ہاتھوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہمارے حالات کی اصلاح فرمادیں۔

جن صبر آزما حالات سے گذر کر ان حضرات نے اپنے دین و ایمان کو بچایا ہے، ان کے پیشِ نظر ان کو ایمان کی حلاوت ہم سے کہیں زیادہ حاصل ہوگی۔ جب یہ خیال آتا تو ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا تھا۔ ان حضرات کو شاید آج سے پہلے چین سے باہر کے کسی مسلمان وفد سے ملنے کا اس طرح موقع نہیں ملا تھا، اور سالہا سال کے بعد غالباً احقر پہلا غیر چینی مسلمان تھا جس نے اس جامع مسجد میں خطاب کیا، اس لیے ان حضرات کے جذباتِ محبت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

جمعہ کے بعد قیام گاہ پر دوپہر کا کھانا کھایا جس کے فوراً بعد لن شا کی دوسری مساجد

میں جانا تھا۔ یوں تو لن شا شہر میں کُل سولہ بڑی مسجدیں ہیں، لیکن یکے بعد دیگرے ان میں سے تین مزید مساجد میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ مسلمانوں کے خیر مقدم کا وہی منظر نظر آیا جو جامع مسجد میں دیکھا تھا۔ ان تینوں مسجدوں میں دینی تعلیم کا بندوبست بھی ہے۔ تینوں مسجدیں بڑی شاندار ہیں، اور حکومت کی امداد سے پچھلے ڈیڑھ دو سال میں تعمیر ہوئی ہیں۔

مساجد کے باہر میزبانوں نے ایک مقامی فیکٹری کے معائنے کا پروگرام رکھا تھا۔ یہ بڑی عظیم الشان فیکٹری ہے جس میں آواز اور عکس سے متعلق آلات اور مشینریاں تیار ہوتی ہیں۔ فیکٹری کے مختلف حصے کئی کیلومیٹر میں پھیلے ہوئے ہیں، یہاں مزائل کے ساتھ فٹ ہونے والے کیمرے، چھوٹے بڑے ٹیپ ریکارڈ، ان اشیاء میں استعمال ہونے والی مشینری اور فاضل پُرزے تیار ہوتے ہیں۔ فیکٹری کے مینیجر نے متعدد اشیاء دکھاتے ہوئے بتایا کہ یہ اشیاء چین ہی کی ایجاد ہیں، اور ابھی دنیا میں کہیں اور پیدا نہیں ہوتیں۔

فیکٹری کے تکنیکی معیار کے بارے میں اظہارِ رائے تو کوئی ماہرِ فن ہی کر سکتا ہے، لیکن عامیانہ نظر سے یہ اپنے میدان کی بڑی معیاری فیکٹری نظر آتی ہے، اور جس چیز نے احقر کو بڑا متاثر کیا، وہ فیکٹری کی عمارت اور اس میں کام کرنے والوں کی سادگی تھی عمارت ایسی ہے کہ باہر سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ کوئی عظیم الشان تکنیکی ادارہ ہوگا۔ پوری عمارت میں آرائش و زیبائش کی کوئی چیز نظر نہیں آئی، پرانے طرز کی عمارت ہے جس کا فرش تک سادہ سیمنٹ کا ہے، دفاتر وغیرہ معمولی درجے کے ہیں، لیکن اس میں صنعتی اور تکنیکی اعتبار سے کام بڑا عظیم الشان ہو رہا ہے، اور تمام مالی وسائل اس اصل کام پر صرف ہو رہے ہیں۔ کاش! کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا یہ زریں اصول، جو درحقیقت اسلام کی تعلیم ہے، ہم بھی اپنانے کے قابل ہو سکیں۔

اس دن کا اختتام ایک خوبصورت پارک میں ایک استقبالیہ سے ہوا جو لن شا پریفیکچر کے کمشنر نے ہمارے وفد کے اعزاز میں دیا تھا۔ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر دونوں مسلمان تھے، اور لن شا کی حدود کے آغاز سے ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں ڈپٹی کمشنر نے بڑی پُرجوش اور محبت بھری تقریر کی۔ احقر نے بھی اپنی جوابی تقریر میں اپنے دورے کے تأثرات تفصیل سے

تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ محبت اور مسرت کے جو جذبات ہمارے دلوں میں موجزن ہیں، ان کے اظہار کے لیے ہمارے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں۔

مغرب کی نماز اسی پارک میں ادا کرنے کے بعد ہم قیام گاہ پر واپس آئے، اور عشاء کے بعد کھانے سے فارغ ہوئے تو طویل سفر اور مسلسل پروگراموں کی تھکن نے جلد ہی بستر کا رُخ کرنے پر مجبور کر دیا۔

چھینگ ہائی کا سفر

۹ نومبر کی صبح سویرے ناشتے کے بعد لن شا سے صوبہ چھینگ ہائی کے دارالحکومت شننگ کے لیے روانگی ہوئی۔ لن شا کے میزبان جن میں لن شا کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر، محکمہ مذاہب کے ڈائریکٹر اور چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے متعدد عہدہ دار شامل تھے، ہمارے اصرار کے باوجود ہمیں لن شا میں رخصت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، ان کا اصرار تھا کہ ہم صوبہ کانسو کی آخری حدود تک وفد کو چھوڑنے کے لیے جائیں گے، چنانچہ وہ حضرات کانسو کی سرحد تک ہمارے ساتھ رہے۔

لن شا سے شننگ جانے کے لیے راستے میں کئی سر بفلک پہاڑ حائل ہیں، جو آجکل برف سے ڈھکے ہوئے تھے، انہی میں سے ایک پہاڑ لاچی کہلاتا ہے، اور اس کی چوٹی اس علاقے کی بلند ترین چوٹی ہے، سطح سمندر سے اس کی بلندی ۲۵۶۰ میٹر ہے۔ یہ چوٹی ہی کانسو اور چھینگ ہائی کے صوبوں کے درمیان سرحد کا کام کرتی ہے۔ ابھی ہم اس چوٹی تک نہیں پہنچ پائے تھے، سڑک کے دونوں طرف پہاڑ تھے، اور دونوں پہاڑوں پر سڑک کے کناروں تک برف کی سفید چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ کہ اس برفستان کی ایک درمیانی وادی میں کئی جیپیں اور کاریں اور ان سے باہر کھڑا ہوا ایک مجمع نظر آیا۔

یہ صوبہ چھینگ ہائی کے لوگ تھے جو شننگ سے ہمارے وفد کے استقبال کے لیے نہ جانے کب سے یہاں کھڑے تھے۔ ان میں صوبہ چھینگ ہائی کے مسلم ایسوسی ایشن کے

صدر شیخ عبداللہ: صوبائی محکمۂ خارجہ کے ڈائریکٹر مسٹر وانگ یان رجن کا درجہ صوبائی وزیر کے برابر ہے، کیونکہ چین میں صوبائی وزیر کا کوئی منصب نہیں ہے، اس کے بجائے متعلقہ محکمے کا سربراہِ اعلیٰ ڈائریکٹر کہلاتا ہے) اقلیتی امور کمیشن کے ڈائریکٹر مسٹر لابن لی اور مذہبی امور کے وائس ڈائریکٹر مسٹر ماشن لو بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں سے شننگ کا فاصلہ تقریباً پانچ گھنٹے کا ہے، لہٰذا اس وقت ان حضرات کے یہاں موجود ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ رات کو چار بجے شننگ سے روانہ ہوئے ہوں گے۔

یہاں سردی لن شا سے بھی کہیں زیادہ تھی، اس لیے یہ حضرات وفد کے تمام ارکان کے عارضی استعمال کے لیے ایک ایک اوورکوٹ ساتھ لائے تھے، جو انہوں نے ہمارے کاروں سے اُترتے ہمیں پہنا دیئے۔ ان میں سے ہر اوورکوٹ کم از کم چھ سات سیر کا ہوگا، اور واقعۃً آگے کی سردی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ جو گرم کپڑے ہم ساتھ لائے تھے، ان کی اوقات یہاں باریک ورق سے زیادہ نہیں تھی۔

اب تک ہم صوبہ کانسو کی گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے، چھینگ ہائی کے میزبان اپنے ساتھ اپنے صوبے سے گاڑیاں لے کر آئے تھے۔ کانسو کے میزبان یہاں ہم سے رخصت ہوگئے۔ اور اب نئی گاڑیوں میں سفر شروع ہوا۔ اب میرے ساتھ گاڑی میں شیخ یونس کے بجائے شیخ عبداللہ تھے جو صوبہ چھینگ ہائی میں مسلم ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔

سالار کاؤنٹی میں

دشوار گذار برفانی چوٹیوں سے گذرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک قصبے میں داخل ہوئے جو سالار کے نام سے مشہور ہے۔ میزبانوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ یہاں کی مساجد اور مدارس کے معائنے کے بعد ہمیں ایک دیہاتی مکان میں دوپہر کا کھانا ہوگا اس کے بعد آگے روانہ ہوں گے۔

سالار کے نام سے یہ کاؤنٹی (ضلع) مسلم اکثریت کی کاؤنٹی ہے۔ پوری کاؤنٹی میں ساٹھ ہزار مسلمان آباد ہیں جن میں سے ۵۱ ہزار سالار قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور

نو ہزار ہوئی تو یہ بت سے۔ اور صرف اس ایک کاؤنٹی میں ۴۹ مساجد ہیں۔ جب ہماری کاروں کا قافلہ اس قصبے میں داخل ہوا تو سڑک کے دونوں طرف مسلمانوں کی قطاریں نہ جانے کب سے منتظر کھڑی تھیں۔ کاروں سے اُترے تو کاؤنٹی کے میئر صالح صاحب، ڈپٹی کمشنر خان شاوین صاحب اور یہاں کی جامع مسجد کے امام شیخ سعید حسن نے وفد کا استقبال کیا۔

یہاں ہم دو مسجدوں میں گئے۔ دونوں بڑی عظیم الشان مسجدیں ہیں، اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی قائم ہیں۔ صوبہ چینگ ہائی میں اب تک کوئی غیر چینی وفد کبھی نہیں گیا تھا، بلکہ اس علاقے میں غیر ملکیوں کی آمد پہلے ممنوع تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہی یہ صوبہ غیر ملکیوں کے لیے کھولا گیا ہے، اس لیے یہاں کے اکثر مسلمان کسی غیر چینی مسلمان کی صورت سے اب تک نا آشنا تھے، اور پہلی بار باہر کے کچھ مسلمانوں کو دیکھنے کے لیے ان کا بیتابانہ اشتیاق قابلِ دید تھا۔ مصافحے کے دوران متعدد افراد کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے نظر آئے۔ اور جب امام صاحب نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس بات پر پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چینی مسلمانوں کو حج پر جانے کے انتظامات کیے ہیں تو ایک صاحب کو میں نے دیکھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ نہ جانے یہ دُور اُفتادہ مسلمان کب سے اپنے سینوں میں حج بیت اللہ کی آرزو چھپائے بیٹھے تھے، اور نہ جانے کتنے لوگ یہ آرزو دل میں لیے دُنیا سے رخصت بھی ہو گئے، اب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حج کا راستہ کھولا ہے تو ان کے سینے مسرت و تشکر کے جذبات سے معمور ہیں، اور اس نعمت پر شکر ادا کرتے نہیں تھکتے۔ یہ حضرات زبان کے اختلاف کی بنا پر الفاظ کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار پر قادر نہیں، لیکن ان کے خلوص و محبت سے لبریز چہرے دل کی داستان سنانے کے لیے کافی تھے، اور ان کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو ان کے اخلاص کی وہ پونجی تھی جو وہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کے سامنے نچھاور کر رہے تھے۔ اس کے ان آنسوؤں میں ماضی کے صبر آزما حالات کی جو رُوح فرسا داستانیں پوشیدہ تھیں ان کے تصور ہی سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے، آفریں ہے ان فرزندانِ توحید پر جنہوں نے حالات کا

مردانہ وار مقابلہ کیا، اور اپنے دین وایمان کو بچا بچا کر صحیح و سلامت عہدِ حاضر تک لے آئے، یہاں تک کہ نہ جانے کتنی مدت کے بعد انہیں اپنے کسی غیر ملکی بھائی کے سامنے اپنے جذبات کے خاموش اظہار کا موقع ملا۔

ایک مسجد سے باہر نکلے تو احاطے میں دو مزار تھے، یہ اُن دو مسلمانوں کی آخری آرام گاہ ہے جو اس قصبے میں اسلام کی روشنی پھیلنے کا سبب بنے۔ مقامی حضرات میں مشہور یہ ہے کہ یہ قارمان اور احمانؔ نامی دو بھائی تھے، یہ دونوں اصل میں سمرقند کے باشندے تھے، کسی وقت سمرقند کا حکمران ان کا دشمن ہوگیا تو یہ ترکِ وطن کر کے ایک اونٹ پر روانہ ہوئے، یہاں ایک چشمہ تھا جس کے کنارے یہ آرام کے لیے اُترے، لیکن جب دوبارہ سوار ہو کر سفر جاری رکھنے کا ارادہ کیا تو اُونٹ نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے اس بات کا غیبی اشارہ سمجھا کہ اسی جگہ اقامت اختیار کر لینی چاہیئے۔ بہ زمانۂ قدیم کے دستور کے مطابق اپنے ساتھ سمرقند کی مٹی اور تھوڑا سا پانی لے کر آئے تھے، انہوں نے اس جگہ کی مٹی اور پانی کو تولا تو اسے سمرقند کی خاک اور پانی کے ہموزن پایا۔ اس سے ان کے ارادے میں مزید تقویت پیدا ہوئی۔ اور یہ یہیں مقیم ہو گئے۔ اب سالار قومیت کے تمام افراد انہی کی اولاد ہیں۔

مسجد سے کچھ فاصلے پر ایک چوبی قبہ بنا ہوا ہے جو ان حضرات کے یہاں ٹھہرنے کی یادگار ہے۔ اسی کے نیچے ایک تالاب ہے جس کے پاس ایک اونٹ کا مجسمہ مذکورہ واقعے کی یاد کے طور پر بنا ہوا ہے۔

مساجد، مدرسے اور مزارات پر حاضری سے فراغت کے بعد مسجد کے امام صاحب ہمیں بستی کے اندر اپنے گھر لے گئے۔ یہ گھر باہر سے کچی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا لیکن اندر سے خاصا کشادہ، آرام دہ اور خوبصورت تھا۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام یہیں تھا۔ یہاں امام صاحب نے سالار قوم کے مخصوص کھانے پکوائے تھے، جو عام چینی کھانوں سے

لہ شاید ان کے اصل نام "قہرمان" اور "عبدالرحمٰن" ہوں۔ تقی

قدرے مختلف ہیں، اور ان میں سے بعض اشیاء پاکستانی کھانوں سے کچھ مناسبت رکھتی ہیں۔ جبکہ چینی کھانے، جن کا ہم اب تک تجربہ کرتے آئے تھے۔ پاکستانی کھانوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی قدرِ مشترک تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غالباً سالار قوم کے کھانوں میں سمرقند کے کھانوں کی خوشبو آئی ہوگی جس کی بنا پر ان میں عام چینی کھانوں سے اختلاف پیدا ہوگیا۔

کھانے کے بعد مسجد میں نمازِ ظہر ادا کی۔ ماشاء اللہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نماز میں شریک تھی۔

نمازِ ظہر کے بعد سفر دوبارہ شروع ہوا، اور کاریں یکے بعد دیگرے بہت سے اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتی اُترتی رہیں۔ نہ جانے کتنے پہاڑ اس دوران عبور کئے۔ انہی پہاڑوں کے درمیان جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی بستیاں آتی رہیں، اور تقریباً ہر بستی میں مسجدیں نظر آئیں۔ ٹوپیوں اور داڑھیوں کی علامت سے مسلمانوں کی تعداد کا بھی اندازہ ہوتا رہا۔ اور بحیثیت مجموعی احقر کا تأثر یہ تھا کہ یہ علاقہ ماشاء اللہ مسلمانوں سے بھرا ہوا ہے۔

صوبہ چینگ ہائی کا رقبہ تو ۷ لاکھ ۲ ہزار مربع کیلومیٹر ہے، لیکن اس کی آبادی چین کے تمام صوبوں میں سب سے کم ہے۔ صوبے کی کل آبادی چالیس لاکھ ہے، جس میں چھ لاکھ مسلمان بتائے جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی احقر کا اندازہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد چھ لاکھ سے یقیناً کافی زائد ہوگی، پورے صوبے میں گیارہ سو سے زائد مسجدیں ہیں جو چین کے حالیہ تغیرات کے بعد (جن کی تفصیل انشاء اللہ آگے ذکر کروں گا) مسلمانوں کے لیے کھول دی گئی ہیں، اور بحمد اللہ نمازیوں سے آباد ہیں۔

سفر کے دوران عصر کا وقت آگیا تو احقر نے میزبانوں سے کہا کہ ہم کسی قریبی بستی میں رُک کر نماز ادا کرنا چاہتے ہیں، تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک چھوٹی سی بستی آئی، ہم نے کاریں رکوکیں، سڑک کے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی کے اوپر مسجد کے مینار نظر آئے، ہم مسجد میں پہنچے تو آس پاس کے مسلمان جمع ہوگئے۔ مسجد میں جماعت ہو چکی تھی، سردی عروج پر تھی، اور وضو خانہ دیہاتی طرز کا تھا، لیکن مسجد کے امام صاحب نے چند ہی منٹ

میں ہمارے لیے گرم پانی کا انتظام کر دیا، اور ہم نے بسہولت مسجد میں نماز ادا کی۔

شننگ شہر میں:

مغرب کا وقت ہو چکا تھا جب ہم شہر شننگ میں داخل ہوئے۔ یہ ایک بارونق اور ترقی پذیر شہر تھا جو کئی ضلعوں پر مشتمل ہے۔ مغربی ضلع کا ایک شاندار سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا، جو جدید ترین سامانِ آسائش سے آراستہ تھا۔ نماز مغرب کے فوراً بعد ملاقات کے کمرہ میں صوبۂ چینگ ہائی کی سیاسی مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین مسٹر شن لینگ (غیر مسلم)، وائس چیئرمین جناب ایوب آئی ین شواں (مسلم)، صوبائی حکومت کے سیکریٹری جنرل مسٹر ماٹر کھو (غیر مسلم)، محکمۂ مذہبی امور کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر تھاؤ شوژین (غیر مسلم) اور چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے وائس سیکریٹری جنرل جناب ماتی فا (مسلم) وفد سے ملاقات کے لیے آئے۔ اس موقع پر وہ تمام حضرات بھی موجود تھے جو چینگ ہائی کی سرحد سے ہمارے ساتھ تھے۔ ان سے مختلف موضوعات پر بالخصوص چینی مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

اس ملاقات کے فوراً بعد مسٹر شن لینگ (چیئرمین سیاسی مشاورتی کمیٹی) نے اسی ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس سے تقریباً ساڑھے دس بجے رات فراغت ہوئی۔

صبح کو ناشتہ کے بعد ہم شننگ کی سب سے بڑی مسجد کے معائنے کے لیے گئے۔ شننگ شہر کی کل آبادی پانچ لاکھ ہے، جس میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار بتائی جاتی ہے، اور شہر کی مسجدوں کی تعداد پینتیس ہے۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے پرانی مسجد "جامع مسجد تنگ کوان" کہلاتی ہے۔ جو پانچ سو سال پرانی ہے، لیکن ثقافتی انقلاب کے خاتمے کے بعد زرِ کثیر کے صرفہ سے اس کی تعمیرِ نو اور مرمت کا کام ہوا ہے، جس میں مسلمانوں کے باہمی چندے کے علاوہ حکومت نے بھی کافی بڑی مالی مدد دی ہے۔ اس مسجد کی وسعت، شکوہ، خوبصورتی اور حسنِ انتظام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ یہاں امامت و خطا

کمرۂ الفضل دہی شیخ عبداللہ شان شین کوئی انجام دیتے ہیں جو صوبائی مسلم ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں، اور چھینگ ہائی کی سرحد سے ہمارے ساتھ تھے۔

مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ہے جس میں ائمۂ مساجد کو تربیت دی جاتی ہے، تربیت کی مدت چھ ماہ ہے۔ اور اُن حضرات کو داخل کیا جاتا ہے جو پہلے سے عربی زبان کے مبادی کے واقف ہوتے ہیں، روزانہ چھ پیریڈ کی تعلیم کے ذریعے اس میں مشکوٰۃ، جلالین اور شرح وقایہ کا معتدبہ حصّہ پڑھایا جاتا ہے، ہم مدرسہ میں گئے تو اس میں مشکوٰۃ شریف کا درس ہو رہا تھا، اور طلباء کی تعداد تقریباً ۲۵ ۔ ۳۰ کے درمیان ہوگی۔ شننگ میں اس روز درجۂ حرارت صفر سے نو درجے نیچے گرا ہُوا تھا، اِس لیے شدید سردی کی بنا پر درسگاہ کے بیچ میں ایک سرپوش والی بہت بڑی انگیٹھی جل رہی تھی، جس کے بعد کمرے کا درجۂ حرارت نسبتۂ معتدل ہوگیا تھا۔ یہاں ہم نے اساتذہ اور طلبہ سے عربی میں باتیں کیں، بعض طلبہ نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں ہمارے سوالات کے جواب دیئے۔

احقر کے سوال پر مقامی حضرات نے بتایا کہ یہاں مسجد کے انتظام کے لیے مسلمانوں کی ایک کمیٹی ہوتی ہے، اور مسجد کی آمدنی چار ذرائع سے حاصل ہوتی ہے، سب سے پہلے تو مسلمانوں کا باہمی چندہ دوسرے بعض مساجد کو حکومت کی طرف سے امداد بھی ملتی ہے، تیسرے بعض مساجد کی مالی امداد چین سے باہر کے بعض مسلم ادارے بھی کرتے ہیں۔ چوتھے مسجدوں کے ساتھ کچھ مستقل ذرائع آمدنی بھی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زیادہ تر مساجد میں بہت سے حمام تعمیر کر دیئے جاتے ہیں، اور عوام سے ان کے استعمال کی فیس وصول کی جاتی ہے، جو مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی ہے۔

جامع مسجد تنگ کوان میں بھی ایسے بہت سے صاف ستھرے حمام بنے ہوئے ہیں۔ وضو کا انتظام بھی بہت اچھا اور صاف ستھرا ہے۔ اس کے علاوہ اس مسجد کے ساتھ ایک کمرہ مُردوں کو غسل دینے کے لیے مخصوص ہے جس میں دو الگ الگ پتھر کے تختے بنے ہوئے ہیں، ایک مَردوں کے غسل کے لیے، اور دُوسرا خواتین کے لیے۔ یہ انتظام احقر نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔

امام صاحب نے بتایا کہ مسجد کے ساتھ ایک خاصا وسیع کتب خانہ بھی ہے، لیکن ثقافتی انقلاب کے دور میں اس کی خاطر خواہ حفاظت نہ ہو سکنے کے سبب ابھی وہ مرتب اور قابلِ استفادہ نہیں ہے۔ دراصل اس مسجد میں انقلاب سے پہلے ایک بڑا دار العلوم قائم تھا، اور یہ کتب خانہ اسی دور کی یادگار ہے۔

بیجنگ کی طرف واپسی

جامع مسجد تنگ کوا کی زیارت کے بعد شننگ سے ہماری روانگی کا وقت آگیا تھا۔ ہمیں یہاں سے بیجنگ جانا تھا۔ لیکن اُس روز شننگ سے بیجنگ کے لیے کوئی پرواز نہیں تھی، اس لیے یہاں سے بذریعہ کار لانچو ایئرپورٹ جانا ضروری تھا جس کا راستہ یہاں سے تقریباً چھ گھنٹے کا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں سے تقریباً دس بجے روانہ ہوئے۔ ایک بجے تک ہمارا سفر صوبہ چھینگ ہائی میں ہی ہوتا رہا، اور یہاں بھی راستے کی بہت سی بستیوں میں مسجدیں نظر آتی رہیں۔ ایک بجے کے قریب احقر نے نماز ظہر کے لیے سفر روکنے کی فرمائش کی تو میزبانوں نے ایک بستی میں قافلہ کو روکا۔ یہ بستی شی ناقی جو دریائے تے تھون کے قریب چھینگ ہائی اور کانسو کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں سڑک کے قریب ہی ایک مسجد بنی ہوئی تھی، لیکن نماز ظہر ہو چکی تھی اور مسجد بند تھی، ہمارے رفقاء میں سے بعض حضرات بستی میں امام صاحب کا مکان تلاش کر کے انہیں بلا لائے، وہ غیر متوقع طور پر وفد سے مل کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ انہوں نے جلدی جلدی گرم پانی کا انتظام کیا، اور ہم نے وضو کر کے نماز پڑھی، دوپہر کے کھانے کے لیے لنچ باکس ہمارے ساتھ تھے، امام صاحب باصرار اپنے گھر سے بھی کھانا لے آئے، اور مسجد کے متصل ایک کمرے میں کھانا کھایا۔ اس کمرے میں چینی دیہات کی روایت کے مطابق ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ جس کے نیچے آتش دان روشن ہونے کی بنا پر وہ تخت کافی گرم رہتا ہے۔ اس تخت پر بیٹھ کر بے تکلفی اور راحت کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔

ہمارے مسجد سے نکلتے نکلتے ہماری آمد کی خبر بستی میں پھیل چکی تھی، اور مسجد کے دروازے پر سینکڑوں مسلمان جمع ہو چکے تھے۔ ہمارے نکلتے ہی انہوں نے باآواز بلند "السلام علیکم" کا نعرہ لگایا، اور مصافحوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور کار تک پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگا۔

ابھی تین گھنٹے کا سفر باقی تھا، یہ سارا سفر صوبہ کانسو میں قطع ہوا۔ اور ہم ٹھیک پانچ بجے لانچو ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ یہاں صوبہ کانسو کے میزبانوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، انہوں نے ایپرن تک رخصت کرنے کے لیے پاس بنوائے ہوئے تھے۔

یہ سب حضرات ایک ایک کرکے بغلگیر ہوئے۔ کئی علماء کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایپرن پر شدید برفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ لیکن جب تک جہاز روانہ نہیں ہوگیا۔ یہ سب حضرات وہیں کھڑے رہے۔ اس خداداد محبت وخلوص کا گہرا نقش دل پر لیے ہم چھ بجے شام بیجنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اور پونے آٹھ بجے کے قریب بیجنگ ایئرپورٹ پر اُترے، جہاں درجۂ حرارت صفر سے چھ درجہ نیچے تھا، اور سائبیریا کی برفانی ہواؤں سے پورا شہر ٹھٹھرا ہوا تھا۔

اگلا دن چین میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا، صبح کے وقت کوئی باقاعدہ مصروفیت نہیں تھی، اس لیے ہم بازار چلے گئے۔ یہ بیجنگ ہوٹل کے قریب بڑا خوبصورت اور بارونق بازار تھا۔ کئی کئی منزلہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور دُور تک پھیلے ہوئے تھے، اور ہر اسٹور میں خریداروں کا اتنا ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا۔ ہر جگہ اشیاء کی قیمتیں معین تھیں، اور مول بھاؤ کا کوئی سوال نہ تھا۔ زیادہ تر چینی مصنوعات تھیں، لیکن کچھ اشیاء، جاپان اور ہانگ کانگ وغیرہ کی بنی ہوئی بھی بِک رہی تھیں۔

دوپہر کو چائنا مسلم ایسوسی ایشن نے سنکیانگ کے باشندوں کے ایک مسلمان ریسٹورنٹ میں الوداعی ظہرانہ دیا تھا۔ میزبانوں کا کہنا تھا کہ آپ سنکیانگ نہ جاسکے تو کم از کم اہلِ سنکیانگ کے ریسٹورنٹ میں ان سے ملاقات کرلیں۔ ریسٹورنٹ کے لوگوں نے بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ ان کے کھانے پاکستان کے شمالی علاقوں کے کھانوں سے

کافی مشابہ تھے، اور ایک ہفتے بعد کھانوں میں پاکستانی خوبو نظر آئی۔

یہاں سے قیام گاہ واپس پہنچ کر فوراً ہی ہم واپسی کے لیے ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔

---

(۴)

مجموعی تاثرات

ہمارے میزبان درست کہتے تھے کہ چین جیسے ملک کے لیے نو دن کی مدّت بالکل ناکافی ہے، ہمیں اپنے دَورے میں یہ حقیقت کھُلی آنکھوں نظر آگئی، اس کے باوجود نو دن کا یہ طوفانی دَورہ بڑا پُرکیف، خوشگوار، معلومات افزا اور مفید رہا۔

سب سے پہلے تو اس دورے سے چین کے مسلمانوں کے بارے میں وہ معلومات حاصل ہوئیں جن کا دُور بیٹھ کر حاصل ہونا مشکل تھا۔ دوسرے ۱۹۴۹ء کے بعد سے چین جس طرح ایک عالمی قوّت کی حیثیت سے اُبھرا ہے، اور اس نے تھوڑی مدت میں عالمی برادری کے اندر جو نمایاں مقام حاصل کیا ہے، اس کے پیشِ نظر اس ملک کے حالات کا کچھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تیسرے یہ ملک اشتراکیت، بلکہ کمیونزم کی دوسری بڑی تجربہ گاہ تھا۔ اور اس میں کمیونزم کے تجربے کے نتائج کا بھی فی الجملہ علم ہُوا۔ میں آخر میں انہی تین حیثیتوں سے اپنے اجمالی تاثرات بالاختصار عرض کرنا چاہتا ہوں۔

چین میں اشتراکیت کا تجربہ:

۱۹۴۹ء سے پہلے چین غیر ملکی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے خانہ جنگی، انتشار، اور بدنظمی کا شکار تھا، اگرچہ پورے چین پر کسی غیر ملکی طاقت کا تسلط نہیں تھا، لیکن استعماری طاقتوں نے اُسے اس طرح اپنے زیرِ اثر لیا ہُوا تھا کہ وہ معنوی اعتبار سے ان کی ایک

کالونی بن کر رہ گیا تھا۔ ان حالات میں ماؤزے تنگ اور اس کے رفقا نے پیہم جدوجہد کے بعد چین میں کمیونسٹ انقلاب برپا کیا۔ اور سنہ ۱۹۴۹ء میں موجودہ "عوامی جمہوریہ چین" کا قیام عمل میں آیا۔

ماؤزے تنگ کٹر کمیونسٹ خیالات کا حامی اور مارکسزم کا اس درجہ علمبردار تھا کہ اس کی شہرۂ آفاق "لال کتاب" میں متعدد مقامات پر روس کے خرشچیف کو "رجعت پسند" اور "بورژوا" طاقتوں کا دلّال قرار دیا گیا ہے۔ گویا ماؤزے تنگ کے خیال میں روس مارکسزم کے راستے پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلا، بلکہ چین نے مارکس کے نظریات کو ٹھیک ٹھیک بروئے کار لانے کا علم اٹھایا تھا۔ چنانچہ ماؤزے تنگ نے برسر اقتدار آنے کے بعد سے اپنی وفات سنہ ۱۹۷۸ء تک چین میں ٹھیٹھ اشتراکی نظام زندگی قائم کرنے کے لیے قول و عمل کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ چنانچہ تعلیم و تبلیغ اور تعمیر ذہن سے لے کر جبر و تشدد تک کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جو ماؤزے تنگ اور اس کے ہم خیال رفقاء نے چین میں نہ آزمایا ہو۔

سنہ ۱۹۴۹ء کے بعد رفتہ رفتہ اشتراکی فلسفے کے مطابق ملک کے تمام وسائل پیداوار سرکاری تحویل میں لیے گئے۔ کئی مرتبہ مختلف انداز سے "زرعی اصلاحات" نافذ کی گئیں، اور بالآخر سنہ ۱۹۵۸ء میں پورے ملک میں "کمیون سسٹم" قائم کر دیا گیا جس کے تحت کوئی زمین کسی کی نجی ملکیت میں نہیں رہی، چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے پاس جو چھوٹے چھوٹے قطعات نجی ملکیت میں باقی رہ گئے تھے، وہ بھی ان سے ضبط کر کے "کمیون" کو دے دیئے گئے، اور اب کاشتکار کی حیثیت ایک مزدور کی رہ گئی۔

دیہی آبادی کو مختلف "کمیونوں" میں تقسیم کر کے انہیں مشترک طور پر زراعت کرنے کا پابند بنایا گیا۔ ان مشترک زرعی فارموں سے جو پیداوار حاصل ہوتی اس کا کچھ حصہ حکومت لے جاتی۔ باقی پیداوار کا ۸۰ فیصد کمیون کی ملکیت ہوتا جس سے علاقے کے ترقیاتی کام بھی کیے جاتے تھے، اور اسے کمیون کے افراد میں بطور اجرت تقسیم بھی کیا جاتا تھا، اور ۲۰ فیصد صرف کام کرنے والے افراد کو ان کے کام کے حساب سے دیا جاتا تھا۔

اسی طرح تمام صنعتیں سرکاری ملکیت قرار دی گئیں، ان میں کام کرنے والے اپنی محنت کے حساب سے تنخواہ کے حق دار ہوتے، لیکن کاروبار کا منافع تمام تر حکومت کے پاس جاتا تھا۔

سنہ ۱۹۶۶ء تک اس نظام کو ملک میں کامیاب بنانے کی کوششیں جاری رہیں، لیکن اشتراکی نظام کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ تمام وسائلِ پیداوار حکومت کے کنٹرول میں آجاتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ حکومت سرکاری ملازمین ہی کے ذریعے چلائی جاتی ہے، اس لیے سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں اور ان کی مطلق العنانی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

دوسری طرف "کمیون سسٹم" کے مذکورہ بالا طریقِ کار میں پیداوار بڑھانے کے لیے کما حقہٗ محنت کا جذبہ سرد پڑجاتا ہے۔

تیسری طرف صنعتی پیداوار پر بھی ذاتی منافع کے محرک کے فقدان کی بنا پر مضر اثر مرتب ہوتا ہے اس لیے حقیقی پیداوار منصوبہ بندی کا ساتھ نہیں دیتی۔

چوتھے جن کاشت کاروں کو ابتدا میں یہ سبز باغ دکھایا جاتا ہے کہ ملک کی ساری زمینیں تمہاری ملکیت ہوجائیں گی، جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ عملاً وہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی ملکیت سے بھی محروم ہوگئے ہیں، اور اب اُن کی آمدنی کا تمام تر تعین حکومت کے ہاتھ میں ہے، جو سرکاری ملازمین کے توسط سے بدعنوانیوں کا ارتکاب بھی کرتی ہے، تو ان کے درمیان اس نظام کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

یہ تمام مسائل چین میں بھی پیش آتے جنہیں حل کرنے کے لیے ابتدا میں لوگوں کے اندر ایک "قومی جذبہ" اور "اشتراکی انقلاب" کی روح پھونکنے پر زور دیا گیا، تاکہ اس جذبے کے ذریعے مذکورہ بالا خرابیوں کو کچلا جاسکے: چنانچہ تعلیمی اداروں سے لے کر گھروں تک "اشتراکی انقلاب" سے محبت اور اس کے لیے خلوص پیدا کرنے کی تبلیغی مہم چلائی گئی، بیرونی اثرات کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے سخت قوانین بنائے گئے، پورا نظامِ زندگی ایسا بنانے کی کوشش کی گئی جس میں سادگی، قناعت پسندی اور حبِ وطن کو فروغ ملے، اور اشتراکی انقلاب کے ساتھ محبت پیدا ہو۔

لیکن ۱۹۶۶ء تک ان تمام تجربات سے گذرنے کے بعد حکومت کو یہ احساس ہوا کہ وہ نوکر شاہی پر قابو پانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکی، دوسری طرف پیداوار میں بھی متوقع ہدف کے مطابق اضافہ نہیں ہوسکا۔ اور ان دونوں باتوں کے لازمی نتیجے کے طور پر عوام میں بھی اس نئے نظام سے بددلی پیدا ہو چلی ہے۔

ثقافتی انقلاب

چنانچہ ۱۹۶۶ء میں ماؤزے تنگ، لن پیاؤ اور ان جیسے انتہا پسند لوگوں نے ایک گہرے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ اس گہرے آپریشن کا نام "ثقافتی انقلاب کی تحریک" تھا، اس تحریک کے مقاصد بڑے متنوع تھے، لیکن بنیادی طور پر اس کا مقصد پرانی نوکر شاہی سے نجات حاصل کر کے ایسی قیادت کو ابھارنا تھا جو اشتراکیت کے ساتھ پوری طرح متفق اور اس کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی ہو۔ اس غرض کے لیے عوام میں ایک مرتبہ پھر انقلابی روح پھونکنے کی کوشش کی گئی، طلبہ کو ریڈ گارڈز بنا کر انہیں بڑے وسیع اختیارات دیئے گئے، عوام سے کہا گیا کہ وہ لوکل باڈیز سے "رجعت پسندوں اور" بورژوا طبقے کے حمایتیوں کو نکال پھینکیں، اور نعرہ یہ دیا گیا کہ "ثقافتی انقلاب" کی تحریک چار پرانی چیزوں (پرانے نظریات، پرانی ثقافت، پرانے رسم و رواج اور پرانی عادتوں[۱]) کے خلاف ایک کھلی جنگ ہے۔ جس میں ہر شخص کو حصہ لینا ہے۔ گویا عوام کے سامنے اس انقلاب کا پروگرام مختصراً یہ تھا کہ ؏

جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جب یہ تحریک چلنی شروع ہوئی تو اس کے ذریعے پورا ملک لاقانونیت، انارکی اور انتشار کی آماجگاہ بن گیا۔ بستی بستی لوکل باڈیز سے پرانے افراد کو نکالنے کی جدوجہد

---

[۱] "چار پرانی چیزوں" (Four Olds) کے خلاف یہ قرارداد ۱۹۶۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں مرکزی کمیٹی کے گیارھویں اجلاس میں منظور کی گئی تھی۔

شروع ہوئی۔ تو وہ لوگ مزاحم ہوئے، اور یہ کشمکش بہت سی جگہوں پر خونی تصادم کی صورت اختیار کر گئی۔ جو لوگ تحریک کے کرتا دھرتا تھے، وہ اس تحریک کو اپنے سیاسی حریفوں اور ذاتی دشمنوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے" ریڈ گارڈز نے جس شخص کو چاہا "رجعت پسند، انقلاب دشمن، اور سامراج کا ایجنٹ" قرار دے کر اس کے گھر پر دھاوا بول دیا، اس کی املاک لوٹ لیں، اُسے اور اس کے گھر کے افراد کو جیل میں بند کروا کر انسانیت سوز اذیت رسانی کا نشانہ بنایا۔ اسی دور میں تمام مذہبی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں، مسجدوں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہ صرف بند کر دیا گیا۔ بلکہ ان کو تباہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی، مذہبی کتابوں کا گھر میں رکھنا جرم قرار پایا، اور جو لوگ گھروں کی تلاشی کا وسیع اختیار لے کر گھر گھر گھوم رہے تھے، انہیں اگر کسی گھر میں قرآن شریف کے ایک نسخے کا بھی سراغ لگ گیا تو انہوں نے بعض جگہ پورے خاندان کو تباہ کر ڈالا۔ غرض قتل و غارت گری، بدامنی، خانہ جنگی اور لاقانونیت کا ایک طوفان تھا جس نے ملک بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بیشتر تعلیمی ادارے بند ہو گئے، تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا، پیداوار تشویشناک حد تک گھٹ گئی، یہاں تک کہ اشیاء خورد و نوش کی قلت ایک دردِ سر بن گئی، ایک پاؤ گوشت بازار سے خریدنے کے لیے بھی سرکاری کوپن ضروری تھا، اور یہ کوپن لے کر بھی لمبی لمبی قطاروں میں لگنے کے بعد پاؤ بھر گوشت ملتا تھا۔

پارٹی کے لیڈروں میں ایک نسبتہً اعتدال پسند گروپ اس ساری لاقانونیت کے خلاف تھا، اور اس میں ملک کی تباہی دیکھ کر اعتدال کا رویہ اختیار کرنا چاہتا تھا، اس گروپ میں لیو شاؤ چی، ڈینگ ژیاؤ پنگ اور چو این لائی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن ماؤزے تنگ اُس وقت عمر کے تقاضے سے بڑی حد تک از کار رفتہ ہو چکا تھا، اور اس کے فیصلوں پر وہ انتہا پسند ٹولہ مسلط تھا جس میں خود اس کی بیوی چیانگ چنگ اُستاد دستِ راست لن پیاؤ[1]

---

[1] "ماؤزے تنگ" کے ساتھ "لن پیاؤ" کی حیثیت کچھ ایسی ہی تھی جیسے کارل مارکس کے ساتھ فریڈرک اینجلز کی۔ ماؤ کی لال کتاب پر پیش لفظ بھی "لن پیاؤ" ہی نے لکھا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ان دونوں کے دوسرے رفقا شامل تھے، ان لوگوں نے اعتدال پسند گروپ کو بھی "انقلاب دشمن" قرار دے کر سازشوں کا نشانہ بنایا، لیو شاؤچی کو قتل کرا دیا، ڈینگ زیاؤ پنگ اور اس کے رفقا کو قید و بند کی صعوبتوں سے گذارا، چو این لائی کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کیں، اور ان مقاصد کے لیے سینکڑوں انسانوں کے خلاف بہیمانہ ظلم و ستم کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم چو این لائی کا انتقال ہوا تو اس گروپ کو مزید کھل کھیلنے کا موقع ملا، لیکن عوام ثقافتی انقلاب کی تباہ کاریوں سے عاجز آ چکے تھے۔ چنانچہ اگلے سال اپریل ۱۹۷۶ء میں آنجہانی چو این لائی کی برسی منانے کے لیے لاکھوں کا مجمع بیجنگ کے تیان آن من اسکوائر اور بعض دوسرے شہروں میں جمع ہو گیا جس نے پہلی بار "چار کے ٹولے" کے خلاف عوامی طور پر صدائے احتجاج بلند کی۔ انتہا پسند گروپ نے اسے اپنے حق میں خطرے کی گھنٹی سمجھ کر اس مجمع کے خلاف تشدد کی کارروائیاں کیں اور اخبارات کے ذریعے ان کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم چلائی۔ لیکن عوامی اضطراب انتہا کو پہنچ چکا تھا، اگست ۱۹۷۶ء میں ماؤزے تنگ کا انتقال ہوا تو ہوا کو فنگ کو اس کا جانشین چیئرمین مقرر کیا گیا۔ ہوا کو فنگ اعتدال پسندوں میں شامل تو نہ تھا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ ماؤزے تنگ نے اپنے بعد اس کی جانشینی کے اشارے بھی دیئے تھے۔ لیکن اعتدال پسند گروپ رفتہ رفتہ اس کو انتہا پسندی کے خلاف کچھ اقدامات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور ثقافتی انقلاب کی تحریک ختم ہو گئی۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ سے پیوستہ) اور وہ ماؤ کا نمبر ۲ سمجھا جاتا تھا، لیکن قدرت کے فیصلے عجیب و غریب ہیں۔ ثقافتی انقلاب کی افراتفری کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ "لن پیاؤ" نے ماؤ کا تختہ الٹنے کے لیے اندر اندر سازش تیار کی، اور اس کے قتل کا منصوبہ بنایا، اتفاق سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور اس وقت کے وزیر اعظم چو این لائی کو اس سازش کا پتہ ہو گیا۔ تو لن پیاؤ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک جہاز میں سوار ہو کر خفیہ طور پر فرار ہو گیا۔ اس کی گمشدگی ایک معمہ بنی رہی، بعد میں پتہ چلا کہ وہ جس جہاز میں سوار ہو کر روانہ ہوا تھا۔ وہ ایک فضائی حادثے کا شکار ہو گیا، اور اس کا تباہ شدہ ملبہ منگولیا کے علاقے میں دریافت ہوا۔

جب "ثقافتی انقلاب" کا سرسام سروں سے اُترا اور خود پارٹی لیڈروں نے اس کے نتائج پر نگاہ بازگشت ڈالی اور اس دَور کا حاصل پارٹی کی پھیلی ہوئی تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عوام پہلے ہی اس دَور سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس لیے اعتدال پسند گروپ رفتہ رفتہ صورتِ حال میں اصلاحات لانے کی پالیسی منوانے کے لائق ہو گیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۷۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی گیارھویں کانگریس کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کھلے بندوں اعتراف کیا گیا کہ ماؤزے تنگ کی بہت سی پالیسیوں سے چین کو شدید نقصان پہنچا ہے، اور اب دورِ اصلاح کی ضرورت ہے، اسی پر بس نہیں، بلکہ اس اجلاس میں ہوا کوفنگ کو بھی چیئرمین شپ سے ہٹا کر پریمیر بنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ بھی یہ بیان کی گئی کہ اس نے اپنی پالیسیوں میں ماؤ کی تقلید کی کوشش کی تھی۔

اس موقع پر اعتدال پسند گروپ (جس میں ڈینگ زیاؤ پنگ کی شخصیت سب سے نمایاں تھی) اپنے قدم اچھی طرح جما چکا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۸۰ء میں انتہا پسند گروپ کے دس سرکردہ رہنماؤں کے خلاف ایک اسپیشل کورٹ میں تاریخی مقدمہ چلا، جسے تاریخ چین کا سب سے اہم مقدمہ کہا جاتا ہے۔ اس مقدمے میں چار کے ٹولے، ماؤ کی بیوہ جیان چنگ اور لن پیاؤ کے دھڑوں کے ممتاز ترین رہنما شامل تھے۔ ان سب لوگوں پر الزامات یہ تھے کہ انہوں نے اپنی پوزیشنوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قتل و غارت گری، صریح فراڈ، دھوکہ بازی، جعلسازی اور سفاکانہ مظالم کا ارتکاب کیا۔

اس مقدمے کو عدالت ہائے عالیہ کے سینتیس ججوں پر مشتمل ایک بنچ نے سُنا۔ دس ممتاز وکلاء نے ملزموں کا دفاع کیا۔ کھلی عدالت میں یہ مقدمہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ بالآخر ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء کو عدالت نے متفقہ طور پر ان تمام ملزموں کو مجرم قرار دیا۔ اکثر ملزموں کو ۱۶ سے لے کر ۲۰ سال اور عمر قید کی سزا ہوئی، اور انہیں سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ ماؤ کی بیوی جیان چنگ کو دو سال کی مہلت کے ساتھ سزائے موت سنائی گئی، جو بعد میں عمر قید کے اندر تبدیل کر دی گئی۔

اس مقدمے کی کارروائی انگریزی زبان میں بیجنگ کے نیو ورلڈ پریس سے شائع

ہوگئی ہے۔ کتاب کا نام "چینی تاریخ کا ایک عظیم مقدمہ" (A Great Trial in Chinese History) ہے۔ یہ کتاب "ثقافتی انقلاب" کے دور کی تباہ کاریوں کا ایک دستاویزی مرقع ہے، اور احقر نے اپنے اس مضمون میں بہت سی معلومات اسی کتاب سے اخذ کی ہیں۔ اس کتاب کے مقدمے میں پروفیسر فے زیاؤ ٹنگ (Fei Hsiao Tung) جو اس مقدمے میں بطور جج شامل تھے، لکھتے ہیں :-

"جو مقدمہ ہمارے پیشِ نظر تھا، اس کا ایک بڑے سیاسی مسئلے یعنی ثقافتی انقلاب سے گہرا تعلق تھا۔ مدعا علیہم پر جن جرائم کا الزام عائد کیا گیا، ان کا ارتکاب ثقافتی انقلاب کے دوران اور اسی کی آڑ میں کیا گیا تھا۔ یہ بات تو اب عیاں ہو چکی ہے کہ "ثقافتی انقلاب" چینی عوام کے لیے ایک رعایت نا آشنا تباہی بن کر آیا تھا؛ اور اس نے چینی عوام اور چینی قوم کو جو زخم لگائے ہیں وہ ابھی تک ہرے ہیں"

اس انقلاب سے سبق سیکھنے، اور اس کی ذمہ داریاں متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جن عناصر نے اس تباہ کاری میں حصہ لیا، اُن کا ٹھیک ٹھیک معائنہ اور تجزیہ کیا جائے۔ سب سے پہلے یہ امتیاز پیدا کرنا ضروری ہے کہ کونسی چیزیں "سیاسی نوعیت کی غلطیاں" تھیں، اور کونسے کام "قانون کی مجرمانہ خلاف ورزیوں" کی تعریف میں آتے ہیں۔

"ثقافتی انقلاب" کی سیاسی غلطیوں کی سنگینی اب کوئی راز نہیں رہی۔ نیشنل پیپلز کانگریس کی مجلس قائمہ کے چیئرمین کی حیثیت میں مسٹر یی جیانگ ینگ نے عوامی جمہوریہ چین کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر اکتوبر ۱۹۷۹ء میں کہا تھا کہ: "جس وقت ثقافتی انقلاب کی مہم شروع کی گئی، اُس وقت پارٹی اور ملک کے اندر کے حالات کے جو اندازے لگائے گئے تھے، وہ حقیقت کے برخلاف ثابت ہوئے، اس وقت 'رجعت پسندی' کی کوئی واضح تعریف نہیں دی گئی، اور ایک غلط پالیسی

اور جد و جہد کا بالکل غلط طریقہ اختیار کر لیا گیا، جو جمہوری مرکزیت کے اصول سے کُلی طور پر منحرف تھا۔"

چین کی کمیونسٹ پارٹی آجکل اُن تجربات کا خلاصہ نکالنے میں مصروف ہے جو ۱۹۴۹ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے بعد سے اب تک میں حاصل ہوئے ہیں، نیز وہ ان تجربات سے سبق بھی حاصل کرنا چاہتی ہے، اور اس کے اس عمل میں ثقافتی انقلاب کے فوائد و نقصانات کا اندازہ بھی شامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تجربات اور اندازے جلد ہی منظرِ عام پر آ جائیں گے۔

"ثقافتی انقلاب" جن وجوہ کی بنا پر اس قدر تباہ کُن ثابت ہوا۔ ان میں ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ایک گروہ کو ثقافتی انقلاب کے دوران جو قوت حاصل ہو گئی تھی، اُس کو اُس نے پارٹی اور ملک دونوں کے اقتدارِ اعلےٰ پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال کیا، اور اس غرض کے لیے ہر قانونی اور غیر قانونی، اخلاقی اور غیر اخلاقی طریقہ استعمال کیا۔ یہ لوگ مجرم تھے، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فوجداری قوانین کی صریح خلاف ورزی کی، اس لیے یہ اُن لوگوں سے بُنیادی طور پر مختلف ہیں جن سے سیاسی غلطیاں سرزد ہوئیں۔"

(A Great Trial in Chinese Hostory P.12)

اس مقدمے نے "ثقافتی انقلاب" کی تباہ کاریوں کو پوری طرح الم نشرح کر دیا۔ جو لوگ اس مقدمے میں صرف غلط کار نہیں، بلکہ مجرم ثابت ہوئے، وہ سزایاب ہو کر چین کے سیاسی منظر سے غائب ہو گئے، اور اس طرح انتہا پسند گروہ اور کمزور پڑ گیا۔[1]

---

[1] یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مقدمے میں ماؤ کی بیوہ جیان چنگ کے سوا اکثر ملزموں نے اپنے بیشتر جرائم کا بالآخر اعتراف کیا۔ ان میں سے بعض نے اظہارِ ندامت کے ساتھ اپنے آپ کو صریح لفظوں میں مستحقِ سزا قرار دیا۔ یہاں تک کہ انکے وکلاءِ صفائی ان کے اظہارِ ندامت کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کے سوا کوئی اور موقف اختیار نہ کر سکے۔

۱۹۸۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بارھویں کانگریس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر چین کے سیاسی اور معاشی نظام میں بڑی انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔ سیاسی طور پر کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین کا عہدہ سرے سے ختم کر دیا گیا، اور اس کی جگہ سیکرٹری جنرل کا عہدہ رکھا گیا، اور اس طرح پارٹی کے ڈھانچے پر جو شخصی چھاپ تھی، اُسے ختم کر کے اجتماعی قیادت کا آغاز کیا گیا، دستور میں دہریت کی طرف جو میلان تھا، اُسے ختم کر کے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کی تاکید کی گئی، اس کے علاوہ اسی کانگریس نے ہوا گوفنگ کو (جو ماؤ کا جانشین سمجھا جاتا تھا، اور جسے چیئرمین شپ سے پہلے ہی ہٹا دیا گیا تھا) پریمیئر شپ سے ہٹا دیا، اور اس طرح انتہا پسند گروپ کے ممکنہ اثرات مزید کمزور پڑ گئے۔ اس کے علاوہ اسی زمانے سے "کھلے دروازے کی پالیسی" اختیار کی گئی، اور غیر ملکیوں کی آمد پر لگی ہوئی پابندیوں کو بہت نرم کر دیا گیا۔

معاشی اعتبار سے یہ زبردست انقلاب آیا کہ دیہات میں کمیون سسٹم کو بالکل ختم کر دیا گیا۔ اور ملک بھر میں ۵۴ ہزار سے زائد جو کمیون قائم تھے، اُن سب کو ختم کر کے "اجتماعی ذمہ داری (Collective Responsibility)" کا ایک نیا نظام جاری کیا گیا۔ اس نظام کے تحت دیہات کے ہر کنبے کو اس کے افراد خاندان کے لحاظ سے ایک قطعۂ زمین کاشت کے لیے دے دیا جاتا ہے، حکومت پیداوار کا ایک معین ہدف (مقدار کے لحاظ سے) مقرر کر دیتی ہے کہ اتنی مقدار حکومت کو دینی ہوگی۔ اس کے بعد باقی پیداوار کاشت کاروں کی اپنی ملک سمجھی جاتی ہے، جسے وہ اپنی مرضی سے فروخت کر کے اس پر نفع کما سکتے ہیں۔

(گویا اب حکومت اور کاشت کار کا رشتہ زمیندار اور مزارع کا سا ہے، حکومت زمیندار ہے، اور کاشت کار مزارع، فرق یہ ہے کہ ہمارے نظامِ مزارعت میں دونوں فریقوں کا حق متناسب حصّوں (تہائی یا چوتھائی یا نصف) کی شکل میں مقرر ہوتا ہے، اور وہاں حکومت نے اپنا حصّہ ایک معین مقدار کی شکل میں طے کر رکھا ہے (جو فقہ اسلامی کے تحت مزارعت کی فاسد صورت ہوتی ہے۔)

دوسری طرف صنعت و تجارت میں یہ انقلابی تبدیلی آئی ہے کہ اب محدود سطح پر نجی سرمایہ کاری کی اجازت دی جانے لگی ہے، یہاں تک کہ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بھی ملک میں سرمایہ لگانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک حد تک ذاتی منافع کے محرک کو پیداوار بڑھانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، اور اس غرض کے لیے رسد و طلب کی قوتوں (Market Forces) کو بھی متحرک کیا گیا ہے۔

جون ۱۹۸۴ء سے صنعتوں میں بھی زراعت کی طرح "ذمہ داری" کا نظام نافذ کر دیا گیا ہے جس کا خلاصہ برٹانیکا ایئر بک ۱۹۸۴ء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"جون میں سرکاری ملکیت کی تمام صنعتوں کو باقاعدہ سرکاری طور پر اپنے نفع اور نقصان کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے، اب ایک فیکٹری کو اپنا تمام منافع حکومت کو حوالہ کرنے کے بجائے اپنے منافع پر حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہوگا، اور باقی منافع مزدوروں کو بونس دینے اور سرمایہ کاری کے دیگر فیصلوں پر رکھتے اور ان سے ان کی کارکردگی کے معیار کے لحاظ سے معاملات طے کرنے کے لیے ایسے نئے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ جو اہمیت کے حامل ہیں۔"

(Britannica Year book 1984 " China " P.235)

آجکل چین میں پالیسی کی ان تبدیلیوں کو "اصلاحات" کا عنوان دیا جا رہا ہے اور "اصلاحات" کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور پروفیسر تے ژیاؤ ٹینگ کے الفاظ میں یہ "۱۹۴۹ء سے لے کر موجودہ دور تک کے عملی تجربات سے حاصل ہونے والے سبق" کا نتیجہ ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان پالیسیوں کے نتیجے میں پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، اور کسانوں کی آمدنی میں بھی۔

یہ ہے چین میں اشتراکی تجربے کی چھتیس سالہ تاریخ کا انتہائی مختصر خلاصہ۔ اس خلاصے سے چند امور بالکل واضح ہیں :۔

(۱) چینی قوم میں اپنی غلطیوں کے اعتراف؛ ان کے حقیقت پسندانہ جائزے اور

اس کے مطابق اپنی پالیسیوں میں تبدیلی لانے کا حوصلہ موجود ہے، جس کا مظاہرہ وہ پچھلے تقریباً نو سال سے کر رہی ہے۔

(۲) وہ بنیادی اشتراکی تصورات جن کو روایتی طور پر اشتراکیت کے بنیادی پتھر کہا اور سمجھا جاتا تھا، چین میں ان کا عملی تجربہ کامیاب نہیں ہو سکا، اور اسی بنا پر باوجودیکہ چین اب بھی ایک کمیونسٹ ملک ہے، وہاں معیشت کے نظام میں رفتہ رفتہ ایسی اصلاحات کی جا رہی ہیں جو کمیونزم کے روایتی تصورات سے خاصی مختلف ہیں۔

(۳) "ثقافتی انقلاب" طبقاتی جنگ کا ایک مثالی مظاہرہ تھا جس کی پشت پر بڑی مستحکم طاقت موجود تھی، لیکن وہ چین کو رستے ہوئے زخموں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔

واقعہ یہ ہے کہ چین میں اشتراکی تجربے کی چھتیس سالہ تاریخ تحقیق و نظر کا بڑا دلچسپ موضوع ہے جس پر احقر کے علم میں اب تک عالم اسلام میں کسی نے محققانہ انداز سے قلم نہیں اٹھایا۔ احقر کی رائے میں وقت کی شدید ضرورت ہے کہ اس تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کر کے اس کے نتائج علمی انداز میں منظر عام پر لائے جائیں، تاکہ ان سے پوری دنیا مستفید ہو سکے۔

یہ مختصر سفرنامہ کسی تحقیقی مقالے کا متحمل نہیں، اور نہ احقر کے لیے نو دنوں کے اس طوفانی دورے میں یہ ممکن تھا کہ تمام متعلقہ پہلوؤں کا پوری ذمہ داری اور دقت نظر سے جائزہ لے سکے، لیکن ایک عام قاری کے لیے حالات کا ایک اجمالی خاکہ احقر نے پیش کر دیا ہے، جو انشاء اللہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا، تاکہ اگر یہ خاکہ کسی باہمت محقق کے دل میں اس موضوع پر تفصیلی کام کرنے کی تحریک پیدا کر سکے، تو میں سمجھوں گا کہ اس مختصر مضمون نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

عام نظامِ زندگی

یہ تو تھا چین میں اشتراکی نظام کا ایک مختصر جائزہ، لیکن چینی عوام میں بعض خوبیاں

ایسی نظر آئیں جو بلاشبہ قابلِ رشک ہیں اور کمالیاتی خوبیاں ایسی ہیں جن کی بنا پر یہ ملک اندرونی خلفشار کے شدید جھٹکے سہنے کے باوجود ترقی کے راستے پر گامزن ہے

ان میں سے پہلی خوبی اس قوم کا سادہ طرزِ زندگی ہے۔ چین میں جہاں جہاں ہمارا جانا ہوا وہاں یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوئی کہ حکومت اور عوام دونوں کی اصل توجہ نمود و نمائش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے بجائے پائیدار ترقیاتی کاموں کی طرف ہے۔ میں شروع میں لکھ چکا ہوں کہ بیجنگ جیسے مرکزی شہر میں رات کے وقت روشنیوں کا انتظام بس ضرورت کے مطابق ہے۔ شہر بھر میں کہیں کوئی نیون سائن احقر کو نظر نہیں آیا۔ اس کے علاوہ پبلسٹی اور اشتہارات کا وہ طوفان جو سرمایہ دارانہ نظام سے متاثر ملکوں میں تمدن کی لازمی خصوصیت بن کر رہ گیا ہے، یہاں وہ بھی مفقود ہے۔ سڑکوں پر اکا دکا اشتہاری سائن بورڈ نظر آتے ہیں، لیکن ان میں بھی سادگی کا پہلو نمایاں ہے۔ بیجنگ خاصا صاف ستھرا شہر ہے، سڑکیں کافی کشادہ ہیں اور ان کی کشادگی کے باعث یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک کروڑ آبادی کا شہر ہے۔ لیکن محلاتی طرز کی عمارتیں اور رہائشی بنگلے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر متوسط درجے کے فلیٹ ہیں، اور انتہائی خستہ حال مکانات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

لوگوں کا لباس بھی عموماً سادہ اور بڑی حد تک ایک جیسا ہے، خاص طور پر کانسو اور چیدنگ ہائی کے صوبوں میں یہ بات محسوس ہوئی کہ عوام اور سرکاری عہدہ داران کے درمیان فاصلے زیادہ نہیں ہیں، سرکاری حکام عوام میں ملے جلے رہتے ہیں۔ لن شا پریفیکچر کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر جو دو روز مسلسل ہمارے ساتھ رہے، ان کے کوٹ کے ایک حصے پر ریت جمی ہوئی تھی، اور وہ عوام کے ساتھ خاصے بے تکلف نظر آتے تھے۔ صوبہ کانسو کے ڈپٹی گورنر بھی اپنے انداز و ادا میں ایک عام آدمی محسوس ہوئے، اور ٹھاٹ باٹ کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ایک ادنیٰ ملازم اور اعلیٰ افسران کی تنخواہوں میں تفاوت بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔

اس لحاظ سے بھی چین دنیا کے ممالک میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ ایک کروڑ

آبادی کے شہر بیجنگ میں پرائیویٹ کاروں کی تعداد ابھی تک چند سو سے زائد نہیں ہوگی۔ ایک زمانے میں تو پرائیویٹ کار رکھنے کی اجازت ہی نہ تھی، اب اجازت مل ہے لیکن ابھی تک شہر میں زیادہ ٹیکسیاں، سرکاری یا غیر ملکیوں کی گاڑیاں ہیں۔ چینیوں کی پرائیویٹ کاریں بہت کم ہیں۔ باقی تمام تر آبادی بسوں میں اور سائیکلوں پر سفر کرتی ہے، ہر سڑک کے دونوں کناروں پر سائیکلوں کے لیے الگ راستہ بنا ہوا ہے۔ جس پر ہر وقت سائیکلوں کا ایک سیلاب بہتا نظر آتا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ سائیکلیں کھڑی کرنے کے لیے مخصوص پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔ طویل فاصلوں کی صورت میں لوگ ایک حد تک سائیکل پر سفر کر کے اسے ان پلاٹوں میں کھڑا کر دیتے ہیں، اور باقی سفر بس سے طے کرتے ہیں۔

ٹھاٹ باٹ اور نمود و نمائش کی کمی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ چین میں عریانی و فحاشی کا وہ انداز نظر نہیں آتا جو مغربی ممالک کا جزوِ زندگی بن گیا ہے، بلکہ اب رفتہ رفتہ مغرب زدہ مشرقی ممالک میں بھی بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔

چینی عوام کا ایک اور وصف محنت اور جفاکشی ہے، شہر ہوں یا دیہات، لوگ اپنے کاموں کی انجام دہی میں منہمک نظر آتے ہیں، چین مجموعی اعتبار سے ایک غریب ملک ہے، اس کے قدرتی وسائل بھی آبادی کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہیں، حد یہ ہے کہ اس کے ۹۶ لاکھ مربع کلو میٹر کے رقبے میں سے صرف دس فیصد حصہ کاشت کے قابل ہے۔ باقی حصہ یا تو پہاڑوں اور دریاؤں کے نیچے ہے، یا بے آب و گیاہ صحراہے، یا دوسرے جغرافیائی عوامل کے تحت ناقابلِ زراعت ہے، لیکن چین کی فی ایکڑ پیداوار پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ یہ زیادتی کسان کی محنت اور جفاکشی کی رہینِ منت بتائی جاتی ہے۔

جن دنوں ہم بیجنگ میں تھے، وہاں تھوڑے فاصلے پر گوبھی سے بھرے ہوئے ٹرک گھوم رہے تھے، گلی گلی گوبھی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ قدم قدم پر لوگ سائیکلوں اور اسکوٹروں پر بڑی مقدار میں گوبھی لے جاتے نظر آرہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آجکل گوبھی کی فصل کٹ رہی ہے، اور اب پوری سردی کے

موسم میں شدید سردی کے باعث گوبھی کی کاشت نہیں ہو سکے گی، اس لیے لوگ اسے پورے موسم کے لیے اپنے پاس ذخیرہ کر رہے ہیں۔ اس غرض کے لیے گھروں میں ایک خاص طرز کی سُرنگ سی بنا کر اس میں گوبھی کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پورے موسم اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

لانچو سے لن شیا جاتے ہوئے راستے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں جگہ جگہ غار اور کھدائی کے آثار نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہُوا کہ یہاں وادیوں کی زمین کی مٹّی کاشت کے لیے موزوں نہیں ہے، اس لیے کاشتکار پہاڑوں کو کھود کر اس سے مٹّی نکالتے ہیں، اور اسے ڈھو کر اپنے کھیتوں میں بچھاتے ہیں، اور پھر اس پر کاشت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ فصل کاٹنے کے بعد ان غاروں سے کھلیان کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

کانسو اور چھینگ ہائی کے زیادہ تر دیہات بہت پسماندہ ہیں، مکانات خستہ، سڑکیں کچی اور ناہموار، باشندوں پر افلاس کے اثرات نمایاں، اور چہرے سُرخ و سفید ہونے کے باوجود یخ بستہ موسم سے جھلسے اور کُملائے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ ہر شخص جفاکشی کے ساتھ محنت میں مصروف ہے، سستی اور کاہلی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔

چینی عوام کو ورزش کا بڑا ذوق ہے، اور فجر کے بعد بیجنگ کی سڑکوں پر نکل جائیں تو جگہ جگہ لوگوں کے جتھے اجتماعی طور پر ورزش کرتے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لیے لوگوں نے باقاعدہ گروپ بنائے ہوئے ہیں جو کسی تجربہ کار ماہر کے زیرِ نگرانی اجتماعی طور پر ورزش کرتے ہیں۔

عام لوگوں کی تنخواہوں کا معیار کافی کم ہے، بیجنگ یونیورسٹی کے ایک اُستاد نے بتایا کہ اُنہیں ماہانہ ایک سو دس یوآن ملتے ہیں (جو چھ سو پاکستانی روپے سے بھی کم بنتے ہیں)، ہم نے پوچھا کہ "کیا اس رقم میں آپ کا گذارہ ہو جاتا ہے؟" اُنہوں نے جواب دیا کہ "ہم چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں، ورنہ خواہشات کی کوئی انتہا نہیں"۔ معلوم ہُوا کہ ان کو جو فلیٹ ملا ہُوا ہے، اس کا کرایہ صرف ۵ یوآن ہے، لیکن وہ صرف پچاس مربع گز میں بنا ہُوا ہے۔ (بس میں سفر کرنے کے لیے انہیں پاس ملتا ہے، علاج اور بچوں کی تعلیم مفت

ہے۔ ضرورت سے زیادہ نئے نئے لباس بناتے رہنے کا معمول نہیں، لہٰذا یہ تنخواہ زیادہ تر اشیائے خورد و نوش ہی پر صرف ہوتی ہے، اور کافی ہو جاتی ہے۔

بہر صورت! سادگی، محنت و جفاکشی اور قناعت کے یہ اوصاف جو قوم بھی اختیار کرے گی، اسے یقیناً ترقی کرنے کا حق ہوگا، اور وہ ایک نہ ایک دن اقوامِ عالم سے اپنا لوہا منوا کر رہے گی۔ یہ اوصاف درحقیقت مسلمانوں کے اختیار کرنے کے تھے، اور جب تک یہ مسلمانوں میں باقی رہے، دُنیا کی کوئی قوم ان کی گرد کو نہ پہنچ سکی، لیکن جب سے ہم نے نمود و نمائش، اسرافِ بیجا، تن آسانی اور عیش و عشرت کا وطیرہ اختیار کیا، دُنیوی عزت اور ترقی نے بھی ہم سے مُنہ موڑ لیا۔ اب یہ اوصاف چین نے اپنائے ہیں تو مختصر مدت میں اس نے اقوامِ عالم کی صف میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔

مسلمانوں کا حال اور مستقبل

مضمون کے شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد بظاہر پانچ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد بالخصوص ثقافتی انقلاب کے دَور میں ان حضرات نے بڑا کٹھن اور صبر آزما وقت گذارا۔ جن مدارس اور کتب خانوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ انقلاب سے پہلے یہاں دینی تعلیم و تبلیغ کے بڑے بڑے مراکز قائم تھے۔ جو انقلاب کے بعد بند کر دیئے گئے۔ ثقافتی انقلاب کے دَور میں بیشتر مسجدیں بھی بند ہو گئیں، اور قرآن کریم کے نسخے تک گھروں میں رکھنا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف قرار پایا۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس دَور میں بھی تہ خانوں میں چھپا چھپا کر مذہبی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اب ان کے لیے سہولت کی راہیں کھول دیں۔ یہ محض پروپیگنڈا نہیں، واقعی حقیقت ہے کہ اب وہاں مسلمانوں کو بڑی حد تک مذہبی آزادی مل گئی ہے، جس کی بنا پر ان کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، مسجدیں دوبارہ تعمیر ہوئی ہیں، نئی نئی مسجدیں بھی بن رہی ہیں، مدارس کا احیاء ہو رہا ہے، نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، غرض حالات بڑے حوصلہ افزا ہیں۔

لیکن مذہب پر پابندیوں کا جو کٹھن دور اُن پر گذرا ہے ظاہر ہے کہ وہ اپنے اثرات چھوڑ کر گیا ہے۔ اس وقت چینی مسلمانوں کی رہنمائی کا واحد مرجع مسجد کا امام ہے جس کی بڑی عزت کی جاتی ہے، لیکن یہ امام دینی تعلیم کے حصول کے لیے اپنے محدود ماحول سے کبھی باہر نہیں نکلا، اس نے چین ہی کے مدارس میں تعلیم پائی ہے، اور اب ائمہ کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے ۱۹۴۹ء کے بعد کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دین کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں، یہ حضرات اوّل تو چینی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان بے تکلفی کے ساتھ نہیں جانتے، دوسرے اگر کچھ عربی زبان انہیں آتی بھی ہے تو عربی کتابوں کی کافی قلت ہے، یہ حضرات اپنا سارا کام مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف، شرح وقایہ اور شرح عقائد سے چلا رہے ہیں۔ دوسری کتابیں بڑے شہروں کے اکا دُکا کتب خانوں میں موجود ہیں، لیکن اندرونی علاقوں میں میسر نہیں۔ عوام کے لیے چینی علما نے چینی زبان میں ایسے عام فہم رسالے لکھ دیئے ہیں جو عقائد و عبادات کی بنیادی معلومات فراہم کر سکیں۔ ایسے بعض رسائل "چائنا مسلم ایسوسی ایشن" نے بھی مرتب کرا کر شائع کئے ہیں۔ لیکن خود ائمہ اور علماء کی رہنمائی کے لیے کتابوں کی کافی کمی ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ مساجد کے ائمہ اب بیشتر عمر رسیدہ ہو چکے ہیں، اور ان کی جگہ لینے کے لیے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ بحمد اللہ بیجنگ، لانچو اور شننگ وغیرہ میں پانچ سالہ تعلیم کے ادارے قائم ہیں، لیکن وہ ملک بھر کی ضرورت کے لیے ناکافی ہیں۔ نئے اداروں کے قیام کے لیے مالی وسائل کی بھی ضرورت ہے اور ماہر اساتذہ کی بھی۔

تیسرا مسئلہ بچوں کی دینی تعلیم کا ہے، بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ ابھی تک ملک میں یہ قانون باقی چلا آتا ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچے کو کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جا سکتی، اگرچہ اس قانون پر عملدرآمد کے سلسلے میں موجودہ حکومت نے قدرے نرم اور لچکدار پالیسی اختیار کی ہوئی ہے، اور اس معاملے میں عملاً زیادہ دار و گیر نہیں کی جاتی، چنانچہ بعض جگہ مکاتب میں بچے تعلیم پا رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک یہ قانون باقی ہے اس وقت تک مسلمان کھل کر بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے، چنانچہ بچوں کو قرآن کریم اور نماز

وغیرہ کی تعلیم زیادہ تر گھروں میں دی جاتی ہے، اور یہ بات بدیہی ہے کہ ماں باپ کی معاشی مصروفیات انہیں اتنا موقع نہ دیتی ہوں گی کہ وہ بچے کے لیے ایک ملتب کی تلاش کر سکیں۔

ادھر ان مسائل کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی سامنے رہنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ مذہبی آزادی عرصے کی مشکلات کے بعد ملی ہے، اور جذبات میں آکر کوئی ایسا اقدام ان کے لیے مناسب نہیں ہے جو اس آزادی کی پالیسی پر منفی اثرات مرتب کرے۔ لہٰذا انہیں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ بحالاتِ موجودہ مناسب یہی ہے کہ جب حکومت رفتہ رفتہ مذہبی آزادی کے معاملے میں کھلی پالیسی اپنا رہی ہے تو ان مسلمانوں کے ساتھ عالمِ اسلام کا جو بھی تعاون ہو، وہ حکومت کے واسطے سے، یا چائنا مسلم ایسوسی ایشن کے واسطے سے ہو۔

ہم نے اپنے اس دورے میں حکومتِ چین کو یہ پیشکش کی ہے کہ وہ مسلمان طلبہ کو پاکستان بھیجے تو ہم ان کی اعلیٰ دینی تعلیم کا انتظام مع قیام و طعام کرنے کو اپنی سعادت سمجھیں گے، نیز یہاں سے چند مدت کے لیے زائر اساتذہ بھی وہاں کے تعلیمی اداروں میں جا سکتے ہیں۔ حکومت کے ذمہ دار افراد نے ان تجاویز کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس سلسلے میں عملی تفصیلات طے کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

عام مسلمانوں کے لیے اپنے چینی بھائیوں سے تعاون کا سب سے پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ انہیں ہمیشہ اپنی دعائے خیر میں یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دین و ایمان کے تحفظ کی توفیق اور اس امانت کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے مواقع عطا فرمائیں۔ آمین۔

دوسرے وہاں کے علماء کو تفسیر، حدیث اور فقہ کی عربی کتابوں کی شدید ضرورت ہے، اگر کچھ اہلِ خیر حضرات ان کے لیے یہ کتابیں بھیجنے کو تیار ہوں تو کتابوں کے انتخاب اور بھیجنے کے طریقے کے بارے میں احقر سے مشورہ فرمالیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

امریکہ اور یورپ کا پہلا سفر

(امریکہ، برطانیہ، مصر، سعودی عرب)

شعبان سنہ ۱۳۹۸ھ جولائی سنہ ۱۹۷۸ء

فرنگ میں کوئی دِن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جُنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

(۹)

امریکہ اور یورپ کا پہلا سفر

گذشتہ ماہ اچانک احقر کو امریکہ اور یورپ کا ایک طویل سفر پیش آگیا جس کی وجہ سے سابقہ شمارے میں اداریہ بھی شامل نہیں ہو سکا۔

امریکہ کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں نے بہت سی تنظیمیں قائم کی ہوئی ہیں، انہی تنظیموں میں سے ایک فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز (ایف آئی اے) کے نام سے موسوم ہے، یہ مختلف امریکی ریاستوں میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جمعیتوں کا ایک اتحاد ہے جس کا مرکز نیویارک میں ہے۔ ایف آئی اے ہر سال امریکہ کے کسی علاقے میں اپنا سالانہ کنونشن منعقد کرتی ہے، اس سال اس نے اپنا کنونشن امریکی ریاست ویسٹ ورجینیا کے مرکزی شہر چارلسٹن میں منعقد کیا تھا جو واشنگٹن سے تقریباً تین سو میل دور جنوب میں واقع ہے، اس مرتبہ اس نے اپنے کنونشن میں ممبر جماعتوں کے علاوہ مختلف اسلامی ملکوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی اس ضمن میں اس نے حکومتِ پاکستان کو مدعو کیا تھا۔ حکومتِ پاکستان نے اس کنونشن میں شرکت کے لیے تین افراد پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا جس میں محترم جناب خالد اسحاق صاحب ایڈووکیٹ، جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب اور راقم الحروف کے نام تجویز کیے گئے۔

اس وفد کی روانگی کی اطلاع ہمیں بالکل اچانک ملی، ۲۰ جولائی کو چارلسٹن میں کنونشن شروع ہو رہا تھا، اور ۱۴ جولائی کو ہم سے اس نامزدگی کی منظوری لی گئی۔ ۲۰ جولائی کو چارلسٹن پہونچنے کا مطلب یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ۱۸ جولائی کو ہم روانہ ہو جائیں اس لیے ہمیں تیاری کے لیے کل تین دن ملے جن میں سے ایک دن کراچی کی شدید بارش کی نذر ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا

کہ ایف آئی اے کی طرف سے دعوت ہی حکومت کو بہت دیر سے ملی تھی، اس لیے سفر کے تمام مراحل نہایت تیز رفتاری سے طے کرنے پڑے۔

۱۸ر جولائی کو صبح دو بجے پی آئی اے کے طیارے کے ذریعے ہم نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ چھبیس گھنٹے کا انتہائی طویل ہوائی سفر تھا جس میں طیارے کو تین برّ اعظم عبور کرکے امریکہ پہونچنا تھا، اور بیچ میں دوبئی، قاہرہ، فرینکفرٹ اور پیرس رُکتے ہوئے جانا تھا۔ اس روز ہمیں کراچی سے روانہ ہونے کے بعد صرف تین گھنٹے رات ملی، اس کے بعد تقریباً تیئس گھنٹے تک مسلسل دن ہی دن رہا، کیونکہ طیارے کا سفر سورج کے ساتھ ساتھ ہو رہا تھا۔ کراچی کے وقت کے لحاظ سے ۱۸ جولائی کو رات نو بجے جب طیارہ پیرس پہونچا تو وہاں شام کے پانچ بجے تھے۔ یہاں ہم نے ائرپورٹ ہی کے ایک حصے میں نمازِ عصر ادا کی، اس کے بعد چھ گھنٹے تک مسلسل بحرِ اٹلانٹک پر پرواز ہوتی رہی لیکن اس پورے عرصے میں ہمارا عصر کا وقت باقی رہا، اور جب ساتویں گھنٹے جہاز نیویارک پہونچا ہے تب بھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، اس وقت کراچی میں ۱۹ر جولائی کی صبح کے پانچ بجے ہوں گے، اور یہاں ۱۸ر جولائی کی شام کے سات بجے تھے اور چونکہ یہاں سورج آٹھ بجے کے بھی بعد غروب ہو رہا تھا، اس لیے عصر کا وقت کافی باقی تھا۔

نیویارک میں پاکستان کے نائب قونصل ہمیں لینے کے لیے ایرپورٹ پہونچ گئے تھے، اس لیے ائیرپورٹ کے تمام مراحل بحمد اللہ چلد نمٹ گئے۔ اس رات نیویارک کے ایک ہوٹل میں قیام رہا، اور اگلے روز گیارہ بجے ہم نیویارک سے چارلسٹن روانہ ہوئے اور دوپہر کو ایک بجے کے قریب منزلِ مقصود پر پہنچے، چارلسٹن ویسٹ ورجینیا کا دارالحکومت ہے۔ اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، یہاں دریائے کینوھا کے کنارے ہوٹل ہالی ڈے ان میں ہمارا قیام ہوا، اسی ہوٹل کے ایک ہال میں سیمینار منعقد ہونا تھا۔

امریکہ میں چار قسم کے مسلمان آباد ہیں، ایک تو وہ مسلمان ہیں جو اصلاً کسی مسلمان ملک کے باشندے ہیں لیکن ملازمت، کاروبار یا تعلیم کی غرض سے امریکہ میں مقیم ہیں، دوسرے وہ مسلمان ہیں جن کے آباء و اجداد کسی مسلمان ملک کے باشندے تھے، اور کسی وجہ سے ترکِ وطن

کر کے یہاں آباد ہو گئے ہیں، اب ان کی اولاد جو امریکہ ہی میں پروان چڑھتی رہی ہے اپنے طرز بود و ماند میں سو فیصد امریکی نظر آنے کے باوجود عقیدۃً اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ تیسرے سیاہ فام نومسلم ہیں ان کی ایک بڑی تعداد تو ایلیجاہ کی پیروکار ہے جو درحقیقت مسلمان نہیں اور کچھ واقعۃً مسلمان ہیں جنھوں نے مختلف مسلمان تنظیموں کی تعلیم و تبلیغ سے اسلام قبول کیا ہے یا وہ شروع میں ایلیجاہ کے پیروکار تھے بعد میں اُن پر حقیقتِ حال واضح ہوئی، اور انھوں نے صحیح معنی میں اسلام قبول کر لیا، ان سیہ فام نومسلموں کو عام طور سے "بلالی مسلمان" کہا جاتا ہے، اور چوتھی قسم سفید فام نومسلموں کی ہے، یہ وہ امریکی نسل کے لوگ ہیں جو مختلف مسلمان تنظیموں کی تعلیم و تبلیغ سے مسلمان ہوئے ہیں۔

ایف آئی اے (جس کے زیر اہتمام یہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا) اگرچہ دستوری لحاظ سے چاروں قسم کے مسلمانوں کی تنظیم ہے لیکن اس میں عملاً پہلی دو قسم کے مسلمان زیادہ اور آخری دو قسموں کے مسلمان کم ہیں، اس تنظیم کے ارباب حل و عقد یا تو کچھ عرب مسلمان ہیں، یا پھر دوسری قسم کے کچھ امریکی مسلمان، اس جماعت سے مختلف امریکی ریاستوں کی متعدد تنظیمیں وابستہ ہیں، اور اس کنونشن میں ان تنظیموں کے نمائندے مدعو کیے گئے تھے، اس کے علاوہ سعودی عرب، مصر، شام، اردن، لبنان اور پاکستان سے بھی مختلف مندوبین کو دعوت دی گئی تھی۔

کنونشن کا اصل مقصد تو وہیں جا کر معلوم ہوا، یہ تھا کہ امریکہ کے مختلف خطوں میں اس تنظیم سے وابستہ جو مسلمان آباد ہیں، ان کا ایک سوشل اجتماع ہو جائے، یہ لوگ باہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں، ایک دوسرے کے مسائل سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں، اور کچھ اجتماعی تفریحات کے ذریعے ایک دوسرے سے قریب آئیں، لیکن اس بنیادی مقصد کے ساتھ ایک سیمینار کو بھی پروگرام میں شامل کر لیا گیا تھا: "امریکہ میں اسلام" اور اسی سیمینار کے لیے ہم لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔

ہمیں چونکہ سیمینار کے لیے مقالہ لکھنے کا وقت ہی نہ ملا تھا، اس لیے ہم اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ تیار نہ کر سکے تھے، اور وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ یہ اسٹیج بھی کسی تحقیقی مقالے کے لیے موزوں نہ تھا، اس کے بجائے پاکستان میں رہتے ہوئے امریکی مسلمانوں کے جن

مسائل کا علم تھا، اور یہاں پہنچ کر دو چار روز ہی میں جس کی تصدیق ہوئی، انہی کے بارے میں چند ضروری گزارشات احقر نے چار سٹی ہی میں مرتب کیں۔ اور افتتاحی اجلاس کے اگلے دن صبح کی نشست کے آخر میں احقر نے یہ مقالہ پڑھا، جلسے کی زبان چونکہ انگریزی تھی اس لیے احقر نے یہ مقالہ انگریزی ہی میں لکھا تھا۔ اس کی خاص خاص باتوں کا اردو خلاصہ ذیل میں پیشِ خدمت ہے :-

رسمی تمہید کے بعد احقر نے اس میں عرض کیا کہ :-

"سیمینار کا نوٹس چونکہ ہمیں بہت مختصر ملا، اس لیے مجھے افسوس ہے کہ میں اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ پیش نہیں کر سکا۔ لیکن میں اس موضوع پر چند عمومی گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور یہ درحقیقت ایک پیغام ہے جو میں آپ حضرات کی وساطت سے امریکہ میں بسنے والے تمام مسلمانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

ہم پاکستانی مسلمان اگرچہ جسمانی اعتبار سے اپنے امریکہ میں مقیم بھائیوں سے بہت دور ہیں، لیکن پاکستانی مسلمانوں کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے اتنی گہری دلچسپی رہی ہے کہ مسلمان خواہ زمین کے کسی حصے میں آباد ہوں، پاکستانی مسلمانوں کے دل ہمیشہ ان کے ساتھ دھڑکتے ہیں، لہٰذا ہم لوگ، اگر پوری جامعیت کے ساتھ نہ سہی، تو عمومی طور پر ضرور ان اہم مسائل سے آگاہ ہیں جو اس برِ اعظم میں اسلام اور مسلمانوں کو درپیش ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ "امریکہ میں اسلام" کے مسئلے کے دو پہلو ہیں، ایک طرف اس موضوع کا تعلق غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ ہے، اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے اور باقی رکھنے سے ہے، یعنی اس موضوع کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ اس خطے کے مسلمان اپنے ملی .... تشخص اور دینی عظمت کو کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں مسئلے باہم اس قدر مربوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ مسلمان اس وقت تک

تبلیغِ اسلام کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے جب تک وہ خود صحیح معنیٰ میں مسلمان بن کر اسلام کا ایک دلکش نمونہ پیش نہ کریں۔

مجھے یقین ہے کہ مغربی ممالک کے غیر مسلموں کے درمیان اسلام کی تبلیغ و دعوت اور نشر و اشاعت کے لیے ہمارا زمانہ موزوں ترین زمانہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ چند صدیوں کے دوران اہلِ مغرب بہت سے نظام ہائے فکر کا عملی تجربہ کر چکے ہیں انہوں نے پوپ پرستی سے لے کر انکارِ خدا تک ہر فکری نظام کو آزما کر دیکھ لیا ہے لیکن جتنے نظریات کو انہوں نے اپنی زندگی میں اپنایا ان میں سے کوئی بھی ان کو زندگی کا کوئی متوازن لائحہ عمل فراہم نہیں کر سکا۔ ان کا قدیم مذہب اُن کی مادی اور سائنسی ترقیات کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوا۔ لیکن جب انھوں نے اس مذہب کو عملاً خیر باد کہہ کر زندگی کی مادہ پرستانہ تعبیر کو اپنایا تو اپنی تمام تر مادی ترقیات کے باوجود وہ رُوح کے سکون اور ضمیر کے اطمینان سے محروم ہو گئے۔ وہ چاند اور مریخ پر کمندیں ڈالنے کے باوجود اپنی رُوح میں جو نہ بجھنے والی پیاس محسوس کرتے ہیں اس کا کوئی مداوا اس زندگی کے پاس مل ہی نہیں سکتا جو مادے کے پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

لہٰذا احقر کی نظر میں روحانیت کے ان پیاسوں کو اسلام کی صراطِ مستقیم دکھانے کا یہ بہترین وقت ہے۔ ان لوگوں پر یہ ثابت کرنے کا یہ مناسب ترین وقت ہے کہ صرف اور صرف اسلام ہی تمھیں ایک ایسی زندگی فراہم کر سکتا ہے جس میں مادی ترقیات روحانی سکون کے ساتھ شیر و شکر ہو کر چل سکیں۔

مشرق اور مغرب کے درمیان ایک عرصے سے زبردست فکری تصادم کی فضا قائم ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تصادم ناقابلِ تصفیہ نہیں۔ اس تصادم کا ایک بہترین حل ممکن ہے، اگر دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں کو سیکھنے کے جذبے سے کام کریں تو دونوں کے درمیان بہترین تصفیہ ہو سکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب پچھلے دنوں مادی ترقیات کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہے اور مشرق کو

اس میدان میں اس سے بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن دوسری طرف مغرب اس وقت اپنی تمام مادی ترقیات کے باوجود روحانی اعتبار سے دیوالیہ ہے، اسے ایک ایسی روحانی ہدایت کی شدید احتیاج ہے جو اسے روحانی سکون عطا کر سکے۔ اور یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ مغرب کو یہ روحانی ہدایت اسلام کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مشرق و مغرب کے درمیان یہ مصالحت عمل میں آجائے کہ مشرق مغرب کے مادی تجربات سے فائدہ اٹھائے، اور مغرب اس سے روحانی ہدایت حاصل کرے تو ایک ہی قرن میں زمین کے یہ دونوں خطے اس انسانیت کے لیے کہیں زیادہ مفید اور تعمیری خدمات انجام دے سکیں گے جو آج باہمی جھگڑوں کے تھپیڑوں، جہالت، مفلسی اور بداخلاقی کے الاؤ میں سسک رہی ہے۔

امریکہ میں جو مسلمان آباد ہیں یہ خاص طور سے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے اس پیغام کو اپنے غیر مسلم ہموطنوں تک پہنچائیں اور ان میں اس طرزِ فکر کی آبیاری کریں۔ یہ کسی خاص تنظیم، کسی خاص گروہ یا کسی خاص جماعت کا فریضہ نہیں، بلکہ یہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے، خواہ وہ کہیں آباد ہو لیکن یاد رکھیے کہ یہ عظیم الشان کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک مسلمان بذاتِ خود سچے اور عملی مسلمان نہ بنیں، یہ انقلابی کارنامہ ان لوگوں کے ہاتھوں انجام نہیں پا سکتا جو محض زبانی یا پیدائشی مسلمان ہوں اور ان کی عملی زندگی میں اسلام کی کوئی جھلک موجود نہ ہو۔ تبلیغِ اسلام کا سب سے مؤثر طریقہ خود اسلام پر عمل ہے، اور اس طرح زیرِ بحث موضوع کا دوسرا پہلو یعنی "خود مسلمانوں کا مسلمان بننا" ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں پر ایک زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور وہ اس ذمہ داری کو صرف اس وقت ٹھیک ٹھیک ادا کر سکیں گے جب وہ خود اپنے ملی تشخص اور اپنی دینی عظمت کا تحفظ کرنے کے لائق ہوں، اگر امریکہ میں رہ کر وہ خود دوسرے امریکیوں کے طرزِ زندگی میں اس طرح جذب ہو گئے کہ دونوں کے درمیان کوئی امتیازی علامت باقی نہ رہی تو اگر انھوں نے

دعوتِ اسلام کا بیڑا اٹھایا بھی تو وہ ایک ایسی مبہم چیز کی دعوت ہوگی جس کا خارجی زندگی میں کوئی وجود وہ ثابت نہ کر سکیں گے۔

امریکی مسلمانوں کو سب سے پہلے اس بات پر اپنا ایمان مستحکم کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام ایک جامع نظامِ زندگی ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے احکام یکساں طور پر دلکش مفید اور واجب العمل ہیں، اس کے بعد عقائد سے لیکر عملی زندگی تک ہر شعبے میں پورے اعتماد اور خود داری کے ساتھ ان احکام پر عمل کرنا چاہیے۔

ان گذارشات کی روشنی میں اگر ہم اسلام کے ساتھ، اپنے آپ کے ساتھ اور اپنی آئندہ نسلوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے پورے طرزِ زندگی پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے، اور اپنی ہر ہر ادا کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کی فکر کرنی چاہیئے، یہاں تک کہ ہم وہ مثالی مسلمان بن سکیں جس کی ہر نقل وحرکت مجسّم تبلیغ ثابت ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یوں تو ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے، لیکن میں چند آسان تجاویز پیش کرتا ہوں جن پر عمل کرنے سے انشاء اللہ اس مقصد کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

۱۔ امریکہ کا ہر مسلمان خاندان چوبیس گھنٹے میں سے کم از کم آدھ گھنٹہ اسلامی تعلیمات کے مطالعے کے لیے مخصوص کرے۔ اس آدھ گھنٹے میں تمام افرادِ خاندان اسلامی عقائد و احکام اور تاریخ و سیرت سے متعلق کسی کتاب کا اجتماعی مطالعہ کریں، خاص طور سے بچوں کو بنیادی اسلامی احکام اور قرآنِ کریم کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ ہر مسلمان خواہ وہ کسی جگہ ہو، پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرے۔ نماز اسلام کا اہم ترین ستون ہے، اور اس کے بغیر اسلامی زندگی اپنانے کی ہر کوشش نامکمل بلکہ ناکام رہے گی۔

۳۔ ہر مسلمان اپنے گھر میں بھی اور باہر بھی، اسلامی طرزِ معاشرت کی پوری پابندی کرے۔

۴۔ ہر مسلمان اس بات کا عہد کرے کہ اُسے جب اور جہاں موقع ملے گا، اپنے گرد وپیش کے غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو موزوں انداز سے پیش کرے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق بخشے کہ ہم اس کے تمام احکام و قوانین کی خود بھی پابندی کریں، اور اسلام کے پیغام کو بہتر سے بہتر انداز میں دوسروں تک پہونچانے کے قابل ثابت ہوں، آمین ثم آمین

احقر نے جو کچھ اس تقریر میں عرض کیا، پورے خلوص اور یقین کے ساتھ عرض کیا، لیکن اس محدود اجتماع میں یہ نحیف و نزار آواز عملاً کتنی مؤثر ہوتی ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

کنونشن کی دوسری نشستوں میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے بھی "عصر حاضر میں مسلمانوں کے مسائل" کے عنوان پر فی البدیہہ تقریر کی، جناب خالد اسحاق صاحب نے بھی ایک موقع پر اپنی مختصر تقریر میں کچھ مفید تجاویز پیش کیں، اور امریکی غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا جو طرزِ عمل ہونا چاہیے، اس پر روشنی ڈالی۔

کنونشن تین روز جاری رہا، اور اس کا ایک مفید پہلو تو یہ تھا کہ امریکہ اور کینیڈا کے مختلف علاقوں سے مسلم تنظیموں کے جو نمائندے جمع ہوئے ان سے تبادلۂ خیال کے ذریعہ وہاں کے مسائل کا علم ہوا۔ ہوٹل ہالی ڈے ان ہی کے ایک ہال میں جمعہ کی نماز بھی ہوئی، اور جن عام مسلمانوں نے اس اجتماع میں شرکت کی، انھیں شاید اسلامی عبادات وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل ہوئی ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اجتماع سے جو کام لیا جا سکتا تھا، احقر کی رائے میں وہ نہیں لیا گیا، جن عام مسلمانوں نے اس کنونشن میں شرکت کی، ان میں اکثریت ان امریکی مسلمانوں کی تھی جن کے آباء و اجداد سالہا سال پہلے امریکہ میں آبسے تھے اور یہ لوگ امریکہ میں ہی پیدا ہوئے، یہیں آنکھ کھولی، اور امریکی تہذیب و معاشرت کے سوا انھوں نے کچھ نہیں دیکھا، چنانچہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی شکل و صورت، لباس و پوشاک، انداز و ادا اور زبان و بیان میں سے کوئی چیز ان کے مسلمان ہونے پر دلالت نہیں کرتی، اور اگر باصرار یہ نہ بتایا جائے کہ یہ لوگ مسلمان ہیں تو انھیں مسلمان سمجھنا مشکل

ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں نماز نہیں آتی، لہٰذا اس اجتماع سے ایک بڑا فائدہ یہ حاصل کرنا چاہیے تھا کہ ان کو اسلامی تعلیمات سے منظم طور پر روشناس کرایا جائے، لیکن افسوس ہے کہ یہ کام کسی منظم پروگرام کے تحت نہیں ہُوا۔ احقر نے اس بارے میں منتظمین سے بات کی تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مزاج و مذاق اور عادات و اطوار کے لحاظ سے سو فیصد امریکی سانچے میں ڈھل چکے ہیں، لہٰذا اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کم از کم زبانی طور پر ہی انہیں مسلمان رکھنے میں کامیاب ہو جائیں، اور اگر اس وقت ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی جو ان کے مزاج کے خلاف ہو تو خطرہ ہے کہ کہیں ہم ان کے اس زبانی اقرار ہی سے محروم نہ ہو جائیں، چنانچہ ان کو نہایت بتدریج اور حکمت کے ساتھ مسلمانوں سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

منتظمین کا یہ عُذر کسی حد تک حق بجانب بھی تھا، لیکن اس کنونشن کے دوران پکنک، کشتی رانی اور ڈنر کے جو پروگرام ترتیب دیئے گئے، ان میں خوردبین لگا کر بھی اسلام کی نہ صرف کوئی جھلک نظر نہ آسکی بلکہ بعض ایسی چیزیں بھی ان پروگراموں کے دوران سامنے آئیں جنھیں دیکھ کر پیشانی عرق عرق ہوگئی۔ حکمت اور تدریج اپنی جگہ ہے، لیکن اس کی رعایت کرتے ہوئے بھی ان پروگراموں کو با مقصد، تعمیری، بلکہ تربیتی اور نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔

امریکہ میں چارلسٹن کے بعد واشنگٹن اور نیویارک میں بھی قیام رہا، امریکہ کے بعد تقریباً ایک ہفتہ لندن میں بھی ٹھہرنا ہُوا، اور جس مغربی زندگی کو اب تک کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سُنا تھا، اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، مغرب کے مادّی عروج اور روحانی دیوالیہ پن کا جو تصور مطالعے سے قائم ہوتا ہے، اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہُوا، بعض چیزوں کو دیکھ کر حسرت ہوئی کہ درحقیقت یہ کام تو مسلمانوں کے کرنے کے تھے، اور بہت سی چیزوں کو دیکھ کر عبرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی دولت عطا فرما کر اور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف بخش کر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے، اور یہ لوگ ان نعمتوں سے محروم ہو کر پستی کے کس آخری کنارے تک پہنچ چکے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحبِ ایمان کے ذہن پر اس مغربی زندگی کا مشاہدہ کر کے اس قدر متضاد تاثرات قائم ہوتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ ان قوموں کے بعض کاموں کو دیکھ کر بے ساختہ تحسین آفرین کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں اور دوسری طرف انہی کی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر بے ساختہ لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔

ان لوگوں کی زندگی کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان میں بحیثیتِ مجموعی جہد و عمل، قومی حمیت اور اجتماعی شعور کی فراوانی ہے۔ ہمارے حلقوں میں ان لوگوں کی عیاشی تو زبان زدِ عام ہے، لیکن اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ صبح نو بجے سے شام چار بجے تک پوری فرض شناسی کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور اس دوران کسی کام چوری، رشوت ستانی، بدنظمی یا سستی اور کاہلی کو روا نہیں رکھتے، کسی انسان کو سرکاری دفتروں سے کام پڑ جائے تو اُسے بلاوجہ چکر کاٹنے نہیں پڑتے بلکہ اگر اس نے قانونی مقتضیات کو پورا کر لیا ہے تو اس کا کام فوراً ہو جاتا ہے، رشوت کی بیماری شاذ و نادر ہے، اور معاملات عام طور سے صفائی اور سچائی کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ یا دھوکہ فریب کا کوئی خطرہ شہریوں کو نہیں ہوتا، باہمی تعلقات میں ان کا طرزِ عمل بحیثیتِ مجموعی نہایت شریفانہ اور با اخلاق ہے، اپنے قیام کے دوران کسی دو آدمیوں کے درمیان تو تکار، غیظ و غضب یا تکرار کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا، جب کہ خالص عوامی حلقوں سے بھی خاصا سابقہ پڑا، ہر اس جگہ جہاں دو سے زیادہ آدمی کسی کام کے منتظر ہوں کسی نگراں کی مداخلت کے بغیر خود بخود قطار بن جاتی ہے، اور بڑے سے بڑے ہجوم میں اس قطار کو عمداً توڑنے کی کوشش نہیں ہوتی، ٹرینوں اور بسوں میں سوار ہوتے وقت، خواہ کتنی جلدی کا وقت ہو، کوئی کسی کو کہنی نہیں مارتا، بلکہ بسا اوقات دوسرے کو سوار ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ عام مقامات، مثلاً ریستورانوں، ٹرینوں، بسوں اور سڑکوں پر بلند آواز سے گفتگو کا دستور نہیں بلکہ سب دھیمی آواز سے بات کرتے ہیں، چنانچہ بڑے بڑے اجتماعات کی جگہوں پر بھی شور و شغب نہیں ہوتا۔ زیرِ زمین ٹرینوں کے بڑے بڑے ڈبے مسافروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ لیکن لوگ یا تو اخبار یا کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں یا خاموش بیٹھے ہیں، اور اگر کوئی بات ضروری ہو تو آہستگی سے کی جاتی ہے کوئی بوڑھا

یا معذور شخص بس یا ٹرین میں داخل ہو تو لوگ فوراً اس کے لیے سیٹ خالی کر دیتے ہیں، اجنبیوں کو راستہ بتانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، بار ہا ایسا ہوا کہ ہمیں کسی راستے کی تلاش تھی اور مقامی لوگوں نے محض ہمارے انداز سے یہ بات محسوس کر کے ہمارے پوچھے بغیر خود رُک کر پوچھا کہ ہمیں کس جگہ کی تلاش ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور عام طور سے میٹر سے زیادہ پیسے از خود ہڑپ کرنے کی فکر میں نہیں رہتے، نیویارک میں ایک دفعہ ٹیکسی کا کرایہ میٹر کے حساب سے نو ڈالر اور کچھ سینٹ بنا۔ میں نے ڈرائیور کو دس ڈالر کا نوٹ دیا، اس کے پاس ریزگاری نہیں تھی وہ اُتر کر ایک دُکان پر گیا، وہاں سے نوٹ بھنا کر لایا، اور باقی ریزگاری پہلے میرے حوالے کر دی اس کے بعد کہا کہ "میں نے آپ کا سامان بھی اٹھایا تھا، اگر آپ چاہیں تو کچھ ٹپ بھی دے دیں۔"

تمدنی سہولیات اور حسنِ انتظام بھی ان ملکوں میں اور سب سے بڑھ کر امریکہ میں قابلِ ستائش ہے، نیویارک رقبے اور آبادی کے لحاظ سے کراچی سے کم از کم تین گنا تو ضرور ہوگا اور یہ طویل و عریض شہر بھی کئی جزیروں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان سمندر حائل ہے، اور بیچ میں خوبصورت پُلوں کے ذریعے ان جزیروں کو ملایا گیا ہے، لیکن اتنے بڑے شہر میں بھی ٹرانسپورٹ کوئی مسئلہ نہیں ہے، خاص طور پر زیرِ زمین لوکل ٹرینوں کا نظام اس قدر آسان اور آرام دہ ہے کہ کار کے ذریعے سفر کرنا پارکنگ وغیرہ کے مسائل کی بنا پر مشکل، لیکن ان ٹرینوں کے ذریعے سفر کرنا آسان ہے، پورے شہر میں زیرِ زمین ریلوے لائنوں کا ایسا وسیع جال بنایا گیا ہے، اور اس پر ہر دو دو منٹ کے بعد اتنی فراوانی سے ٹرینیں مہیا کی گئی ہیں کہ ایک حصے سے دوسرے حصے تک سفر کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ پچاس سینٹ کا ایک ٹوکن لے کر آپ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کی بکنگ ٹیلیفون ہی کے ذریعے پختہ ہو جاتی ہے اور ائیر کمپنی کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ سفر ملتوی ہونے کی صورت میں مسافر اپنی بکنگ منسوخ کرانا نہیں بھولے گا، اندرونِ ملک سفر میں ایئر پورٹ پر عموماً دیر نہیں لگتی، نیویارک اور واشنگٹن میں ہوائی اڈے کے رَن وے پر اُڑنے والے جہازوں کی اس طرح قطار لگی رہتی ہے جیسے ٹریفک سگنل کے پاس کاروں کی، اس کے باوجود جہاز کے لیٹ ہونے کے واقعات شاذونادر ہی رونما ہوتے ہیں، جہاں جہاں ایئر بس سروس کا نظام قائم ہے، وہاں آپ پرواز

سے پانچ منٹ پہلے ہی پہنچ جائیں تو کسی سابقہ بکنگ کے بغیر ایئر کمپنی آپ کو سیٹ دینے کی پابند ہے، خواہ اس کے لیے اُسے دوسرا جہاز بھیجنا پڑے، بلکہ واشنگٹن سے نیویارک جاتے ہوئے ہم تو پرواز سے صرف تین منٹ پہلے ایئرپورٹ پہنچے، انہی تین منٹ میں کاؤنٹر بریفنگ بھی ہو گئی، سامان بھی چلا گیا، ہم طیارے میں سوار بھی ہو گئے، اور پرواز بھی بروقت ہو گئی۔

کمپیوٹروں نے خاص طور پر زندگی کو بیحد تیز رفتار بنا دیا ہے، قدم قدم پر مشینوں کے عجیب وغریب مناظر نظر پڑتے ہیں، اگر آپ کی رقم بینک میں جمع ہے اور رات کو کسی ایسے وقت آپ کو پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے جب کہ بینک بند ہے، تو آپ کمپیوٹر کے ذریعے مطلوبہ رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ نیویارک میں بعض علاقے بیحد گندے بھی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی صفائی ستھرائی اور شہری خوبصورتی کا معیار کافی بلند ہے، غرض باشندوں کو تمدنی سہولیات فراہم کرنے میں جس ذہانت، باریک بینی، محنت اور حسنِ انتظام سے کام لیا گیا ہے وہ بلاشبہ قابلِ تحسین وستائش ہے۔

لیکن اگر مغربی ممالک کی صرف انہی خصوصیات کا حال دور دور سے سُنا جائے تو بظاہر اس سے یہ اندازہ قائم ہو گا کہ یہ علاقے امن وعافیت کا گہوارہ ہوں گے، یہاں سکون واطمینان کا دَور دورہ ہو گا اور جرائم وبداخلاقی کا بیج مارا جا چکا ہو گا، لیکن حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ مغربی زندگی کی مذکورہ بالا روشن خصوصیات کے باوجود ان اندازوں کا جواب کُلّیۃً نفی میں ہے، تمدنی سہولیات، عام معاشی خوشحالی، صفائی، معاملات اور اخلاق وشرافت کے جو چند نمونے احقر نے اُوپر ذکر کئے ہیں، وہ ان خصوصیات کی محض ایک جھلک ہے اور اس پر بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مغربی زندگی کا دوسرا پہلو انتہائی تاریک، بھیانک اور مذکورہ بالا صفات سے حیرت انگیز حد تک متضاد ہے۔

کیفیت یہ ہے کہ روپے پیسے کی ریل پیل کے باوجود، چوری، جیب تراشی، نقب زنی

اور ڈکیتیوں کے واقعات روزمرہ کا معمول ہیں جس معاشرے میں امانت و دیانت اور صفائی معاملات کے قابلِ رشک مناظر نظر آتے ہیں، ٹھیک اسی معاشرے کا حال دوسری طرف یہ ہے کہ کوئی راہگیر جیب کتروں اور ٹھگوں سے محفوظ نہیں راہ چلتے چلتے کوئی آدمی قریب آکر اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے، اور دوسرے ہی لمحے اس کی چھوٹی سی پستول راہگیر کی طرف ہوتی ہے، اور وہ دن دہاڑے اپنی جیب خالی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ راستہ اگر قدرے سنسان ہو تو چلتے ہوئے آدمی کو روک کر اس کے سر پہ اس زور سے ضرب لگائی جاتی ہے کہ وہ بیہوش ہو جاتا ہے، اور پھر اس کی جان و مال ضارب کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اس خاص طریقۂ واردات کو (Hugging) کہا جاتا ہے، اور یہ آرٹ اب روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

گھروں میں نقب زنی، لوٹ مار اور ڈاکے روزانہ ہیں خاص طور سے جن ہوٹلوں میں غیر ملکی لوگ مقیم ہوں وہاں نت نئے طریقے سے ڈاکہ زنی کی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے تمام ہوٹلوں میں کمرے کے دروازے پر چٹخنی کے علاوہ ایک زنجیر اس مقصد سے لگائی جاتی ہے تاکہ دروازہ کھلنے کے باوجود چوکھٹ سے اٹکا رہے، اور اگر دروازہ کھولنے والا کسی دھوکے کا شکار ہوا ہے تو وہ دوبارہ دروازہ بند کر سکے، بہت سے ہوٹلوں پر نوٹس لگا ہوا ہے کہ رات کے نو بجے کے بعد ہوٹل کا دروازہ مقفل ہو جائے گا، اس کے بعد کوئی مسافر آئے تو پہلے فون پر انتظامیہ سے بات کرکے اپنے مسافر ہونے کا یقین دلائے اس کے بعد اندر داخل ہو۔ پچھلے دنوں نیویارک میں چند گھنٹوں کے لیے بجلی فیل ہوئی تھی تو لوٹ مار کا جو طوفان مچا اس کا شور ساری دنیا نے سنا۔ یہ اس معاشرے میں امن و امان اور جان و مال کے تحفظ کا معیار ہے جس کی پولیس انتہائی چوکس تربیت یافتہ فرض شناس اور فعّال ہے، اور جس کے شاندار تمدنی انتظامات اور حسنِ اخلاق کا بیان آپ نے اوپر پڑھا ہے۔

جہاں تک ان لوگوں کے جنسی طرزِ عمل کا تعلق ہے، اس کے مناظر دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ وہی قوم ہے جس کی شرافت و اخلاق کے مظاہرے ہم دوسرے شعبوں میں

دیکھ کر آئے ہیں، صرف تفریح گاہوں پر ہی نہیں، بارونق سڑکوں اور پُرہجوم بازاروں میں ٹرینوں اور بسوں میں اور پبلک مقامات پر برسرِ عام بوس وکنار اور جنسی التذاذ ایک عام بات ہے جس کے پانچ سات مناظر دن بھر میں خواہی نخواہی نظر آہی جاتے ہیں، عورتوں کے لیے عریانی عیب تو کیا ہوتی، شاید مایۂ افتخار سمجھی جاتی ہے، کپڑے نام کی جو چند دھجّیں ہوتی ہیں، ستر پوشی کے نقطۂ نگاہ سے ان کا بھی کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا، اور خاص خاص مواقع پر بالکل برہنگی میں بھی چنداں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا جگہ جگہ Nude Dancers (مادر زاد رقاصائیں) کے بورڈ بڑے فخر سے لگے نظر آتے ہیں۔ قحبہ خانوں کے اشتہار "مجالس حسن" (Beauty Parlours) کے نام سے برسر بازار تقسیم ہوتے ہیں۔ نیویارک کے ایک بازار میں گذرتے ہوئے ایک شخص نے ایک اشتہار ہم جیسوں کے ہاتھ میں بھی تھما دیا جس میں چند برہنہ تصویروں کے ساتھ جلی حروف میں لکھا تھا۔

Play with our Bodies یعنی "ہمارے جسموں سے کھیلیے" اور اس اشتہار میں جو کچھ لکھا تھا اسے ایک شریف آدمی کے لیے پڑھنا بھی مشکل ہے۔ غرض یہ کہ جنسی طرزِ عمل کے لحاظ سے یہ قومیں بلا مبالغہ کتے بلیوں کی سطح تک پہونچ چکی ہیں۔

پھر حیرت اور عبرت کا انتہائی مقام یہ ہے کہ جس معاشرے میں عورت اتنی سستی اور اس سے لذت حاصل کرنا اتنا آسان ہو، جہاں عورت سے لطف اندوز ہونے کے لیے خلوت بھی ضروری نہ ہو، اور جہاں زنا بالرضا کو صرف قانونی طور پر ہی نہیں، سماجی اور عقلی اعتبار سے بھی کوئی عیب نہ سمجھا جاتا ہو، ٹھیک اسی معاشرے میں "زنا بالجبر" کی اتنی وارداتیں ہوتی ہیں کہ الامان!

زنا کے علاوہ ہم جنسی کا رجحان انتہائی تیزی سے بڑھ رہا ہے، اور باہمی رضامندی ہو تو اس انسانیت سوز بدمذاقی میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ہمارے قیام کے دوران "نیویارک ٹائمز" میں ایک بحث "ہم جنسی" کے موضوع پر چل رہی تھی، ہم نے سمجھا کہ اس کے جواز و عدم جواز کی بحث ہوگی، لیکن پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ مرحلہ گذر چکا ہے، اب یہ بات

تو طے ہو چکی ہے کہ اس بداخلاقی میں فی نفسہٖ کوئی قباحت نہیں، البتہ بحث یہ ہے کہ اس عمل میں کالے گورے کے درمیان کوئی امتیاز برتا جائے یا نہیں ؟

شراب نوشی تو اس معاشرے میں ایک مقدس عمل ہے، قدم قدم پر شراب خانے موجود ہیں، اس کے باوجود غیر قانونی منشیات کا کاروبار زوروں پر ہے، نوجوانوں میں افیون اور چرس وغیرہ کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ راحت و آسائش کے اسباب، تمدنی سہولیات اور عیش و عشرت کی آسانی کے باوجود قلبی سکون کا یہ عالم ہے کہ بے خوابی کی شکایت عام ہو رہی ہے، اور خواب آور ادویہ کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

ظاہری اخلاق کے اس معیار کے باوجود جس کا مختصر تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، خاندانی تعلقات کا نظام درہم برہم ہے اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت و الفت کے تقاضے نایاب ہوتے جا رہے ہیں، امریکی معاشرے میں بڑھاپا موت سے بدتر عذاب ہے، بوڑھوں کے لیے الگ مرکز قائم ہیں جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہوتا ہے لیکن وہ اس محبت کو ترستے ہیں جو صرف خون کے رشتے کی خاصیت ہے۔ بڑے بڑے مالدار لوگوں کے ماں باپ ان مراکز میں بے چارگی کے ساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں، اور ان کی اولاد مہینوں بلکہ بعض اوقات سالوں ان سے ملنے نہیں آتی اور جو بوڑھے گھر پر رہ جائیں، انھیں کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا، ایسے بوڑھوں کی طرف سے باقاعدہ اشتہارات شائع ہوتے ہیں کہ "ہم سے فلاں پتے پر مل کر گھنٹہ بھر بات کر لیجیے" اور اس ہمدردی کا بسا اوقات معاوضہ بھی پیش کیا جاتا ہے، تنہائی سے اکتائے ہوئے بوڑھے بعض اوقات بے مقصد لوگوں کو فون کرتے رہتے ہیں، تاکہ کچھ دیر کسی سے بات کر سکیں۔

مغربی معاشرے میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت عورت کی ہے، اس بیچاری کو جس بُری طرح بے وقوف بنا کر اس کے ساتھ جو فراڈ کھیلا گیا ہے اس کا اندازہ تو پہلے بھی تھا، لیکن ان مغربی ممالک کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس کی زار و زبوں حالت پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو گئی۔ کہنے کو تو کہا یہ گیا ہے کہ ہم عورت کو مرد کے دوش بدوش

لانا چاہتے ہیں، لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ معاشرے میں جتنے نچلے درجے کے کام ہیں وہ تمام تر نہ سہی تو بیشتر ضرور، عورت کے حوالے ہیں۔ اس دوران ہمیں دسیوں ہوٹلوں میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں مرد بیرا شاذ و نادر ہی نظر آیا، عام طور سے یہ خدمت عورتوں ہی کے سپرد ہے، دکانوں پر سودا بیچنے کا کام بھی اکثر و بیشتر عورتیں ہی کرتی ہیں۔ ہوٹلوں کے "ڈیسک" پر عموماً عورتیں نظر آتی ہیں، جہاز کا پائیلٹ یا کیپٹن تو مرد ہوگا، لیکن مسافروں کی خدمت اور ناز برداری کا فریضہ عورتوں کے سپرد ہے۔ دُنیا کی کسی چیز کا اشتہار عورت کے بغیر نامکمن سا ہے اور ہر وہ کاروبار جس میں عام لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو، اس کی انجام دہی عورت کے سپرد ہے اور پھر یہ نہیں کہ گھر سے باہر کے یہ فرائض انجام دینے کے بعد عورت کو امورِ خانہ داری سے چھٹی مل گئی ہو، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی نگہداشت بھی عام طور سے بدستور اسی کے سپرد ہے بلکہ اس آزادی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ گھر کے جن کاموں کا تعلق باہر سے ہے مثلاً اشیائے ضرورت کی خریداری وغیرہ بھی عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ بعض عورتیں دفتر کی ڈبل ڈبل ڈیوٹی کرنے کے بعد بھی گھر پہنچ کر کھانا تیار کرنے، گھر کی صفائی، اور بچوں کی نگہداشت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ پھر اس کا سماجی رتبہ یہ ہے کہ جس مرد کا دل چاہے۔ اس کا دل لبھا کر اُس سے دوستی پیدا کرلے۔ اور جب تک دل چاہے، اس کی قربت سے بر سرِ عام لطف اندوز ہو، اور جب اس سے جی بھر جائے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سے راہ و رسم پیدا کرلے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مغربی مرد عورت سے قدم قدم پر لطف اندوز بھی ہونا چاہتا ہے اس کے ذریعے اپنی تجارت بھی چمکانا چاہتا ہے، لیکن اس کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کیلئے تیار نہیں، اور اس خود غرضانہ فراڈ کو سندِ جواز دینے کے لیے اس کا نام "تحریکِ آزادیٔ نسواں" رکھ دیا ہے، دعویٰ تو یہ کیا گیا ہے کہ ہم عورت کو مرد کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور اُسے اعلیٰ مناصب تک لے جانا چاہتے ہیں، لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ عموماً معاشرے کے تیسرے درجے کے کام عورت کے حوالے ہیں، اور اعلیٰ مناصب پر بدستور مرد ہی کا تسلط ہے مغربی ممالک کا ایک سرسری جائزہ لے کر ہی دیکھ لیجئے کہ وہاں کتنی عورتیں صدر، وزیرِ اعظم یا

سربراہِ مملکت کا عہدہ حاصل کر سکی ہیں، کابینہ میں عورتوں کا تناسب کیا ہے؟ اسمبلی اور سینٹ میں مردوں کے مقابلے میں کتنی عورتیں ممبر بنی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی مغربی ملک میں ان اعلیٰ مناصب پر فائز عورتوں کی تعداد شاید پچیس تیس سے زائد نہ ہو، لیکن ان چند عورتوں کو اعلیٰ مناصب تک پہونچانے کی خاطر لاکھوں عورتوں کو اس طرح سڑکوں پر گھسیٹ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے تیسرے درجے کے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن عورت کی اس ہمہ جہتی تذلیل کا خوبصورت نام "آزادیٔ نسواں" رکھ کر اور جن معاشروں نے عورتوں کو گھر کی ملکہ بنا کر اس کے سر پر عفت وعصمت کا تاج رکھا ہے، ان کے خلاف دقیانوسیت اور پسماندگی کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر مغرب نے اپنے اس فراڈ کو سندِ جواز ہی نہیں دی، بلکہ عورت بے چاری کو یہ باور کرا دیا ہے کہ صرف مغرب اس کے حقوق کا علمبردار ہے۔ چنانچہ مغربی عورت کی مظلومیت کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس بے چاری کو اپنی مظلومیت کی خبر نہیں، اور جن قزاقوں نے اس کی عزت وحرمت کو ملیامیٹ کیا ہے، انہی کو وہ اپنا نجات دہندہ سمجھنے پر مجبور ہے۔

مغربی ممالک سے متعلق اپنے سفر کے چند مشاہدات احقر نے کسی تعصب یا ادنیٰ مبالغے کے بغیر اوپر پیش کئے ہیں اور ان تمام مشاہدات کے نتیجے میں احقر کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ مغرب میں تبلیغِ اسلام کا بہترین وقت ہے، مغرب کے عوام اس لحاظ سے قابلِ رحم ہیں کہ وہ مادّی ترقیات کے نقطۂ عروج پر پہونچنے کے لیے اپنی انتھک جدوجہد کے باوجود اس دُنیا میں بھی ان ترقیات کے بہت سے خوشگوار نتائج سے محروم ہیں، اور آخرت کے لحاظ سے تو معاملہ صفر ہے ہی۔ مغرب کے سفر کے دوران قرآنِ کریم کی یہ آیات بار بار کانوں میں گونجتی رہیں:-

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ۔

(ترجمہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں ان کو گرفتارِ عذاب

رکھے اور ان کی جان کفر کی حالت میں نکل جاوے۔

اور:-

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِى الْبِلَادِ، مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔

(ترجمہ) تجھ کو دھوکہ نہ دے ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا چند روزہ بہار ہے پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور وہ بری آرام گاہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغرب میں تبلیغِ اسلام کی کوئی باقاعدہ منظم اور مخلصانہ جدّ و جہد ہماری طرف سے ابھی تک شروع نہیں ہوئی، مسلمانوں کی جو چھوٹی چھوٹی تنظیمیں مختلف علاقوں میں کام کر رہی ہیں، اُن کی تمام تر توجہ خود مسلمانوں کے مسائل کی حد تک محدود ہے، اور ہماری شامتِ اعمال یہ ہے کہ وہاں بھی یہ تنظیمیں باہمی افتراق و انتشار اور دھڑے بندیوں کی شکار ہیں صرف ایک تبلیغی جماعت کی سادہ، پُرخلوص مگر محدود کوششیں غیر مسلموں کی طرف بھی متوجہ ہیں۔ خاص طور سے انگلستان میں اس جدّ و جہد کے بہت مفید اثرات سامنے آئے ہیں، لیکن اس رُخ پر کوئی ہمہ گیر کام نہیں ہوا، نہ ہمارے پاس اس غرض کے لیے کافی لٹریچر ہے، نہ کوئی منصوبہ بندی ہے، اور نہ جہد و عمل کا خاطر خواہ جذبہ ہے، ان حالات میں مغرب میں کام کرنے کا انتہائی وسیع میدان موجود ہے، اگر کوئی منظم جدّ و جہد اس سمت میں کی جائے تو اس کے بہت مفید اثرات سامنے آسکتے ہیں وہاں کن کن پہلوؤں سے کس کس کام کی ضرورت ہے؟ یہ ایک مستقل مفصل موضوع ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی تجاویز ذہن میں ہیں، لیکن اس شمارے میں اُسے پیش کرنے کا موقع نہیں رہا، زندگی رہی تو انشاءاللہ پھر کسی فرصت میں اس موضوع پر مفصل گفتگو ہو سکے گی۔

امریکہ سے واپسی پر تقریباً ایک ہفتہ لندن میں بھی قیام رہا، وہاں اسلامک سینٹر اور بعض دوسری مسجدوں میں خطاب کا بھی موقع ملا، انگلینڈ کے دوسرے شہروں سے بھی وہاں جانے کا اصرار تھا، لیکن رمضان المبارک قریب ہونے کی بنا پر ہم نے اپنے سفر کو مختصر

گیا، اور (مصر کی تقویم کے لحاظ سے) ۲۹ شعبان کی رات کو لندن سے قاہرہ روانہ ہوگئے، راستے میں جہاز اٹلی کے دارالحکومت روم اور یونان کے دارالحکومت ایتھنز بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرا، اور پھر صبح آٹھ بجے کے قریب ہم قاہرہ پہنچ گئے، یہاں دو دن اور ایک رات قیام رہا، قاہرہ صدیوں سے عالم اسلام کا ممتاز علمی مرکز رہا ہے، اس لیے یہاں زیادہ ٹھہرنا چاہیے تھا، لیکن خواہش یہ بھی تھی کہ رمضان المبارک کا آغاز حجاز مقدس میں ہو، اس لیے یہاں کا حق ادا نہ ہوسکا، اس دو روزہ کے قیام میں صرف جامعۃ الازہر سرسری طور سے دیکھ سکے، اس کے علاوہ قاہرہ کا وہ عجائب گھر دیکھنے کا موقع ملا جس میں فراعنہ اور ان کی بیگمات کی حنوط کردہ لاشیں محفوظ ہیں، یہ ایک عظیم عبرت کدہ ہے جس میں خدائی کے دعوے دار پتھر بنے پڑے ہیں، اور قرآن کریم کے اس ارشاد کی حقانیت کی گواہی دے رہے ہیں۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً

پس آج ہم تمہارے بدن کو نجات دیتے ہیں تاکہ تم اپنے بعد آنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بن جاؤ۔

قاہرہ کے قیام میں ایک شدید غلط فہمی کی واضح تردید ہوئی۔ عام طور سے مشہور یہ ہے کہ مصر میں قمری تقویم حسابی تخمینوں پر مرتب کی جاتی ہے، اور چاند دیکھنے کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا، لیکن اس روز اس خیال کی تردید ہوگئی۔ جس روز ہم قاہرہ پہنچے ہیں، وہاں کے حساب سے وہ چاندرات تھی، معلوم یہ ہوا کہ وہاں ہر سال ۲۹ شعبان کو عشاء کے قریب "استقبالِ رمضان" کے نام سے ایک تقریب ہوتی ہے جس میں مصر کے ممتاز علماء اعیانِ حکومت اور معززینِ شہر شریک ہوتے ہیں، یہ تقریب ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر کی جاتی ہے۔ اس روز اس تقریب میں مفتیٔ مصر شیخ احمد الخجنہ کے علاوہ صدر سادات کی نیابت کے طور پر قاہرہ کے گورنر بھی شریک تھے۔ اس میں مفتیٔ مصر نے ایک عالمانہ تقریر کرتے ہوئے ان لوگوں کی واضح تردید کی جو رمضان اور عید وغیرہ کے تعین کے حسابات کو فیصلہ کن قرار دیتے ہیں، اور اعلان کیا کہ کتاب و سنت کی رو سے اعتبار چاند کے حقیقۃً نظر آنے کا ہے، البتہ

انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اختلافِ مطالع کے مسئلے میں جمہور کے قول کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور جن خطّوں میں رات مشترک ہو، وہاں اگر کسی جگہ چاند نظر آجائے اور اس کی اطلاع شرعی ذرائع سے دوسری جگہ پہونچ جائے تو دوسری جگہ بھی یہ رویتِ ہلال معتبر ہونی چاہیے۔ اس اصول کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ حکومتِ مصر کی طرف سے قاہرہ اور اسکندریہ کی رصدگاہوں میں، نیز برج القاہرہ پر چاند دیکھنے کے لیے جماعتیں مقرر کی گئی ہیں (برج القاہرہ دریائے نیل کے کنارے ایک خوبصورت مینار ہے جس کی اونچائی اسّی منزلوں کے برابر ہے، اور یہاں سے نہ صرف قاہرہ کا پورا شہر بلکہ مضافاتی علاقے بھی نظر آتے ہیں)، لیکن کسی بھی جگہ چاند نظر نہیں آسکا، اس کے علاوہ سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ممالک سے بھی رابطہ قائم کیا گیا، وہاں بھی چاند نظر نہیں آیا۔ اس لیے پہلا روزہ جمعہ کے بجائے ہفتے کو رکھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ اس سفر کا اختتام حجازِ مقدّس پر ہوا، رمضان المبارک کا پہلا روزہ مکہ مکرمہ میں رکھا، رمضان کی مبارک ساعتوں میں عمرہ و زیارت کی توفیق ہوئی، پانچ دن حرمین شریفین کے جوار میں رہنے کا شرف ملا، اور ایک پھر اس حقیقت کی مکمل آنکھوں تصدیق ہوئی کہ دنیا و ما فیہا کے تمام مناظرِ حسن و جمال اُس حسن و جمال کے آگے گرد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس بظاہر بے آب و گیاہ خطّے میں ودیعت فرمادیا ہے، امریکہ اور انگلینڈ میں بحمد اللہ راحت و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے، موسم بھی خوشگوار تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک دن بھی نشاطِ خاطر میسّر نہ آسکا، بلکہ ایک عجیب قسم کی ظلمت محسوس ہوتی رہی، لیکن بیت اللہ کے جوار میں پہونچنے کے بعد شدید گرمی، روزے اور عمرے کی تھوڑی بہت مشقت کے باوجود یوں محسوس ہوا کہ ؎

اگر جنّت بریں رُوئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

ہندوستان کا سفر

بہ سلسلۂ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند

مارچ سنہ ۱۹۸۰ء

(۱۰)

ہندوستان کا سفر

پچھلے مہینے دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم کا وہ یادگار صد سالہ اجلاس منعقد ہوا جس کا مدت سے اشتیاق اور انتظار تھا۔ اس اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے احقر نے ہندوستان کا سفر کیا، اور تقریباً پورا ہی مہینہ اس سفر کی نذر ہوگیا۔

اس اجلاس میں شریک ہونے والوں کے لیے پاک و ہند کی حکومتوں نے باہمی معاہدے کے تحت خصوصی سہولتیں فراہم کی تھیں، اور حکومت پاکستان نے لاہور سے ایک اسپیشل ٹرین اٹاری تک اور حکومت ہند نے اٹاری سے دیوبند تک چلائی تھی۔ لاہور میں اس ٹرین کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ رخصت کیا گیا اور اس میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو افراد کا قافلہ دیوبند کے لیے روانہ ہوا، اس قافلے میں دیوبند سے وابستگی رکھنے والے ممتاز علماء، خطباء، طلباء اور دوسرے مسلمان شامل تھے۔ اور مقصد و مشرب کی یک جہتی نے اس اجتماعی سفر میں بڑا کیف و سرور پیدا کر دیا تھا۔ ٹرین لاہور سے ۱۹ مارچ کو ٹھیک بارہ بجے روانہ ہوتی تھی۔ لیکن اٹاری میں کسٹم اور امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے عصر کا وقت ہو گیا اور مغرب کی نماز امرتسر کے اسٹیشن پر پڑھی گئی۔ امرتسر سے دیوبند تک کا سفر اگرچہ سات آٹھ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے، لیکن رات کو بے وقت پہنچنے کے خیال سے ٹرین کو اس انداز سے لے جایا گیا کہ وہ اگلے دن فجر سے پہلے دیوبند نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ یہ سفر رات بھر جاری رہا۔

آنکھ کھلی تو سحری کا وقت تھا اور گاڑی سہارنپور کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ گویا دیوبند اب صرف اٹھائیس میل دور رہ گیا تھا، لیکن اشتیاق و انتظار کی ناقابل بیان

کیفیت نے اس مسافت کو انتہائی صبر آزما بنا دیا۔

دیوبند کے ساتھ مجھ ناچیز کا تعلق بڑا گوناگوں قسم کا ہے۔ اگرچہ احقر کی جائے پیدائش دیوبند ہی ہے۔ لیکن میری عمر صرف چھ سال تھی جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے تھے اس کے بعد تیرہ سال کی عمر میں ایک مرتبہ اور دیوبند جانا ہوا لیکن وہ بھی مسافر اور مہمان بن کر اس لیے اپنے سابقہ وطن کی حیثیت سے دیوبند کا تصور احقر کی نظر میں ایک دھندلے خواب سے زیادہ نہیں لیکن قدرت نے کسی انسان کی جائے پیدائش میں اس کے لیے جو کشش رکھی ہے اس کا حیرت انگیز مظاہرہ ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے۔ بظاہر ایک چھ سالہ بچے کو وطن اور وطن کی محبت کا کوئی شعور نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک طبعی بات ہے کہ آج تیس سال بعد بھی دیوبند کے نام سے دل میں محبت کی پھوار یں پڑتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیوبند میں ابھی تک احقر کے ایسے عزیز و اقارب آباد ہیں جن کی بے لوث محبت اور جن کا خلوص بذات خود ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیوبند احقر کے لیے صرف ایک جائے پیدائش اور اعزہ و احباب کا شہر نہیں، بلکہ رشد و ہدایت کا وہ عظیم سرچشمہ ہے جس کے فیض نے ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود مجھ جیسے نہ جانے کتنے پیاسوں کو سیراب کیا ہے۔ یہ ان علماء محققین کا مرکز ہے جن کی خوشہ چینی کر کر کے مجھ جیسے طالب علم جی رہے ہیں۔ یہ ان اولیاء اللہ کی سرزمین ہے جنہوں نے اپنی پاکیزہ سیرتوں سے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کی، اور دین و دنیا کی جو کوئی نعمت مجھ جیسے طالب علموں کے پاس ہے وہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ یہ ان خدا مست مجاہدین کی چھاؤنی ہے۔ جنہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر طاغوت کی ہر شکل اور باطل کے ہر روپ کے خلاف جہاد کیا۔ اور اپنے خون پسینے سے برصغیر کے علاقے میں مسلمانوں کی عزت و آزادی کے چراغ روشن کیے، اور مختصر یہ کہ یہ ان نفوس قدسیہ کا دیار ہے جو اس آخری صدی میں دین کے مجدد ثابت ہوئے، اور جنہوں نے قرآن و سنت کی علمی و عملی تفسیر اس آخری دور میں پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کا بھیجا ہوا یہ دین آج بھی عمل کرنے والوں کے لیے سدا بہار ہے۔ ان نفوس قدسیہ

نے دیوبند کی سرزمین میں جو دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی ہے اور اس کی بنا پر اس چھوٹی سی بستی سے عقیدت و محبت کا جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ خون اور نسب کے ہر رشتے سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔

گاڑی سہارنپور سے دیوبند کی طرف بڑھ رہی تھی اور دل میں جذبات و تصورات کا ایک تلاطم برپا تھا۔ ذہن میں ماضی کے بے شمار ورق تیزی سے اُلٹ رہے تھے۔ اور نگاہوں کے سامنے یادوں کی ایک فلم چل رہی تھی، اپنے سابقہ وطن کو دیکھنے کا شوق، اعزہ و احباب سے ملنے کی آرزو اور سب سے بڑھ کر اکابر علمائے دیوبند کے مآثر کی زیارت کی تڑپ نہ جانے کتنے جذباتِ شوق کا کارواں تھا جو ٹرین سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دیوبند کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُفق پر دُور تک پھیلے ہوئے بجلی کے قمقمے نمودار ہوئے، دیوبند کے آس پاس چونکہ ایک ایسی جگمگ کرتی ہوئی کوئی آبادی نہیں ہے، وہاں سے پھیلنے والے عالمگیر معنوی نور کے بعد کبھی دیوبند کو نمود و نمائش کی ظاہری چمک دمک کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لیے یقین ہو گیا کہ یہ اجلاسِ صد سالہ کا وہ کیمپ ہو گا جو عارضی طور پر دیوبند کی بستی کے باہر قائم کیا گیا ہے، اور تھوڑی ہی دیر میں جب صبحِ صادق کا جھٹپٹا اُجالے میں تبدیل ہو رہا تھا تو ریل گاڑی اس کیمپ کے سامنے ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم پر رُک گئی جس پر "دارالعلوم ہالٹ" لکھا ہوا تھا، یہ پلیٹ فارم ریلوے نے عارضی طور پر اجلاس میں آنے والی اسپیشل ٹرینوں کے لیے قائم کیا تھا کیونکہ اجلاس کا کیمپ یہاں سے شروع ہوتا تھا اور حدِ نظر تک چلا گیا تھا، ہم نے یہاں اُتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ دیوبند کا اصل اسٹیشن تقریباً تین میل دُور تھا، فیصلہ یہ ہوا کہ تمام لوگ اسی اصل اسٹیشن پر جا کر اُتریں گے، چنانچہ نماز کے بعد ٹرین پھر روانہ ہوئی، اور چند منٹ میں اس نے دیوبند پہنچا دیا۔

چوبیس سال کے بچھڑے ہوئے اعزہ سے ملاقات ہوئی، بہت سی صورتیں ایسی تھیں کہ قریبی رشتہ داری کے باوجود ان کی زیارت پہلی بار ہو رہی تھی بہت سی صورتیں وہ تھیں کہ مرورِ ایام کی وجہ سے انہیں پہچاننا مشکل تھا، غرض یہ دن عزیزوں اور دوستوں

سے ملاقات اور دیوبند کی گلیوں اور مکانات کے درمیان پُرانی یادیں تازہ کرنے میں گزرا، عم زادۂ محترم جناب مولانا خورشید عالم صاحب کے یہاں قیام ہوا جو دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں سے ہیں، اور اجلاسِ صد سالہ کے ان آٹھ منتظمین میں سے ہیں جن کی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برسرِ اجلاس خاص طور پر تحسین فرمائی۔ مہمانوں کی کیمپنگ، پنڈال، اسٹیج اور اسٹالوں کا انتہائی مشکل انتظام انہی کی شب و روز کی انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا، ان کا مکان بھی ہمارے آبائی محلے میں ہے، اور اسی کے متصل وہ مکان بھی ہے جو کبھی ہمارا تھا۔

قیام گاہ سے نکل کر سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی، وہاں ایک عید کا سا سماں تھا، اور ہر لحظہ مہمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، سب سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم کی خدمت میں حاضری ہوئی، خیال یہ تھا کہ اس وقت ان پر اتنے عظیم اجلاس کی ذمہ داری اور اس کے انتظامات کا زبردست بوجھ طاری ہو گا، لیکن دیکھا کہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی نشست پر انتہائی پُرسکون انداز میں تشریف فرما ہیں۔ حسبِ معمول ایک دلآویز تبسم کے ساتھ ہر آنے والے کا خیر مقدم فرما رہے ہیں اور اس طرح مصروفِ گفتگو ہیں جیسے کوئی نئی بات ہی نہیں۔ فرمانے لگے کہ دل یوں چاہتا تھا کہ جتنے حضرات باہر سے آئے ہیں اُن میں سے ایک ایک کی قیام گاہ پر خود جا کر ان کا خیر مقدم کروں، لیکن دو تین روز سے بخار سا ہے، اس لیے معذور ہو گیا، احقر نے اجلاس کے انتظامات کی بات چھیڑی تو فرمایا کہ "بھائی! مَیں نے تو اپنے تمام رفقا سے کہہ دیا ہے کہ جتنا انتظام آپ کے بس میں ہے وہ کر لیجیے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیے، انشاء اللہ سارے کام ان کی طرف سے دُرست ہو جائیں گے۔"

دارالعلوم کا ایک ایک گوشہ ایک مستقل تاریخ ہے، احاطۂ مولسری میں داخل ہوتے ہی ان مقدس شخصیتوں کے سانسوں کی مہک آج بھی فضا میں محسوس ہوتی ہے۔ مشرق میں وہ کنواں آج بھی علم کے پیاسوں کو سیراب کر رہا ہے جس کے بارے میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب جیسے ولی اللہ نے یہ خواب دیکھا تھا کہ یہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا

ہے۔ اس کے ارد گرد تشنگان معرفت کا ہجوم ہے، اور سرکار رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس کنویں سے سیراب فرما رہے ہیں۔ احاطے کے بیچوں بیچ مولسری کے وہ درخت ہیں جن کی پُرکیف چھاؤں میں نہ جانے کتنے علماء و اولیاء اسباق کے تکرار میں مصروف رہے، مغرب میں وہ دارالحدیث ہے جس نے اس صدی کے سب سے مایہ ناز محدثین پیدا کئے۔ اور اس کے اُوپر دارالتفسیر کا وہ پرشکوہ گنبد ہے جس میں گزشتہ صدی کے عظیم مفسر تیار ہوئے۔ احاطہ مولسری کی شمالی دیوار میں وہ کمرہ ہے جو مدتوں دارالافتاء کی حیثیت میں استعمال ہوا۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سالہا سال تک یہیں فتاویٰ لکھتے رہے۔ اور اس طرح یہاں سے "فتاویٰ دارالعلوم" کا وہ عظیم خزانہ تیار ہوا جس کا بمشکل بیسواں حصہ ابھی تک شائع ہو سکا ہے۔ غرض اس احاطے سے لے کر باب الظاہر تک یہاں کا چپہ چپہ اس صدی کے بہترین انسانوں کی یادگار ہے اور اس کے ایک ایک کونے کی تاریخ پر مستقل کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ماضی کے تصورات کا ایک جہان دل میں لیے گھنٹوں اس ادارے کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا، ایک ایک یادگار کو دیکھ کر متنبیؔ کا یہ شعر زبان پہ آجاتا تھا ؎

بلیت بلی الاطلال إن لم أقف بها
وقوف شحیح ضاع فی الترب خاتمه

عصر کے بعد چند رفقاء کے ہمراہ قبرستان کا رُخ کیا، یہ قبرستان "مقبرہ قاسمی" کے نام سے موسوم ہے۔ سب سے پہلے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی، دارالعلوم انہی کا لگایا ہوا پودا ہے جس کے برگ و بار آج سارے عالم اسلام میں پھیل چکے ہیں۔ آج اس مزار پر دارالعلوم کے فیض یافتگان کا اتنا ہجوم تھا کہ شاید پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ انہی کے پائنتے میں دو قبریں سب سے ممتاز نظر آتی ہیں۔ ایک شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ کی ہے جو دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے، اور پھر مدرس، صدر مدرس، شیخ الحدیث سبھی کچھ رہے، اور دارالعلوم کی چٹائیوں پر بیٹھ کر ہی اُنہوں نے آزادیٔ ہند کی وہ بین الاقوامی تحریک چلائی جو "ریشمی رومال کی تحریک"

کے نام سے معروف ہے، دیکھنے میں مشتِ استخوان، اور کفر و باطل کیلئے ایک ناقابلِ تسخیر چٹان سے

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ساری عمر جہاد اور اس کی تیاری میں گذری جب وفات کا وقت آیا تو طبیعت پہ آزردگی دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھے کہ شاید موت کی فکر ہے، لیکن پوچھا گیا تو جواب دیا کہ: "آرزو یہ تھی کہ کسی میدانِ کارزار میں موت آتی، سر کہیں ہوتا دھڑ کہیں، غم اس کا ہے کہ آج بستر پہ مر رہا ہوں" علم و فضل، تقویٰ و طہارت، جہد و عمل، تواضع و للہیت اور ایثار و قربانی کا یہ پیکرِ جمیل دار العلوم دیوبند کی فصل کا پہلا پھل تھا جو یہاں ایک کچی قبر کے نیچے آرام فرما ہے۔ انہی کے بالکل برابر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کا مزار ہے، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہندؒ کے ان جاں نثار رفقاء میں سے تھے جنہوں نے اپنے شیخ کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اور ان کے مقصدِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے جان کو جان نہیں سمجھا۔ احقر کے والد ماجدؒ، ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے تھے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ جب شیخ العرب والعجم بن چکے تھے تو حضرت شیخ الہندؒ کے گھر میں نکاح کی کوئی تقریب تھی، اس موقع پر میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ حضرت مدنیؒ خود اپنے سر پہ پانی کا مٹکا رکھ کر اپنے شیخؒ کے گھر لے جا رہے تھے۔ انہوں نے جس طرح ساری عمر اپنے شیخؒ کی خدمت و صحبت میں گذاری، اللہ تعالیٰ نے انہیں وفات کے بعد بھی اپنے شیخؒ کا پہلو نصیب فرمایا۔

ان حضرات کے آس پاس حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ مفتی اعظم دار العلوم، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ مہتمم دار العلوم، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہٗ اور نہ جانے علم و فضل کے کتنے پہاڑ مدفون ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مدنیؒ کے پائتانے ذرا مغرب کی طرف ہٹ کر احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہٗ کا مزار ہے۔ جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے ہم سبق اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، اور ہر علم و فن میں اعلیٰ استعداد رکھنے کے باوجود ساری عمر دارالعلوم کے درجۂ فارسی و ریاضی کے اُستاذ رہے اور دیوبند کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں کئی کئی پشتوں نے ان سے نہ پڑھا ہو۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے "میرے والدِ ماجدؒ" میں ان کے حالات قدرے تفصیل سے لکھ دیئے ہیں۔

اس قبرستان کے شمال میں ذرا فاصلے پر حضرت حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے جو دارالعلوم کے مؤسسین میں سے ہیں اور ولایت و تقویٰ کے اس مقام پر تھے جو معاصر اہلِ علم کے لئے بھی قابلِ رشک تھا۔

قبرستان کے شمال مغرب میں تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر دیوبند کی عیدگاہ ہے۔ اور اس کے جنوبی پہلو میں امام العصر حضرت سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کا مزار ہے۔ اس دعوے میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس صدی میں علم حدیث کے سب سے بڑے امام تھے۔ اس بات کا اعتراف صرف علمائے ہند ہی نے نہیں، عالمِ عرب کے محقق علماء نے بھی کیا ہے، حافظے اور وسعتِ مطالعہ میں ان کی کوئی نظیر ماضی قریب میں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرتؒ کی تقریر بخاری اور تقریر ترمذی شائع ہو چکی ہیں، لیکن جن حضرات نے براہِ راست آپ کے درس میں شرکت کی ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ ان تقریروں میں حضرت شاہ صاحبؒ کے اندازِ درس کی مشکل ۲۵ فی صد جھلک آسکی ہے۔

غرض اس قبرستان کا ایک ایک فرد ایسا ہے کہ اس کے تذکرے کے لیے مستقل کتابوں کی ضرورت ہے، اور بحمداللہ بہت سے بزرگوں کی سوانح شائع بھی ہو چکی ہیں، کاش! کوئی اللہ کا بندہ "مقبرۂ قاسمی" کے نام سے ایک کتاب لکھے اس میں ان تمام بزرگوں کے مزارات کی نشاندہی بھی ہو اور ان کی نمایاں خصوصیات کا تذکرہ بھی۔

مغرب کے بعد اُس جگہ کا رُخ کیا جہاں اگلے دن سے اجلاسِ صد سالہ شروع ہونے

والا تھا۔ دیوبند کے شہر میں کوئی ایسی جگہ فراہم ہونے کا سوال ہی نہیں ہے جہاں اتنا بڑا اجتماع منعقد ہو سکے، چنانچہ جب ہم کراچی میں رہتے ہوئے یہ تصور کرتے تھے کہ دیوبند میں اتنا بڑا اجتماع کہاں اور کیسے منعقد ہوگا؟ تو تصور ہی سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی لیکن آفرین ہے ان حضرات کی ہمت پر جنہوں نے دیوبند جیسی چھوٹی جگہ میں جس کی آبادی مشکل ساٹھ ستر ہزار ہوگی اور جس کے تمام وسائل قصباتی انداز کے ہیں۔ اتنے بڑے اجتماع کا انتظام کیا۔ اس غرض کے لیے دارالعلوم نے عیدگاہ کے اس پار ایک طویل وعریض رقبے کے کھیت خالی کرائے تھے اور پھر زمین کو اس طرح ہموار کر دیا تھا۔ جیسے یہ جگہ ہمیشہ سے جلسے منعقد کرنے ہی کے لیے بنائی گئی ہو، اس جلسہ گاہ کا مغربی سرا ریلوے لائن سے شروع ہوتا تھا اور مشرقی کنارہ اس سے تقریباً دو ڈھائی میل دُور باغات تک پہنچا ہوا تھا۔ شمال میں اس کی حد جی ٹی روڈ تھی اور جنوب میں عیدگاہ۔

اس جلسہ گاہ کے مشرقی حصے میں باہر سے آنے والے حضرات کی رہائش کے لیے کیمپ لگائے گئے تھے ہر علاقے کے مہمانوں کا الگ کیمپ تھا اور ہر کیمپ پر اُس علاقے کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ پانی فراہم کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین سو ہینڈ پمپ نصب کیے گئے تھے۔ شمالی حصے میں اشیاء خورد و نوش کے اسٹال تھے۔ مغرب میں جلسہ گاہ تھی جس میں شامیانوں کے نیچے تین لاکھ افراد کے بیٹھنے کا انتظام تھا اور اتنی ہی جگہ شامیانوں کے باہر کھلے میدان کے طور پر رکھی گئی تھی اور اس کے پیچھے اقامتی کیمپ تھے۔ جلسہ گاہ کے مغربی سرے پر انتہائی پُر شکوہ اسٹیج پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا جو تین سو فیٹ لمبا تقریباً ڈیڑھ سو فیٹ چوڑا اور دس فیٹ اونچا تھا۔ اسٹیج پر خصوصی مہمانوں کے لیے صوفوں اور کرسیوں کا انتظام تھا۔ اور اجتماع کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لیا جا سکتا ہے کہ شامیانوں کے مشرقی سرے پر کھڑے ہو کر اتنے وسیع و عریض اسٹیج پر بیٹھے ہوئے آدمی صاف نظر نہیں آتے تھے۔ شامیانوں کے بیچ میں بانسوں کے ستون اتنے توازن کے ساتھ بالکل سیدھ میں لگائے گئے تھے کہ کم از کم میں نے اس سے پہلے بانسوں میں اتنا توازن نہیں دیکھا شامیانوں کے درمیان اسٹیج تک پہنچنے کے لیے پانچ کشادہ راستے رکھے گئے تھے جن میں

دو رویہ آمد و رفت ہوسکے، لیکن جلسے کے دوران یہ تمام راستے بھی آدمیوں سے اس طرح پٹے ہوئے تھے کہ گذرنا تو کجا تل دھرنا محال تھا۔

جمعہ کی نماز اسی پنڈال میں ہونی تھی اور جمعہ کے بعد افتتاحی اجلاس کا آغاز ہونے والا تھا ہم لوگ جمعہ سے پہلے جب پنڈال کی طرف آئے تو انسانوں کا ایک سمندر تھا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زمین سے آدمی اُبل رہے ہیں اور جی ٹی روڈ پر جو پنڈال کے شمال میں ساتھ ساتھ چل رہی تھی بسوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ تھا جن کی چھتوں پر آدمی چڑھے ہوئے تھے۔ ادھر ریلوے اسٹیشن پر ہندوستان کے اطراف سے اسپیشل ٹرینیں ہر گھنٹے پہنچ رہی تھیں۔ منیٰ اور عرفات کے بعد ایسا پُرشکوہ نظارہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ نمازِ جمعہ کی امامت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم نے فرمائی وہ اسٹیج پر تھے، اور ہمیں رہائشی کیمپوں کے قریب جگہ ملی۔ جبکہ ہمارے پیچھے بھی حدِ نظر تک آدمی ہی آدمی تھے۔

نماز کے بعد ہم نہ جانے کس طرح اسٹیج پر پہنچے تو جلسہ کا آغاز ہو رہا تھا۔ اسٹیج سے نظر دوڑا کر دیکھا تو حدِ نگاہ تک سر ہی سر نظر آتے تھے اور پورا پنڈال اس طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ سرکنا محال تھا۔ درمیانی راستوں پر بھی آدمی اس طرح کھڑے تھے کہ نہ آگے جانے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی اور بیٹھنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ احقر کی عمر تو تھوڑی ہی سی ہے بڑے بڑے سن رسیدہ اور جہاں دیدہ حضرات کا کہنا یہ تھا کہ عمر میں کبھی کسی جلسے کا ایسا اجتماع نہیں دیکھا۔

جلسے کا افتتاح عالمِ اسلام کے مشہور قاری شیخ عبدالباسط عبدالصمد کی تلاوت سے ہوا اور اس کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی نے اپنے افتتاحی خطبے میں دارالعلوم کے مقصد اس کی تاریخ اور صد سالہ کارناموں پر روشنی ڈالی۔

اس جلسے میں اندرا گاندھی (وزیرِ اعظم ہندوستان) کی شرکت بلاشبہ ایک افسوسناک واقعہ تھا لیکن اوّل تو یہ خبر انتہائی غلط اور شرانگیز ہے کہ اجلاس کا افتتاح اُن سے کرایا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک عام مقرر کی حیثیت سے جلسے میں خود شریک ہوئیں ان کی

شرکت دار العلوم کے منتظمین کی خواہش پر نہیں بلکہ خود اُن کے اصرار پر ہوئی۔ دار العلوم نے کسی بھی سربراہ مملکت کو اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی لیکن شاید اتنے عظیم اجتماع سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اندرا گاندھی صاحبہ نے اصرار کیا کہ وہ خود اس جلسے میں شریک ہوں گی اور ان کے اصرار کو قوت کے ساتھ رد نہ کرنے پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کو بالکلیہ پاکستان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال! اس جلسے میں ایک غیر مسلم عورت کی تقریر خواہ اس کے اسباب اضطراری ہی کیوں نہ ہوں ایک افسوسناک واقعہ ضرور ہے۔ جس نے اس مقدس اجتماع کے انوار و برکات اور اس کی پاکیزہ فضا میں تکدر پیدا کر دیا۔ اور عجب نہیں کہ یہ اسی افسوسناک واقعہ کی بے برکتی ہو کہ اجلاس کی جس نشست میں انہوں نے شرکت کی اس میں مجمع کا ایک حصہ بیشتر اوقات قابو سے باہر رہا اور ساری نشست میں اس حصے کی ابتری اتنی نمایاں رہی کہ تقاریر کا سننا مشکل ہو گیا۔

اس ایک افسوسناک پہلو سے قطع نظر اس نشست کے بعد کے تمام اجلاس بفضلہ تعالیٰ نہایت کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچے مسلسل تین دن تک جاری رہنے والے اجلاس میں حاضرین کا تنی استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ بیٹھے رہنا کہ کسی بھی نشست میں پنڈال کے اندر کوئی ادنیٰ خلا نظر نہ آنے۔ جلسوں کی تاریخ میں ایک انوکھا اور بے نظیر واقعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے پنڈال میں پنکھوں اور پانی پلانے کا انتظام ناممکن تھا لیکن دن کے وقت شدید حبس کے باوجود مجمع جس استقلال کے ساتھ جمع رہا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس اجتماع کے موقع پر دیوبند میں برصغیر کے مایہ ناز علماء، صلحاء اور بزرگ موجود تھے، بلکہ عالم عرب کے بھی ممتاز اہل علم و قلم اور پوری دنیائے اسلام کے سفارتی نمائندے بھی شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ تین روز کے اجلاس میں ان تمام حضرات کی تقاریر اور بیانات ممکن نہیں تھے جبکہ اسی اجلاس میں دس ہزار سے زائد فضلاء دار العلوم کی دستار بندی بھی ہونی تھی۔ لیکن اجلاس کے دوران ان میں سے بیشتر حضرات کے خطبات اور ان کی

تقاریر و مواعظ سے حاضرین مستفید ہوتے رہے اور جن حضرات کی تقاریر یادگار افادیت کی حامل تھیں ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہم العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہم العالی کی تقریریں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اس اجلاس کا اصل مقصد فضلاء دارالعلوم کی دستاربندی تھا اور چونکہ یہ جلسہ دستاربندی تقریباً ستر سال بعد منعقد ہو رہا تھا اس لیے اس دوران فارغ التحصیل ہونے والے علماء کی ایک بڑی تعداد تو دنیا سے رخصت ہو چکی تھی جو حضرات بقیدِ حیات تھے اور دیوبند تک پہنچ سکے تھے ان کی تعداد بھی تقریباً دس ہزار تھی اور اگر عام معمول کے مطابق سب کی باقاعدہ دستاربندی کی جاتی تو اس تین روزہ اجلاس کا ہر دوسرا پروگرام منسوخ کرنے کے باوجود شاید سب کا حق ادا نہ ہو سکتا اس لیے کیا یہ گیا کہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش سے جو فضلائے دارالعلوم یہاں تشریف رکھتے ان میں سے ایسے حضرات دستاربندی کے لیے منتخب کئے گئے جن کا علمی و عملی مقام مسلّم الثبوت ہے ان کی دستاربندی کی گئی اور باقی حضرات کو دستی طور پر دستاریں تقسیم کی گئیں۔

دستاربندی کا منظر بھی نہایت عجیب و غریب اور اثر انگیز منظر تھا جن حضرات کی دستاربندی ہوئی اُن میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے نواسے جناب بھائی جی سعید صاحب بھی شامل تھے جو اس وقت دارالعلوم کی بزرگ ترین ہستی ہیں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کو دستار بھی انہوں نے ہی عنایت فرمائی اس کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم نے مدینہ طیبہ سے چار خصوصی دستاریں ارسال فرمائی تھیں جن میں سے ایک حضرت مہتمم صاحب مدظلہم کے لیے ایک مولانا محمد سالم صاحب مدظلہم کے لیے ایک مولانا اسعد مدنی صاحب مدظلہم کے لیے اور چوتھی غالباً حضرت بھائی جی سعید صاحب مدظلہم کے لیے تھی۔

اجلاس کے اختتام پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب مدظلہم کی تحریک پر کچھ قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔ جن میں نمایاں ترین قراردادِ افغانستان میں روسی جارحیت

کے خلاف اور مجاہدین افغانستان کی حمایت میں تھی۔ ہندوستان میں منعقد ہونے والے ایک اجتماع کی طرف سے یہ قرارداد نہایت اہمیت کی حامل اور جرات مندانہ قرارداد تھی۔ قراردادوں کے بعد اتوار ۲۳ مارچ کو دوپہر ایک بجے کے قریب حضرت مہتمم صاحب مدظلہم نے دعا پر اس یادگار اور تاریخی اجلاس کا اختتام فرمایا۔

جلسے دنیا میں بہت ہوتے رہتے ہیں لیکن جس ذوق و شوق، واہمیت اور لگن کے ساتھ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد نے اس اجلاس میں شرکت کی وہ یقیناً برصغیر کی تاریخ کا ایک منفرد واقعہ ہے ایسے ایسے معذور لوگ جو چند قدم بھی دوسروں کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتے نہ جانے کتنی مشقتیں اٹھا کر اجلاس میں پہنچے اور شروع سے آخر تک اس میں شریک رہے۔ دیوبند کے عام باشندوں نے بھی اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی ساری توانائیاں خرچ کر دیں بعض محلوں نے اجلاس میں آنے والے مہمانوں کے لیے دسترخوان عام بچھا رکھا تھا کہ مہمان وہاں آ آ کر کھانے میں شریک ہوتے رہیں۔

اتنے بڑے مجمع کا ٹھیک ٹھاک اندازہ تو مشکل ہی ہے اس میں مبالغہ آمیزیاں بھی ہوتی ہیں لیکن احقر کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ اس اجتماع کے حاضرین کی تعداد پندرہ سے بیس لاکھ تک ضرور ہوگی۔ دیوبند جیسا چھوٹا قصبہ جس کی آبادی بمشکل ساٹھ ستر ہزار ہوگی اس پر پندرہ بیس لاکھ افراد بیک وقت پہنچ جائیں تو خوراک اور پانی کا قحط پڑ جانے وبائیں پھوٹ پڑنے، گندگی اور تعفن پھیل جانے کا قوی اندیشہ ہو سکتا تھا لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کا اور اکابر دیوبند کی دعاؤں کی برکت تھی کہ اتنے بڑے مجمع میں کسی فرد واحد کو کھانا یا پانی نہ ملنے کی شکایت نہیں ہوئی۔ نہ کسی گندگی یا ادنیٰ تعفن کا کسی کو احساس ہوا، نہ کوئی لڑائی جھگڑا پیش آیا، اور نہ کوئی قابل ذکر حادثہ رونما ہوا، یہ اتنا بڑا مجمع تین روز کے بعد بحمد اللہ پوری خیر وعافیت اور صبر و سکون کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

برصغیر کے باشندے تو پھر بھی بڑے بڑے جلسوں اور اجتماعات کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن عرب ممالک میں اس قسم کے جلسوں اور اجتماعات کا زیادہ رواج نہیں ہے اس لیے خاص طور سے عرب مہمان اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر حیران و ششدر تھے، متعدد حضرات نے

بڑے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ منیٰ اور عرفات کے علاوہ اتنا بڑا اجتماع ہم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے دیوبند کی سرزمین پر اسلام اور مسلمانوں کی شوکت کا ایسا مظاہرہ فرمایا جسے دیکھ کر غیر مسلم بھی دنگ تھے۔ اور خاص طور سے ہندوستان کے حالات کے پیش نظر یہ اجتماع انشاء اللہ مسلمانوں کے لیے بغایت مفید اور حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔

اجلاس صد سالہ کے دوران دارالعلوم کے دارالحدیث میں ایک خصوصی مجلس مذاکرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس مجلسِ مذاکرہ کا موضوع نہایت اہم اور نازک تھا یعنی دینی مدارس اور عہدِ حاضر میں ان کی ذمہ داریاں اسی میں دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کا مسئلہ بھی زیر بحث آتا تھا اس کی دو نشستیں رکھی گئی تھیں۔ پہلی نشست کے صدر مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے اور دوسری نشست عالم اسلام کے ممتاز عالم و مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم کے زیرِ صدارت تھی۔ اس دوسری نشست میں پاکستان سے احقر اور برادرِ محترم مولانا سمیع الحق صاحب (مدیر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک) نے بھی دینی مدارس کے نصاب و نظام سے متعلق اپنے مقالے پیش کیے۔ مذاکرے کا موضوع اگرچہ نہایت اہم تھا۔ لیکن اجلاس صد سالہ کے لیے اتنے عظیم اجتماع کی وجہ سے دینی مدارس کے اکابر اس میں بہت کم شریک ہو سکے۔ اور بڑے اجلاس کی ناگزیر مصروفیات کی بنا پر اس مذاکرے کو اتنا وقت اور اتنی توجہ فراہم نہ ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا تاہم اس میں بعض نہایت گرانقدر مقالے بھی پیش ہوئے۔ جن میں سے اس وقت برادرِ محترم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کا مقالہ اس لیے بطورِ خاص یاد رہ گیا ہے کہ اس نے ناچیز کو کافی متاثر کیا۔ مذاکرے کے آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے جو تقریر فرمائی وہ بلاشبہ اس مذاکرے کا حاصل تھی اور اسے مولانا مدظلہم کے علم و بصیرت کا شاہکار کہنا چاہیے۔

اس اجلاس کا ایک اور عظیم فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان، ہندوستان، اور بنگلہ دیش کے وہ خدام دین جو دور دور سے ایک دوسرے کے بارے میں سنتے پڑھتے رہتے تھے لیکن ان کے درمیان ملاقات کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ اس مبارک اجتماع کی بدولت ان کو ایک دوسرے

سے ملنے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور وہ باہم قریب آئے۔

احقر نے گذشتہ ماہ کے اداریے میں بھی لکھا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر میلوں ٹھیلوں اور جشنوں کے کبھی قائل نہیں رہے انہوں نے ہمیشہ للّٰہیت کے ساتھ دین کی خدمت انجام دی ہے اور نام و نمود سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔ یہ اجلاس صد سالہ بھی کوئی جشن یا میلہ نہیں تھا۔ اس کو "جشنِ صد سالہ" کا عنوان دینا بھی غلط ہے کیونکہ دارالعلوم کی طرف سے اس کا نام "جشنِ صد سالہ" نہیں بلکہ "اجلاسِ صد سالہ" مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس سلسلے میں دارالعلوم کی طرف سے جو لٹریچر شائع کیا گیا اس میں اسے "اجلاسِ صد سالہ" ہی کہا گیا ہے۔ "جشنِ صد سالہ" کا لفظ چھوڑ کر "اجلاسِ صد سالہ" کا لفظ اختیار کرنا محض ایک اتفاق نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا اقدام ہے تاکہ اسے عام جشنوں کی طرح کوئی جشن نہ سمجھا جائے بلکہ درحقیقت یہ ایک جلسہ دستار بندی تھا جو تقریباً سو سال کے بعد منعقد ہوا اس لیے اُس نے اتنے عظیم اجتماع کی صورت اختیار کرلی اور کوئی شک نہیں کہ اس اجتماع کے ذریعے مسلمانوں کی جو شوکت ظاہر ہوئی، دارالعلوم دیوبند کے جن مآثر کو لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا، اور اکابر دیوبند کے جو ایمان افروز تذکرے سُننے میں آئے، اور ان سے جو نئے حوصلے دلوں میں پیدا ہوئے وہ اس اجتماع کا بہت بڑا فائدہ ہے۔

لیکن جو حضرات اکابر علمائے دیوبند سے وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کا کام اس اجتماع کے ان فوائد پر فخر و مسرت کا اظہار کرکے ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ جن اکابر کے نام پر ہم ایسا فقید المثال اجتماع منعقد کرنے کے قابل ہوئے ان کا مشن کیا تھا؟ ان کی زندگیاں کیسی تھیں؟ انہوں نے قرآن و سنّت کے پیغام کو محفوظ رکھنے اور دُنیا کی آخری حدود تک پہنچانے کیلئے کیا قربانیاں پیش کیں؟ —— آج ہم ان بزرگوں کی قائم کی ہوئی عملی سطح سے کتنی دُور نکل آئے ہیں؟ ہمارے درمیان علمی اور عملی انحطاط کس تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے؟ —— اور ہم کس طرح اس انحطاط سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس اجتماع کے بعد نئے حوصلوں اور نئی امنگوں کے ساتھ ہمیں یہ عہد کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے بزرگوں کے

نقشِ قدم کو مضبوطی کے ساتھ تھامیں گے۔ انہوں نے ہمیں فکر و عمل کی جو راہ دکھائی تھی اس پر ثابت قدم رہیں گے، اور اپنی زندگیوں کو اُن کے قائم کیے ہوئے نمونوں کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کریں گے۔

دارالعلوم دیوبند کسی متعصب فرقے کا نام نہیں ہے، نہ یہ کوئی سیاسی جماعت ہے، نہ کوئی ایسا گروہ یا جتھہ ہے جو ہر حق و ناحق میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے قائم کیا گیا ہو، اور نہ یہ کوئی بحث و مناظرہ کی کوئی ٹیم ہے جو صرف کسی خاص فرقے کی تردید کے لیے معرضِ وجود میں آئی ہو۔ بلکہ درحقیقت دارالعلوم دیوبند قرآن و سنّت کی اُس تعبیر کا نام ہے جو صحابۂ کرامؓ، تابعین عظام اور اسلافِ اُمّت کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، یہ اُس علمِ صحیح کا نام ہے جو بزرگانِ دین نے پیٹ پر پتھر باندھ کر ہم تک پہنچایا ہے، یہ سیرت و کردار کی اس خوشبو کا نام ہے جو صحابہ و تابعین کی سیرتوں سے پھُوٹی ہے۔ یہ اس عہد و عمل کا نام ہے جس کا سہرا بدر و احد کے میدانوں تک پہنچتا ہے۔ یہ اس اخلاص و للّٰہیت، تواضع و سادگی تقویٰ و طہارت اور حق گوئی و بے باکی کا نام ہے جو تاریخِ اسلام کے ہر دَور میں علمائے حق کا طرّۂ امتیاز رہی ہے۔ پچھلی صدی میں دارالعلوم دیوبند کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دَورِ انحطاط میں ان علمی و عملی اوصاف کو زندہ کیا، اور ایسے انسان پیدا کیے جو ان اوصاف کے جیتے جاگتے پیکر تھے۔ لہٰذا جو شخص ان اوصاف سے متصف ہے جسے ان خطوط پر پہلے اپنی اور پھر ساری اُمّت کی اصلاح کی فکر ہے، وہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے۔ خواہ ظاہری طور پر اس نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھا بھی نہ ہو، اور جو شخص ان اوصاف سے بے فکر اور اس مشن سے بے پرواہ ہے اس کا دارالعلوم دیوبند سے کوئی تعلق نہیں، خواہ ظاہری طور سے اس کے پاس دارالعلوم کی سند اور دستار کیوں نہ موجود ہو ——

آج ہمیں اس معیار پر اپنا جائزہ لینا چاہیئے کہ دارالعلوم دیوبند سے ہماری وابستگی کتنے فیصد باقی رہ گئی ہے؟ اور اگر اس سوال کا حقیقت پسندانہ جواب ہمارے دل میں کوئی ندامت پیدا کر سکے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے حقیقی وابستگی پیدا کرنے کے لیے تدبیر کیا ہو؟ خدا کرے کہ اس اجتماع کا یہ فائدہ ہم حاصل کر سکیں کہ یہ فکر ہم میں

سے ہر شخص کے دل کا اَمٹ دَرد بن کر رہ جائے۔ ایسا دَرد جو مُردہ دِلوں کو نئی زندگی بخشے اور زوال پذیر ماحول میں نشاۃِ ثانیہ کی رُوح پھُونکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

آمین ثم آمین

اجلاسِ صد سالہ کے بعد ہندوستان کے دوسرے مختلف علاقوں میں بھی جانا ہُوا۔ جن میں تھانہ بھون، گنگوہ، نانوتہ، جلال آباد، دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور الہ آباد شامل ہیں، ان سفروں کے بعض حالات بھی قابلِ ذکر ہیں۔

---

(۲)

ذاتی طور پر اس سفر کا ایک مقصد احقر کی نظر میں یہ بھی تھا کہ ہمارے جو دوسرے علمی و دینی مراکز ہندوستان میں رہ گئے ہیں، بقدرِ امکان ان کی زیارت اور وہاں کے اہلِ علم وصلاح کی ملاقات سے مستفید ہوں۔ اور تین ہفتے میں یہ مقصد جس حد تک پورا ہوسکتا تھا، بحمداللہ وہ پورا ہُوا۔

دیوبند میں احقر کا قیام گیارہ دن رہا لیکن یہ گیارہ دن گیارہ لمحوں کی طرح گذر گئے۔ دیوبند کے حضرات سے ملاقاتیں بذاتِ خود مستقل وقت چاہتی تھیں، لیکن اجلاس کی وجہ سے وہاں نہ صرف برِّصغیر بلکہ پورے عالمِ اسلام کے اہلِ علم وفکر اور اہلِ صلاح وتقویٰ موجود تھے۔ اور ان سبھی سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ چنانچہ یہ ایام اسی لذیذ مصروفیت میں گذر گئے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان ایام کے قیمتی لمحات کو تول تول کر خرچ کرنے کے باوجود بہت سے حضرات سے ملاقات ہی نہ ہوسکی۔ بہت سوں سے تو نہایت سرسری انداز میں ملنا ہُوا اور اطمینان سے ملنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔

احقر کے برادرزادے (جو عمر میں مجھ سے بڑے ہیں) مولانا شاہد حسن صاحب دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اہلِ دیوبند سے اجتماعی ملاقات کا یہ حیلہ کیا کہ ایک روز

جامع مسجد دیوبند میں تنظیم ابنائے دار العلوم کی طرف سے عشاء کے بعد ایک جلسے کا اعلان کر دیا اور اس میں احقر کی تقریر رکھ دی۔ اگرچہ سہ روزہ اجلاس صد سالہ کے بعد پورا دیوبند تھکا ہوا تھا لیکن احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں کو عقیدت و محبت کا جو غیر معمولی تعلق تھا وہ انہیں اس روز بھی کھینچ لایا، اور اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ پاکستان سے برادر مکرم مولانا سعید الرحمٰن علوی (مدیر خدام الدین) اور بنگلہ دیش سے حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب مدظلہم نے بھی اجتماع سے مؤثر خطاب فرمایا۔ احقر کو اس جامع مسجد میں زبان کھولتے ہوئے سخت تردد تھا جس جگہ حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مدنیؒ اور دوسرے اکابر خطاب فرماتے رہے ہوں وہاں اس احقر کے لیے لب کشائی ایک آزمائش سے کم نہ تھی۔ لیکن انہی بزرگوں کے فیض نے چند کلمات عرض کرنے کی توفیق بخشی۔
سورۂ قریش کے حوالے سے احقر نے عرض کیا کہ قریش مکہ کو کعبۃ اللہ کی مجاورت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا فرمایا تھا کہ پورا جزیرۂ عرب ان کا احترام کرتا تھا، اور جس ماحول میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا، وہاں قریشِ مکہ کو چور ڈاکو بھی کچھ نہ کہتے تھے۔ سارا عرب سفر کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ لیکن قریش مکہ اطمینان کے ساتھ شام، یمن کا سفر کرتے، اور انہی تجارتی سفروں سے ان کے معاش کا بندوبست ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش میں اہلِ مکہ کو اپنے اس انعام کی طرف توجہ دلا کر ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارا یہ امن و سکون اور تمہاری یہ معاشی خوشحالی صرف بیت اللہ کی رہینِ منّت ہے۔ اس لیے تم پر اس بیت اللہ کی تعظیم اور اس کے پروردگار کی عبادت دوسروں سے زیادہ واجب ہے۔ اس سورت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسانوں کے جس گروہ کو دنیا میں جس دینی خصوصیت کی بناء پر کوئی عزت و وقعت حاصل ہوئی ہو اس پر دین کی پابندی دوسروں سے زیادہ فرض ہو جاتی ہے۔

اس قرآنی تعلیم کے حوالے سے احقر نے عرض کیا کہ آج بحمد اللہ دیوبند کی بستی چار دانگ عالم میں مشہور و معروف ہے۔ اس کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے باشندوں کو لوگ محبت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر اطرافِ زمین سے لوگوں نے جس طرح جوق در جوق اس بستی کا رُخ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

مسلمانوں کے دلوں میں اس خطۂ ارض کی کیا قدر و قیمت ہے؟ سوال یہ ہے کہ آج دُنیا بھر میں اس بستی کی دھوم کیوں مچی ہوئی ہے؟ ان تنگ و تاریک گلیوں، کچے پکے مکانوں شکستہ سڑکوں اور بے ترتیب بازاروں میں کونسی کشش ہے جو لاکھوں انسانوں کو یہاں کھینچ لائی ہے؟ ظاہر ہے کہ دیو بند کی یہ شہرت و عظمت صرف اور صرف اُس عظیم درس گاہ کی رہینِ منت ہے جس نے اس پسماندہ بستی میں علمِ دین کی شمعیں روشن کر کے اسے ایک مینارۂ نور بنا دیا۔ یہ ہر دلعزیزی صرف اُن بزرگوں کا صدقہ ہے جنہوں نے اس بستی میں بیٹھ کر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کی، اور اس چودھویں صدی میں تجدید و احیائے دین کا فریضہ انجام دیا۔

لہٰذا ہم لوگوں کو جو دیو بند سے کسی بھی حیثیت سے وابستہ ہیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ہماری دینی اور دنیوی ترقی کا راز صرف ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے میں ہے اور اگر ہم ان بزرگوں کے طریقے کو چھوڑ کر اپنے لیے کوئی اور راہ اختیار کرینگے تو وہ ہمیں ہلاکت کی طرف لے جائے گی۔

اس موضوع پر تقریباً ۴۵ منٹ احقر نے اپنی گذارشات پیش کیں۔ امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے صاحبزادۂ گرامی جناب مولانا انظر شاہ صاحب مدظلہم دارالعلوم کے طبقۂ عُلیا کے اساتذہ میں سے ہیں۔ آجکل دارالعلوم میں بخاری شریف کا درس ان سے متعلق ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے والد ماجدؒ کی مسند کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ انہوں نے محبت و شفقت کی انتہا کر دی کہ اس مجلس میں وہ بھی تشریف لے آئے۔ ابھی احقر نے اپنی گذارشات شروع ہی کی تھیں کہ وہ تشریف لاتے نظر آئے اور تقریر کے دوران تشریف فرما رہے۔ چنانچہ آخر میں ان سے درخواست کی گئی تو انہوں نے بڑا مؤثر خطاب فرمایا۔

دیو بند آنے کے بعد بڑا اشتیاق اس بات کا تھا کہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہ (جو حضرت میاں صاحبؒ کے نام سے مشہور ہیں) کے مکان پر حاضری ہو۔ اگرچہ حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ کا زمانہ احقر کی یاد سے پہلے کا ہے، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے بعد اپنے اساتذہ اور بزرگوں میں شاید سب سے زیادہ تعلق انہی سے تھا۔ اور حضرتؒ کی حیات میں شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو جس میں والد صاحبؒ

حضرت میاں صاحبؒ کے پاس تشریف نہ لے جاتے ہوں۔ چنانچہ حضرت میاں صاحبؒ کے اتنے واقعات ہم نے حضرت والد صاحبؒ سے سُنے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے بھی ان کی زیارت کی ہوئی ہے۔ حضرتؒ کے صاحبزادے حضرت حاجی بلال صاحب مدظلہم آج کل حضرت ہی کے مردانہ مکان میں مقیم ہیں۔ اُن کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ انہوں نے اس مکان کو اسی طرح جوں کا توں رکھا ہوا ہے جس طرح حضرت کے زمانے میں تھا۔ حضرت حاجی بلال صاحب مدظلہم اگرچہ علیل اور صاحبِ فراش تھے لیکن نہایت محبت وشفقت کا معاملہ فرمایا۔ ان کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر ایسا لگتا تھا، جیسے حضرت میاں صاحبؒ ہی کی خدمت میں حاضر ہیں اور حضرت والد صاحبؒ سے سُنے ہوئے واقعات (جن کا کچھ حصہ بھائی جان مرحوم کے قلم سے بارہا البلاغ میں آچکا ہے) ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔

حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ ہی نے اپنی حیات میں اپنے مکان کی قریبی مسجد میں ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی، جو اَب ماشاء اللہ کافی ترقی کر چکا ہے۔ اور مدرسہ اصغریہ کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت حاجی بلال صاحب کے صاحبزادے مہتمم سید خلیل میاں صاحب مدظلہم اس مدرسے کے منتظم ہیں۔ اس مدرسے میں قرآن کریم اور ابتدائی اردو دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے اور کبھی درسِ نظامی کی ابتدائی کتب بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ مولانا خلیل میاں صاحب نے اصرار کر کے ایک روز عشاء کے بعد کھانے پر مدعو فرمایا۔ یہ نشست بھی بڑی پُرکیف رہی ــــ احقر دو روز بعد تھانہ بھون اور نانوتہ اور گنگوہ جانا چاہتا تھا۔ مولانا نے اس سفر کے لیے اپنی جیپ فراہم کر کے سفر کا بہت بڑا مسئلہ کر دیا۔ چنانچہ دو روز بعد انہی کی جیپ میں یہ سفر ہوا۔

احقر کے لیے ایک ماہ کے اس سفر کا حاصل درحقیقت وہ دن تھا جب دیو بند سے تھانہ بھون کے لیے روانگی ہوئی۔ دل کی خواہش تو یہ تھی کہ نانوتہ، بھون اور گنگوہ میں سے ہر جگہ کئی کئی روز گذارے جاتے۔ لیکن مدت قیام کم تھی اس لیے ایک ہی دن میں تینوں مقامات پر حاضری دینی تھی اور اس سفر کی سب سے پہلی منزل نانوتہ تھی۔

نانوتہ دیوبند سے مغرب میں ۱۶ میل اور سہارنپور سے جنوب میں ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنی زرعی پیداوار اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے باغات اور کھیتوں کی بنا پر تو زرخیز ہے ہی، لیکن یہاں سے علم وفضل اور طہارت وتقویٰ کے جو آفتاب نمودار ہوئے ان کے اعتبار سے مردم خیز بھی ہے۔

استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ جو علمی اعتبار سے تمام علمائے دیوبند کے جدِ امجد ہیں، اسی قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اور شاگردِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے پیدائش بھی یہی ہے۔ اور ان کے علاوہ مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا محمد احسن نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد منیر نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ سب اسی قصبے کے باشندے تھے۔

ہم نانوتہ پہنچ کر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ مزار بستی سے کچھ دُور شمال میں سہارنپور جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ ایک سرسبز وشاداب باغ کے کنارے چھوٹی سی چار دیواری ہے جس میں چند کچی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں مغربی جانب میں سب سے پہلی قبر حضرت مولانا قدس سرہٗ ہی کی ہے۔ مزار مبارک پر حاضری ہوئی تو حضرتؒ کے بہت سے واقعات ذہن میں تازہ ہوگئے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے خاص اُستاذ ہر علم وفن میں اعلیٰ درجے کے فضل وکمال کے ساتھ ساتھ انتہائی سادہ، متواضع اور صاحبِ کشف وکرامات بزرگ تھے۔ حضرت تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات آپ کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور حضرت مولانا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی سوانح حیات "سیرت یعقوب ومملوک" کے نام سے مرتب فرما دی ہے جو مکتبہ دار العلوم سے شائع ہو چکی ہے۔

اس وقت آپ کا وہ واقعہ یاد آیا جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا سنا تھا اور "سیرت یعقوب ومملوک" میں بھی نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت مولانا چونکہ دار العلوم دیوبند

کے استاذ ہونے کے علاوہ شیخ طریقت اور مرجع خلائق بھی تھے اس لیے آپ کے پاس عام لوگوں کی آمد و رفت بہت رہتی تھی۔ اس وجہ سے بعض اوقات درس گاہ میں پہنچتے پہنچتے دیر ہو جاتی تھی۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ اس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے۔ انہوں نے یہ دیکھا تو دارالعلوم کے سرپرست قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ سے شکایت کی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے پہلے تو حضرت مولانا محمد یعقوب کو سمجھایا کہ

"مولانا یہ نہ سمجھیے کہ آپ خدمتِ خلق میں مصروف رہنے کی وجہ سے معذور ہیں۔ جن لوگوں کی آپ خدمت کرتے ہیں وہ تو مقامی ہیں۔ لیکن یہ طلبا جو دُور دراز سے تحصیل علم کے لیے آئے ہیں اگر ان کا وقت خراب ہوگا تو آخرت میں آپ سے ان کی باز پُرس ہوگی۔" حضرت مولانا نے یہ سُن کر سر جھکا دیا۔ لیکن اس کے بعد آپ نے حضرت مہتمم صاحب کو بلا کر فرمایا۔

"میں نے مولوی محمد یعقوب صاحب کو پابندیٔ وقت کے لیے کہہ تو دیا ہے، لیکن اگر آئندہ کبھی ان سے اس قسم کی شکایت پیش آئے تو آپ اس کی زیادہ فکر نہ کریں، کیونکہ خدا کی قسم! مولوی محمد یعقوب صاحب کا مقام یہ ہے کہ اگر وہ مدرسے میں ایک بھی سبق نہ پڑھائیں اور دن میں مدرسے کا صرف ایک ہی چکر لگا جایا کریں تب بھی مدرسے کے لیے کافی ہے۔ اور ان کی تنخواہ کی قیمت وصول ہے۔"

آپ کی وفات کا یہ واقعہ بھی حضرت والد صاحبؒ ہی سے سنا تھا۔ اور آپ کی مطبوعہ سوانح میں موجود نہیں ہے کہ دیوبند کے اطراف میں ہیضے کی وبا۔ کا آغاز ہو رہا تھا حضرت مولانا کو اس کے بارے میں کوئی کشف ہوا ہوگا۔ آپ نے دیوبند میں یہ اعلان کرایا کہ :

"ہیضے کی شدید وبا گھر گھر پھیلنے والی ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ کثرت سے صدقہ و خیرات دیں اور اپنی مملوکات میں سے ہر چیز سے صدقہ نکالیں۔ روپے میں سے روپیہ، غلے میں سے غلہ، کپڑے میں سے کپڑا، شاید اللہ تعالیٰ ان صدقات کی برکت سے اس بلا کو روک دیں۔"

لیکن دیوبند کے بعض شیخ زادوں نے سُنا تو انہوں نے اس پر توجہ دینے کے بجائے استہزار کا انداز اختیار کیا اور کہنے لگے کہ :

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے میں چندے کی کمی ہو گئی ہے جسے پُورا کرنے کے لیے مولوی صاحب یہ اعلان کر رہے ہیں" ـــــ حضرت کو یہ جملہ پہنچا تو جوش میں آکر فرمایا

"اچھا تو اب وبا آکر رہے گی، اور ایک ایک گھر سے کئی کئی جنازے اُٹھیں گے۔"
حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ "حضرت! آپ بھی تو یہیں مقیم ہیں۔" فرمایا :

"ہاں! یعقوب اور یعقوب کی اولاد بھی اسی وبا میں جائے گی" ـــــ چنانچہ وہ شدید وبار آئی اور حضرت مولانا کی وفات بھی اسی وبار کے دوران ہوئی۔ پھر یہ بھی مشہور ہے ـــــ واللہ اعلم ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی قبر کی مٹی کو اس وبار کے مریضوں کے لیے سامانِ شفا بنا دیا، جس گھر میں کسی کو ہیضہ ہوتا، مولانا کی قبر سے کچھ مٹی اُٹھا کر لے جاتا اور اس کے استعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ مریض کو شفا بخش دیتے۔

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے بازو میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزارِ مبارک ہے ۔ آپ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کے چھوٹے بھائی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے رشتے کے بھائی تھے اور جہاد شاملی میں آپ کے دست و بازو رہے ہیں۔ ۱۳۱۱ھ سے ۱۳۱۳ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے ہیں۔ نہایت باخدا اور صاحبِ دیانت و تقویٰ بزرگ تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے "ارواحِ ثلاثہ" میں انہی کا واقعہ لکھا ہے کہ، ایک مرتبہ آپ مدرسے کے ڈھائی سو روپے لے کر مدرسے کی روداد چھپوانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے۔ آپ نے کسی کو چوری کی اطلاع نہیں کی۔ اور اپنے مکان واپس آکر اپنی کوئی زمین فروخت کی اور اس کی قیمت سے ڈھائی سو روپے لے کر دوبارہ دہلی پہنچے اور روداد چھپوا کر لے آئے۔ کچھ دنوں کے بعد اس واقعے کی اطلاع اہلِ مدرسہ کو ہوئی۔ ان کو اندازہ تھا کہ حضرت مولانا محمد منیر صاحبؒ ان کے کہنے سے یہ رقم واپس نہیں لیں گے۔ اس لیے دارالعلوم دیوبند کے سرپرست قطب الارشاد

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کو سارا واقعہ لکھ کر ان سے مسئلہ دریافت کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ "مولوی صاحب کے پاس وہ رقم بطورِ امانت تھی۔ اور روپیہ چونکہ ان کی کسی زیادتی کے بغیر ضائع ہوا ہے، اس لیے وہ اس کے ذمّے دار نہیں ہیں"۔

اہلِ مدرسہ نے حضرت مولانا محمد منیر صاحبؒ کو حضرت گنگوہیؒ کا یہ فتویٰ دکھا کر درخواست کی کہ آپ روپیہ واپس لے لیجئے۔ حضرت مولانا محمد منیر صاحبؒ نے جواب میں فرمایا:

"کیا میاں رشید نے فقہ میرے لیے ہی پڑھا تھا اور کیا یہ سارے مسائل میرے ہی لیے ہیں؟ ذرا وہ خود اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپے لے لیتے؟" جاؤ اس فتوے کو لے جاؤ۔ میں ہرگز دو پیسے بھی نہیں لوں گا۔"

نانوتہ سے روانہ ہوئے تو اگلی منزل تھانہ بھون تھی۔ وہ تھانہ بھون جس کے لذیذ و پُرکیف تصور ہی سے جسم و جان میں عقیدت و محبت کی پھواریں پھوٹتی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ تھانہ بھون جس کے تذکروں کی فضا میں اس ناچیز نے آنکھ کھولی۔ اور جس کا ذکرِ جمیل صبح و شام حضرت والد صاحبؒ کے وردِ زباں پایا۔ وہ تھانہ بھون جس سے پھوٹنے والے انوار اب بھی زندگی کی پُرپیچ راہوں میں مجھ جیسے نہ جانے کتنے بھٹکنے والوں کی رہبری کا واحد ذریعہ ہیں، آج ہیں عالمِ حقیقت میں اسی چشمۂ خیر اور اسی دکانِ معرفت کا رُخ کر رہا تھا، اور قلب و رُوح کی کائنات اشتیاق و مسرت کے کچھ نرالے زمزموں سے لبریز تھی۔

اس سے پہلے تصور نے تھانہ بھون اور اس کی خانقاہ کے نہ جانے کتنے خاکے بنائے تھے، لیکن جب کچی گلیوں سے گزر کر ہمارا یہ مختصر سا قافلہ خانقاہ کے دروازے پر پہنچا تو خانقاہ ان تمام خاکوں سے زیادہ سادہ مختصر اور دل کش تھی۔ اپنی یاد میں یہ خانقاہِ اشرفیہ کی پہلی حاضری تھی، لیکن اس کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے سالہا سال کی واقفیت ہے اور اسے دیکھتے ہوئے زمانہ گذرا ہے۔

حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے پاکستان آ جانے کے بعد حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس خانقاہ کا انتظام سنبھالا تھا اور انہوں نے

اس کی ایک ایک چیز کو اسی انداز میں باقی رکھنے کی پوری کوشش فرمائی تھی جیسی وہ حکیم الامت مجددِ ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں تھی۔ اب مولانا کے صاحبزادے مولانا نورالحسن صاحب مہتممِ خانقاہ ہیں۔ آپ کا اصلاحی تعلق مولانا مسیح اللہ خانصاحب مدظلہم العالی سے ہے اور نوعمری کے باوجود آپ نے یہاں کا نظم ونسق اسی طرح برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد اس کے ایک ایک گوشے سے یہ صدا آتی معلوم ہوتی ہے کہ ؎

میرے دلِ وارفتۂ حیرت کو ہے اب تک
اس نازشِ صدناز کی ایک ایک ادا یاد

یہ خانقاہ ابتداءً شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مرکزِ فیض تھی۔ یہ تینوں بزرگ جو "اقطابِ ثلاثہ" کہلاتے تھے۔ مدتوں یہاں اصلاح وارشاد میں مشغول رہے۔ اور اسی کی وجہ سے اسے "دکانِ معرفت" کہا جانے لگا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے جہاد میں جب حضرت حافظ صاحب شہید ہو گئے اور حضرت حاجی صاحبؒ مکہ مکرمہ ہجرت فرما گئے تو خالی ہو گئی۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کو مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے بھی اس کا خیال رہتا تھا کہ یہ خانقاہ دوبارہ آباد ہو۔ چنانچہ جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہٗ نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تو آپ کی دوررس نگاہوں نے اس مرکزِ معرفت کو آباد کرنے کے لیے ان کا انتخاب فرمالیا۔ اور ان کو یہ تاکید کی کہ جب کبھی آپ کانپور سے تدریس کی خدمت ترک کریں تو کسی اور مدرسے میں جانے کے بجائے خانقاہ تھانہ بھون کو آباد فرمائیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے کانپور سے ترکِ تعلق کے بعد اس خانقاہ کو از سرِ نو آباد فرمایا اور پھر یہاں سے علم ومعرفت کی جو خوشبو پھوٹی اس نے ایک عالم کو مہکا دیا۔

مولانا نورالحسن صاحب خانقاہ کے مختلف حصے دکھاتے جاتے تھے اور چشمِ تصور اتنیں

سال کا فاصلہ طے کرکے یہاں وہ مقدس بزم سجی ہوئی دیکھ رہی تھی جس کے میرِ محفل حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ تھے اور جس میں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ، حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ، حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ۔ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ اور نہ جانے کیسے کیسے نادرِ روزگار حضرات اس شمعِ محفل کے گرد پروانہ وار تشریف فرما رہے اور یہاں سے نکل کر بقول مرشدی حضرت عارفی مدظلہم ان میں سے ایک ایک فرد کا یہ حال ہوگیا ہے کہ؎

مری آنکھوں میں چشمِ مستِ ساقی کا وہ عالم ہے
نظر بھر کر جسے بھی دیکھ لوں مے خوار ہو جائے

مسجد کے صحن میں بیٹھ کر خیال آیا کہ سیدی و مرشدی ڈاکٹر حضرت محمد عبدالحئی صاحب عارفی مدظلہم نے اپنی کتاب "مآثر حکیم الامت" کے آغاز میں خانقاہ کا پورا نقشہ اور اس کی تمام جزوی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ کتاب کے اس حصے کو یہاں بیٹھ کر پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم سب رفقاء نے وہاں بیٹھ کر اس کا اجتماعی مطالعہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت مدظلہم العالی کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائے اور آپ کو بایں فیوض تادیر سلامت رکھے، آپ نے جس والہیت اور عاشقانہ جزرسی کے ساتھ اس خانقاہ کا نقشہ کھینچا ہے اس کی صحیح قدر و قیمت وہیں پہنچ کر معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی چونکہ خانقاہ کی بیشتر چیزیں اسی نقشے کے مطابق ہیں، اس لیے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حضرت مدظلہم اس وقت ہم سے مخاطب ہیں اور تمام تفصیلات سمجھا رہے ہیں۔ اس خانقاہ کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز ایسی نہیں ہے جو اس نقشے میں بیان ہونے سے رہ گئی ہو، اس تفصیل اور دقیقہ رسی کے ساتھ یہ منظر کشی صرف عشق ہی کرا سکتا ہے۔ یہ عقل و خرد کے بس کا روگ نہیں۔

دیکھنے میں یہ چھوٹی سی مسجد ہے جس کے اندرونی حصے میں کل تین صفیں ہوتی ہیں، صحن

اور برآمدے بھی کچھ زیادہ کشادہ نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹی سی جگہ سے کیا عظیم الشان کام لیا کہ یہاں سے ایک ہزار کے لگ بھگ اعلیٰ درجہ کی تصانیف تیار ہوئیں۔ وعظ و ارشاد کا ایک ترالا رنگ وجود میں آیا۔ حقائق و معرفت کے دریا بہلئے گئے، طریقت و تصوف کی تجدید ہوئی، علمی و عملی مشکلات کی گتھیاں سلجھائی گئیں، علوم نبوت کے عقدے وا ہوئے، ہزارہا انسانوں کو حسنِ اخلاق و معاشرت کے دل کش سانچوں میں ڈھالا گیا۔ شرافت و انسانیت کو نئی زندگی ملی، شریعت، عقل اور عشق کی حدیں قائم کی گئیں، اور تینوں کے حسین و متوازن امتزاج سے وہ مذاقِ زندگی وجود میں آیا جو اس آخری دور میں کتاب و سنت کی عملی تفسیر کا دوسرا نام ہے۔ ان تمام باتوں کے تصور نے حضرت والد صاحب کی وہ نظم ذہن میں تازہ کر دی جو اسی خانقاہ کے بارے میں کہی گئی تھی ؎

کبھی یہ جگہ منزلِ اولیا تھی　　فرشتوں کی محفل تھی، بزمِ ہدیٰ تھی
یہ مسکن تھی اک دن حکیم امم کی　　ہوا اس کی ہر اک مرض کی دوا تھی

یہ چھوٹی سی بستی، یہ چھوٹی سی مسجد
یہ چھوٹی سی مجلس خدا جانے کیا تھی؟

خانقاہ سے نکل کر قبرستان کا رُخ کیا، راستے میں پہلے ایک چار دیواری کے درمیان حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید قدس سرہٗ کا مزار تھا، پہلے وہاں حاضری ہوئی، یہ بڑے صاحبِ مقام بزرگ تھے جنہوں نے اپنے حالات و مقامات کو ظرافت کے پردے میں چھپایا ہوا تھا۔ ساری عمر خانقاہ میں بیٹھ کر اصلاح و ارشاد میں گزاری اور جب ۱۸۵۷ء میں اللہ کے لیے جان و تن کی بازی لگانے کا وقت آیا تو خانقاہ کا یہ بوریہ نشین مجاہدین کی صف میں اپنے سر کا نذرانہ لیے سب سے آگے آگے تھا یہاں تک کہ اسی جہاد میں جامِ شہادت نوش کر کے یہاں آسودہ ہو گیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہاں سے ذرا آگے بڑھ کر وہ قبرستان شروع ہو جاتا ہے جو خود حضرت حکیم الامت

قدس سرہٗ نے وقف فرمایا تھا۔ اس قبرستان کے مغربی سرے پر ایک چبوترہ ہے جس پر تین کچی قبریں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے پہلی قبر میں وہ مجددِ وقتؒ محوِ آرام ہے جس کے فیوض و برکات نے اس چھوٹی سی بستی کو اس آخری دور میں رشکِ صد گلزار بنا دیا۔ اس مزارِ مبارک کے سامنے بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا کے سارے غم و آلام کافور ہو گئے ہیں، اور پورا وجود سکینت و طمانیت کی آغوش میں چلا گیا ہے ـــــ واردات و کیفیات اور حالات و مقامات تو بڑوں کی باتیں ہیں ــ ہم جیسے بدذوق اور کوردل افراد کو ان کی تو کیا ہوا لگتی؟ لیکن حضرتؒ کے قدموں میں بیٹھ کر جو سکونِ خاطر نصیب ہوا ہے وہ میرے لیے اس سفر کی سب سے بڑی متاع تھی، اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ؎

کرتی جاتی ہے سرایت جان و تن میں ان کی یاد
رفتہ رفتہ جانے کیا سے کیا ہوا جاتا ہوں میں

نمازِ ظہر کا وقت قریب تھا، واپس خانقاہ کی مسجد میں آکر نمازِ ظہر ادا کی، نماز کے بعد دفعۃً خیال آیا کہ یہی وقت حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی مجلسِ عام کا ہوا کرتا تھا چنانچہ قدم بے ساختہ حضرتؒ کی نشست گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ تھوڑی دیر مجلس کی جگہ بیٹھا رہا اور اس دل پر جو گذری اس کا اظہار لفظ و بیان کے ذریعے ممکن نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس مقام پر ۴۸ سال گذر جانے کے باوجود سکینت و طمانیت، سوز و گداز اور انوار و برکات کا یہ حال ہے، وہاں اس وقت کا کیا عالم ہوگا جب یہ مجلسِ جہاں آرا زندہ و تابندہ تھی ؎

ترے وصال کا عالم نہ جانے کیسا ہوگا؟
ترے فراق کی لذت سے مر گئے ہیں لوگ

دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ یا اللہ! آپ نے اس مجلس کی بدولت ہزارہا انسانوں کی زندگیاں بدلی ہیں۔ ہزاروں دلوں میں انقلاب پیدا فرمایا ہے۔ اور یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا فرمائے جنہوں نے اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو سیراب کیا، ہم اگرچہ ایسے وقت یہاں پہنچے ہیں جب یہ پاکیزہ مجلس برخاست ہو چکی وہ جلوہ جہاں تاب روپوش ہو چکا۔ لیکن یا اللہ! اس مجلس کو یہ تاثیر بخشنے والے آپ ہی تھے۔ اس مجلس کو انقلاب

انگیز آپ ہی نے بنایا تھا اور آپ کی ذات حیّ و قیوم ہے، آپ کی وہ رحمت آج بھی زندہ و پائندہ ہے جو اس مجلس کے حاضرین پر نازل ہوتی تھی۔ اپنے فضل و کرم سے اس مجلس کے فیوض و برکات کا کچھ حصّہ ہمیں بھی عطا فرما دیجئے، اور ہم خستہ حالوں کو اس رحمت سے محروم نہ فرمائیے۔ آمین یا رب العالمین۔

اور اس دُعا کے ساتھ ہی سیّدی و مُرشدی حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب عارفی مدظلہم العالی کے یہ اشعار یاد آگئے ؎

وہ نظر آتا ہے دیکھ اے دل سوادِ کوئے دوست
گوشے گوشے سے جہاں کے آرہی ہے بوئے دوست
آج آساں ہو گئی دُشواریٔ منزل مجھے
کھینچ لایا مجھ کو میرا جذبۂ دِل سُوئے دوست
اے وفورِ شوق اتنی فرصتِ نظارہ دے
جذب کر لوں دیدہ و دل میں بہارِ رُوئے دوست

جذب کر لے میری ہستی اپنے ہر انداز میں
ہاں مجھے بھی رنگ لے اپنے رنگ میں اے خوئے دوست

---

(۳)

تھانہ بھون سے رخصت ہونے کے بعد کچھ دیر جلال آباد میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری دی، آپ اِس وقت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز ترین خلفاء میں سے ہیں۔ جلال آباد میں آپ کے زیرِ سرپرستی ایک عظیم الشان مدرسہ ہے جو آپ کی برکت سے خانقاہ بھی بنا ہوا ہے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں افریقہ، یورپ اور امریکہ میں بھی آپ کے فیوض جاری ہیں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

حضرت نے حسبِ معمول نہایت شفقت کا معاملہ فرمایا۔ آپ کی صحبت میں چند لمحات بھی ایک گراں قدر نعمت تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے سرفراز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ رحمت تادیر بعافیت سلامت رکھے۔ آمین

جلال آباد سے روانہ ہوکر تقریباً چالیس منٹ میں ہم گنگوہ پہنچے۔ یہ وہ عظیم بستی ہے جو حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے (دسویں صدی ہجری) سے اہلِ اللہ کا مرکز رہی ہے۔ اور تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہاں امامِ ربّانی قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرّہ کی جو مسندِ ارشاد آراستہ ہوئی اس نے نہ صرف پورے علاقے کو بلکہ پورے برصغیر کو انوارِ علومِ نبوّت سے جگمگا دیا۔

گنگوہ کی بستی سے باہر گھنے درختوں کے سائے میں ایک کچے چبوترے پر حضرت گنگوہی قدس سرّہٗ کا مزار ہے۔ مزار کیا ہے؟ بظاہر ایک سادہ سی کچی قبر ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلال و جمال کی ایک کائنات یہاں فروکش ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرّہٗ ہمارے تمام بزرگانِ دیوبند کے سرتاج و قافلہ سالار ہیں۔ آپ کی پوری زندگی اتباعِ سنّت کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ آپ ہی نے مروّجہ بدعات کے خلاف احیائے سُنّت کا عَلَم بلند کرکے دیوبند کے مسلک کو ممتاز فرمایا۔ دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم حاصل کرنے کے بعد آپ ایک مرتبہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب سے مناظرہ کے لیے تھانہ بھون تشریف لے گئے تھے۔ وہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرّہٗ سے ملاقات ہوگئی جس کے نتیجے میں مناظرہ تو دھرا ہی رہ گیا۔ آپ اسی ملاقات میں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوگئے اور بیالیس دن وہیں خانقاہ میں مقیم رہے۔ صرف ایک جوڑا بدن پر رہ گیا تھا اسی کو دھوتے اور دوبارہ پہن لیتے۔ بیالیس دن کے بعد جب وہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے خلافت عطا کی اور فرمایا:

"میاں مولوی رشید! جو نعمت اللہ تعالیٰ نے مجھے دی تھی، وہ آپ کو دے دی۔"

گنگوہ پہنچ کر مدتوں استغراق کا عالم طاری رہا۔ کسی نے حضرت حاجی صاحبؒ سے شکایت کی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:

"میاں غنیمت جانو کہ وہ آبادی میں ہیں۔ ان پر جو عالم گذر رہا ہے اگر حق تعالیٰ کو ان سے اصلاحِ خلق کا کام لینا نہ ہوتا تو خدا جانے کس پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھے ہوتے۔"

ایک مرتبہ خود حضرت حاجی صاحبؒ نے خط لکھ کر حال دریافت کیا۔ اس کے جواب میں آپ نے جو حالات بیان فرمائے ان سے آپ کے مقام کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ:

"شریعت طبیعت بن گئی ہے، مدح و ذم یکساں معلوم ہوتی ہے اور کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔"

احقر نے یہ جملے بارہا حضرت والد صاحبؒ سے اور سیدی و مرشدی حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی مدظلہم سے سُنے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ جب یہ مکتوب حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اسے سر پہ رکھ لیا اور فرمایا "اللہ اکبر! ہمیں تو اب تک یہ حالات حاصل نہیں ہو سکے۔"

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مزارِ مبارک پر حاضری اس سفر کی اہم حاصلات میں سے تھی، علم و عمل ورع و تقویٰ اور جہد و عمل کا یہ پیکرِ جمیل جس زمین پر آسودہ ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انوار و برکات کی کیا کیا بارشیں برستی ہوں گی؟ اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں لیکن اتنی بات کا احساس ہم جیسے کئی گئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ع

خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر

عصر کی اذان ہو چکی تھی، چنانچہ مزارِ مبارک کے پاس بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں نماز ادا کی، اور اس کے بعد خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جو بستی کے بیچوں بیچ محلہ سرائے میں واقع ہے، یہ خانقاہ دراصل حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کی خانقاہ ہے جو دسویں صدی ہجری کے مشہور و معروف اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور آپ کا

مزارِ مبارک بھی اسی خانقاہ کے احاطے میں واقع ہے۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب قدس سرہ کی یہ خانقاہ بالکل اُجاڑ اور ویران ہو چکی تھی۔ اور اس میں اصطبل بنا لیا گیا تھا حضرت گنگوہیؒ قدس سرہٗ نے اپنے ہاتھوں سے اسے صاف کر کے از سرِ نو آباد فرمایا۔ پھر یہیں اپنے خرچ سے سہ دری تعمیر فرمائی اور اس میں دورۂ حدیث کا درس شروع فرمایا، کچھ دنوں کے بعد بعض حاسدین نے حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب قدس سرّہٗ کے سجادہ نشینوں کے کان بھرے یوں کہ یہ اس خانقاہ پر قابض ہو رہے ہیں، چنانچہ یہ حضرات ایک وفد بنا کر آئے اور عرض کیا کہ "آپ اس جگہ کو چھوڑ دیں"۔ اس وقت حضرت اپنے خرچ سے سہ دری تعمیر فرما چکے تھے، اطراف و اکناف سے دورۂ حدیث کے طلبا وہاں مقیم تھے۔ صحاح ستّہ کا درس جاری تھا اور یہ خانقاہ تین سو سال بعد آباد ہوئی تھی۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو سجادہ نشینوں کے اس مطالبے پر جنگ و جدل یا کم از کم مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ سکتی تھی، کوئی اور ہوتا تو خانقاہ پر قبضہ باقی رکھنے کے لیے دین ہی کے نام پر نہ جانے کتنی تاویلات ذہن میں آتیں۔ خدمتِ دین اور تحفظِ مسلک کی نہ جانے کتنی دُہائیاں دی جاتیں اور لڑائی جھگڑے کے کتنے ہی جواز فراہم ہو جاتے، لیکن وہاں تو "شریعت طبیعت بن چکی تھی" اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی سامنے تھا۔

أنا زعيم ببيت في وسط الجنة لمن ترك المراء وهو محقّ

جو شخص حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑا ترک کر دے میں اس کے لیے جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کے لیے تیار ہوں۔

حضرت نے ان سجادہ نشین حضرات سے پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھا کہ

"جب حضرت شیخ کا یہ حجرہ گھوڑوں کا اصطبل بنا ہوا تھا اس وقت آپ حضرات کہاں تھے؟" بلکہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر فرمایا:

"اس کام کے لیے کسی جماعت کو زحمت کرنے کی ضرورت نہ تھی، آپ کسی ایک شخص سے بھی کہلا بھیجتے تو میں یہ جگہ خالی کر دیتا"۔ چنانچہ آپ نے فوراً وہاں سے منتقل

ہونے کی تیاری شروع کردی۔ اطراف و اکناف سے آئے ہوئے جاں نثار شاگردوں کا جم غفیر اس واقعے پر سخت مشتعل تھا۔ لیکن آپ نے انہیں سختی سے فرمایا کہ: جو شخص اس فیصلے کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکالے گا وہ میرا دوست نہیں، دشمن ہوگا۔" چنانچہ تھوڑی دیر میں آپ نے اپنا سامان وہاں سے اٹھا کر قریبی مسجد میں منتقل فرمایا اور اللہ کے گھر میں فروکش ہو گئے۔

اس بے مثال ایثار، للّٰہیت، اخلاص اور ضبط و تحمّل کا ثمرہ اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ چند ہی روز گذرے تھے کہ سجّادہ نشین حضرات اپنے عمل پر پشیمان ہوئے، اور دوبارہ آکر درخواست کی کہ آپ اب وہیں تشریف لے جائیں اور خانقاہ کو دوبارہ آباد فرمائیں، حضرتؒ نے ابتداءً انکار فرمایا، لیکن جب ان کا اصرار دیکھا تو دوبارہ وہیں تشریف لے گئے اور پھر آخر وقت تک اسی خانقاہ میں رونق افروز رہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ سے لے کر حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب کاندھلویؒ اور حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تک کتنے آفتاب و ماہتاب اس خانقاہ سے فیض حاصل کرتے رہے اور اس خاموش گوشہ تبلیغ نے دعوت و تبلیغ سے لیکر جہاد و قتال تک کتنے عظیم منصوبوں کو جنم دیا۔ اس کی تاریخ بڑی طویل ہے اور یہ مختصر صفحات اس کی تفصیل کے لیے ناکافی۔

احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہٗ، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے عاشقِ زار تھے اور اکثر مدرسے کی چھٹی کے ایام میں اسی خانقاہ کی کشش انہیں دیوبند سے پیدل یہاں تک کا سفر کرنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ چشمِ تصور ان سب بزرگوں کو یہاں جلوہ آرا دیکھتی رہی یہاں تک کہ شام ہونے لگی اور ہم خانقاہ سے رخصت ہو کر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے پوتے مولانا حکیم مسعود احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کا مکان خانقاہ کی پشت پر واقع ہے۔ حضرت مولانا نے انتہائی

شفقت و محبت کا برتاؤ فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے پاس ان کے آخری ایامِ علالت میں حضرت حکیم صاحب موصوف کا ایک گرامی نامہ آیا تھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت خود جواب لکھنے سے معذور تھے، اس لیے احقر کو جواب لکھنے کا حکم دیا، احقر کو جواب لکھنے میں کچھ اپنی غفلت اور کچھ اپنی مصروفیت کی بنا پر ایک دن کی تاخیر ہو گئی، چنانچہ اگلے روز حضرت والد صاحبؒ نے اس کے جواب کے بارے میں پوچھا تو احقر نے جواب دیا کہ "ابھی تک جواب نہیں لکھ سکا، انشاء اللہ آج لکھ دوں گا" اس پر آپ نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "بندۂ خدا، اس کام کو تو سب سے مقدم سمجھ کر کرنا تھا، تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کس کا خط ہے؟ میرے ایسے نصیب کہاں تھے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے پوتے کا خط میرے نام آتا" اور یہ کہہ کر آپ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

اگرچہ حضرت حکیم صاحب موصوف نے دارالعلوم میں حضرت والد صاحبؒ سے پڑھا ہے، اور وہ اپنے آپ کو حضرتؒ کا شاگرد ہی کہتے ہیں، لیکن حضرت گنگوہیؒ کی نسبت سے حضرت والد صاحبؒ ان کے ساتھ ایسا معاملہ فرماتے تھے جیسے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے ساتھ۔

تھوڑا سا وقت ان کی خدمت میں گزار کر ہم دل میں کیف و سرور کی ایک ناقابلِ بیان کیفیت لیے ہوئے دیوبند کی طرف واپس ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دن اس سفر کا اصل حاصل تھا اور حرمین شریفین کے بعد روئے زمین کی کسی بھی دوسری جگہ جا کر وہ سرور و کیف اور سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اس روز عطا فرمایا فللّٰہ الحمد اولہ و آخرہٗ۔

دیوبند کے بعد ایک دن سہارنپور بھی جانا ہوا۔ برصغیر کے دوسرے بڑے علمی مرکز مدرسہ مظاہر العلوم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ بفضلہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کی برکت سے یہاں اب بھی اپنے قدیم بزرگوں کے انداز و ادا کی جھلکیاں نظر آئیں۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہم کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب اور حضرت مولانا محمد شاہد صاحب نے انتہائی شفقت و محبت کا

معاملہ فرمایا، اساتذہ کرام سے بھی مختصر ملاقات رہی۔ کتب خانے کی بھی زیارت ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے طبیعت سیر نہ ہوسکی لیکن احقر کے لیے یہ مختصر سی ملاقات بھی بڑی نعمت تھی۔

سہارنپور کے بعد دہلی میں بھی چار دن قیام رہا۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہم العالی کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جناب قاری محمد ادریس صاحب مدظلہم کے یہاں قیام رہا۔ مرکز تبلیغ نظام الدین بھی حاضری ہوئی، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اور حضرت مولانا عبیداللہ صاحب مدظلہم العالی کی زیارت و ملاقات کی سعادت ملی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہم کے مزارات پر بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے مشہور و معروف روزنامے "الجمعیۃ" کے فاضل ایڈیٹر جناب ناز انصاری سے پاکستان ہی میں نیاز حاصل ہوچکا تھا اور ان کے حسنِ اخلاق اور دلکش باتوں کا تاثر پہلے ہی سے دل پر قائم تھا، انہوں نے کرم فرمایا اور یہاں پر بھی ملاقات کا شرف بخشا۔ بلکہ "الجمعیۃ" کا وہ خصوصی شمارہ بھی عنایت فرمایا جو اجلاس صد سالہ کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل وہ دارالعلوم کراچی پر تفصیل سے ایک مضمون "الجمعیۃ" کے ایک شمارے میں شائع فرما چکے تھے جو انشاء اللہ البلاغ کی کسی قریبی اشاعت میں نقل کیا جائے گا۔ ہمارے ایک محترم عزیز جناب محمود عثمانی نے، جو ہمدرد دواخانے کے پبلسٹی مینیجر ہیں، دہلی کے قیام کے دوران خصوصی کرم فرمایا اور غیر ملکیوں کو جو مشکلات پیش آسکتی ہیں ان میں بیحد مدد فرمائی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیرا۔ اسی دوران دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری میں مسلمان سلاطین کے مآثر جامع مسجد، لال قلعہ، تاج محل اور دوسرے تاریخی مقامات بھی بصد حسرت و یاس دیکھے اور پانچ دن کے بعد یہاں سے الٰہ آباد کیلئے روانگی ہوئی۔

الٰہ آباد میں بعض اعزہ سے ملاقات کے علاوہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضری کا بھی بڑا شوق تھا، آپ حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے اکابر خلفاء میں سے تھے اور آپ نے الٰہ آباد میں اپنے شیخ کے طرز پر مدرسہ

خانقاہ قائم فرما کر اصلاح و ارشاد کا نہایت مفید نظام قائم فرمایا ہوا تھا۔ جس سے خلق خدا کو بے حد نفع پہنچا، اس علاقے میں آپ سے پہلے نہ کوئی قابل ذکر مدرسہ تھا، نہ کوئی تربیت گاہ تھی، اور دین سے ناواقفیت کے سبب بدعات و رسوم کا دور دورہ تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ سے یہاں دین کی نشر و اشاعت کا جو کام لیا وہ حیرت انگیز ہے۔ سینکڑوں لوگوں کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا، اور بے شمار افراد کو صحیح فہم دین کی توفیق ہوئی۔ حضرت مولاناؒ سفر حجاز کے دوران راستے ہی میں راہیِ آخرت ہوتے۔ یہاں تک کہ نعش مبارک بھی سمندر کی نذر ہوئی ؎

نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے خاص خلیفۂ مجاز اور آپ کے داماد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب مدظلہم آجکل اس مدرسے کے خانقاہ کے نگران ہیں۔ آپ سے دیوبند میں بھی ملاقات ہوئی تھی اور خانقاہ میں حاضری کے وقت تو انہوں نے شفقتوں کی انتہا کر دی۔ بحمد اللہ! یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ مدرسہ اور خانقاہ اب بھی آباد ہیں، اصلاح و تربیت کا سلسلہ قائم ہے۔ حضرت مولاناؒ قدس سرہٗ کے ملفوظات جو نہایت تاثیر کے حامل ہیں یہاں سے شائع ہو رہے ہیں اور ایک ماہانہ رسالہ "وصیت العرفان" کے نام سے جاری ہے، جو زیادہ تر حضرت مولانا قدس سرہٗ کے افادات ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ بحمد اللہ اس خانقاہ میں کئی بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ علماء و صلحاء اور اہل اللہ کے اس اجتماع کو دیکھ کر یہ اطمینان ہوا کہ ؎

ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کا شہر میں دوسرا مرکز ایک مسجد تھی جو چھوٹی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ بحمد اللہ وہاں بھی حضرتؒ کے دوسرے داماد مولانا قمر الزماں صاحب کے زیر نگرانی ایک مدرسہ سرگرم عمل ہے، اور وہاں سے بھی حضرت مولاناؒ کے فیض کی اشاعت ہو رہی ہے۔ یہاں سے "معرفتِ حق" کے نام سے ایک ماہنامہ حضرتؒ کے افادات کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے، بحمد اللہ یہاں بھی حاضری ہوئی،

اور دیگر علماء وصلحا کی محفل سے استفادہ کا موقع ملا، ان حضرات نے بڑی جس شفقت و عنایت کا معاملہ فرمایا وہ دل پر نقش ہے۔ جب احقر لکھنؤ جانے لگا تو مولانا قمر الزماں صاحب اور مولانا عمار صاحب رات کے چار بجے اسٹیشن پہنچے اور نہ صرف رخصت کے وقت اپنی زیارت کا شرف بخشا، بلکہ ناشتے کا سامان بھی ساتھ لائے جو بذاتِ خود ایک نعمت تھا، چہ جائے کہ ایسے صالح اور محب اور مشفق ہاتھوں سے ملے۔

الٰہ آباد کے قیام میں ایک اور عظیم نعمت جو احقر کو حاصل ہوئی وہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی دامت برکاتہم کی زیارت و ملاقات تھی۔ حضرت مولانا مدظلہم اُن گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں جن کے تصور سے عہدِ حاضر کے افلاس کا احساس کم ہوتا ہے۔ آپ ایک واسطے سے حضرت شاہ فضلِ رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کے خلیفہ ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے خلفاء میں سے ایک بزرگ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شیخ تھے جن کی صحبت میں رہ کر آپ نے ریاضت و مجاہدات اور تربیتِ باطن کی منزلیں طے فرمائیں، یہاں تک کہ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا کہ:

"اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا لائے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ: احمد میاں (یعنی مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی) کو لایا ہوں" ـــــ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہم (صدر مفتی دار العلوم دیوبند) سے پوچھا کہ سلسلۂ نقشبندیہ میں اس وقت قوی النسبۃ بزرگ کون ہیں؟ تو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہم نے حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہم ہی کا نام لیا۔ آپ کو صاحب نسبت ولی اللہ ہونے کے ساتھ شعر گوئی کا بھی بڑا نفیس ذوق و ملکہ حاصل ہے، اور آپ کا مجموعۂ کلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے حال ہی میں طبع کرا دیا ہے۔

احقر نے سیدی و مرشدی حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب مدظلہم العالی اور حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا تذکرہ تو بارہا سنا تھا اور اسی وقت سے

زیارت کا اشتیاق بھی تھا، لیکن یہ اشتیاق بفضلہ تعالیٰ اس سفر میں پورا ہوا۔ حضرت مولانا کا اصل قیام پرتاب گڑھ میں رہتا ہے لیکن بکثرت الہ آباد بھی تشریف لاتے رہتے ہیں۔ احقر کے خسرِ محترم جناب شرافت حسین صاحب مدظلہم نے جو بحمداللہ بزرگوں کی زیارت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے بتایا کہ حضرت مولانا آجکل الہ آباد ہی میں تشریف فرما ہیں۔ چنانچہ احقر ان کے ہمراہ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو لمحات آپ کی صحبت میں نصیب ہوئے، وہ بلاشبہ زندگی کی یادگار نعمتوں میں سے تھے، اپنے بزرگوں کی ساری ادائیں وہاں جلوہ گر تھیں، وہی سادگی، وہی بیساختگی، وہی تواضع، وہی عبدیت و فنائیت کا رنگ، وہی سوز و گداز، نہ کوئی شان و شوکت، نہ معروف پیروں کا ساٹھاٹھ باٹھ اور نہ مصنوعی درویشی کا تکلف، سر سے پاؤں تک مجسّم شفقت و رحمت، آنے والے کو دین کی کوئی نہ کوئی بات پلانے کی لگن، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سیدی و مرشدی حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہم العالی کی نسبت سے اس ناکارہ پر بیحد الطاف و عنایات کا معاملہ فرمایا، اس وقت طبیعت ناساز تھی، لیکن نہایت انبساط کے ساتھ گفتگو بھی فرمائی۔ بہت سی گراں قدر نصیحتیں بھی کیں، بحمداللہ اس قیام میں دو مرتبہ حضرت مدظلہم کی خدمت میں حاضری ہوئی اور وہ مبارک سراپا ہمیشہ کے لیے دل و نگاہ میں بس گیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کو بعافیت تمام ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ہمیں استفادے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

الہ آباد کے بعد ایک دن لکھنؤ میں قیام رہا، لکھنؤ کے سفر کا مقصد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی زیارت اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہم العالی کی صحبت و زیارت سے استفادہ تھا۔ برادرِ محترم مولانا برہان صاحب سنبھلی (ناظم مجلس تحقیقاتِ شرعیہ و استاذِ تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے کرم فرمایا اور اسٹیشن سے اپنی رہنمائی میں دارالعلوم لے گئے، وہاں حضرت مولانا محمد اشرف خاں صاحب (صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی) پہلے سے قیام پذیر تھے، دوپہر کو کھانے پر اہلِ علم کا بڑا اچھا اجتماع ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم بھی

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہم سے ملاقات کے لیے وہاں تشریف لے آئے اور اس طرح پہنچتے ہی حضرت موصوف کی زیارت ہو گئی۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم العالی رائے بریلی میں تشریف فرما تھے۔ آپ سے دیوبند میں ملاقات کے دوران احقر اپنے قصد تعمیر کا ذکر کر چکا تھا اور پختہ ارادہ یہی تھا کہ ایک دن لکھنؤ سے رائے بریلی جا کر حضرت مولانا مدظلہم کی خدمت میں حاضری ہوگی لیکن ــــــ عرفت ربی بفسخ العزائم بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر احقر کو فوراً پاکستان لوٹنا پڑا اور لکھنؤ میں ایک دن سے زائد قیام کا موقع نہ ملا۔ وہ ایک دن بھی دفتری کارروائیوں اور سیٹ وغیرہ کا اطمینان کرنے کی نذر ہو گیا۔ احقر رائے بریلی حاضر ہونے سے محروم رہا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہم کی خدمت میں حاضری کی بھی حسرت رہ گئی۔

تاہم بحمد اللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے فاضل اساتذہ و اہل علم کی مختصر صحبت نصیب ہوئی۔ ندوہ جیسا علمی مرکز اب تک نہیں دیکھا تھا۔ بحمد اللہ اس کی زیارت ہو گئی، اس کا عظیم کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا۔ مسند عبد بن حمید کا مخطوطہ پہلی بار یہیں دیکھنا نصیب ہوا اور بہت سی نادر کتابیں نظر سے گزریں۔

ندوہ کی علمی و دینی فضا دیکھ کر بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور جو شعر پڑھا ندوہ بقول اکبر مرحوم مسلمانوں کی "زبانِ ہوش مند" تو ہمیشہ سے تھا لیکن دین و دردمندی کی جو کسر بیان کی جاتی تھی وہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب مدظلہم نے پوری فرما دی ہے۔ خاص طور سے حضرت مولانا علی میاں مدظلہم العالی کی فکر و بصیرت، جہد و عمل اور سوز و گداز کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مدظلہم نے اس ادارے کو حیاتِ نو بخش دی ہے۔ مختصر سے وقت میں یہاں جو کچھ دیکھا اور جن حضرات اساتذہ سے ملاقاتیں ہوئیں بحمد اللہ ان کی روشنی میں اس ادارے سے بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور مختلف شعبوں میں دینی خدمات کا مستقبل روشن نظر آیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مدظلہم کے وجودِ باجود کو مسلمانوں پر تادیر سایہ فگن رکھے، ان کے زیرسایہ اس ادارے کو مزید ترقیات سے نوازے اور اس کے

آثارِ طیبہ کو دوسرے دینی و علمی اداروں تک متعدی فرمائے۔ آمین

اگلے روز صبح ناشتے پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ حضرت مولانا مدظلہم کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ کی تحریری اور تبلیغی خدمات سے پورا برِصغیر مستفید ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان علمی اور عملی کمالات کے ساتھ بے نفسی کی جو دولت آپ کو عطا فرمائی ہے اس کی مثالیں اب خال خال ہیں۔ آپ اجلاس دیوبند میں تشریف نہیں لا سکے تھے، اس لیے اگر لکھنؤ حاضری نہ ہوتی تو آپ کی زیارت سے محروم جانا پڑتا۔ بفضلہٖ تعالیٰ لکھنؤ کے سفر کا یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے حضرت مولانا مدظلہم کی صحبت کا شرف ملا۔ بہت سی ضروری باتیں معلوم ہوئیں۔ آپ نے اپنی بعض نو طبع شدہ تالیفات عنایت فرمائیں، اور یہ فائدہ تو ان سب بزرگوں کی صحبت کا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہم جیسوں کے لیے مجسم درس ہوتی ہے، ان کی سادگی، ان کی تواضع، ان کے اخلاقِ کریمانہ، ان کے نہاں خانۂ دل کی تڑپ اور دین کے راستے میں ان کی محنتیں دیکھ کر کم از کم شرم تو آتی ہی ہے کہ یہ حضرات بہت دور کے نہیں۔ اسی دور کے حضرات ہیں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ اور ہم پران کی کسی نہ کسی درجے میں نقل اُتارنے کا جذبہ کچھ دیر کے لیے پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ اگر یہ جذبہ بار بار بیدار ہوتا رہے تو کیا بعید ہے کہ کسی وقت استحکام اختیار کر لے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیا

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت مولانا مدظلہم کی خدمت میں قیامِ لکھنؤ کا بہترین وقت گذارنے کے بعد واپسی ہوئی، اور اسی روز جمعہ کے بعد امرتسر کے لیے روانگی ہو گئی۔

○

ہندوستان کا یہ پچیس روزہ قیام احقر کے لیے جن گوناگوں فوائد کا حامل تھا، ان کا اجمالی تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو گیا، آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہمسایہ ملک اور بارہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کا وطن ہونے کی حیثیت سے وہاں کے مجموعی حالات کے بارے

میں چند تاثرات بھی عرض کر دیئے جائیں۔

ہندوستان میں بعض ایسی قابلِ تعریف باتیں نظر آئیں جو ہم اہلِ پاکستان کے لیے درس آموز ہیں، مثلاً یہ کہ جن جن علاقوں میں احقر کا جانا ہوا، کم از کم وہاں ظاہری شان و شوکت اور تکلفاتِ زندگی کی دوڑ ہمارے مقابلے میں کم محسوس ہوئی۔ وہاں حکومتوں کی پالیسی شروع سے یہ رہی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات پر انحصار کم سے کم کیا جائے اور ملکی مصنوعات کو فروغ دے کر زیادہ سے زیادہ اشیاء میں خود کفیل ہونے کی کوشش کی جائے، چنانچہ آج وہاں صرف کاریں ہی نہیں، ہوائی جہاز اور ریٹینک بھی بن رہے ہیں۔ بازاروں میں غیر ملکی مصنوعات شاذ و نادر نظر آتی ہیں۔ سارے ملک میں کوئی ایسی کار آپ کو نظر نہیں آئے گی جو کسی دوسرے ملک کی بنی ہوئی ہو۔ پورے ملک میں ہر جگہ صرف ایک ہی کار استعمال ہو رہی ہے جو ہندوستان میں بنتی ہے اور اُمراء و حکام سے لے کر نیچے تک کے تمام افراد وہی کار استعمال کرتے ہیں۔ سڑکوں پر بھی کاریں کم اور رکشہ وغیرہ زیادہ نظر آتے ہیں، معیشت میں سادگی زیادہ ہے، اور ٹیپ ٹاپ نسبتاً کم۔ اس کے علاوہ یہ بات نمایاں محسوس ہوتی ہے کہ حکومت نے جس قسم کا قومی شعور عوام میں پیدا کرنا چاہا تھا اس میں وہ خاصی کامیاب رہی ہے۔ لوگوں میں اپنے ملک سے محبت اور دوسروں پر اس کی برتری ثابت کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہندی زبان، باوجودیکہ اکثریت کے لیے نامانوس تھی لیکن اب اس کا عام چلن نظر آتا ہے اور اس کو تیزی سے پھیلانے میں حکومت کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ ان قابلِ تعریف باتوں کے جو مفید نتائج عوام کی زندگی میں برآمد ہونے چاہئیں وہ بالکل نظر نہیں آتے، بلکہ نتائج بالکل برعکس نظر آتے ہیں۔ مثلاً خود کفیل ہونے کا نتیجہ عوام کی خوش حالی کی صورت میں نکلنا چاہیئے تھا، لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ فقر و افلاس وہاں پاکستان سے زیادہ نظر آتا ہے۔ چند گنے چنے علاقوں کے سوا خوش حالی کی رونق چہروں پر نظر نہیں آتی۔ اس کے بجائے چہرے فلاکت سے مرجھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح قومی و ملکی شعور کا تقاضا یہ تھا کہ رشوت ستانی، جرائم، لاقانونیت اور دوسری بدعنوانیاں کم ہوتیں، لیکن اس معاملے میں ہندوستان ہمارے ملک

سے چند قدم آگے ہو تو ہو، کم کسی طرح نہیں۔ قیمتوں کا معیار اگر پاکستان سے کچھ کم ہو تو اُجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ کم ہے۔ غرض مذکورہ قابلِ تعریف باتوں کا کوئی بہتر عملی نتیجہ نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی یہ ہمت قابلِ صد ستائش ہے کہ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھنے کی جان توڑ کوشش کی ہے، خاص طور سے وہاں کے بعض علماء نے مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور ان کو سہارا دینے کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے دین کا جتنا تحفظ وہاں رہتے ہوئے کیا جا سکتا تھا، بحمداللہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

لیکن انفرادی کوششوں کے مقابلے میں حالات کا جو سیلاب مسلمانوں کو مخالف سمت میں دھکیل رہا ہے وہ کافی تشویشناک ہے۔ تعلیم گاہوں میں خدا رسول کے نام کا تو ظاہر ہے کوئی سوال نہیں، لیکن اس کے برعکس ذہنیت پلائی جا رہی ہے۔ اُردو کا بیج مارا جا چکا ہے اور بعض شہروں میں میلوں چلنے کے بعد بھی اُردو کا کوئی بورڈ مشکل سے نظر آتا ہے۔ رسم الخط تبدیل کر کے نئی نسل کا رشتہ ماضی کے ورثے سے بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ چنانچہ نئی نسل کے نوجوانوں میں ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے جو اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ظاہر ہے کہ کسی دینی پروگرام کا کیا سوال ہے! ادھر ہندی فلمیں اور رسالے عُریانی اور فحاشی میں یورپ اور امریکہ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک شریف آدمی کے لیے کسی بک اسٹال پر چند لمحے کھڑا ہونا ممکن نہیں۔ پاکستان میں بھی ہم عُریانی اور فحاشی کا دن رات رونا روتے ہیں۔ اور بلاشبہ اس لعنت میں ہم بھی گرفتار ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے پاکستان ہندوستان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی ہے، اور غُربا تک اس عادت میں مبتلا ہیں۔ ایک ذمے دار ہندو آفیسر سے گفتگو کے دوران احقر نے پوچھا کہ "بہت سی اشیاء میں خود کفیل ہونے کے باوجود بھارت میں اتنا شدید افلاس کیوں ہے؟" ان صاحب نے جواب دیا کہ:

"اس ملک میں شراب نوشی کی وبا تیزی سے پھیل رہی ہے، اس کی موجودگی میں

یہاں کے باشندے کتنا ہی کمالیں ان کا افلاس دُور نہیں ہو سکتا۔"

پھر ایک انتہائی تشویشناک بات یہ ہے کہ ہندو مسلمان کا مذہبی امتیاز رفتہ رفتہ بہت کم ہوتا جا رہا ہے، اور اسے ختم کرنے کی باقاعدہ منظم کوشش کی جا رہی ہے ــــ انتہا یہ ہے کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شادی کے واقعات بھی ہونے لگے ہیں۔ اور الہ آباد کی ایک مسلمان طالبہ نے مجھے بتایا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شادی ہو تو، حکومت اس پر انعام دیتی ہے۔ جسے "مخالف فرقے سے شادی کا انعام (Intercaste marriage Prize) کہا جاتا ہے۔

ہم پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اپنے ماحول کی دینی ابتری اور بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے صبح و شام شاکی رہتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جا کر وہاں کا عام ماحول اور مسلمانوں کے حالات قریب سے دیکھنے کے بعد پاکستان کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی، اور اندازہ ہوا کہ یہ ملک ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت ہے۔

اگر ہم اس ملک کی خلوص، للّٰہیت، جذبے اور لگن کے ساتھ تعمیر کر سکیں تو یہ سارے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بہترین سہارا ہے۔ بحمد اللہ ہم یہاں بہت سی ان بلاؤں سے محفوظ ہیں جو ہندوستان میں عام ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ہم اس مقصد کو پورا کریں جس کے لیے یہ ملک معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ان برائیوں کا قلع قمع کریں جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں اور اس ملک کو دینی اعتبار سے ایک مثالی ملک بنانے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم یہاں کسی غیر مسلم حکومت کے ہاتھوں مجبور نہیں ہیں بلکہ اپنے پورے نظامِ زندگی کو ٹھیک ٹھیک اپنے دین کے مطابق استوار کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اگر ہم نے اس نعمت کی ناشکری کی اور اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمارے لیے دُنیا و آخرت میں تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس نعمت کی قدر پہچاننے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جنوبی افریقہ
کے دو سفر

(۱) ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۰ھ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء

(۲) ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۱ھ ستمبر سنہ ۱۹۸۲ء

(۱۱)

جنوبی افریقہ

پہلا سفر

جنوبی افریقہ کے بعض مخلص مسلمانوں کی طرف سے ایک مدت سے یہ اصرار چل رہا تھا کہ برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور یہ ناکارہ اس ملک کا دورہ کریں۔ پچھلے دنوں ہماری مصروفیات اس قسم کی رہیں کہ اس فرمائش کی تعمیل کی نوبت نہ آسکی۔ بالآخر ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ مطابق ۲ نومبر ۱۹۸۱ء کو سفر کی نوبت آئی۔ تقریباً دس گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد ایک رات کینیا کے دارالحکومت نیروبی میں گزاری اور ۳ نومبر کی صبح وہاں سے برٹش ایرویز کے ذریعے روانہ ہوکر ساڑھے بارہ بجے دوپہر جوہانسبرگ پہنچے۔ ہوائی اڈے پر اطراف کے مسلمانوں اور اہلِ علم کا بڑا مجمع موجود تھا، جوہانسبرگ سے تقریباً تیس میل دور ایک بستی آزادول میں جناب احمد حسن لہر صاحب کے مکان پر قیام ہوا۔

جنوبی افریقہ اِس وقت دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ قدرت نے اس علاقے کو معدنی اور زرعی وسائل سے مالا مال فرمایا ہے۔ یہاں سونے، پلاٹینم، چاندی اور یورینیم کی کانیں ہیں، اور کہتے ہیں کہ دُنیا کا تقریباً تین چوتھائی سونا اس ملک سے پیدا ہوتا ہے۔ آب و ہوا، قدرتی مناظر اور زرعی پیداوار کے لحاظ سے بھی یہ خطہ دُنیا کے ممتاز علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اصل میں یہ ملک مختلف سیاہ فام افریقی قبائل کا مسکن تھا، پھر اس پر انگریزوں نے قبضہ کرکے اپنی حکومت قائم کی، اور ایک مدت کے بعد ڈچ قوم نے اسے بزورِ شمشیر انگریزوں سے چھین کر وہاں اپنی حکومت قائم کرلی جو اب تک

چلی آتی ہے، اور اسی طرح رہوڈیشیا (موجودہ زمبابوے) کے آزاد ہونے کے بعد پورے برِ اعظم افریقہ میں صرف یہی ملک ایسا ہے، جو ابھی تک گوروں کے زیرِ تسلط ہے اور جہاں ابھی تک مقامی باشندوں کی حکومت قائم نہیں ہوسکی۔ اور حاکم قوم نے اس ملک کو تمدنی اور صنعتی اعتبار سے یورپ اور امریکہ کے معیار پر لانے کے لیے جتنی کوشش یہاں کی ہے، وہ کسی اور ملک میں نہیں، چنانچہ یہاں کے بڑے شہر جوہانسبرگ، پریٹوریا اور ڈربن تمدنی اور قدرتی حسن کے لحاظ سے لندن اور نیویارک سے زیادہ ہوں تو ہوں کم کسی طرح نہیں ہیں۔

یہ ملک چار صوبوں پر مشتمل ہے: ٹرانسوال، نٹال، اورنج فری اسٹیٹ، اور کیپ پراونس۔ ان میں سے اورنج فری اسٹیٹ تو خالصۃً گوروں کا صوبہ ہے جس میں کسی اور قوم کو بسنے کی اجازت نہیں، باقی تین صوبوں میں پانچ قسم کی اقوام آباد ہیں۔ گورے جو برسرِ اقتدار قوم ہیں، اور ان میں یہودی اور عیسائی دونوں مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کالے جو ملک کے اصل باشندے ہیں اور ملک میں بھاری اکثریت انہی کی ہے، لیکن حقوق کے لحاظ سے وہ اس ملک کی مظلوم ترین قوم ہے، ان کی اکثریت عیسائی ہے۔ کلرڈ یعنی رنگین قوم، جو گوروں اور کالوں کے اختلاط سے وجود میں آئی۔ انڈین جو اصلاً ہندوستان کے باشندے تھے، لیکن تجارت اور کاروبار کی غرض سے یہاں آباد ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر بمبئی سورت، اور گجرات وغیرہ کے حضرات ہیں، مدراس اور کیرالہ کے ہندو بھی اسی زمرے میں آتے ہیں، لیکن ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ پانچویں قوم ملائی کہلاتی ہے یہ اصلاً ملایا کے باشندے ہیں، اور جس زمانے میں انگریز بیک وقت ملایا اور جنوبی افریقہ دونوں پر برسرِ اقتدار تھا اُس وقت انہوں نے کچھ ملائی مسلمانوں کو قیدی بنا کر یہاں بھیج دیا تھا، اُن سے یہ نسل چلی، یہ بیشتر مسلمان ہیں اور ان کی بڑی تعداد کیپ پراونس میں آباد ہے۔

ہمیں دعوت دینے والے انڈین مسلمان تھے، یہ زیادہ تر گجرات اور سورت کے آس پاس کے رہنے والے حضرات ہیں، ان کے آباء و اجداد نے کسی زمانے میں جنوبی افریقہ کو اپنا وطن بنا لیا تھا، یہ حضرات بنیادی طور پر نہایت دیندار، علماء اور اہل اللہ سے وابستہ، دین کی غیر معمولی طلب رکھنے والے لوگ ہیں۔ جنوبی افریقہ کا عام ماحول کفر و فسق کی ...

ڈوبا ہوا ہے، لیکن ان حضرات نے بڑی محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ اس مشکل ماحول میں اپنے دینی تشخص اور دینی زندگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان حضرات کی بھاری تعداد اپنی دینی غیرت اور دینی تصلب کے معاملے میں شاید بہت سے اسلامی ملکوں کے عام مسلمانوں سے بھی آگے ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے خالص مغربی ماحول میں یہاں کے مسلمانوں میں اکثر و بیشتر رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل پیرا ہونے کا قابل رشک جذبہ نظر آتا ہے، اور غور کرنے سے ظاہر اسباب میں اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، اور وہ یہ کہ ان حضرات نے جنوبی افریقہ میں آباد ہونے کے بعد اپنا مسلسل رابطہ ہندوستان اور پاکستان کے اکابر علماء اور بزرگوں سے استوار رکھا ہے۔ یہاں کے بیشتر مسلمان خط و کتابت کے ذریعے ہندوستان یا پاکستان کے کسی نہ کسی بزرگ سے وابستہ ہیں اور ان سے اصلاح و تربیت کا تعلق رکھتے ہیں، اس کے علاوہ برِ صغیر کے علماء اور بزرگوں کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ دعوت دیتے رہتے ہیں، اور ملک بھر میں ان کے مواعظ و ملفوظات اور خصوصی مجلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کی بڑی تعداد جوق در جوق شریک ہوتی ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ، حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم وقتاً فوقتاً یہاں دورے کرتے رہے ہیں اور ان حضرات کے فیوض و برکات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اب کچھ عرصے سے بفضلہ تعالیٰ تبلیغی جماعت کا کام بھی یہاں بہت پھیل گیا ہے، اور اس سے فضا میں اور زیادہ خوشگوار تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں میں تبلیغی جماعت کے کام کا بڑا عظیم فائدہ ظاہر ہوا ہے، اور اب بستی بستی یہ مبارک کام پھیل رہا ہے۔

آج سے تقریباً چودہ سال پہلے احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ، نے یہاں کا ایک تفصیلی دورہ کیا تھا، اور بفضلہ تعالیٰ ڈیڑھ ماہ کے اس دورے کے حیرت انگیز اثرات اب تک کھلی آنکھوں نظر آتے ہیں، نہ جانے کتنی زندگیوں میں اس دورے کی بدولت انقلاب برپا ہو گیا، کتنے بھٹکے ہوئے لوگ دین کے راستے پر لگ گئے، کتنوں کے دل کی دنیا بدل گئی،

فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے کتنے لوگ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گئے، اور ان کی زندگی استوار ہو گئی، ایسے لوگ اب بھی وہاں موجود ہیں جو برملا یہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی زندہ کرامت ہے۔ پھر ان حضرات کی ایک بڑی تعداد مسلسل خط و کتابت کے ذریعے حضرت والد صاحبؒ سے وابستہ رہی، اور آپ سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم رکھا۔ انہی میں سے بعض حضرات ہمارے داعی اور میزبان تھے۔

ایک مہینے کے اس قیام میں جنوبی افریقہ کے دو صوبوں ٹرانسوال اور نیٹال کے بیس سے زائد شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا، جن میں سے جوہانسبرگ، پریٹوریا، کروگرس ڈروپ، لینیشیا، رسٹن برگ، اروشنی، بنونی، مڈل برگ، بار برٹن، نیلس پرٹ، ہیک پورٹ، برنز، ڈربن، پیٹر میرٹز برگ اور ٹونگاٹھ وغیرہ کے نام اس وقت یاد رہ گئے ہیں اور بہت سے شہروں کے نام یاد نہیں رہے۔ بیشتر مقامات پر برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی یا احقر کو عام جلسوں اور خصوصی اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا، تقریباً ہر جگہ مسلمانوں کا دینی ذوق و شوق اور جذبہ قابلِ دید تھا۔ لوگ وعظ میں شرکت کے لیے بعض مرتبہ سو ڈیڑھ سو کیلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے آئے، اور ان کے سوالات سے ان کی طلب کا اندازہ ہوتا تھا۔

کچھ عرصے سے وہاں کے مسلمانوں میں ایک تشویشناک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہاں کے نوجوان رفتہ رفتہ اُردو اور گجراتی زبان سے بالکل بے خبر ہوتے جا رہے ہیں، گھروں کی عام زبان انگریزی ہو چکی ہے، بچے کے پیدا ہونے کے بعد ماں باپ بھی اس سے انگریزی ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بچوں کی مادری زبان انگریزی بن چکی ہے اور اُردو یا گجراتی نہیں سمجھتے، اور چونکہ اس علاقے میں مسلمانوں تک دینی معلومات کے پہنچنے کا راستہ اُردو یا گجراتی ہی تھا، اس لیے اب جو نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے وہ دینی معلومات سے دُور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اب وہاں کے علماء بھی مسجدوں میں انگریزی ہی میں تقریر کرنے لگے ہیں، اور مکاتب و مدارس میں درس بھی انگریزی ہی میں ہونے لگا ہے۔

ہمارے خطابات عام طور سے عشاء کے بعد مسجدوں میں ہوئے اور وہ بیشتر اُردو ہی

میں تھے، لیکن کچھ نوجوانوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جو لوگ اُردو میں وعظ پوری طرح نہیں سمجھ سکتے ان کے لیے الگ نشستیں انگریزی میں رکھی جائیں، چنانچہ بہت سے شہروں میں عصر کے بعد ایک نشست ایسے نوجوانوں کے لیے الگ رکھی گئی، اس میں احقر نے انگریزی میں خطاب کیا، اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ مغرب تک رہا۔ احقر انگریزی کی شُدبُد رکھنے کے باوجود انگریزی میں برجستہ تقریر کا عادی نہیں، لیکن ضرورت کے پیشِ نظر اس آزمائش کو قبول کیا، اور یہ وہاں کے حضرات کے دینی جذبے کی برکت تھی اور اُن کی طلب کی سچائی تھی کہ انہوں نے احقر کی ان ٹوٹی پھوٹی گزارشات کو نہ صرف برداشت کیا، بلکہ احقر کی ہمت افزائی بھی فرمائی۔

برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم نے عمومی جلسوں سے خطاب کے علاوہ تقریباً ہر جگہ خصوصی مجالس سے بھی خطاب فرمایا، اور اس میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ، حضرت والد صاحبؒ، اور مرشدی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ کے ملفوظات وارشادات سنانے کا سلسلہ جاری رکھا، جس سے بحمد اللہ بہت فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد شہروں میں خواتین کے بہت سے اجتماعات سے بھی خطاب فرمایا، اور وہاں کے حالات کے مناسب نہایت مفید ہدایتیں فرمائیں جن کا بحمد اللہ خوشگوار اثر ظاہر ہوا۔

سفر کے آخر میں جمعیت علماء ٹرنسوال کی طرف سے جوہانسبرگ کی مسجد نیوٹاؤن میں علماء کا ایک خصوصی اجتماع بھی رکھا گیا، جس میں صوبے کے اطراف سے تقریباً چالیس علماء شریک ہوئے۔ اس مجلس میں جنوبی افریقہ کے بہت سے دینی، تبلیغی اور فقہی مسائل پر مفید تبادلۂ خیال ہوا۔

پہلے انڈین حضرات گوروں کے شہروں میں ملے جُلے رہتے تھے، لیکن کچھ سال پہلے جنوبی افریقہ کی حکومت نے "گروپ ایریا ایکٹ" کے نام سے نیا قانون نافذ کیا جس کی رُو سے ہر بڑے شہر کے ساتھ انڈین حضرات کے لیے الگ شہر بسانے کا حکم دیا گیا، اس نئے

قانون کے تحت کوئی انڈین گوروں کے کسی شہر میں نہیں رہ سکتا، چنانچہ انڈین حضرات اپنے آبائی مکانات فروخت کر کے نئے شہروں میں مکانات بنانے پر مجبور ہوئے۔ اور اب کئی سال گزرنے کے بعد انتقالِ آبادی کا یہ عمل قریب التکمیل ہے، اور ہر بڑے شہر سے کچھ فاصلے پر ایک انڈین شہر آباد ہے، جہاں جنوبی افریقہ کے صرف ہندی الاصل باشندے سکونت پذیر ہیں۔ انتقالِ آبادی کا یہ عمل شروع میں تو ہندی الاصل باشندوں پر بہت گراں گزرا، کیونکہ برسوں کے رسے بسے لوگ اس قانون کی بنا پر اپنے مکانات چھوڑنے اور نئے مکان تعمیر کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن دینی اعتبار سے مآلِ کار یہ بات مسلمانوں کے لیے مفید ہی ثابت ہوئی، انڈین حضرات میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اس لیے ان علیحدہ آبادیوں میں ان کے لیے اپنے اسلامی شعائر اور اسلامی آداب و معاشرت کا تحفظ زیادہ آسان ہوگیا، ملی جلی آبادیاں خاص طور سے بچوں اور نئی نسلوں کے لیے بہت مُضر ہوسکتی تھیں، اور گوری قوموں کے اختلاط سے مسلمان بچوں کا دینی مستقبل خطرے میں تھا۔ ان علیحدہ آبادیوں کی وجہ سے مسلمان اپنے دینی شعائر کا تحفظ زیادہ اہتمام کے ساتھ کر سکتے ہیں، نیز بچوں کی تربیت بھی نسبۃً آسان ہوگئی ہے۔ یہاں مسلمانوں نے جو عالیشان اور خوبصورت مسجدیں تعمیر کی ہیں، بہت سے مسلمان ملکوں میں ایسی صاف ستھری اور خوبصورت مسجدیں نہیں ملیں گی، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ مسجدیں صرف ظاہری حُسن ہی کے اعتبار سے معیاری نہیں ہیں، بلکہ بحمداللہ وہ نمازیوں سے آباد ہیں۔ صرف عمر رسیدہ افراد نہیں، بلکہ نوجوان اور نوخیز لڑکے بھی مسجدوں میں حاضر ہوتے ہیں، وہاں تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں، عشاء کے بعد تبلیغی نصاب کا اجتماعی مطالعہ ہوتا ہے، اور دینی سرگرمیوں کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ ان اسلامی شعائر کے اہتمام کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اپنی ظاہری وضع قطع کو موافقِ سُنّت بنانے کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے، نوجوانوں میں بھی ایک بڑی تعداد کے چہروں پر خوبصورت داڑھیاں ہیں، اور کسی بڑے مجمع میں جائیں تو وہاں باریش مسلمانوں کا تناسب شاید پاکستان سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔

بچوں کی دینی تعلیم اس قسم کے غیر مسلم ممالک میں سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے، لیکن

ماشاء اللہ یہاں کے علماء نے اس مسئلے کو بھی خوبی کے ساتھ حل کیا ہے، ہر مسلمان آبادی میں ایک ابتدائی دینی مدرسہ قائم ہے جس میں ظہر سے عصر تک تعلیم ہوتی ہے بچے سرکاری اسکولوں سے فراغت کے بعد یہاں آتے ہیں، اور عصر تک پڑھتے ہیں۔ ان مدارس میں قرآن کریم حفظ و ناظرہ، تعلیم الاسلام، اُردو اور ابتدائی دینیات پڑھانے کا انتظام ہے اور سات سال کے نصاب میں قرآن کریم اور دین کی ضروری معلومات فراہم کر دی جاتی ہیں۔ اِن مدارس کا انتظام ٹرانسوال میں جمعیت علماء ٹرانسوال کرتی ہے۔ اور اسی کی نگرانی میں امتحانات وغیرہ ہوتے ہیں۔ جمعیت علماء ٹرانسوال کے ناظم اعلیٰ مولانا ابراہیم میاں صاحب ہیں۔ جنہوں نے پریٹوریا سے کچھ فاصلے پر واٹرفال کے مقام پر ایک فارم میں اپنا مرکز قائم کیا ہُوا ہے، مولانا ابراہیم میاں صاحب میاں برادر کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے امام العصر حضرت مولانا سیّد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں کے زیرِ سایہ علم و دین کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اب وہ واٹرفال کے اسلامی مرکز کے ذریعے ٹرانسوال میں دین کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں اور ان کی مبارک جدّوجہد کے آثار نہ صرف پورے صوبے بلکہ پورے ملک میں محسوس ہوتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے جس شہر میں بھی جانا ہُوا، وہاں مدارس نظر آئے، اور ان میں پڑھانے والے اور مساجد کے ائمہ و خطباء تمام تر دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل یا ان کے فیض یافتہ دوسرے مدارس کے فارغ التحصیل حضرات ہیں، اور ہر جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ دیوبند کے چشمۂ خیر نے دُنیا کے کیسے دُور دراز کے گوشوں تک فیض پھیلایا ہے، اس ملک میں جو جنوب کے اندر دُنیا کے بالکل آخری سرے پر واقع ہے، اور جہاں کفر و فسق کی گرم بازاری اپنے عروج پر ہے، وہاں دین کا کلمہ انہی بوریہ نشینوں کی خاموش جدوجہد کے ذریعے زندہ و سربلند ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو باین فیوض سلامت رکھے اور مسلمانوں کو ان سے بیش از بیش مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

جنوبی افریقہ میں متوسط تعلیم کے دو دینی مدرسوں میں بھی حاضری ہوئی، ایک مدرسہ تو واٹرفال میں ہے اور اس کے مہتمم مولانا ابراہیم میاں صاحب ہیں، اس مدرسے میں

قرآن کریم حفظ و ناظرہ اور ابتدائی اُردو دینیات کے علاوہ عربی زبان اور درسِ نظامی کی متوسط کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، طلبہ کے لیے دارالاقامہ بھی ہے، اور ایک دارالافتا بھی ہے جس کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم سنجالوی صاحب ہیں، یہاں سے مختلف دینی موضوعات پر انگریزی زبان میں مفید لٹریچر کی نشر و اشاعت کا بھی انتظام ہے، اور مسلمانوں کی دینی ضروریات سے متعلق رسائل و کتب کا بڑا ذخیرہ یہاں سے شائع ہوا ہے۔ اس مدرسے میں تقریباً تمام دن گزارنے کا موقع ملا اور اساتذہ و طلبہ سے علمی و دینی مذاکرہ ہوتا رہا۔

دوسرا مدرسہ صوبہ نیٹال میں نیوکاسل کے مقام پر ہے اور اس کا نام دارالعلوم ہے، اس کے منتظمِ اعلیٰ مولانا محمد اسحاق سیمہ صاحب ہیں، اور یہاں بھی مشکوٰۃ المصابیح کے معیار تک درسِ نظامی کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہ مدرسہ شہر کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے، اور ایک چرچ کی عمارت خرید کر قائم کیا گیا ہے، یہاں بھی ایک دارالاقامہ ہے، اور جنوبی افریقہ کے تمام صوبوں کے طلباء یہاں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں، مولانا محمد اسحاق سیمہ صاحب ڈابھیل کے فارغ التحصیل ہیں اور مدرسے کے دوسرے اساتذہ پاکستان کے دینی مدارس کے فضلاء ہیں، انہی میں سے ایک اُستاد مولانا محمد یونس صاحب ہمارے دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں، اور چند سال قبل یہاں سے فارغ ہو کر گئے ہیں۔

صوبہ نیٹال میں نیوکاسل کے علاوہ ڈربن، ٹونگاٹھ اور پیٹر میرٹزبرگ بھی جانا ہوا ڈربن اس صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے اور بحرِ ہند کے کنارے واقع ہے، جنوبی افریقہ کے جتنے شہر ہم نے دیکھے ان میں یہ شہر اپنے حسین قدرتی مناظر اور معتدل آب و ہوا کے لحاظ سے سب سے زیادہ خوبصورت ہے، یہاں بھی جمعیت علماء نیٹال کے نام سے علماء کی ایک تنظیم قائم ہے، اس کے سکریٹری جنرل مولانا محمد یونس پٹیل دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، اور نوجوان ہونے کے باوجود بڑی فعال اور سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں، جمعیت کو حضرت مولانا بخاری اور حضرت مولانا عبدالحق عمرجی جیسے تجربہ کار علماء کی سرپرستی حاصل ہے، مولانا احمد عمر صاحب جن کے یہاں ہمارا قیام ہوا، ان کا تعلق بھی جمعیت سے ہے اور انہوں نے پُر خلوص میزبانی کا حق ادا کر دیا، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر

عطا فرمائیں۔ آمین۔

ڈربن میں جنوبی افریقہ کے ہندی الاصل باشندوں کے لیے ایک الگ یونیورسٹی بھی قائم ہے، یہاں کے اسلامیات اور اسلامی تاریخ کے شعبوں میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ڈاکٹر سلمان ندوی اور معروف اہل قلم پروفیسر حبیب الحق ندوی صاحب پروفیسر ہیں، ان دونوں حضرات نے بھی ڈربن کے قیام کے دوران اپنی مخلصانہ رفاقت کا شرف بخشا، یونیورسٹی کے مختلف شعبے اور خاص طور پر کتب خانہ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب کی رہنمائی میں دیکھا۔

جنوبی افریقہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ وہاں کی سیاہ فام مقامی آبادی کا ہے، اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ جنوبی افریقہ کی سیاہ فام آبادی سیاسی اعتبار سے دُنیا کی سب سے زیادہ مظلوم قوم ہے۔ جنوبی افریقہ کے اصل باشندے اور اسّی فیصد اکثریت ہونے کے باوجود یہ لوگ ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم ہیں، ووٹ دینا اور پارلیمنٹ میں نمائندگی تو بڑی بات ہے جس کا یہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کے لیے شہروں میں رہنا بھی ممنوع ہے، دن بھر جن شہروں میں محنت مزدوری کرتے ہیں، وہاں نہ صرف یہ کہ اپنا کوئی مکان نہیں بنا سکتے، بلکہ وہاں رات گزارنا بھی ان کے لیے جائز نہیں، اُن کی رہائش کے لیے عام شہروں سے کافی فاصلے پر الگ بستیاں آباد ہیں، اور ان بستیوں کا حال یہ ہے کہ جس ماحول میں جوہانسبرگ اور پریٹوریا وغیرہ اپنی ظاہری چمک دمک کے اعتبار سے لندن اور نیویارک کو مات کر رہے ہیں، وہاں سیاہ فام باشندوں کی بعض بستیاں بجلی تک کی سہولت سے محروم ہیں، جو لوگ بڑے شہروں میں کام کرتے ہیں وہ پو پھٹتے ہی اپنی بستیوں سے روانہ ہوتے ہیں اور رات گئے واپس پہنچتے ہیں، اگر کسی شخص کو شہر میں مکان خریدنے یا کرائے پر لینے کی استطاعت ہو تو وہ بھی قانونی پابندی کی وجہ سے شہروں میں نہیں رہ سکتا۔ ملک بھر میں سفید فام نسل اور ہندی الاصل باشندوں کے لیے تعلیم مفت ہے، لیکن سیاہ فام باشندوں کی تعلیم پر فیس مقرر ہے۔ ایک ہی

معیار کا کام سفید فام کرے تو اس کی تنخواہ زیادہ اور سیاہ فام کرے تو اس کی تنخواہ نصف ہے، نہ جانے کتنے پبلک مقامات ایسے ہیں جہاں سفید فام نسل کے کُتے جا سکتے ہیں، لیکن سیاہ فام افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔ سیاہ فام افراد پر یہ پابندی ہے کہ وہ ہر وقت اپنا پرمٹ اپنے ساتھ رکھیں، پولیس والے کسی بھی وقت کسی کالے آدمی کو پکڑ کر اس کا پرمٹ مانگ سکتے ہیں اور اگر وہ اس کے پاس اس وقت موجود نہ ہو تو مزید تحقیق کے بغیر اس کو حوالات میں بند کر دیتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ساری دُنیا میں قیدیوں کی تعداد یہاں سب سے زیادہ ہے۔

یہ انسانیت سوز اندھیر گردی اس ملک میں ہو رہی ہے جسے "مہذّب" اور "ترقی یافتہ" ملک کہا جاتا ہے، اور یورپ اور امریکہ کے وہ "مہذّب" ممالک جو صبح و شام "عوام کی حکمرانی" اور "آزادی و حقِ خود اختیاری" کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور جنہوں نے ساری دُنیا میں اپنے آپ کو "جمہوریّت" کا علمبردار باور کرایا ہُوا ہے، وہ ظلم و استبداد کے یہ لرزہ خیز مناظر کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں، لیکن اُن کے دل میں "انصاف پسندی" کی کوئی لہر اس معاملے میں نہیں اُٹھتی۔ افریقہ اور ایشیا کے غریب ممالک نے جنوبی افریقہ کی موجودہ حکومت کا بائیکاٹ کیا ہُوا ہے، لیکن یورپ اور امریکہ کے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں اور سونے کی کانوں نے حق و انصاف کی ہر آواز کے لیے اُن کے کان بند کر رکھے ہیں۔

جنوبی افریقہ کا اصل مسئلہ اس مظلوم و مقہور اور دھتکاری ہوئی قوم تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے، ان لوگوں کی اکثریت عیسائی ہے، اور ان کی ہم مذہب حکمران قوم نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس کے باوجود عیسائی مشنریاں ان کی بستیوں میں سرگرمی سے کام کر رہی ہیں، اگر مسلمان مبلّغین اُن کو دینِ حق سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ محبّت و الفت اور عدل و مساوات بھی فراہم کر سکے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے تو یہ قوم جسے دوسری نسلوں کی طرف سے نفرت و حقارت اور ظلم و جَور کے سوا کچھ نہیں ملا، یہ بہت جلد اسلام کی طرف آسکتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اپنی قابلِ رشک اسلام دوستی کے باوجود اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی، اور تکلیف دہ بات یہ ہے

کہ ان کا رویہ اُن لوگوں کے ساتھ عام طور سے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ حکمران قوم کے رویّے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سیاہ فام آبادی ہندی الاصل مسلمانوں کے بارے میں بھی وہی تأثرات رکھتی ہے جو سفید فام قوم کے بارے میں اس کے تأثرات ہیں۔

یہ صورتِ حال ایک اہم دینی فریضے سے غفلت تو ہے ہی، خود جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کے مستقبل کے لیے بھی نہایت خطرناک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سفید فام قوم کی طرف سے ملک کے اصلی باشندوں پر ظلم وستم کی یہ حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی، ایک نہ ایک دن وہاں استعمار کا سُورج اسی طرح غروب ہو کر رہے گا جیسے زمبابوے، موزنبیق اور دوسرے افریقی ملکوں میں ہُوا ہے۔ خود جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت نوشتۂ دیوار پڑھ کر اپنے قوانین میں بتدریج نرمی کرنے پر مجبور ہو رہی ہے: لہٰذا ایک نہ ایک دن یہ مجبور و مقہور اکثریت استعمار کے ایوانوں کو ڈھا کر اس ملک کی زمامِ اقتدار سنبھالے گی۔ اور اگر یہاں کے مسلمانوں نے اُن میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کو عام نہ کیا، اور اُن کے ساتھ وہ رویّہ اختیار نہ کیا جو اسلامی عدل و مساوات کا تقاضا ہے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بپھری ہُوئی اکثریت مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی؟

برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور احقر جنوبی افریقہ کے مسلمان عوام، اداروں اور انجمنوں کی خدمت میں ہر جگہ یہ گزارش کرتے رہے کہ وہ اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ دیں۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ اب یہ احساس مسلمانوں میں پیدا ہو رہا ہے، اور بعض مقامات پر اس سمت میں کوششیں شروع بھی ہو گئی ہیں، لیکن یہ کام اتنا بڑا، اتنا دیر طلب اور اتنا صبر آزما ہے کہ محض چند اشخاص یا اداروں کے بس کا نہیں ہے۔ لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ممالک کی حکومتوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے، اگر مسلمان ممالک، بالخصوص سعودی عرب اور پاکستان اس معاملے میں اپنے فرائض کو محسوس کر کے اس علاقے میں تبلیغ و دعوت پر مستقل طور پر اپنے وسائل صرف کریں تو انشاء اللہ بڑے فوائد کی توقع ہے۔ کاش کہ مسلمان ممالک اس قابل ہو سکیں کہ وہ اپنے مخصوص مسائل سے ہٹ کر

دُوسرے اُن ممالک کے حالات کی طرف بھی توجہ دے سکیں جہاں انسانیت اسلام کے پیامِ عدل و مساوات کے لیے تڑپ رہی ہے۔

ناسپاسی ہوگی، اگر آخر میں جنُوبی افریقہ کے اُن احباب اور بزرگوں کا ذکر نہ کروں جنہوں نے اِس سفر کے دوران اپنے خلوص و محبت اور مہمان نوازی کے اَنمٹ نقوش دل و دماغ پر ثبت کئے۔ یُوں تو وہاں کا ہر مسلمان ہمیں خلوص و محبت کا پیکر نظر آیا، لیکن خاص طور پر جن حضرات کا ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے، اُن میں جناب احمد حسن نہر صاحب اور ان کے صاحبزادے عبدالحق صاحب تو ہمارے براہِ راست میزبان تھے، جن کا مکان ہمارے قیام کے دوران چہل پہل کا مرکز رہا، اور انہوں نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ نیز برادرِ محترم محمد اسماعیل کھرا صاحب کا یہ خلوص ہر شکریے سے بالاتر ہے کہ انہوں نے ایرپورٹ پر پہلی ملاقات سے لے کر رخصت کے آخری وقت تک مسلسل اپنی پُر لطف رفاقت سے ہمیں محظوظ کیا اور راحت رسانی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، اور اس غرض کے لیے ایک ماہ تک ملازمت اور اپنی گھریلو مصروفیات سب سے دست بردار رہے۔ وراچھیہ فیملی بالخصوص سلیمان وراچھیہ، امین وراچھیہ اور ابوبکر وراچھیہ صاحبان تو ہمیشہ سے ہمارے لیے حقیقی بھائیوں کی طرح ہیں اور اس موقع پر انہوں نے اس اخوت کا حق ادا فرمایا۔ ان کے علاوہ کروگرس ڈورپ اور آزادول میں محمد ہاشم لونات صاحب، ابراہیم دستو صاحب، احمد پٹیل صاحب، احمد بزات صاحب، یوسف ایمجی صاحب، یُوسف نانا بھائی صاحب، مڈل برگ کے حافظ محمد سعید صاحب، رشید بھامجی اور رشید جوتھیا صاحبان، اور ڈربن کے مولانا احمد عمر صاحب بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، جن کی محبت اور خلوص کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دُنیا و آخرت میں ظاہری و باطنی ترقیات عطا فرمائیں اور عافیتِ دارین کی دولت سے نوازیں۔ آمین ثُم آمین

جنوبی افریقہ سے واپسی پر ایک رات نیروبی میں گزاری، اور وہاں سے براہِ خرطوم

عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ حاضری کی توفیق ملی، چار دن مکہ مکرمہ اور پانچ دن مدینہ طیبہ میں قیام کی سعادت نصیب ہوئی، اور ایک بار پھر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ؎

اگر جنت بریں رُوئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

دوسرا سفر

رمضان المبارک کے آغاز کی بات ہے کہ جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ سے مجھے اپنے دوست ابوبکر دراچھیا کا ایک تار موصول ہوا۔ اس تار میں کہا گیا تھا کہ کیپ ٹاؤن کی سپریم کورٹ میں قادیانیوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک درخواست دائر کر کے عبوری حکمِ امتناعی حاصل کر لیا ہے، اس مقدمے میں مسلمانوں کی طرف سے جوابی کارروائی میں مدد دینے کے لیے آپ کی فوری حاضری ضروری ہے، تار میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ حکمِ امتناعی کی توثیق کے لیے ۶ ر اگست کی تاریخ مقرر ہوئی ہے، چونکہ پاکستان سے فون یا ٹیلیکس کے ذریعہ جنوبی افریقہ سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہیں، اس لیے میں نے تار ہی کے ذریعہ جواب دیا، اور مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر آنے کا وعدہ کر لیا، کچھ عرصے کے بعد ایک اور ٹیلی گرام سے معلوم ہوا کہ اب حکمِ امتناعی کی توثیق کی تاریخ بڑھ گئی ہے، نیز یہ کہ کیپ ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے احباب نے فون پر بار بار مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس دوسرے تار کے جواب میں احقر نے اپنے پاسپورٹ وغیرہ کی تفصیلات جنوبی افریقہ روانہ کر دیں، تاکہ وہاں ویزا کے لیے کوشش کی جا سکے۔

حکمِ امتناعی کی توثیق کے لیے نئی تاریخ ۹ ر ستمبر مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران معلوم ہوا کہ کیپ ٹاؤن کے بعض مسلمانوں نے حکومتِ پاکستان، رابطہ عالمِ اسلامی اور بعض دوسرے حضرات سے بھی اس مقدمے میں مدد کی درخواست کی ہے۔ مسئلے کی اہمیت ہر مسلمان کو مسلّم تھی، اس لیے جس جس شخص سے اس بارے میں مدد کی فرمائش کی گئی وہ فوراً

جانے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جنوبی افریقہ سے سفارتی تعلقات نہ ہونے کے سبب ویزا دہیں سے آسکتا تھا، اور ۴ ستمبر تک کسی ایک شخص کا بھی ویزا موصول نہیں ہوا تھا، تاریخ کے قریب آنے کی وجہ سے اب پاکستان میں مزید انتظار ممکن نہ تھا، اس لیے رائے یہ ہوئی کہ یہاں سے روانہ ہو کر نیروبی پہنچ جائیں، اور وہاں سے فون پر رابطہ قائم کر کے ویزا حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ۸۔ افراد کا ایک قافلہ سفر کے لیے تیار ہو گیا، ان میں سے احقر نجی دعوت کی بنیاد پر جا رہا تھا، اُدھر مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے مولانا عبدالرحیم اشعر، مولانا مفتی زین العابدین، حاجی غیاث محمد صاحب سابق اٹارنی جنرل پاکستان، اور ریاض الحسن گیلانی ایڈووکیٹ بھی جانے کے لیے تیار تھے۔ تیسرے رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے مولانا ظفر احمد انصاری اور ریٹائرڈ جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب کو نامزد کیا گیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب انصاری نے سفر میں اپنی مدد کے لیے جناب عبدالمجید صاحب کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

اس طرح ۵ ستمبر کی شام کو سات بجے نو افراد کا یہ قافلہ پی آئی اے کے طیارے سے نیروبی روانہ ہوا۔ اور راستے میں دُبئی رکتا ہوا مقامی وقت کے مطابق رات کے ایک بجے یہ دُبئی پہنچا، یہاں کینیا میں پاکستانی سفیر بریگیڈیئر اشرف صاحب اپنے عملے کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے، رات کو ہوٹل ہلٹن میں قیام ہوا، اور اگلا سارا دن جنوبی افریقہ سے فون پر رابطہ قائم کر کے ویزا کے حصول کی کوشش میں صرف ہوا، بالآخر شام چار بجے جوہانسبرگ سے ابوبکر دراچھیا صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ ویزا کا انتظام ہو گیا ہے، اور انشاء اللہ تمام حضرات کو جوہانسبرگ کے ایئرپورٹ پر ویزا مل جائیگا۔

چنانچہ منگل ۷ ستمبر کی صبح کو نو بجے کے ایل ایم کے طیارے کے ذریعہ ہم نیروبی سے روانہ ہوئے، اور تقریباً چار گھنٹے کی پرواز کے بعد مقامی وقت کے مطابق ساڑھے بارہ بجے دوپہر جوہانسبرگ کے جان اسمٹس ایئرپورٹ پر اُترے۔ یہاں احباب کا ایک بڑا مجمع استقبال کے لیے موجود تھا۔ طے یہ ہوا کہ آج کا دن جوہانسبرگ ہی میں ٹھہر کر مقدمے کی تفصیلات معلوم کی جائیں، واٹرفال کے مدرسے کے مہتمم مولانا ابراہیم میاں صاحب

نے سب حضرات کے قیام کا انتظام اپنے مدرسہ میں کیا، انتہائی مستعدی کے ساتھ مقدمے کے کاغذات کی کاپیاں ہم سب کو فراہم کیں، اور عصر کے بعد کچھ مقامی وکلاء کو جمع کر لیا تاکہ وہ اس ملک کے عدالتی طریق کار کے بارے میں ہمیں ضروری معلومات فراہم کر سکیں۔

جنوبی افریقہ کا عدالتی طریق کار ہمارے ملک کے طریق کار سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں مدعی مدعا علیہ پر اصل مقدمہ دائر کرنے سے پہلے ہی اپنی شکایت کو مختصراً بصورتِ درخواست عدالت کے سامنے پیش کر کے عبوری حکم حاصل کر سکتا ہے، اس غرض کے لیے اُسے ایک بیانِ حلفی داخل کرنا پڑتا ہے جس میں وہ مختصراً اپنی شکایت بیان کر کے اپنے اس ارادے کا اظہار کرتا ہے کہ میں اس شکایت کی بنیاد پر مدعا علیہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والا ہوں، لیکن چونکہ مقدمے کی کارروائی میں دیر لگنے کا امکان ہے۔ اس لیے مجھے اس مدت کے لیے عبوری حکم مطلوب ہے۔ اگر عدالت سمجھے کہ بادی النظر میں مقدمے کی کوئی بنیاد ہے تو وہ فریق ثانی کا موقف سنے بغیر یکطرفہ طور پر بھی عبوری حکمِ امتناعی جاری کر سکتی ہے، لیکن اس کے بعد فریقِ ثانی سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا موقف ظاہر کرنے کے لیے بیانِ حلفی داخل کرے، پھر ایک معین تاریخ پر دونوں فریقوں کے دلائل سن کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اُس یک طرفہ حکمِ امتناعی کو ختم کیا جائے یا اس کی توثیق کی جائے۔ حکمِ امتناعی کی توثیق یا عدمِ توثیق کا فیصلہ ہونے کے بعد مدعی کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایک معین مدت تک اپنا اصل کیس دائر کرے جسے یہاں کی اصطلاح (Main Action) کہتے ہیں۔ اس ایکشن کی صورت میں فریقین کے گواہان کی پیشی اور مقدمے کی تفصیلی کارروائی کے بعد مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے جس میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔

کیپ ٹاؤن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چھبیس ہزار ہے، اور مرزائیوں کی تعداد دو سو سے بھی کم ہے۔ یہاں انہوں نے "احمدیہ انجمن لاہور" کی ایک شاخ "احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام" کے نام سے قائم کی ہے، اواخر شعبان میں اس انجمن نے کیپ ٹاؤن کے پانچ دینی رہنماؤں کے خلاف کیپ ٹاؤن کی سپریم کورٹ میں یہ درخواست دائر کی

کہ وہ ہمارے ارکان کو غیر مسلم قرار دیتے ہیں، چنانچہ نہ وہ ہم کو مسجدوں میں عبادت کرنے دیتے ہیں، نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ اور ہم چونکہ اس سلسلے میں مدعا علیہم کے خلاف مفصّل مقدمہ دائر کرنے والے ہیں جس کا فیصلہ ہونے میں کافی دیر لگ سکتی ہے، اس لیے مدعا علیہم کے خلاف اصل مقدمے کے فیصلے تک عبوری حکمِ امتناعی جاری کیا جائے، اُس وقت کے جج نے اپنے قواعد کے مطابق ان کو یکطرفہ طور پر حکمِ امتناعی دے دیا، شروع میں اس حکمِ امتناعی کی توثیق کے لیے ۲۹ اگست کی تاریخ مقرر ہوئی، بعد میں اسے بڑھا کر ۹ ستمبر کر دیا گیا۔

اس دوران پانچوں مدعا علیہم کی طرف سے مفصّل حلفی بیانات تیار کیے گئے، اور ماہرین کے طور پر دار الکفل کے حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم سنجالوی اور ڈربن کے ڈاکٹر حبیب الحق ندوی نے بھی حلفی بیانات داخل کیے۔

ان حلفی بیانات میں مرزائیت کی تاریخ، مرزا غلام احمد قادیانی کی حقیقت، اس کے درجہ بدرجہ دعووں اور عقیدۂ ختمِ نبوّت کی تشریح کی گئی تھی، نیز یہ واضح کیا گیا تھا کہ مرزائیوں نے خواہ وہ قادیانی گروپ سے تعلق رکھتے ہوں، یا لاہوری گروپ سے، کس طرح عقیدۂ ختمِ نبوّت کی کھُلّم کھُلا مخالفت کر کے اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ سے الگ کر لیا ہے، اور دُنیائے اسلام نے کس طرح یک زبان ہو کر انہیں کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

جنوبی افریقہ میں رہتے ہوئے مرزائیت کے بارے میں جو بنیادی معلومات جمع کی جا سکتی تھیں۔ ان بیاناتِ حلفی میں وہ بڑی حد تک بیان کر دی گئی تھیں ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت کے موقع پر مسلمانوں کی طرف سے جو بیان حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر احقر اور مولانا سمیع الحق صاحب نے مرتب کیا تھا، اور جو "ملّتِ اسلامیہ کا موقف" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ احقر کے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب نے کیا ہے، اور وہ مکتبہ دار العلوم سے (Qadianism on Trial)

ـــــ ـ ـ ـ ـ کے نام سے شائع ہوا ہے، دو سال پہلے دورۂ افریقہ کے دوران یہ کتاب میں اپنے بعض احباب کو دے کر آیا تھا، ان بیاناتِ حلفی کی ترتیب میں اس کتاب سے بھی کافی مدد ملی۔

البتہ مقدمے کی تفصیلات اور یہاں کے عدالتی طریقِ کار کے پیشِ نظر یہ بات واضح تھی کہ فی الوقت سب سے اہم مسئلہ اُس حکمِ امتناعی کا انخلاء ہے جو تین ماہ پیشتر عدالت نے جاری کیا تھا، اور جس کی رُو سے مسلمانوں پر یہ پابندی عائد ہو گئی تھی کہ وہ مقدمے کے دوران مرزائیوں کو مسجدوں میں نماز پڑھنے اور مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اس حکمِ امتناعی کے خلاف جو قانونی نکات اُٹھانے ضروری تھے اُن کا ان بیاناتِ حلفی میں ذکر نہیں تھا۔

چنانچہ باہمی مشورے سے جو نکات ذہن میں آئے، وفد کے معزز رکن جناب حاجی غیاث محمد صاحب سابق اٹارنی جنرل پاکستان نے اُن کو قلمبند کر کے ٹائپ کرا لیا۔

صبح آٹھ بجے ہم لوگ جوہانسبرگ سے بذریعہ طیارہ کیپ ٹاؤن کے لیے روانہ ہوئے، اور تقریباً دس بجے کیپ ٹاؤن پہنچ گئے۔ ایئرپورٹ پر کیپ ٹاؤن کے علماء و مشائخ، مسلمان جماعتوں کے ذمہ دار حضرات اور عام مسلمانوں کی بڑی تعداد استقبال کے لیے موجود تھی۔

یہاں پہنچ کر مسلمانوں کے وکیل مسٹر اسماعیل محمد ایڈووکیٹ سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ جوہانسبرگ سے یہاں تک ہر شخص ان کی قانونی قابلیت، وکالت میں مہارت اور ذہانت و ذکاوت کے بارے میں رطب اللسان تھا۔ ملاقات کے دوران ہم نے واقعۃً انہیں ایسا ہی پایا۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس مقدمے سے ان کی دلچسپی صرف پیشہ ورانہ فرائض کی حد تک محدود نہیں، بلکہ وہ ذاتی جذبے اور اپنے ضمیر کی آواز کے تحت اس مقدمے کی پیروی کر رہے ہیں۔

وفد کی طرف سے جو نکات مرتب کیے گئے تھے جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب اور حاجی غیاث محمد صاحب نے اسماعیل محمد صاحب سے اُن کی وضاحت کی، ان تمام نکات کو اُنہوں نے دلچسپی اور جذبۂ تشکر کے ساتھ سُنا، اور اپنی بحث میں اُن سے نہ

صرف پورا فائدہ اُٹھایا، بلکہ اپنے زورِ بیان اور مؤثر اندازِ تخاطب سے اُنہیں چار چاند لگا دیئے۔

۹ ستمبر کی صبح ساڑھے نو بجے کے قریب مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تھی، لیکن نو بجے سے ہی کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھر چکا تھا، یہاں تک کہ سامعین کی کثرت کی بنا پر کمرۂ عدالت تبدیل کرنا پڑا۔ اور ایک بڑے کمرے میں مقدمہ منتقل کیا گیا، جہاں جگہ بھی کشادہ تھی، اور اُوپر سامعین کے لیے ایک وسیع گیلری بھی موجود تھی، لیکن مقدمہ کا آغاز ہوتے ہوتے یہ کمرۂ عدالت اور گیلری بھی دونوں پوری طرح بھر گئے، اور کہیں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ رہی، اس مقدمے سے مسلمانوں کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ دو دن تک صبح دس بجے سے شام ساڑھے چار بجے تک کارروائی جاری رہی، اور بیسیوں افراد بیٹھنے کی جگہ نہ ہونے کے باعث پورے عرصے کھڑے رہ کر کارروائی سنتے رہے، حد یہ ہے کہ گیلری میں مسلمان خواتین بچّوں کو گود میں لیے انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ بیٹھی رہیں۔

جج ایک عیسائی عورت تھی، مرزائیوں کی طرف سے دو یہودی وکیل پیروی کر رہے تھے۔ اور ایک نوجوان مرزائی وکیل ان کی مدد کر رہا تھا، مسلمانوں کی طرف سے اصل وکیل اسمٰعیل محمد ایڈووکیٹ تھے۔ پہلے دن مرزائیوں کے یہودی وکیل مسٹر ینگ کو حکمِ امتناعی کی توثیق کے لیے دلائل پیش کرنے تھے، لیکن اپنے دلائل پیش کرنے سے پہلے اُس نے کھڑے ہو کر یہ درخواست پیش کی کہ اس مقدمہ میں درخواست "انجمن اشاعتِ اسلام لاہور" کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اب ایک شخص مسٹر پیک کو اس درخواست کے شریک کی حیثیت میں مقدمے کا فریق بنایا جائے۔

اس درخواست کا منشاء دراصل اپنے مقدمے کی ایک قانونی کمزوری کو دُور کرنا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اصل درخواست چونکہ ایک انجمن کی طرف سے پیش ہوئی تھی جو صرف ایک شخصِ قانونی (Legal Person) کی حیثیت رکھتی تھی، اور انسان نہیں تھی، اس لیے وہ نہ بحیثیت انجمن ہتکِ عزّت کی دعویدار بن سکتی تھی، اور نہ قبرستان

میں دفن ہونے اور مسجد میں داخلے کا مطالبہ کر سکتی تھی، چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے اس درخواست کے خلاف ایک قانونی نکتہ یہ بھی پیش ہونے والا تھا۔

اس ممکنہ قانونی اعتراض کو دُور کرنے کے لیے مرزائیوں کی طرف سے یہ درخواست پیش کی گئی تھی، تاکہ مسٹر پیٹ ایک حقیقی شخص کی حیثیت میں مذکورہ درخواست کا حق دار قرار پا سکے، اور اگر انجمن کی درخواست مسترد ہو تو کم از کم مسٹر پیٹ کی درخواست باقی رہ جائے۔

جج نے اس موقع پر مسلمانوں کے وکیل سے پوچھا کہ اس درخواست کے بارے میں آپ کا مؤقف کیا ہے؟ مسلمانوں کے وکیل نے کہا کہ مقدمے کے اس مرحلے پر درخواست ہمارے نزدیک سخت قابلِ اعتراض ہے، اس لیے کہ اب تک کی ساری کارروائی انجمن کی درخواست کی بنیاد پر ہوئی ہے، اور اسی کی جواب دہی کے لیے تیاری کی گئی ہے۔ لہٰذا اس نئے شخص کو اس مرحلے پر فریق بنانا ہمارے لیے انصاف کے خلاف ہوگا۔ جج نے اس مرحلے پر درخواست کو مُسترد کر کے مرزائیوں کے وکیل مسٹر ینگ کو دلائل پیش کرنے کے لیے کہا۔

جمعرات ۹ ستمبر کو سارا دن مرزائیوں کے وکیل مسٹر ینگ ہی کی بحث میں گذر گیا، وہ بار بار ایک ہی بات دُہراتا کہ مرزائی چونکہ مسلمان ہیں، اور توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کو کافر قرار دے، یا ان کو مسجدوں میں داخل ہونے یا قبرستان میں دفن ہونے سے روک سکے، جج نے اُسے بار بار ٹوکا کہ اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے، اور نہ یہ میرے فرائضِ منصبی میں داخل ہے کہ مرزائی مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ جب خود آپ کے اعتراف کے مطابق سالہا سال سے مسلمان آپ کو غیر مسلم سمجھتے آ رہے ہیں، اور خود آپ کے اعتراف کے مطابق سالہا سال سے آپ کا کوئی فرد مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہُوا تو آج وہ کونسی ہنگامی ضرورت پیش آ گئی ہے جس کی بنا پر اچانک آپ نے حکم امتناعی حاصل کرنے کی درخواست دے دی ہے۔

مسٹر ینگ اپنی طویل تقریر کے باوجود اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ البتہ ایک مرحلے پر اس نے کہا کہ "حکم امتناعی کے لیے ہماری ہنگامی ضرورت یہ ہے کہ اگر کیپ ٹاؤن کے علماء اور مشائخ کو ہمیں کافر کہنے سے نہ روکا گیا تو گھر برباد ہو جائیں گے اور احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان تمام نکاح کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔"

اس پر جج نے کہا: "لیکن ریکارڈ پر ایسا کوئی واقعہ موجود نہیں ہے جس سے کسی احمدی کا غیر احمدی سے نکاح کرنا ثابت ہو۔"

ینگ نے جواب میں کہا کہ: "جناب اس بات کے ریکارڈ پر ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کو اس بات کا جوڈیشل نوٹس لینا چاہیئے کہ مسلمان مسلمان سے نکاح کرتا ہے اور احمدی چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے ان کے آپس میں ضرور نکاح ہوئے ہوں گے۔" اس پر جج نے برجستہ کہا: "آپ چاہتے ہیں کہ اس طرح میں آپ کے مسلمان ہونے کا پہلے ہی فیصلہ کر دوں؟ اور پھر مسلمانوں کے ساتھ آپ کے نکاح کا جوڈیشل نوٹس لوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا جوڈیشل نوٹس تو یہ ہے کہ مسلمان مسلمان سے نکاح کرتا ہے اور احمدی، احمدی سے نکاح کرتا ہے۔"

غرض اس طرح کی دلچسپ نوک جھونک دن بھر جاری رہی، اور شام کو پونے چار بجے کے قریب جب عدالت کا وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے، جج نے مسلمانوں کے وکیل اسماعیل محمد صاحب کو دلائل پیش کرنے کی دعوت دی۔ وقت چونکہ مختصر تھا، اس لیے انہوں نے تفصیلی دلائل شروع کرنے سے پہلے باقی ماندہ پندرہ منٹ میں اپنے نکات کا نمبر وار خلاصہ بڑے مؤثر انداز میں بیان کر دیا، اور ساتھ ہی اپنے دلائل ایک مفصل تحریر کی شکل میں جج کے حوالے کر دیئے، اور کہا کہ ان نکات پر مفصل بحث میں کل کروں گا۔ اس پر اس دن عدالت کا اجلاس برخاست ہو گیا۔

اگلے دن اسماعیل محمد صاحب کو اپنے دلائل کا آغاز کرنا تھا، لیکن اس سے پہلے مسٹر ینگ نے کھڑے ہو کر دوبارہ اپنی وہی درخواست نظر ثانی کے لیے پیش کی کہ اس مقدمے میں مسٹر پیک کو فریق بنایا جائے۔ اور یہ درخواست "انجمن اشاعت اسلام" کے علاوہ مسٹر پیک

کی طرف سے بھی سمجھی جائے۔

جج نے اس درخواست پر غور کو ملتوی کر کے اسماعیل محمد صاحب سے کہا کہ وہ اپنے دلائل شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر شروع کی، اور تمام متعلقہ نکات کو بڑی خوبصورتی حسنِ ترتیب اور زورِ بیان کے ساتھ اپنی تقریر میں سمو دیا۔

یہاں اسماعیل محمد صاحب کی پوری تقریر اور اس کے تمام دلائل و نکات کو نقل کرنا ممکن نہیں، البتہ اس کے تین اہم نکات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ان کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ متعدد قانونی نظائر کی روشنی میں درخواست گذار کو حکمِ امتناعی کا استحقاق صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب بادی النظر میں طور پر مقدمہ اس کے حق میں ہو، اور اس کا کیس سنگین شکوک و اعتراضات سے خالی ہو، اس کے برعکس یہاں درخواست گذار کا کیس بادی النظر طور پر ہی غلط اور سنگین اعتراضات سے لبریز ہے۔ بیاناتِ حلفی سے ظاہر ہے کہ دُنیا بھر کے مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کو دائرۂ اسلام سے خارج اور کافر قرار دیتے ہیں، اسی بنیاد پر پاکستان میں جہاں مرزائیت کا ہیڈ کوارٹر قائم ہے، قومی اسمبلی اور سینیٹ نے ان لوگوں کو صفائی کا پورا موقع دینے اور ضروری تحقیق کے بعد متفقہ طور پر انہیں غیرِ مسلم قرار دیا۔ اور اس کے مطابق دستورِ پاکستان میں ترمیم کی۔ اسی بنیاد پر دُنیا بھر کے مسلمانوں کی مانند تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی نے پورے عالمِ اسلام کی ۱۴۰ سے زائد سربرآوردہ تنظیموں کے ایک مشترک اجلاس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے متبعین کو بیک آواز غیرِ مسلم قرار دیا۔ اور جنوبی افریقہ کے تمام مسلمان انہیں ہمیشہ غیرِ مسلم قرار دیتے اور ان کے ساتھ غیر مسلموں کا معاملہ کرتے آئے ہیں، جس کا اعتراف خود درخواست گذار کے بیانِ حلفی میں موجود ہے۔

مسلمانوں کے بیاناتِ حلفی میں مرزا صاحب کی کتابوں کے مفصل اقتباسات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا، بلکہ اپنے آپ کو حضرت مسیح علیہ السلام سے تمام شان میں بڑھ کر بتایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کی، اور اپنے آپ کو (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بروزِ ثانی اور آپ کا

ہمسر و مظہر اتم بتایا۔ اور پھر انہی بیاناتِ حلفی میں قرآن و حدیث اور ماہرینِ اسلامی علوم کے واضح حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی مفہوم میں کسی بھی قسم کی نبوت کا دعویدار کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس مرزائیوں کے بیانِ حلفی میں نہ ان کے مسلمان ہونے کی کوئی دلیل بیان کی گئی ہے، نہ اسلامیات کے کسی ماہر کا کوئی بیان ان کی حمایت میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے بادی النظر میں طور پر مقدمہ ہرگز ان کے حق میں نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ درخواست گذار نے اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ وہ "احمدیہ انجمن لاہور" کی ایک شاخ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ "احمدیہ انجمن لاہور" کے ارکان کو پاکستان کے دستور نے غیر مسلم قرار دے دیا ہے، لہٰذا اس کے ارکان مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کا حق نہیں رکھتے، اور لاہور کی انجمن نے اپنی اس پوزیشن کو کبھی وہاں کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا، اب اسی انجمن کی ایک ذیلی شاخ اپنی اصل انجمن کے بالکل برخلاف پوزیشن کا کیونکر دعویٰ کر سکتی ہے؟ اس لحاظ سے بھی بادی النظر میں طور پر مقدمہ اس کے حق میں نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہے۔

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ حکمِ امتناعی کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ توازنِ سہولت (Balance of Convenience) کس فریق کے حق میں ہے؟ یعنی حکمِ امتناعی جاری کرنے سے مدعا علیہ کے جیتنے کی صورت میں اس کا زیادہ نقصان ہو گا؟ یا جاری نہ کرنے سے مدعی کے جیتنے کی صورت میں مدعی کا؟

یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ کیپ ٹاؤن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چھبیس ہزار ہے، جبکہ مرزائیوں کی تعداد ڈیڑھ سو دو سو سے زائد نہیں۔ اب اگر ان چھبیس ہزار مسلمانوں کو حکمِ امتناعی کے ذریعے اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ مرزائیوں کو غیر مسلم سمجھنے کے باوجود اپنی مسجدوں میں عبادت اور اپنے قبرستانوں میں تدفین کی اجازت دیں تو جب تک اصل مقدمے کا تصفیہ نہ ہو انہیں اپنے عقیدے، اپنے ضمیر اور اپنے دین کے احکام کے بالکل برخلاف ایسے کام پر مجبور رہنا پڑے گا جس سے وہ شدید نفرت

کرتے ہیں، اور اس سے ان کے مذہبی جذبات کو جو زبردست ٹھیس لگے گی، مقدمہ جیت جانے کے بعد اس کی تلافی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر حکمِ امتناعی جاری نہ کیا جائے تو اس سے مرزائیوں کا کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہیں ہوگا۔ مرزائیوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ چودہ سال سے اُن کا کوئی مُردہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہُوا۔ اب اگر مقدمے کے فیصلے تک دو تین سال مزید یہی صورتِ حال برقرار رہے تو اس سے کوئی ناقابلِ تلافی نقصان لازم نہیں لاتا۔ اس لیئے توازنِ سہولت' کا اصول بھی واضح طور پر مسلمانوں کے حق میں اور مرزائیوں کے خلاف ہے۔

تیسرا نکتہ وہی تھا کہ زیرِ بحث مقدمے میں درخواست کسی انسان نے نہیں بلکہ ایک انجمن نے پیش کی ہے، یہ انجمن نہ مسجد میں داخل ہو سکتی ہے، نہ قبرستان میں تدفین کی اہل ہے، اس لیے انجمن کی یہ درخواست محلِ نظر ہی سے ناقابلِ سماعت ہے۔ اس موقع پر اسماعیل محمد نے ازراہِ تفنن یہ بھی کہا کہ "اگر یہ انجمن زمین میں دفن ہو سکتی تو ہم بہت خوش ہوتے۔ لیکن کیا کریں کہ قبرستان میں دفن ہونے کے لیے انسان ہونا ضروری ہے"۔ اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ مرزائیوں کے وکیل مسٹر بینگ اپنے مقدمے کی کمزوری سے پوری طرح واقف ہیں، اور کل اور آج انہوں نے مسٹر پیک کو فریق بنانے کی جو درخواست دی ہے، وہ ان کی طرف سے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انجمن کی طرف سے یہ درخواست قانونی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے اپنے مقدمے کو بالکل آخر وقت میں تباہی سے بچانے کے لیے وہ مسٹر پیک کو فریق بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر اس آخری مرحلے پر ان کی اس درخواست کو منظور کیا گیا تو یہ ہمارے ساتھ شدید ناانصافی ہوگی۔ ہمارے تمام بیانات انجمن کے دعوے کے جواب میں مرتب کیے گئے ہیں، اگر ابتداء میں دعویٰ مسٹر پیک کی طرف سے ہوتا تو ہمارے جوابی بیاناتِ حلفی میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا، اس لیے گیارہ بج کر انسٹھ منٹ پر فریق بنانے کی یہ درخواست کسی بھی لحاظ سے منظور ہونے کے لائق نہیں۔

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے، اور جمعہ کا وقت ہُوا چاہتا تھا، جج نے اس موقع پر

فریق بنانے کی درخواست کو مسترد کر کے عدالت نو دن تک کے لیے برخاست کر دیا۔

جمعہ کے بعد دو بجے اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو مرزائیوں کے دوسرے وکیل نے اسماعیل محمد کے جواب میں بحث شروع کی، اور تقریباً وہی باتیں دُہرائیں جو مسٹر ٹیک کہہ چکے تھے، یہاں تک کہ شام چار بجے جب عدالت کا وقت ختم ہونے لگا تو جج نے فیصلے کے دلائل کو مؤخر کر کے اپنا مختصر حکم سُنا دیا کہ عدالت کی طرف سے جو حکمِ امتناعی جاری کیا گیا تھا وہ واپس لیا جاتا ہے۔ اور مقدمہ کا خرچ بھی درخواست گذار (یعنی مرزائی انجمن) کو دینا ہوگا، البتہ اخراجات کا تعین بعد میں کیا جائے گا۔

اس فیصلے کے اعلان کے بعد کمرۂ عدالت کا منظر قابلِ دید تھا، تمام مسلمان آپس میں گلے مل مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے، اسماعیل محمد کی درخواست پر کیپ ٹاؤن کے شیخ نظیم نے دُعا کرائی، اور اس طرح یہ مرحلہ بحمد اللہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس فیصلے کے بعد اکیس دن تک مرزائی صاحبان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا اصل مقدمہ دائر کریں۔ اس مدت کے دوران اگر انہوں نے مقدمہ دائر نہ کیا تو بات بالکلیہ ختم ہو گئی۔ لیکن اگر انہوں نے اس مدت میں اصل مقدمہ دائر کر دیا تو بظاہر یہ کیس طُول کھینچے گا، اس میں ماہرین کی گواہیوں کی بھی ضرورت پڑے گی اور اس کے فیصلے میں دو تین سال بھی لگ سکتے ہیں۔ لیکن حکمِ امتناعی کے مسترد ہو جانے کے بعد مقدمے کا طول کھینچنا مسلمانوں کے لیے انشاء اللہ مُضر نہیں ہوگا۔

مقدمے سے فراغت کے چوبیس گھنٹے مزید کیپ ٹاؤن میں قیام رہا۔ یہ وقت یہاں کے خاص خاص مقامات دیکھنے اور یہاں کے علماء و مشائخ اور دینی تنظیموں سے ملاقات میں گذرا۔

کیپ ٹاؤن جنوب میں افریقہ کے برِّ اعظم کا آخری سرا ہے، یہ جنوبی افریقہ کا سب سے پُرانا شہر اور اس کے سب سے بڑے صوبے راس امید (Cape of Good Hope)

کا دارالحکومت ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے پندرھویں صدی کے آخر میں مشہور پرتگیزی ملاح واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تھا۔ ہندوستان میں اپنی تجارت اور اس کے پردے میں اپنی سیاست۔ کو فروغ دینے کے لیے مغربی ممالک مدت سے کسی ایسے راستے کی تلاش میں تھے جو مسلمانوں کی ترک وتاز سے مامون ہو، اس غرض کے لیے انہوں نے مختلف بحری مہمات روانہ کیں، یہاں تک کہ جب ۱۴۸۷ء میں برتمانی ڈائز افریقہ کے جنوبی سرے تک پہنچ کر واپس آیا تو پرتگال کے بادشاہ جان دوم نے افریقہ کے اس جنوبی سرے کی دریافت کو آئندہ مہمات کے لیے امید افزا سمجھ کر اس کو "راس امید" (Cape of Good Hope) کا نام دیا، اور دس سال بعد اسی "راس امید" کے راستے واسکوڈی گاما، ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اسی وجہ سے یہ صوبہ اب تک "راس امید" کے نام سے موسوم چلا آتا ہے۔

چونکہ بعد میں "راس امید" مغربی ممالک کے تجارتی سفروں کے لیے اہم ترین منزل بن چکا تھا، اس لیے وہ اس علاقے پر مدت سے دانت لگاتے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ہالینڈ کی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۵۲ء میں اس پر قبضہ جما لیا۔ انہوں نے مقامی سیاہ فام آبادی پر غلبہ پانے کے لیے یہاں سفید فام آبادی کو بڑھانے کی تدبیریں شروع کیں، ہالینڈ کے باشندے یہاں آباد ہونے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (مقالہ: کیپ پراونس) میں لکھا ہے کہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا شوق استعمار پورا کرنے کے لیے ہالینڈ کے یتیم خانوں سے یتیم لڑکیاں اکٹھی کر کے یہاں بھیجیں، دوسری طرف جلاوطنی کے سزایاب لوگ زبردستی یہاں دھکیلے گئے، اس طرح رفتہ رفتہ یہاں سفید فام افراد کی تعداد بڑھی، اور ان کی نسل پھیل کر علاقے کی ایک قابل لحاظ آبادی بن گئی۔

ڈچ استعمار کے اسی دور (سترھویں صدی) میں جنوبی افریقہ کی سرزمین میں پہلی بار، کیپ ٹاؤن ہی راستے اسلام کی روشنی داخل ہوئی۔ یہاں اسلام اور مسلمانوں کے داخلے کی داستان بھی بڑی پُراثر ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اسلاف نے ہر خطے میں اسلام کی اشاعت اور تحفظ وبقا کے لیے کیسی عظیم قربانیاں دی ہیں۔

سترھویں صدی میں ہالینڈ کی ڈچ قوم نے ایک طرف تو جنوبی افریقہ پر اپنا تسلط جما لیا تھا، اور دوسری طرف ملایا اور اس کے قرب و جوار کے جزیروں کو بھی اپنے استعمار کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ ملایا اور اس کے قریبی جزیروں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اور وہاں بار بار مسلمانوں کی طرف سے جہادِ آزادی کی تحریکیں اُٹھتی رہتی تھیں۔ ان تحریکوں کو ڈچ قوم نے ہمیشہ اپنی عادت کے مطابق جبر و تشدّد کے ذریعے دبایا۔ اور وہاں کے بہت سے مسلمان مجاہدین کو گرفتار کر کے غلام بنا لیا۔ غلام بنانے کے باوجود چونکہ یہ خطرہ تھا کہ یہ لوگ کسی بھی وقت آمادۂ بغاوت نہ ہو جائیں، اس لیے ڈچ حکومت نے ان کو جلاوطن کر کے کیپ ٹاؤن بھیج دیا تھا، تاکہ اپنے وطن سے ہزارہا میل دُور رہ کر یہ بالکل بے دست و پا ہو جائیں۔

چنانچہ ملایا اور اس کے قرب و جوار کے تقریباً تین سو مسلمان مجاہدین غلام بنا کر پابہ زنجیر کیپ ٹاؤن لائے گئے۔ اور یہاں بھی چونکہ اُن کی قوتِ ایمانی سے ہر وقت ڈچ قوم کو خطرہ رہتا تھا اس لیے اُن کو اپنے دین سے منحرف کرنے اور ان کی نسلوں کو ایمان کے نُور سے محروم کرنے کی پوری کوشش کی گئی، چنانچہ اُن ستم رسیدہ مسلمانوں کو نماز پڑھنا تو کُجا، کلمہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ان سے دن بھر سخت مشقت لی جاتی اور اگر کوئی شخص نماز پڑھنے یا ذکرِ الٰہی کرنے کی کوشش کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

لیکن آفرین ہے ان خدامست مجاہدین پر، کہ غریب الوطنی اور جبر و تشدّد کے ان اقدامات کے باوجود انہوں نے اپنے دین کو سینے سے لگائے رکھا، دن بھر محنت و مشقت کی چکّی میں پسنے کے بعد یہ اولوالعزم مجاہدین جب رات کو اپنی قیام گاہوں پر پہنچتے تو تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنے نگرانوں کے سونے کا انتظار کرتے رہتے۔ اور جب وہ سو جاتے تو رات کی تاریکی میں چھُپ چھُپ کر ایک پہاڑی پر چڑھتے اور وہاں دن بھر کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔ کیپ ٹاؤن کے ایک عالم شیخ عبدالمجید مجھے اپنی کار میں اس پہاڑی پر لے گئے، اور وہ جگہ دکھائی جہاں اللہ کے یہ اولوالعزم بندے رات کی تاریکیوں میں سربسجود ہوتے تھے۔ یہ جگہ قدیم شہر سے

خاصے فاصلے پر ہے، اور دن بھر شدید محنت کی تھکن سے چور ان مسلمانوں کا روزانہ یہاں آکر نماز پڑھنا ایک ایسا مجاہدہ ہے جس کا تصور ہی آنکھوں کو پُرنم کر دیتا ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

سالہا سال تک اللہ کے یہ بندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے، اور ایسے مشکل حالات میں بھی انہوں نے ایمان کی شمع نہ صرف یہ کہ اپنے سینوں میں فروزاں رکھی، بلکہ یہ امانت اپنی آنے والی نسلوں تک بھی پہنچائی۔

تقریباً اسّی سال ان مسلمانوں پر ایسے گذرے ہیں کہ نہ انہیں مسجد بنانے کی اجازت تھی نہ نماز پڑھنے کی۔ بالآخر برطانیہ کے گوروں نے کیپ ٹاؤن پر حملہ کر کے یہ علاقہ ڈچ قوم سے چھیننا چاہا، اور ایک زبردست فوج لے کر راس امید کے ساحل تک پہنچ گئے۔ اس جنگ میں ڈچ قوم کو ایسے جانباز سپاہیوں کی ضرورت تھی جو اپنی جان پر کھیل کر ان انگریزوں کا راستہ روکیں، اور جان کی قربانی دینے کے لیے ان غریب الوطن مسلمانوں سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈچ حکومت نے ان مجبور و مقہور مسلمانوں کو جنگ میں آگے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اس موقع پر اللہ کے ان بندوں نے اپنے ظالم و جابر آقاؤں کا اقتدار بحال رکھنے کے لیے جملہ آور انگریزوں سے جنگ بھی لڑی، اس جنگ میں شامل ہو کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے وقت انہوں نے ڈچ حکمرانوں سے نہ کسی روپے پیسے کا مطالبہ کیا، نہ اپنے لیے کوئی اور راحت طلب کی، البتہ صرف ایک شرط پیش کی، اور وہ یہ کہ اس جنگ کے صلے میں ہمیں کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد بنانے کی اجازت دی جائے، چنانچہ اس طرح بیسیوں مسلمانوں نے اپنی جان دے کر یہاں ایک مسجد بنانے کی اجازت حاصل کر لی، یہ جنوبی افریقہ میں پہلی مسجد تھی جو ان مجبور و مقہور ملائی باشندوں نے تعمیر کی۔

میرے دوست احمد چوہان ایڈوکیٹ مجھے جنوبی افریقہ کی یہ پہلی مسجد دکھانے کے لیے لے گئے تھے، کم و بیش تین سو سال پہلے بنی ہوئی یہ مسجد آج بھی اسی ڈھانچے پر برقرار ہے، محراب ابھی تک جوں کی توں ہے، اور اس کے در و دیوار سے اس کے بنانے والوں

کے جذبۂ اخلاص کی شہادت ملتی ہے۔ اتفاق سے کیپ ٹاؤن تمدنی ترقی میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا، لیکن یہ مسجد اپنی اسی سادگی پر برقرار ہے، اور یہاں کے ائمۂ مساجد آج بھی اسی خاندان سے مقرر ہوتے ہیں جسے ابتدائی تعمیر کے وقت امام بنایا گیا تھا۔ صرف ایک فرق واقع ہے، اور وہ یہ کہ جن بے سروسامان مسلمانوں نے ابتداءً یہ مسجد بنائی تھی اُن کے پاس قبلے کی صحیح سمت معلوم کرنے کے لیے مناسب آلات نہیں تھے، اس لیے شاید انہوں نے اندازے سے قبلے کا رُخ متعین کر کے اس پر محراب بنادی تھی۔ لیکن اب آلات کی مدد سے پتہ چلا کہ محراب قبلے کے صحیح رُخ سے کافی ہٹی ہوئی ہے، چنانچہ اب صفیں محراب کے رُخ پر بچھانے کے بجائے ترچھی کر کے قبلے کے صحیح رُخ پر بچھائی جاتی ہیں۔

اسی مسجد کے صحن میں ایک کھجور کا درخت ہے۔ چونکہ کیپ ٹاؤن میں آس پاس کہیں کھجور کے درخت نظر نہیں آتے، اس لیے اسے دیکھ کر مجھے اچنبھا سا ہوا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مسجد کے کوئی امام صاحب حج کے لیے حجازِ مقدس گئے تو واپسی میں مدینہ طیبہ کی کھجوریں لائے تھے، انہوں نے ایک گٹھلی یہاں بو دی تھی، اس سے یہ درخت لگا ہے۔

ان ملائی مسلمانوں نے اس طرح بیش بہا قربانیاں دے کر اس علاقے میں اسلام پھیلایا ہے، اب بفضلہ تعالیٰ کیپ ٹاؤن میں دسیوں مسجدیں ہیں، اور ہزارہا مسلمان آباد ہیں، جن میں اکثریت ملائی نسل کے مسلمانوں کی ہے، بعد میں کچھ ہندوستانی باشندے بھی یہاں آکر آباد ہو گئے۔ چونکہ یہ ملائی مسلمان مسلکاً شافعی تھے، اس لیے ان کا زیادہ تر رابطہ مصر اور شام کے علماء سے رہا، اور وہ یہاں سے اپنی اولاد کو علم دین کے حصول کے لیے مصر اور شام بھیجتے رہے، چنانچہ یہاں عموماً مصر کے تعلیم یافتہ مشائخ دینی خدمات انجام دیتے رہے، اور اب بھی یہاں کے علماء میں شیخ نجار، شیخ نظیم اور شیخ عبدالمجید وغیرہ جامعہ ازہر ہی کے فارغ التحصیل ہیں۔ البتہ اب وہاں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علماء بھی پہنچ گئے ہیں، انہی فضلاءِ دیوبند میں مولانا یوسف کراں صاحب افریقی نژاد عالم ہیں جو ما شاء اللہ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی اور مقامی بانٹو زبان کے علاوہ فرنچ، ڈچ اور جرمن زبان سے بھی واقف ہیں، اور کیپ ٹاؤن کی باغ و بہار

شخصیت ہیں۔ قادیانیوں کے اس مقدمے کے سلسلے میں انہوں نے خاموشی سے بڑی خدمات انجام دیں، اور ہم لوگوں کے سفر کے انتظامات میں موثر حصہ لیا۔

کیپ ٹاؤن اپنے قدرتی مناظر اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز شہر ہے یہاں کی ٹیبل ماؤنٹین ایک شہرہ آفاق پہاڑی ہے جس کی چوٹی ایک مربع میز کی طرح ہے کیپ ٹاؤن اسی کے دامن میں آباد ہے۔ اور یہاں سے تقریباً اسی نوّے کلومیٹر کے فاصلے پر براعظم افریقہ کا وہ سرا ہے جس پر اس سمت میں نہ صرف افریقہ بلکہ دنیا کی آبادی ختم ہو گئی ہے، اور یہاں سے بحر منجمد جنوبی تک پانی ہی پانی ہے۔ یہ جگہ کیپ پوائنٹ کہلاتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں دنیا کے دو عظیم سمندروں بحر اوقیانوس اور بحر ہند کا سنگم ہے اور کہتے ہیں کہ اگر دھوپ تیز ہو تو دونوں سمندروں کے درمیان ایک خط نظر آتا ہے جو مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ کا منظر پیش کرتا ہے۔ فضا کے ابر آلود ہونے کی بنا پر ہم یہ خط تو نہ دیکھ سکے لیکن حسین پہاڑوں اور سرسبز جنگلات کے دونوں طرف دنیا کے دو عظیم سمندروں کے بہاؤ اور پھر ایک مثلث جزیرے کی نوک پر ان دونوں کے یک جان ہونے کا منظر ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

کیپ ٹاؤن سے واپسی پر ہمارے بیشتر رفقاء تو واپس روانہ ہو گئے، لیکن مولانا مفتی زین العابدین صاحب، مولانا عبد الرحیم اشعر صاحب اور احقر پانچ چھ روز مزید جنوبی افریقہ میں رہے۔ اس دوران جوہانسبرگ، کروگرس ڈورپ اور آزادویل جانا ہوا۔ یہاں کے قدیم احباب اور بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ایک دن کے لئے ڈربن بھی جانا ہوا جس کے لیے مولانا احمد عمر صاحب اور ان کے والد جناب سلیمان عمر صاحب کا بیحد اصرار تھا، یہاں جمعیت علماء نٹال مولانا عبد الحق عمرجی، مولانا یونس پٹیل اور برادر محترم جناب ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب سے ملاقات رہی۔ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اور ڈربن کی یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے سربراہ ہیں۔ اس مرتبہ ان کے چہرے پر

بڑی پُر نور اور حسین داڑھی دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے کہولت کے دور میں واپس آگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عافیت اور سلامتی کے ساتھ دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

جمعرات ۱۶ ستمبر کی شام کو ہم جوہانسبرگ سے نیروبی روانہ ہوئے، نیروبی، کینیا کا دارالحکومت ہے، اور یہاں پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے، میں یہاں دو مرتبہ پہلے بھی آچکا ہوں، لیکن اس مرتبہ یہاں کے ایشیائی باشندوں کو شدید خوف وہراس کا شکار دیکھا۔ وجہ یہ تھی کہ تقریباً ایک ماہ قبل یہاں کے سیاہ فام باشندوں نے پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں کے خلاف ایک ایسا فساد برپا کیا تھا، جس میں لوٹ مار، قتل وغارت گری اور خواتین کی بےحرمتی کے ایسے لرزہ خیز واقعات پیش آئے کہ ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان فسادات کے نتیجے میں بہت سے بڑے مسلمان تاجر بالکل قلاش ہو کر رہ گئے، بہت سے بے گھر ہوگئے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت سی خواتین پر جارحانہ حملے کے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ اب یہاں کے غیر مقامی مسلمان بری طرح سہمے ہوئے ہیں۔

یہاں کے پاکستانی باشندوں نے ایک رات کھانے کی دعوت پر یہ تمام واقعات بڑے پُر اثر انداز میں سنائے، اور یک زبان ہو کر بتایا کہ اب اس ملک میں ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے، اور ہر وقت ہماری جان، مال اور آبرو خطرے میں ہے، لہٰذا ہم واپس پاکستان میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔

یہ واقعات سُن کر بہت دل دُکھا، اور بلاشبہ اب حالات اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ان حضرات کی یہ پریشانی بالکل بجا اور برحق ہے۔ اور مسلمان حکومتوں کو ان کے اس مسئلے پر پوری ہمدردی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی احقر نے ان دوستوں سے یہ عرض کیا کہ ہمیں اس پہلو پر بھی سوچنا چاہیے کہ سالہا سال تک اس ملک میں مقیم رہنے کے باوجود نوبت اس المناک سانحے تک کیوں پہنچی؟ مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ دُنیا کے جس کسی خطے میں گئے

ہیں انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق، بلند کردار اور محبت و الفت کے ذریعے ہمیشہ مقامی آبادی کے دل جیتے ہیں۔ لیکن اب جگہ جگہ سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ مسلمان تارکین وطن ہر جگہ مقامی آبادیوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں، ابھی کچھ عرصہ پہلے یوگنڈا میں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا تھا، اور انہوں نے وہاں سے کینیا میں پناہ لی تھی، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کینیا کی زمین بھی ان پر تنگ ہو رہی ہے۔

اگر حقیقت پسندی سے اس صورتِ حال کے اسباب تلاش کیے جائیں تو اس کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ مقامی آبادی کی پسماندگی اور جہالت وغیرہ کی بنا پر ہمارا طرزِ عمل ان کے ساتھ حقارت آمیز ہو جاتا ہے، اُن کے ساتھ ہمارا برتاؤ وہ نہیں ہوتا جس کی تعلیم ہمیں اسلام نے دی ہے، ہم بھی ان ملکوں میں جا کر دولت سازی میں منہمک ہو جاتے ہیں، اور دوسری غیر مسلم اقوام کی طرح مقامی آبادیوں کے ساتھ تحقیر اور استحصال کا معاملہ کرتے ہیں، اگر ہم ان کو محبت و اُلفت فراہم کر سکتے، اگر ہم ان کے دکھ درد میں اُن کا ہاتھ بٹا سکتے، اگر ہم اُن کی پسماندگی کو دور کرنے اور ان کو اسلامی اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے کوئی محنت کر سکتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کے دل میں ہمارے خلاف نفرت کے پہاڑ کھڑے ہوتے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان ممالک کے وسائل سے پورا مادی فائدہ اٹھانے کے باوجود اس ملک کے پسماندہ باشندوں پر الا ماشاء اللہ کوئی رقم، اور کوئی محنت خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، جن حضرات کو غریبوں کی امداد کا ذوق ہوتا ہے۔ عام طور سے ان کی امدادی رقوم بھی مقامی آبادی پر خرچ ہونے کے بجائے، ان کے آبائی وطنوں میں خرچ ہوتی ہیں، مقامی آبادی ہمارے گھروں اور دکانوں میں ملازم کے طور پر کام کرتی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ان کے ساتھ محبت و الفت کا سلوک کر کے ان کو اسلامی تعلیمات اور اخلاق سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے ہوں، اور جب ہم خود اسلامی تعلیمات سے عملاً بیگانہ ہوں گے تو دوسروں کو کیا تلقین کر سکیں گے؟

میری نظر میں ان مسلمانوں کو جو حصولِ معاش کی تلاش میں دوسرے ممالک میں قیام پذیر

ہیں، یوگنڈا اور کینیا کے ان حالات سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ کسی ملک سے وسیع پیمانے پر انتقالِ آبادی آسان نہیں ہوتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ بیرونی ممالک میں رہنے والے تمام حضرات واپس آکر اپنے آبائی وطن میں رہائش اختیار کرلیں۔ لیکن وہ اپنی زندگیوں پر نظرثانی کرکے مقامی آبادی کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کو ضرور بدل سکتے ہیں، مسلمان کا مقصدِ زندگی صرف حصولِ معاش سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اصل مقصدِ زندگی خود مسلمان بننا اور دوسروں کو مسلمان بنانا ہے، جب تک مسلمانوں نے اپنے اس مقصد کو پیشِ نظر رکھا، وہ جہاں گئے، ہردلعزیز ہو کر رہے، اور جب سے انہوں نے اس مقصد کو نظرانداز کرکے صرف کھانے کمانے پر اکتفا کیا، اس وقت سے اس قسم کے سانحات جگہ جگہ پیش آنے لگے، اب بھی اگر ہم اپنے مقصدِ حیات کی طرف لوٹ آئیں تو یہی ہمارے دین کا تقاضا بھی ہے، اور یہی ہماری راہِ نجات بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حقیقت کا صحیح ادراک عطا فرماکر اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

نیروبی میں جمعہ کا دن گذارنے کا موقع ملا، اس کی مرکزی مسجد میں احقر کو جمعہ کے موقع پر انگریزی میں چند دینی گذارشات بھی پیش کرنے کا موقع ملا، پھر جمعہ ہی کی رات کو وہاں سے روانہ ہو کر بفضلہ تعالیٰ حجِ بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منورہ کی بھی سعادت ملی، اور دو ہفتے حرمین شریفین کے مبارک سائے میں گذارنے کے بعد یکم اکتوبر کو واپس کراچی پہنچنا ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس سفر میں سرزد ہونے والی سیئات کو اپنے کرم سے معاف فرماکر اسے اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں۔ آمین

(کینیڈا، امریکہ، فرانس)

صفر ۱۴۰۹ھ اکتوبر ۱۹۸۸ء

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نُور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دُھویں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلّی

(۱۲)

دیارِ مغرب

میں تین ہفتے

کینیڈا دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ اور یہاں مسلمانوں کی بھی بہت بڑی تعداد اب آباد ہو گئی ہے۔ یہاں کے مختلف مسلمانوں نے کئی بار احقر کو آنے کی دعوت دی، لیکن بوجوہ احقر اس پر عمل نہ کر سکا۔ بالآخر کچھ حضرات نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ کے خلیفۂ مجاز حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم العالی سے رابطہ قائم کر کے احقر کو دعوت دینے کے لیے انہیں واسطہ بنایا۔ حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم سے احقر کو دیرینہ نیاز حاصل ہے، انھوں نے حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کی خدمت و صحبت سے خوب خوب فیض اٹھایا ہے۔ عرصۂ دراز تک سعودی عرب میں مقیم رہے، اور اب کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں قیام پذیر ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم نے احقر کو خط میں ان حضرات کی خواہش کا ذکر فرمایا اور کینیڈا کے مسلمانوں کے بعض مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی۔ احقر نے حاضری کا وعدہ کر لیا۔ شروع میں شوال کا مہینہ طے ہوا، لیکن مجھے کچھ اعذار پیش آگئے اس لئے بالآخر صفر کے وسط میں احقر نے حاضری کا وعدہ کر لیا۔

۲۱ صفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء کا دن گذارنے کے بعد رات کو تین بجے میں ایئر فرانس کے طیارے کے ذریعے روانہ ہوا۔ یہ سفر پیرس کے راستے طے پایا تھا جہاں مجھے چوبیس گھنٹے قیام بھی کرنا تھا۔ کراچی سے پیرس تک یہ براہ راست پرواز آٹھ گھنٹے میں پیرس کی فضا میں پہنچی۔ پاکستان میں اس وقت

دن کے گیارہ بجے ہو گئے۔ لیکن یہاں سات بجے کا وقت تھا۔ جہاز اپنے مقررہ وقت پر پیرس پہنچا، لیکن جب اترنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ فضا میں شدید کہر کی وجہ سے اترنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جہاز مزید دو گھنٹے فضا میں چکر کاٹتا رہا۔ اور نو بجے اُسے اترنے کی اجازت ملی۔ اس طرح یہ سفر مسلسل دس گھنٹے کا ہو گیا۔

ایئرپورٹ کے مراحل سے فارغ ہونے اور ہوٹل تک پہنچنے میں مزید تین گھنٹے لگ گئے اور اس طرح میں بارہ بجے ہوٹل تک پہنچ سکا۔ پیرس میں قیام کے دوران میرا ارادہ ایک لائبریری دیکھنے کا تھا۔ نیز میں جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ لیکن رات بھر کی بے خوابی اور تھکن کے بعد اب ہمت نہ رہی اور میں نے عصر تک ہوٹل ہی میں آرام کرنا ضروری سمجھا۔ عصر کے وقت ایک الجزائری دوست مجھے وہاں کے تبلیغی مرکز "مسجد رحمت" میں لے گئے۔ تبلیغی احباب سے ملاقات ہوئی۔ نماز مغرب بھی وہیں پڑھی۔ ایک دوست مجھے واپس ہوٹل پہنچا گئے۔

اگلی صبح نو بجے ہی میں ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہاں سے ایئرپورٹ کا فاصلہ کافی تھا۔ اور صبح کے وقت پیرس کی مصروف سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے گاڑیوں کو رینگ رینگ کر چلنا پڑتا ہے۔ اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہ مسئلہ لوگوں کے لیے ایک عذاب بنا ہوا ہے اور اسی بنا پر لوگ ان بڑے شہروں میں کاروں کے مالک ہوتے ہوئے بھی زیر زمین ریل کے ذریعے سفر کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں اتنا وقت صرف نہیں ہوتا۔

بہرکیف ٹیکسی نے شہر کا مصروف علاقہ رینگ رینگ کر طے کیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں چارلس ڈیگال ایئرپورٹ پہنچی۔ ٹیکسی کو ایک سو ساٹھ فرانک کرایہ ادا کیا جو پاکستانی روپے میں ایک ہزار روپے سے کچھ کم بنتا ہے۔ پیرس کی گرانی کا عالم یہ ہے کہ [illegible] جیسا شخص [illegible]ں میں بآسانی دیوالیہ ہو سکتا ہے۔

$12\frac{1}{2}$ بجے دوپہر ایئر فرانس کا طیارہ ٹورنٹو کے لیے روانہ ہوا اور سات گھنٹے مسلسل بحرِ اوقیانوس پر پرواز کرنے کے بعد مانٹریال اُترا تو ابھی عصر کا وقت نہیں ہوا تھا۔

یہاں جہاز تقریباً ایک گھنٹے رکا۔ چلنے سے ذرا پہلے میں نے عصر کی نماز پڑھی۔

یہاں سے ٹورنٹو تک ایک گھنٹے کا سفر اور تھا اور مقامی وقت کے مطابق شام کے ۵½ بج رہے تھے جب جہاز ٹورنٹو پر اترا۔ ایئرپورٹ پر حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم، میرے میزبان جناب محمد شمیم صاحب دہلوی، عبدالحی پٹیل صاحب میرے ہم زلف سکندر صاحب اور کچھ اور دوست استقبال کے لیے موجود تھے۔

ٹورنٹو سے تقریباً اسی کیلومیٹر کے فاصلے پر واٹرلو کے نام سے ایک شہر ہے حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب وہاں پر مقیم ہیں۔ میزبان حضرات نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ ٹورنٹو میں اپنی مصروفیات شروع کرنے سے پہلے ایک دن واٹرلو میں حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کی قیام گاہ پر کسی معین مصروفیت کے بغیر گذارا جائے، تاکہ وہاں کچھ آرام بھی ہو جائے وہاں کی مسجد و مدرسہ کا معائنہ بھی اور یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ گفتگو بھی۔ چنانچہ ہم ایئرپورٹ سے واٹرلو روانہ ہو گئے۔

اس علاقے میں سردیوں کی آمد آمد تھی، اور موسم کافی ٹھنڈا مگر خوشگوار تھا۔ کار صاف شفاف اور کشادہ ہائی وے پر دوڑتی رہی، دونوں طرف حد نظر تک سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی جگہ خشک اور سبزے سے خالی نظر نہیں آتی۔ اور سب سے زیادہ حسن اُن خوبصورت درختوں نے پیدا کر دیا تھا جن پر خزاں کی علامت کے طور پر بہار آئی ہوئی تھی۔ شمالی امریکہ کے متعدد علاقوں میں خودرو درختوں پر قدرت کا یہ عجیب نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ خزاں سے پہلے اُن کے سبز پتے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور درختوں کا کچھ حصہ زرد اور کچھ حصہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ یہ زردی اور سُرخی بھی کہیں ہلکی، اور کہیں گہری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پورا درخت مجموعی طور پر حسین رنگوں کا ایک دلکش مجموعہ ہو جاتا ہے۔ جن جنگلات میں درختوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہاں خاص طور پر یہ رنگا رنگ درخت انتہائی حسین منظر پیش کرتے ہیں۔ اور لوگ اس منظر کو دیکھنے کے لیے دور دور سے سفر کر کے جاتے ہیں۔ موسم خزاں کے آغاز پر درختوں کی یہ بہار میں نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھی۔

یہاں راستوں کے بعض مقامات پر موسم بتانے کے لیے برقی تھرمامیٹر نصب ہیں جو روشن ہندسوں کے ذریعے درجۂ حرارت بتاتے ہیں۔ ایک ایسا ہی بورڈ اس وقت درجۂ حرارت ایک سینٹی گریڈ بتا رہا تھا۔

مغرب کے وقت ہم واٹرلو پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا شہر ہے جس کی آبادی پچیس تیس ہزار کی ہوگی۔ اس میں ہزار بارہ سو مسلمان بھی ہیں۔ اور ایک مسجد بھی موجود ہے جس میں حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کے صاحبزادے امامت اور بچوں کی تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اسی مسجد کے قریب حضرت ڈاکٹر صاحب کا مکان بھی ہے۔ اسی مکان میں قیام ہوا۔ عشاء کے بعد کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو یہاں نو بجے تھے لیکن پیرس کے حساب سے رات کے دو اور پاکستان کے حساب سے صبح کے چھ بج چکے تھے اور تھکن کی وجہ سے ذہن چکرا رہا تھا۔ اوقات کے فرق کی وجہ سے انسان جب مشرقی ممالک سے سفر کرکے امریکہ یا کینیڈا جاتا ہے تو ایک دو دن تک اس کے سونے جاگنے کا نظام مختل ہو جاتا ہے دن کے وقت نیند آنے لگتی ہے اور رات کو نیند غائب ہو جاتی ہے۔

بہرکیف، اس رات کھانے کے بعد جلد ہی سو گئے۔ اگلے روز بھی دن کے وقت کوئی خاص پروگرام نہیں رکھا گیا تھا ناشتہ کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب اور احقر کے میزبان محمد شمیم صاحب جو ٹورنٹو سے ساتھ ہی یہاں آگئے تھے۔ کینیڈا اور یہاں کے مسلمانوں کے حالات و مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

کینیڈا روس کے بعد رقبے کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کے مختلف علاقوں میں تین شائر بتائی جاتی ہیں یہ مشرق میں بحر اوقیانوس اور مغرب میں بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے۔ شروع میں یہ انگریزوں کی نو آبادی تھی کسی زمانے میں فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کیا اور اب پھر انگریزی بولنے والوں کے تسلط میں آگیا لیکن فرانسیسی بولنے والوں کی بہت بڑی تعداد یہاں آباد ہے۔ صوبہ کوئبک میں تو اکثریت انہی کی ہے اور صدر ٹروڈو کے زمانے سے پورے ملک کی دو سرکاری زبانیں قرار دے دی گئی ہیں۔ ایک انگریزی اور ایک فرنچ۔

مسلمان بھی اس ملک میں کافی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ٹورنٹو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اور سب سے زیادہ مسلمان یہیں آباد ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے جن میں دنیا کے تقریباً ہر خطے سے آئے ہوئے مسلمان شامل ہیں۔

ان حضرات سے مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی جو رفتہ رفتہ انشاءاللہ آگے سامنے آئیں گے۔

عصر کے بعد ہم لوگ واٹرلو سے روانہ ہوئے۔ یہاں سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر کیمبرج کے نام سے ایک اور شہر ہے۔ یہاں بھی ایک مسجد ہے جس میں حضرت ڈاکٹر صاحب کے دوسرے صاحبزادے امامت و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں مغرب کی نماز کے بعد یہاں احقر کی تقریر کا پروگرام تھا۔ چنانچہ مغرب ہم نے یہیں پڑھی اور پھر عشاء تک احقر کا بیان ہوا۔ ——— احقر نے سورۂ ملک کی یہ آیت پڑھی۔

هو الذی جعل لكم الارض ذلولا فامشوا فی مناكبها وكلوا من رزقه واليه النشور

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو رام کر دیا۔ پس تم اس کی بلند جگہوں میں چلو اور اس کے رزق میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیت کی روشنی میں احقر کی گزارشات کا موضوع یہ تھا کہ رزق کی تلاش میں دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچنا اس آیت کی رُو سے جائز ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کو اس کی عطا سمجھ کر اس کا قولی اور فعلی شکر ادا کیا جائے اور یہ بات ہر آن پیشِ نظر رکھی جائے کہ لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔ اگر یہ باتیں ذہن میں مستحضر رہیں تو دوسرے ملکوں میں بھی انسان اپنے ایمان اور عمل کو سلامت رکھے گا۔

عشاء کے بعد کیمبرج میں ایک دوست کے گھر پر کھانا تھا۔ کھانے کے بعد ہم ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔ اور رات کو ½ ۱۱ بجے کے قریب ٹورنٹو پہنچے۔

ٹورنٹو میں

اگلا دن جمعہ تھا اور نمازِ جمعہ ٹورنٹو کی سب سے بڑی مسجد "مسجد المدینۃ" میں ادا کرنی تھی۔ چونکہ جمعہ کے دن یہاں چھٹی نہیں ہوتی، اور لوگ دوپہر کے کھانے کے وقفے

ہیں نماز کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے ان علاقوں میں معمول یہ ہے کہ نماز جمعہ سے پہلے کی تقریر بہت مختصر تقریباً دس منٹ کی ہوتی ہے۔ آج یہ تقریر احقر کو کرنی تھی۔ اجتماع کافی تھا، مسجد بھری ہوئی تھی۔ احقر نے اس مختصر تقریر میں اپنے گھروں اور بیوی بچوں کی دینی تربیت پر زور دیا۔ پھر اسی کا خلاصہ عربی خطبے میں بیان کیا اور نماز جمعہ پڑھائی۔

ہمارے قیام کا انتظام مسجد کے قریب ہی فرینک ڈیل ایونیو میں احمد داؤد صاحب کے مکان پر ہوا وہ خود اس مکان کے نچلے حصے میں مقیم رہے اور اوپر کے تین کمرے ہمیں دے دیئے۔ اس طرح ملنے جلنے کے لیے آنے والوں کو بھی سہولت ہوگئی

عشاء کے بعد اسی مسجد المدینہ میں مفصل تقریر کا اعلان تھا۔ اس مجلس میں لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور احقر نے تقریباً ۱½ گھنٹہ کی تقریر میں صبح ہی کے موضوع کو قدرے تفصیل سے بیان کیا اور نیک صحبت کی فکر کی تاکید کی۔

ہفتے کے دن صبح سے دوپہر تک لوگ ملاقات کیلئے آتے رہے۔ دوپہر کو کھانا شمیم صاحب کے یہاں تھا۔ ہفتہ چونکہ چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے اس روز یکے بعد دیگرے تین تقریریں رکھدی گئی تھیں۔ اور تینوں یہاں کی جامع مسجد میں ہونی تھیں۔

جامع مسجد ٹورنٹو کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اس کے آس پاس عرب حضرات کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ یہ حضرات سنیچر کو ظہر کے بعد کوئی نہ کوئی دینی اجتماع منعقد کرتے ہیں آج انہوں نے احقر کو خطاب کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ظہر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ احقر نے ان سے عربی میں خطاب کیا۔ حاضرین میں تقریباً تمام عرب ملکوں کے حضرات موجود تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ عرب حضرات میں دینی معاملات کے اندر عقلی حکمتوں کو فیصلہ کن حیثیت دینے کا رواج عام ہے اس لیے احقر کے خطاب کا موضوع یہی تھا کہ دین میں عقل کا مقام کیا ہے؟ اور اس کے استعمال کی کیا حدود ہیں؟ الحمدللہ اس خطاب سے بہت سے حضرات کے شبہات دور ہوئے۔ خطاب کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ سوالات زیادہ تر فقہی نوعیت کے تھے۔ اور کنیڈا کے مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل سے متعلق تھے۔ احقر نے بیچ میں یہ سلسلہ ختم کرنے کی کوشش کی لیکن

حاضرین نے کہا کہ ابھی سیری نہیں ہوئی، اس لئے تقریباً پون گھنٹے مزید یہ سلسلہ جاری رہا، اور بفضلہ تعالیٰ مفید ثابت ہوا۔

مغرب کے بعد اسی مسجد میں تبلیغی اجتماع تھا، اس سے بھی مختصر خطاب ہوا اور عشاء کے بعد یہیں مفصل اردو خطاب کا اعلان تھا جو تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ حاضرین میں جو حضرات اردو داں نہیں تھے، ان کے لیے ساتھ ساتھ ایک گوشے میں انگریزی ترجمہ ہوتا رہا۔

اگلا دن اتوار تھا اور ظہر کے بعد اسکا آبرو کمیونٹی سنٹر کے ہال میں مردوں اور عورتوں کا باپردہ اجتماع رکھا گیا تھا۔ اور اسی روز رات کو عشاء کے بعد ایک اور مسجد میں خطاب تھا۔

اتفاق سے پیر کے دن بھی سرکاری تعطیل تھی۔ یہاں دستور یہ ہے کہ جب فصلیں کٹ جاتی ہیں تو سرکاری طور پر "یوم تشکر" (Thanks giving Day) منایا جاتا ہے۔ چنانچہ پیر کو یوم تشکر منایا جا رہا تھا، اس لیے اس روز بھی تین پروگرام رکھے گئے تھے۔

شمالی امریکہ (ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا) میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اور نمایاں تنظیم اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا سمجھی جاتی ہے جو یہاں "اسنا" (Isna) کے نام سے مشہور ہے۔ جناب محمد اشرف صاحب اس کی کینیڈا کی شاخ کے چیئرمین ہیں انہی کے ایک دوست جناب پرویز نسیم صاحب نے یہاں مسلمانوں کے لیے مکانات کی خریداری کے لیے ایک ہاؤسنگ کوآپریٹو کارپوریشن قائم کی ہوئی ہے، اسنا کے دفتر ہی میں اس کا مرکز بھی ہے، پیر کی صبح دس بجے ان دونوں حضرات نے احقر کو اس اسکیم کے مختلف پہلوؤں پر شرعی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے لیے گفتگو کی دعوت دی تھی اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں تھا۔

امریکہ اور کینیڈا میں مکانات کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جسے حل کرنے کے لیے یہاں جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ بینک اس غرض کے لیے سودی قرض دیتا ہے، جو کئی سال کی مدت میں واجب الادا ہوتا ہے۔ یہاں مکان کے کرائے

اتنے زیادہ ہیں کہ اس سودی قرض کی ماہانہ قسط کی ادائیگی مکان کے کرائے کے قریب قریب پڑ جاتی ہے، اس لیئے لوگ کرائے کے مکانوں میں رہنے کے بجائے بنک سے قرض لے کر مکانات حاصل کر لیتے ہیں اور یہ قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دین کی فکر عطا فرمائی ہے، وہ اس طریق کار سے اس لیے فائدہ نہیں اٹھا سکتے کہ اس طرح انہیں سودی کاروبار میں ملوث ہونا پڑتا ہے جو حرام ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پرویز نسیم صاحب نے استنا کے تعاون سے اسلامک کوآپریٹو ہاؤسنگ کارپوریشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو سود کے بغیر مکانات کے حصول کے لیے کوئی مناسب راستہ مہیا کیا جائے۔ لیکن جس اسکیم پر یہ کارپوریشن عمل کر رہی ہے۔ یہاں کے علماء نے اسے بھی ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے کنیڈا آنے کے بعد اس کے بارے میں تقریباً ہر مجلس میں مجھ سے بھی سوالات ہوتے رہے۔ لہٰذا یہ مجلس اس لیے منعقد کی گئی تھی کہ میں کارپوریشن کے ذمہ دار حضرات سے اس کا طریقِ کار سمجھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کروں۔

چنانچہ احقر حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مدظلہم کی معیت میں ان حضرات کے دفتر میں حاضر ہوا، بارہ بجے تک ان کے قواعد و ضوابط اور معاملات کی تفصیل دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ فی الوقت شرعی نقطۂ نظر سے اسکیم میں متعدد خامیاں موجود ہیں، لیکن ان کا ازالہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ میں کارپوریشن کا مطبوعہ مواد اور عملی مسائل کا جائزہ لے کر کسی اور نشست میں وہ ترمیمات پیش کروں جن کے ذریعہ یہ خامیاں دور ہو سکیں۔ چنانچہ آئندہ پیر کی شام کو اگلی میٹنگ طے کر کے یہ مجلس برخاست ہو گئی۔

نمازِ ظہر کے بعد ۲ بجے کمیونٹی سنٹر ہال ویسٹن میں اور عشاء کے بعد ویسٹن ہی کی مسجد میں خطاب ہوا۔ درمیان کا وقت مفتی محمد یوسف صاحب کے مکان پر گذرا۔ مفتی محمد یوسف صاحب گجرات کے ایک مدرسہ سے فارغ التحصیل ہیں اور انہوں نے جلال آباد میں حضرت

مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم العالی کے مدرسہ میں افتاء کی تربیت حاصل کی ہے اب یہاں ایک مدرسے میں تدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں اور کینیڈا میں لوگ دینی مسائل کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے ہیں اور وہ فتویٰ کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ سلیم الطبع، متواضع اور سادہ مزاج نوجوان ہیں۔ انہوں نے اپنی محبت سے احقر کی بڑی عزت افزائی کی۔ ٹورنٹو کے قیام کے دوران بکثرت ساتھ رہے اور یہاں کے فقہی مسائل پر گفتگو فرماتے رہے۔ ان کا مکان بھی چونکہ اسی علاقے میں ہے، اس لیے سہ پہر سے عشاء تک انہی کے یہاں قیام رہا۔ رات کا کھانا بھی انہی کے یہاں تھا۔

اگلے دن ۱۱ر اکتوبر کی صبح کو ہم پاکستان کے قونصل خانے گئے۔ یہاں پاکستان کے قونصل جنرل افضال اکرم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ انہیں خوش اخلاق، ملنسار اور فعال پایا۔ ٹورنٹو کے پاکستانی حضرات اُن کی کارکردگی سے خوش ہیں۔ اُن سے پاکستان کی بعض نئی خبریں معلوم ہوئیں۔

نیاگرا آبشار

اسی روز احقر کے میزبانوں نے دنیا کی مشہور ترین آبشار نیاگرا کی سیر کا پروگرام رکھا تھا۔ نیاگرا ٹورنٹو سے تقریباً سوا سو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب اور عبدالقادر صاحب ہم سفر تھے۔ نماز ظہر کے بعد ہم ٹورنٹو سے روانہ ہوئے، سڑکیں نہایت کشادہ اور صاف تھیں، لیکن ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے یہ سفر تقریباً دو گھنٹے میں طے ہوا۔ نیاگرا ایک مستقل شہر ہے اور اسی کے کنارے وہ شہرۂ آفاق آبشار واقع ہے جو اپنے قدرتی حسن کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور دُنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

اس کرشمۂ قدرت کی شہرت تو بچپن سے سُنی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا دلکش منظر جسے دیکھ کر انسان بیساختہ فتبارک اللہ احسن الخالقین پکار اُٹھتا ہے، پہلی بار نظر نواز ہوا۔

نیاگرا دراصل ایک دریا ہے جو امریکہ کی چار مختلف قدرتی جھیلوں سے مرکب ہے۔

جن کے طاس کا مجموعی رقبہ دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل ہے۔ یہ دریا امریکہ اور کینیڈا کے درمیان حدِ فاصل کا کام بھی کرتا ہے اور شمال سے جنوب میں بہتا ہوا کینیڈا کی مشہور جھیل اونٹاریو میں آگرتا ہے۔

جس مقام پر دریا نے دنیا کے مشہور ترین آبشار کی شکل اختیار کی ہے، وہاں اس دریا کے راستے میں ایک نہایت گہرا اور طویل وعریض نالہ حائل ہو گیا ہے، اور جب یہ دریا ایک وسیع رقبے میں زور وشور سے بہتا ہوا اس نالے کے کنارے پہنچتا ہے تو اس کے پانی کا زبردست ریلا انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اس نالے میں گرتا ہے اور اس طرح پورے کا پورا دریا ایک آبشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس نالے کا مغربی سرا کینیڈا میں ہے اور اس کی شکل گھوڑے کے نعل کی سی ہے اسی لیے اس کو (Horseshoe Falls) یعنی "نعلی آبشار" کہا جاتا ہے، اور دریا کا بیشتر حصہ یہیں سے نالے میں گرتا ہے دوسری طرف یہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر نالے کا جنوبی کنارا امریکہ میں ہے اور پانی کا باقی ماندہ حصہ چکر کاٹ کر اس کنارے سے نیچے گرتا ہے جسے امریکی آبشار کہا جاتا ہے۔

کینیڈا کا "نعلی آبشار" ہلالی نصف دائرے کی شکل میں ہے۔ اس نصف دائرے کا قطر دو ہزار چھ سو فیٹ ہے۔ اور نالے کی سطح سے اس کی اونچائی ایک سو باسٹھ فیٹ ہے۔ گویا یہاں سے دریا کا بیشتر پانی نصف دائرے کی شکل میں پچاس میٹر سے زائد کی بلندی سے نالے میں گرتا ہے جس کا شور دور سے سنائی دیتا ہے اور اس کی اڑتی ہوئی چھینٹیں نالے کی نچلی سطح سے بلند ہو کر دریا کی اصل سطح سے بھی اونچی چلی جاتی ہیں اور ان چھینٹوں کی وجہ سے ہر وقت آبشار کے سامنے ایک سفید بادل حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے پانی ۶ کروڑ گیلن فی منٹ کے حساب سے گرتا ہے۔ اور ماہرین کا کہنا ہے کہ پانی کا یہ زبردست سیلاب اس جگہ کروڑوں سال سے اسی زور شور کے ساتھ گر رہا ہے، لیکن یہ قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ نالے کا وہ کنارہ جہاں سے یہ لاکھوں ٹن پانی اس خوفناک دباؤ کے ساتھ گرتا ہے، لاکھوں صدیوں سے اس کا صرف چند فیٹ حصہ اب تک گھس کر جھڑ سکا ہے باقی جوں کا توں قائم ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين۔

یہاں آبشار کا نظارہ کرنے کے لیے ایک طویل سڑک اور اس کے کنارے ایک فٹ پاتھ ہے۔ جو نعلی آبشار کے دہانے سے شروع ہو کر نالے کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی ہے۔ یہاں سے کھڑے ہو کر جنوب کی طرف سے دریا کا سفر اور پھر اچانک نالے میں گرنے کا نظارہ اتنا دلفریب اور مسحور کن ہے کہ انسان اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس سڑک کے نیچے سے ایک سُرنگ نکالی گئی ہے جو نالے کی اُس نچلی سطح تک لے جاتی ہے جہاں آکر یہ دیو ہیکل دریا گرتا ہے۔ وہاں ایک پلیٹ فارم بنا ہوا ہے جہاں سے لوگ برساتی پہن کر آبشار کے اپنے سامنے گرنے کا نظارہ کرتے ہیں۔ برساتی پہننا اس لیے ضروری ہے کہ دریا کی طوفانی چھینٹوں سے بچاؤ اس کے بغیر ممکن نہیں۔

پھر اس نالے کے کنارے کنارے سڑک پر مشرق کی طرف چلیں تو کچھ دور چل کر نالے کے جنوبی کنارے پر امریکی آبشار گرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ آبشار سیدھا ہے۔ اس کا عرض ایک ہزار فیٹ ہے اور یہ ایک سو ستر فیٹ کی بلندی سے نالے میں گرتا ہے۔ اس کی چوڑائی بھی کنیڈین آبشار کے مقابلے میں کم ہے اور سیدھا گرنے کی وجہ سے پانی کی مقدار اور اس کے بہاؤ کا زور بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کنیڈا کے "نعلی آبشار" کے مقابلے میں ماند معلوم ہوتا ہے۔ کچھ اور مشرق میں چلیں تو نالے کے اوپر ایک خوبصورت پُل بنایا گیا ہے جو "دھنک پُل" (Rainbow Bridge) کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہی پل شمالاً جنوباً کنیڈا اور امریکہ کو ملاتا ہے۔ اس پُل کے بیچوں بیچ امیگریشن پوسٹ بنی ہوئی ہے۔ اور اگر پاسپورٹ ساتھ ہو تو اس پُل کے ذریعے امریکہ کے سیاح کنیڈا کا حصہ اور کنیڈا کے سیاح امریکہ کا حصہ دیکھنے کے لیے آجاتے ہیں۔

آبشار کے شمال میں نیاگرا کی تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لیے بڑے حسین پارک، رہائش گاہیں، ریستوران اور تفریحات کے بہت سے مراکز ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس جگہ کو دنیا کی حسین ترین تفریح گاہ قرار دیا جاتا ہے، جہاں لوگ کئی کئی ہفتے گذارتے ہیں، لیکن اس وقت موسم سرد تھا۔ اس لیے بہت کم سیاح آئے ہوئے تھے، اور اسی بنا پر ہم جیسے لوگ یہاں اطمینان سے کچھ وقت گذار سکے، ورنہ ہجوم کے زمانے میں یہاں جو طوفانِ بدتمیزی

برپا ہوتا ہے اس کی موجودگی میں یہاں زیادہ ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہیں پر ایک ہیلی کاپٹر سروس بھی ہے جو ہیلی کاپٹر کے ذریعے علاقے کی سیر کراتی ہے۔ ہمارے رہنما عبدالقادر پٹیل صاحب نے اصرار کر کے ہمیں اس ہیلی کاپٹر میں بھی سوار کر دیا۔ اس میں پائلٹ کے علاوہ چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے، لیکن ہم تین ہی افراد اس میں سوار ہوئے، یہ ہیلی کاپٹر کی سواری کا پہلا اتفاق تھا۔ جو کھڑے کھڑے فضا میں بلند ہو گیا اور تقریباً دس منٹ تک نیاگرا آبشار اور اس کے ملحقہ علاقوں پر پرواز کرتا رہا۔ یہاں سے نیاگرا دریا، دونوں آبشاروں، امریکہ اور کینیڈا کے ملحقہ سبزہ زاروں کا منظر واقعۃً اتنا دلکش تھا کہ زمین سے اس کا لطف محسوس نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف! یہ شہرۂ آفاق آبشار جو دنیا کے عجائب میں شمار ہوتا ہے اور جس کی شہرت بچپن سے سنتے آئے تھے، آج اس کی سیر بڑی پُرلطف رہی۔ اللہ تعالیٰ نے جب دُنیا میں ایسے حسین نظارے پیدا فرمائے ہیں تو جنت کے نظاروں کا عالم کیا ہو گا جس کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

> میں نے اپنے بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کی ہیں جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سُنا نہیں اور کسی بشر کے دل میں ان کا تصور تک نہیں گذرا۔

ہم نے نمازِ مغرب آبشار کے سامنے ایک سبزہ زار میں ادا کی غروبِ آفتاب کے بعد آبشاروں پر ایک قریبی ٹاور سے مختلف رنگوں کی روشنیاں ڈالی جاتی ہیں جن سے دریا، آبشاروں اور ملحقہ علاقوں کا منظر اور زیادہ حسین ہو جاتا ہے، لیکن اس روز کسی وجہ سے روشنیاں بند تھیں۔ ہم نمازِ مغرب کے بعد وہاں سے واپس ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔

اگلے دن زیادہ تر قیام گاہ پر ہی رہنا ہوا، دو مخصوص نشستیں تھیں جن میں مختلف حلقہ ہائے خیال کے حضرات سے ملاقات اور مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

سائنس سنٹر

جمعرات یکم ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کو صبح سے بارہ بجے تک قیام گاہ پر ہی ملاقاتوں

کا سلسلہ رہا ۱۲۰۰ بجے ہمارے میزبان احمد داؤد صاحب ٹورنٹو کے سائنس سنٹر لے گئے۔ یہ عوام کے لئے سائنسی معلومات اور سائنسی مظاہروں کا بڑا عظیم الشان مرکز ہے، اور کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں منفرد ہے۔

یہ مرکز ایک وسیع و عریض چار منزلہ عمارت میں واقع ہے اور اس کے تمام حصّوں کو ایک پورا دن صرف کر کے دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہم نے تقریباً چار گھنٹے یہاں گذارے اور بمشکل اس کا نصف حصّہ سرسری انداز میں دیکھ پائے۔ اس مرکز میں سائنس کے مختلف شعبوں کی معلومات کو نقشوں، کمپیوٹروں، آلات کے عملی استعمال اور مظاہروں کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے۔

پہلی منزل پر نو شعبے ہیں ایک شعبہ ایٹم سے متعلق ہے جس میں ایٹم کی دریافت اور اس کی خصوصیات وغیرہ دکھائی گئی ہیں۔ دوسرا ٹیکنالوجی کے زیرِ عنوان ہے جس میں مختلف آلات اور مشینوں کا استعمال دکھایا گیا ہے۔ تیسرا مواصلات سے متعلق ہے جس میں مختلف وسائلِ سفر کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھا سائنس کی نمائش ہے جس میں مختلف سائنسی آلات کے ذریعے آواز اور روشنی وغیرہ پیدا کرنے کے مختلف کھیل رکھے گئے ہیں، پانچواں شعبہ رسل و رسائل کا ہے جس میں ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، وائرلیس، ریڈیو اور ٹی وی کے دلچسپ مظاہرے دکھائے گئے ہیں۔ چھٹا حصّہ "زندگی" سے متعلق ہے جس میں حیوانات کی کے مختلف مراحل خوردبینوں وغیرہ کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ ساتواں شعبہ ان فطری قوتوں کے مظاہرے کا ہے جو زمین پر اثر انداز ہوتی ہیں آٹھواں حصّہ کنیڈا کے قدرتی وسائل کے بارے میں ہے اور نواں حصّہ توانائی کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

دوسری منزل پر خلا کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں، مثلاً پوری کائنات کا ایک ماڈل بنا کر دکھایا گیا ہے کہ اس میں سیارے کس طرح گردش کرتے ہیں، چاند، سورج اور زمین کا تعلق واضح کیا گیا ہے، سورج کی روشنی سے دن رات پیدا ہونے کا منظر دکھایا گیا ہے اسی طرح مختلف سیاروں کے نمونے دکھائے گئے ہیں، چاند کے سفر وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اسی منزل پر ایک حصّہ مالے کیول (molecule) کے بارے میں ہے جس میں مختلف اشیا کے مالے کیول اور ان کے خواص کا مظاہرہ کرایا جاتا ہے۔ یہیں ایک حصے میں لیزر شعاعوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی شعاع ہے جس سے آج کے دور میں بہت سے کام لئے جا رہے ہیں یہاں تک کہ اسے آپریشن میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ شعاع رنگین چیز پر اثر کرتی ہے لیکن سفید یا بے رنگ اشیا پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہاں انہوں نے اس کا مظاہرہ کرایا کہ ایک رنگین غبارے پر یہ شعاع ڈالی گئی تو وہ پھٹ گیا، پھر سفید غبارے پر وہی شعاع ڈالی وہ اپنی جگہ صحیح و سالم رہا۔ پھر سفید غبارے کے اندر ایک سُرخ غبارہ رکھ کر اس پر شعاع ڈالی گئی تو یہ حیرت انگیز منظر نظر آیا کہ اندر کا سُرخ غبارہ پھٹ گیا، اور باہر کا سفید غبارہ صحیح و سالم رہا۔

اسی منزل پر زمین اور اس پر پیدا ہونے والی مختلف غذاؤں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ باقی دو منزلیں زیادہ تر نمائش گاہوں اور اجتماعات اور دفاتر وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔

چار گھنٹے اس سائنسی مرکز میں پلک جھپکتے گذر گئے یہاں اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی قدرتِ کاملہ سے کیا کیا عجائب پیدا فرمائے ہیں، اور انسان کو عقل و فکر اور ہمت و تدبیر کی کیسی توفیق عطا فرمائی ہیں جن کے ذریعے وہ ان عجائب قدرت کی دریافت اور ان کے استعمال کا طریقہ معلوم کرتا ہے اور وہ ہزارہا سال سے اس کام میں مصروف ہے لیکن ابھی تک اس کائنات کا کروڑواں حصّہ بھی دریافت نہیں کر سکا۔ فتبارك الله احسن الخالقين۔

یہاں سے فارغ ہوتے ہوئے عصر کا وقت تنگ ہونے والا تھا ہم نے یہیں پر باجماعت نماز عصر ادا کی، اسی روز مجھے مانٹریال روانہ ہونا تھا، چنانچہ قیام گاہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی ایئرپورٹ روانہ ہو گیا۔

مانٹریال میں

رات کے آٹھ بجے جہاز مانٹریال کے لیے روانہ ہوا اور ایک گھنٹے کے سفر کے

بعد مانٹریال پہنچا۔ مانٹریال کنیڈا کا دوسرا بڑا شہر ہے اور اس کے جنوبی مشرقی صوبے کیو بیک (Quebec) کا دارالحکومت بھی ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک وسیع و عریض دریا سینٹ لارنس بہتا ہے جس کا پاٹ یہاں ایک میل یا اس سے بھی زائد ہے یہ دریا مانٹریال کو بحر اوقیانوس سے ملاتا ہے اور اسی دریا پر کنیڈا کی اہم ترین بندرگاہ بھی واقع ہے۔ دریا اتنا وسیع و عریض اور گہرا ہے کہ اس میں بڑے بڑے جہاز آرام سے آ جاتے ہیں۔

کیو بیک صوبہ کی بیشتر آبادی فرنچ ہے اسی لیے یہاں کی سرکاری زبان بھی فرانسیسی ہے۔

رات نو بجے میں مانٹریال ایئر پورٹ پر اُترا تو احقر کے میزبان جناب سمیع اللہ صاحب اور یہاں کے اسلامک سنٹر کے صدر جناب محمد صدیق صاحب وغیرہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ قیام جناب محمد صدیق صاحب کے مکان پر ہُوا۔ اگلا دن جمعہ تھا اور جمعہ کی نماز احقر کو اسلامک سنٹر میں پڑھانی تھی، لیکن میری خواہش کے مطابق میزبانوں نے جُمعہ سے پہلے میکگل یونیورسٹی دکھانے کا پروگرام رکھا تھا۔ چنانچہ ½ ۹ کے قریب سمیع اللہ صاحب مجھے لینے کے لیے آ گئے۔

میکگل یونیورسٹی

مانٹریال میں کئی بڑی یونیورسٹیاں ہیں، جن میں سے بعض کی زبان انگریزی اور بعض کی فرنچ ہے لیکن میکگل یونیورسٹی سے احقر کی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ اس یونیورسٹی کا اسلامی علوم کا شعبہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ عصرِ حاضر کے متعدد مشہور مستشرقین اسی یونیورسٹی سے پیدا ہوئے اور بہت سے مسلمان اسکالر بھی یہاں سے اسلامی علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے فخر محسوس کرتے ہیں چنانچہ عالم اسلام کے بہت سے تجدد پسند مصنفین جو مستشرقین جیسی فکر کے حامل تھے، یہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔

میکگل یونیورسٹی قدیم مانٹریال شہر کے گنجان آباد علاقے میں واقع ہے۔ جمعہ تک

وقت اتنا نہیں تھا کہ یہاں کے نظام و نصاب کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے پہلے یہاں کی اسلامی علوم کی لائبریری دیکھنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ مشہور یہ ہے کہ یہ لائبریری براعظم امریکہ میں اسلامی علوم کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لائبریری میں اسلامی علوم کی کتابوں کا بڑا گرانقدر ذخیرہ موجود ہے کتابوں کی کل تعداد نوے ہزار ہے۔ دنیا بھر سے تقریباً نو سو مجلات و رسائل کا ریکارڈ محفوظ ہے اور ۳۳۰ مجلات باقاعدگی سے آتے ہیں۔ ۱۶۵ مخطوطات بھی ہیں کتابوں میں قدیم ترین مخطوطہ علامہ خیالی کی شرح العقائد النسفیہ کا ہے جو ۱۹۹ھ میں لکھا گیا اور مطبوعہ کتابوں میں قدیم ترین وہ سولہ کتابیں ہیں جو استنبول میں پریس کے موجد ابراہیم متفرقہ نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں طبع کی تھیں اس کے علاوہ خطاطی کا ایک قدیم ترین نمونہ دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔

کتابوں کے ذخائر میں عربی، فارسی، اردو، ترکی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں اسلامی علوم کی اہم کتابیں شامل ہیں اور اگر اس کا انتظام صحیح ہو تو یہ ایک نفیس کتب خانہ ہے۔ ہم نے دور دور سے بڑی شہرت سنی تھی کہ مغربی ممالک میں کتب خانوں کی ترتیب و تنسیق مثالی انداز کی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کتابوں کی تلاش کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ اس لائبریری کے بارے میں بھی قیاس یہی تھا اور بہت سے وہ لوگ جو یہاں سے پڑھ کر جاتے ہیں اس کتب خانے کے نہ صرف ذخیرے بلکہ ترتیب کی بھی تعریف کرتے ہوئے آتے ہیں۔ لیکن کتب خانہ دیکھنے کے بعد بیساختہ یہ شعر زبان پر آگیا کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

واقعہ یہ ہے کہ کتابوں کی ترتیب اور درجہ بندی کے لحاظ سے یہ اس قدر ناقص اور بے ہنگم کتب خانہ ہے کہ اس دور میں کسی باوقار علمی ادارے کے اندر شاید اس سے زیادہ بے ڈھب ترتیب کا تصور مشکل ہو۔ مجھے جب پہلی بار پہلی الماری میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں گڈمڈ نظر آئیں تو میں نے سمجھا کہ اتفاق سے اس الماری میں ایسا ہوگیا ہوگا۔ لیکن اگلی الماری

کا بھی یہی حال تھا۔ اور پھر شروع سے آخر تک اوپر کی منزل کی تمام الماریاں چھاننے کے بعد اندازہ ہوا کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ فقہ کی کتابوں کے ساتھ تاریخ کی تفسیر کے ساتھ رجال کی حدیث کے ساتھ فلسفے کی، کلام کے ساتھ جغرافیہ کی کتابیں ایسی گڈمڈ رکھی ہیں کہ ہیں کہ ان کا مروجہ درجہ بندی کے کسی زاویے سے کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

میں نے نیچے آکر کتب خانے کی فہرست سے ترتیب کا اندازہ لگانا چاہا، لیکن فہرستیں تین ہیں۔ ایک مروجہ کیٹلاگ کی صورت میں ایک رجسٹر کی صورت میں اور ایک کمپیوٹر میں کچھ کتابوں کا اندراج کیٹلاگ میں ہے کچھ کا رجسٹر میں اور کچھ کا کمپیوٹر میں۔ اور یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ کس قسم کی کتب کہاں تلاش کی جائیں۔ میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ فقہ کے تحت کون کونسی کتب موجود ہیں تو فقہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی عنوان تینوں فہرستوں میں سے کہیں نہیں تھا۔ جو خاتون کتابوں کی تلاش میں مدد دینے پر مامور تھیں، ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کتابوں کی فہرست میں "فقہ" کا کوئی عنوان ہونا چاہیئے۔

بالآخر میں اس معمے کے حل کے لیے لائبریری کے انتظامی سربراہ کے پاس گیا۔ مسٹر ایڈم گاسک لائبریری کے منتظم اعلیٰ ہیں اور بڑے خلیق اور ملنسار انسان ہیں۔ انہوں نے نشان دہی کی کہ فقہ کا موضوع کمپیوٹر میں "اسلامک لا" کے زیر عنوان موجود ہے۔ پھر انہوں نے خود کمپیوٹر میں یہ موضوع نکال کر دکھایا اب میں نے اس کے ذیلی عنوانات دیکھے تو سب سے پہلا ذیلی عنوان "الفروسیۃ" نظر آیا جس میں علامہ ابن قیم کی مشہور کتاب "الفروسیۃ" کو درج تھی۔ اب یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ درجہ بندی کرنے والے نے فقہ میں سب سے پہلا اہم عنوان "فروسیۃ" کو کس بنیاد پر قرار دیا؟ میں نے مسٹر ایڈم گاسک سے اس کی وجہ پوچھی تو ان کو "فروسیۃ" کا مطلب ہی نہیں معلوم تھا، اس لیے انہوں نے اس کا جواب دینے سے معذرت ظاہر کی۔ پھر میں نے ان سے کتب خانے کی بے ترتیبی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے اول تو مختلف ناکافی جواب دیئے، لیکن بالآخر خاصی جرح کے بعد اصل وجہ یہ معلوم ہوئی کہ جب مشہور مستشرق ڈاکٹر ولفریڈ کینٹول اسمتھ نے اس ادارے کا انتظام سنبھالا تو انہوں نے کتب خانے کی درجہ بندی کی اسکیم بھی خود بنائی جو مروجہ اسکیموں سے مختلف تھی۔ یہ اسکیم موضوعات یا حروف تہجی سے

زیادہ عالمِ اسلام کے مختلف علاقوں کی بنیاد پر تھی، مثلاً مصر میں لکھی ہوئی کتابیں ایک جگہ شام کی دوسری جگہ، وعلیٰ ہذا القیاس۔

بعد میں لائبریری کے منتظمین نے اس اسکیم کو بدل کر لائبریری آف کانگریس کی اسکیم پر کرنا چاہا۔ لیکن عملاً وہ بھی پوری طرح اختیار نہ کی جاسکی، اور نتیجہ اس بے ترتیبی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

میں نے مسٹر ایڈم گاسک کو بتایا کہ ہمارے دارالعلوم کا کتب خانہ اگرچہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے آپ کے کتب خانے سے نصف کے قریب ہے (یعنی نوّے ہزار کے بجائے تقریباً پچاس ہزار کتابیں) لیکن الحمد للہ ترتیب اور درجہ بندی ایسی ہے کہ کتاب کی تلاش میں ایک آدھ منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ اور ہر موضوع کی کتابیں اپنی منطقی ترتیب کے ساتھ مہیا ہیں۔

بہر کیف! اگر اس کتب خانے کی ترتیب بہتر ہو تو بلاشبہ یہ ذخیرۂ کتب کے لحاظ سے ایک اچھا کتب خانہ ہے۔ یہاں سے ادارے کے طلبہ اور اساتذہ کو کتب مستعار بھی دی جاتی ہیں۔ اور باہر کے جو لوگ فیس ادا کر کے ممبر بن جائیں ان کو بھی کتابیں جاری کی جاتی ہیں۔

کتابیں مستعار دینے کے لیے ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ پہلی قسم کی کتب زیادہ سے زیادہ دو ہفتے تک مستعار لی جاسکتی ہیں۔ دوسری قسم کی کتابیں دو دن کے لئے لی جاسکتی ہیں۔ رسالوں کے مجلد فائل صرف رات بھر کے لیے جاری کئے جاتے ہیں۔ باقی کتابیں صرف لائبریری میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ باہر نہیں لے جائے جاسکتیں۔ مقررہ وقت پر کتابیں واپس نہ ہوں تو جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔

کتب خانے کے بعد ادارے کے تدریسی شعبے میں بھی جانا ہوا۔ وقت کی کمی کے باعث ادارے کا نظام پوری طرح سمجھنے کا تو موقع نہیں تھا۔ لیکن تدریسی موضوعات کا ایک سرسری خاکہ سامنے آیا۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی جماعتوں میں مختلف موضوعات کے علاوہ عربی زبان اور اس کے ساتھ عالمِ اسلام کی کسی ایک دوسری زبان (مثلاً فارسی، ترکی، اردو وغیرہ) کا پڑھنا بھی لازمی ہے۔ لیکن فرانسیسی یا جرمن یا دونوں زبانوں کو سیکھنا بھی ضروری

ہے ۔ اُوپر کی جماعتوں میں مندرجۂ ذیل موضوعات کی تدریس نصاب میں شامل ہے :۔

(۱) مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ (۲) بیسویں صدی کے عربوں کے افکار (۳) مسلم ہندوستان کی تاریخ (۴) اسلامی روایت جس میں قرآن کریم ، سیرت طیبہ ، عقائد ، اعمال اور اداروں کا تاریخی مطالعہ شامل ہے ۔ (۵) اسلامی تہذیب کے کلاسیکی عہد کی تاریخ (۶) فاطمیوں کی تاریخ (۷) قرونِ متوسطہ میں اسلامی تہذیب کی تاریخ (۸) اسلامی افکار کے ارتقا کا جائزہ

اس کے علاوہ تفسیرِ قرآن ، اسلامی فلسفے ، اسلامی اصولِ فقہ ، تصوف شیعہ افکار اسماعیلی فکر اور ادب عرب ، ایران اور پاکستان میں اسلامی ارتقاء ، احیاءِ اسلام کی تحریکیں ، بنیاد پرستی کی تحریک ، مسلمان ملکوں میں سماجی اور معاشی تغیرات جیسے موضوعات بھی تعلیم کے مختلف مراحل میں شاملِ نصاب ہیں ۔

یہ بات تو واضح ہی ہے کہ اس ادارے کا مقصد اسلام کو دینِ برحق سمجھ کر اس کی ہدایات و تعلیمات سے استفادہ نہیں ہے ۔ چنانچہ یہاں اساتذہ کی بیشتر تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہے ، جنہوں نے اپنی تحقیق و جستجو کا موضوع اسلام اور مسلمانوں کو بنایا ہے اور وہ روزانہ اسلامی علوم کے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود اس سے اپنے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکے ۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مغرب میں اسلام پر ریسرچ کرنے والے ان اداروں کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات کے بیج بونا اور مسلمان ملکوں میں مغربی مفادات کا تحفظ کرنے والوں کو علمی ہتھیار فراہم کرنا ہے ۔ اور اگر بہت زیادہ خوش گمانی سے کام لیا جائے تو علم برائے علم ہے ۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "علم برائے علم" جو محض "جاننے" کی حد تک محدود رہ کر "ماننے" اور "جھکنے" سے نا آشنا ہو ، انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا ۔ ایسا علم کائنات میں سب سے زیادہ ابلیس کو حاصل ہے ، لیکن وہ اُسے "کفر" اور "جہنم" سے بھی نہیں بچا سکا ۔ اور جو علم انسان کو اپنے خالق و مالک تک پہنچا کر اُسے ایمان بھی نصیب نہ کر سکے ۔ اُس پر خواہ مرعوب کن ڈگریوں کا کیسا دلفریب خول چڑھا ہوا ہو کارزارِ حیات میں وہ انسان کے کسی کام کا نہیں ۔

اور یہیں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ کریم جیسی کتاب ہدایت بھی اگر سینے میں طلب حق" کی کسک پیدا کئے بغیر پڑھی جاتے تو انسان کو ہدایت نہیں پہنچاتی، بلکہ اگر طلب حق کے بجائے دل میں استکبار اور "خود رائی" ہو تو اسی کتاب سے ہدایت کے بجائے گمراہی حصے میں آتی ہے اور انسان منزل کا پتہ حاصل کرنے کے بجائے اپنی فکری اور عملی بے راہ روی میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے فرمایا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّ يَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔

مستشرقین کے ان اداروں کا مقصد اور خواہ کچھ ہو، لیکن طلب حق نہیں ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دن رات قرآن وسنت کا مشغلہ رکھنے کے باوجود اس کے حقیقی نور سے محروم ہیں اور مقام عبرت ہے کہ کفر تک کی ظلمتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔

لیکن اس سے زیادہ عبرتناک مسلمان ملکوں کا یہ طرزِ فکر ہے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود انہوں نے اسلامی علوم کے بارے میں بھی انہی اداروں کی ڈگریوں کو اپنے معاشرے میں بڑا اونچا مقام دے رکھا ہے اور مسلمانوں کو بھی مجبور کر رکھا ہے کہ اگر سرکاری سطح پر اسلامی علوم میں اپنی قابلیت منوانی ہے تو انہی اداروں میں پڑھ کر آؤ، اور اُن لوگوں کے معیار پر پورے اُترو جو اسلامی علوم سے ایمان اور عمل صالح کی دولت حاصل کرنا نہیں چاہتے گویا اسلام کا بھی وہی علم معتبر ہے جسے اسلام کی حقانیت سے انکار کرنے والے یہ غیر مسلم صحیح قرار دیں۔ ذہنی غلامی اور غیرت کے دیوالیہ پن کی یہ انتہا ہے جو آج بہت سے مسلم ملکوں میں ایک فیشن سی ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر دین اور دین کے علوم میں مہارت و قابلیت کو جانچا جا رہا ہے اور ان سے کوئی یہ کہنے والا موجود نہیں کہ ؎

کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو

بہرکیف! استشراق کی تحریک، اس کے مقاصد اور اس کے طریقِ کار پر تبصرہ

ایک مستقل موضوع ہے جس کی تفصیلات سے اس سفر نامے کو بوجھل نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ چند تاثرات تھے جو اس ادارے کے معائنے کے دوران دل و دماغ پر چھائے رہے۔

اب جمعہ کا وقت قریب تھا، یہاں سے ہم مانٹریال کی مرکزی مسجد "مسجد الاسلام" پہنچے جو "اسلامک سنٹر" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہلے دس منٹ اردو میں احقر کا خطاب ہوا، پھر اسی کا خلاصہ احقر نے عربی خطبے میں عرض کیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد مرکز کا معائنہ ہوا ماشاء اللہ یہ بڑی اچھی مسجد ہے جس کے ساتھ تعلیمی اور تبلیغی خدمات کے متعدد شعبے موجود ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے اور مرکز کا انتظام برصغیر اور عرب ممالک کے مسلمان مِل جُل کر انجام دیتے ہیں

اسی روز مغرب کے بعد ویسٹ آئی لینڈ کی ایک مسجد میں بھی مفصل تقریر ہوئی، خواتین بھی پردے کے انتظام کے ساتھ موجود تھیں اور تقریر کے بعد دیر تک سوال و جواب کا بھی سلسلہ رہا۔

اگلے دن صبح ۱۰ بجے احقر کی قیام گاہ یعنی جناب محمد صدیق صاحب کی قیام گاہ ہی پر سوال و جواب کی ایک نشست تھی جس میں مختلف حلقہ ہائے خیال کے حضرات نے خاصی بڑی تعداد میں دلچسپی کے ساتھ شرکت کی اور سلسلہ ۱۲ بجے دن تک جاری رہا۔

معہد الرشید الاسلامی

بارہ بجے ہم مانٹریال سے تقریباً سو کیلو میٹر کے فاصلے پر ایک شہر کورن وال (Corn Wall) کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں ایک دینی مدرسہ "معہد الرشید الاسلامی" کے نام سے قائم ہے۔ اسے دیکھنا اور وہاں کے حضرات سے ملنا مقصود تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کورن وال پہنچے یہ مدرسہ ایک دریا کے کنارے بڑے پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ ماشاءاللہ مدرسے کو بڑی وسیع زمین ملی ہوئی ہے اور ایک بہت بڑی عمارت جو پہلے کسی ہسپتال کی عمارت تھی۔ اپنی بہت سی تنصیبات کے ساتھ سستے داموں دستیاب ہو گئی ہے۔

مدرسے کے مہتمم مولانا مظہر عالم صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے فارغ التحصیل ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ کوئی عالم دین برّاعظم امریکہ کو اپنا مستقر بنا کر وہاں دین کی تعلیم وتبلیغ کا فریضہ انجام دیں اور وہاں کوئی ایسا ادارہ قائم کریں جو اس علاقے کی ضروریات کے مطابق نہ صرف بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کرے، بلکہ رفتہ رفتہ ایسے علما تیار کرے جو امریکہ میں مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کرسکیں۔ اس غرض کے لیے آپ نے مولانا مظہر عالم صاحب کا انتخاب کیا اور انہیں کینیڈا بھیجنے کا انتظام فرمایا۔ مولانا جب کینیڈا آکر اُترے تو ان کی یہاں کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ انگریزی زبان سے بھی واقف نہیں تھے۔ اس لیے ابتدا میں بڑی قربانیوں کے ساتھ وقت گذارا، یہاں تک کہ کئی روز تک ایئرپورٹ ہی پر بھوکے پیاسے پڑے رہے لیکن بالآخر حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کے دل کی تڑپ اور مولانا کی قربانیاں رنگ لائیں، اور اللہ تعالیٰ نے غیب سے مدد فرمائی۔ اور ہوتے ہوتے یہ عظیم الشان مدرسہ وجود میں آگیا۔ مولانا نے یہاں پہنچنے کے بعد ہی انگریزی سیکھی اب وہ انگریزی میں بے تکلف تقریریں فرماتے ہیں اور اس مدرسہ کو اس معیار تک پہنچانے کے لیے بڑی غیر معمولی ہمت، استقامت اور محنت کا مظاہرہ فرمایا۔

اب ماشاءاللہ اس مدرسہ میں کینیڈا اور امریکہ کے مختلف علاقوں کے بہت سے بچے مقیم ہیں، مقامی بچے بھی زیرِ تعلیم ہیں۔ ابھی چونکہ آغاز ہی ہے۔ اس لئے فی الحال قرآن کریم حفظ، ناظرہ اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ مروجہ عصری تعلیم بھی اس کے ساتھ ساتھ جاری ہے اور مدرسہ کی سند سرکاری طور پر منظور شدہ ہے۔ جوں جوں یہ بچے تعلیم میں آگے بڑھیں گے، انشاءاللہ اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام ہوتا جائیگا۔

یہ مدرسہ — جسے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کی کرامت ہی کہنا چاہیئے، دیکھ کر بہت دل خوش ہوا کہ ماشاءاللہ اس علاقے میں مسلمانوں کے دین کے تحفظ کے لئے یہ بڑا قابلِ قدر ادارہ قائم ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ظاہری و باطنی ترقیات عطا فرمائیں اور دین کی زیادہ خدمت کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین

دوپہر کا کھانا مولانا مظہر عالم صاحب کے یہاں کھایا۔ انہوں نے بڑی محبت سے مدرسہ دکھایا، اور اس کے مختلف کاموں کا تعارف کرایا۔ نمازِ عصر مدرسہ ہی میں ادا کرکے ہم واپس مانٹریال کے لیے روانہ ہوئے۔

مغرب کی نماز کے بعد مانٹریال کی ایک مضافاتی بستی ساؤتھ شور کی مسجد میں احقر کا خطاب تھا اور عشاء کے بعد یہاں کے ایک متدین تاجر جناب احمد شیخ صاحب کے مکان پر کھانا اور اس کے بعد سوال وجواب کی نشست تھی جو رات دس بجے کے بعد برخاست ہوئی۔

واپسی میں احقر کے میزبان جناب محمد صدیق صاحب دن بھر کی تھکن کے بعد تفریح کے لئے مانٹریال شہر سے ہوتے ہوئے یہاں کے مشہور پہاڑ موئنٹ لارنس لے گئے۔ یہ بڑا خوبصورت اور سرسبز و شاداب پہاڑ ہے جس کے دامن میں پورا مانٹریال شہر آباد ہے اور کچھ عجب نہیں کہ "مانٹریال" دراصل "موئنٹ لارنس" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ اس پہاڑ کی چوٹی سے پورے شہر کا منظر بڑا دلفریب ہے۔ پہاڑ کے دامن میں حدِ نظر تک روشنیوں کی ایک فصل اُگی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور سینٹ لارنس کے پانی میں ان روشنیوں کا عکس بہتے ہوئے سونے کا منظر پیش کرتا ہے۔ بحتری نے ایک تالاب کے کسی ایسے ہی منظر کو دیکھ کر کہا تھا ؎

إذا النجوم تراءت في جوانبها[1]
ليلاً حسبت سماء ركبت فيها

اولمپک اسٹیڈیم

اگلا دن اتوار تھا اور مغربی ممالک میں عام طور سے لوگوں کا معمول یہ ہے کہ ظہر تک اپنے گھروں میں رہتے ہیں اور کوئی اجتماع یا تقریب ہو تو ظہر کی نماز کے بعد ہوتی ہے جس میں لوگ اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج ظہر کی نماز کے بعد اسلامک سنٹر

---

[1] "جب رات کے وقت ستارے اس کے مختلف گوشوں میں نظر آنے لگتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے آسمان اس میں پیوست ہو گیا۔

ہیں احقر کی مفصل تقریر رکھی گئی تھی اور ظہر تک کا وقت خالی تھا۔ احقر کے میزبان جناب سمیع اللہ صاحب مجھے دس بجے کے قریب لینے کے لئے آگئے اور درمیانی وقت میں مانٹریال کا مشہور اولمپک اسٹیڈیم دکھانے لے گئے۔ چند سال پہلے یہاں کھیلوں کے عالمی مقابلے منعقد ہونے تھے، یہ اسٹیڈیم اور اسکی ملحقہ عمارتیں اس وقت تعمیر ہوئی تھیں۔ اور چونکہ فن تعمیر کے لحاظ سے یہ عمارتیں منفرد خصوصیات کی حامل ہیں۔ اس لیے اب یہ ایک تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔

یہ جگہ مانٹریال کے مشرق میں واقع ہے اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے مانٹریال کا حسین ترین علاقہ ہے یہاں پہلے سے ایک وسیع پارک موجود تھا لیکن ۱۹۷۶ء میں جب اس جگہ کا انتخاب اولمپک کھیلوں کے لیے کیا گیا تو تقریباً ۱۲ کروڑ ڈالر کے خرچ سے یہاں اسٹیڈیم کی یہ عمارت تعمیر ہوئی جو دنیا بھر میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اسے ایک ستار کی شکل میں بنایا گیا ہے جس کا پیٹ اسٹیڈیم کا اصل گراؤنڈ ہے اور اس پر ایک جھکے ہوئے پیالے کی شکل میں ایک فولڈنگ چھت ہے جسے جب چاہیں۔ اوپر سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ چھت اوپر موجود ہو تو یہ ایک وسیع وعریض ہال ہے اور چھت اٹھالی جائے تو یہ ایک میدان ہے۔ اس فولڈنگ چھت کا رقبہ دو لاکھ مربع فیٹ ہے، اور یہ مجموعی طور پر ۱۹۰ ٹن وزنی چھت لے کنارے پر ستار کے سطول کی شکل میں ایک ۵۵۶ فیٹ بلند ٹاور ہے جو ۵۰ منزلہ عمارت کے برابر ہے اور انتہائی بلندی پر اس کے میلان کا زاویہ ۴۵ ڈگری ہے۔ اس ٹاور سے اسٹیل کی مضبوط رسیاں اسٹیڈیم کی چھت کی طرف لٹکائی گئی ہیں جو ایک طرف جھکے ہوئے ٹاور کا توازن برقرار رکھتی ہیں اور دوسری طرف چھت کو اوپر اٹھانے کے کام آتی ہیں اور اس طرح یہ دیو ہیکل چھت ۴۵ منٹ میں اوپر اٹھ جاتی ہے یہ ٹاور جو اس ستار نما عمارت کے سطول کے طور استعمال ہوتا ہے دنیا کا سب سے بلند و ترچھا ٹاور ہے اس میں اوپر تک لے جانے کے لیے ایک کیبل کیبن لگایا گیا ہے جو دو منزلہ ہے اور ترچھے زاویے سے اوپر چڑھنے کے باوجود پورے راستے سیدھا رہتا ہے۔ اس میں ۹۰ افراد بیک وقت سفر کر سکتے ہیں اور دو منٹ میں اوپر پہنچا دیتا ہے اور راستے میں اس کی

شیشے کی دیوار سے گردوپیش کا حسین منظر بھی دکھائی دیتا ہے۔

یہ عمارت بلاشبہ فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے اور متعدد جہتوں سے بڑی حیرت انگیز عمارت ہے۔ لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ کروڑوں ڈالر کی یہ خطیر اور ہزاروں انسانوں کی ذہنی اور عملی توانائیاں کس مقصد پر خرچ ہوتی ہیں؟ تو یہ انسانیت کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ کھیل جسمانی ورزش اور تفریحِ طبع کے لیے ایک فراغت کا مشغلہ تو ہو سکتا ہے لیکن جس طرح اسے مقصدِ زندگی بنا کر اس پہ تن من دھن کی بازی لگائی جا رہی ہے اور فقر و افلاس میں ڈوبی ہوئی اس دنیا میں اس پہ جس طرح اربوں کھربوں روپیہ صرف ہو رہا ہے، عقل و خرد اور حق و انصاف کی نظر میں اس کا کوئی جواز ہے؟ — لیکن اس ترقی یافتہ زمانے میں اس قسم کے لمحاتِ فکریہ فرسودگی اور دقیانوسیت کی علامت بن گئے ہیں۔ لہٰذا کون ایسی فرسودہ باتوں پہ کان دھرے!

ظہر سے ذرا پہلے ہم اسلامک سنٹر پہنچ گئے اور نمازِ ظہر کے بعد تقریباً گھنٹہ بھر خطاب ہوا مردوں اور عورتوں کا اچھا بڑا اجتماع تھا۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کی بھی طویل نشست ہوئی۔

میرے ایک عزیز جناب شمیم صاحب مانٹریال ہی میں مقیم ہیں، لیکن اب تک ان کے یہاں جانا نہیں ہوا تھا۔ یہاں سے اُن کے مکان پہ جانا ہوا، وہاں بھی بہت سے دوست پہنچ گئے یہاں تک کہ ایئرپورٹ کے لیے روانگی کا وقت آگیا۔ مغرب کی نماز میں نے ایئرپورٹ پر ادا کی اور واپس ٹورنٹو کے لیے روانہ ہوگیا۔

ٹورنٹو میں اگلے دن اسنا (Isna) کے صدر جناب اشرف صاحب اور ہاؤسنگ کارپوریشن کے چیئرمین جناب پرویز نسیم صاحب سے شام کا وقت طے تھا کہ اس میں ہاؤسنگ اسکیم کے صحیح شرعی طریقے پر گفتگو ہوگی۔ لیکن میں مسلسل سفر کی وجہ سے اب تک اسکیم کی تفصیلات کا کماحقہ مطالعہ کر کے اپنی تجاویز مرتب نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ میں نے صبح سے دوپہر تک اسی اسکیم پر غور اور متبادل تجاویز کی تیاری میں وقت گذارا۔ بیچ بیچ میں لوگ بھی ملنے کے لیے آتے رہے۔ عصر کے بعد ہم اسنا (Isna) کے دفتر کے لیے روانہ ہوئے۔ نمازِ مغرب

بھی وہیں ادا کی۔ رات کا کھانا بھی وہیں ہوا۔ اور اسکیم کے مختلف پہلوؤں پر رات گیارہ بجے تک گفتگو ہوتی رہی۔ پرویز نسیم صاحب نے اسکیم کی تفصیلات اور احقر کی تجاویز کے اور احقر کی تجاویز کے بارے میں عملی مسائل پیش کئے۔ بالآخر الحمد للہ احقر کی تجاویز سے انہوں نے اتفاق کر لیا اور یہ طے ہو گیا کہ وہ طریقِ کار میں ترمیم کے لئے اپنے بورڈ سے منظوری لیں گے۔ اس کے بعد ان تبدیلیوں کی روشنی میں اپنے معاہدات از سرِ نو مرتب کر کے میرے پاس کراچی بھیجیں گے۔

اگلا دن منگل تھا۔ صبح کے وقت کچھ ضروریات کی خریداری کا پروگرام تھا۔ چنانچہ اس قیام کے دوران پہلی بار بازار جانا ہوا۔ ایٹین سنٹر (Eaton Centre) یہاں کی بہت بڑی سپر مارکیٹ ہے جو کئی منزلوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور بجائے خود قابلِ دید ہے۔

ادھر ٹورنٹو میں آتے جاتے تقریباً روزانہ یہاں کا شہرۂ آفاق سی این ٹاور نظر آتا رہتا تھا۔ جو اس وقت دنیا کا سب سے اونچا ٹاور ہے۔ رفقاء نے وہاں بھی لے جانے کا پروگرام بنایا۔ اور ایٹین سنٹر سے وہاں لے گئے۔ یہ ٹاور ۵۵۳ء۳۳ میٹر (۱۸۱۵ فٹ ۵ انچ) بلند ہے۔ جس کی اونچائی تقریباً ایک سو اکیاسی منزل کے برابر ہے اوپر کے حصے میں آلاتِ رصد نصب ہیں اور ۱۴۶۵ فیٹ کی بلندی پر سب سے اونچی تماشاگاہ بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس روز ہواؤں کے تیز جھکڑوں کی وجہ سے اس منزل کو بند کیا ہوا تھا۔ اس سے نیچے ۱۱۳۶ فیٹ کی بلندی پر ایک گھومتا ہوا ریستوران ہے۔ یہاں شیشے کی دیواروں سے پورے شہر کا منظر عجیب و غریب ہے۔ سامنے ایک طرف اونٹاریو جھیل جو کینیڈا کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور باقی اطراف میں ٹورنٹو اور اس کے مضافاتی علاقے پھیلے ہوئے ہیں۔ نیچے سڑکوں پر چلتی ہوئی گاڑیاں اور رینگتے ہوئے انسان چیونٹیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ مجھے اپنے والد ماجد کی بات یاد آ گئی کہ جب اتنی سی بلندی پر پہنچ کر دنیا کی چیزیں اتنی چھوٹی اور حقیر نظر آنے لگتی ہیں تو جو ذات سات آسمان اور اس سے بھی اوپر جنت و جہنم کے

نظارے کر کے آئی، اگر وہ دنیا کو مچھر کے پَر سے بھی زیادہ بے حقیقت قرار دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

اسی روز نماز مغرب کے بعد ایک دوست جناب نعیم صاحب کے یہاں اُن حضرات کا ایک خصوصی اجتماع تھا۔ جو ٹورنٹو کے مختلف حصوں میں درس قرآن وغیرہ کے حلقے قائم کرتے ہیں۔ وہاں احقر کا خطاب بھی ہوا اور رات گئے تک یہاں کے تبلیغی اور دعوتی مسائل پر تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا۔

اُدھر امریکہ کے مشہور شہر شکاگو سے مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کے متعدد فون آئے وہ چاہتے تھے کہ چند روز کے لیے احقر شکاگو بھی حاضر ہو۔ چنانچہ بدھ ۷، ربیع الاول (۱۹ اکتوبر) سے ہفتہ ۱۰ ربیع الاول تک تین روز کے لیے شکاگو کا دورہ طے ہو گیا تھا۔

شکاگو میں

چنانچہ اگلے دن صبح ۷ بجے میں قیام گاہ سے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ ۱۰ بجے امریکن ایئر لائنز کا طیارہ روانہ ہوا۔ یہاں اول تو ہر جگہ ہی ایئرپورٹ کا انتظام نہایت سادہ اور آسان ہے مشرقی ممالک کی طرح ایئرپورٹ پر بہت سے صبر آزما مراحل سے گذرنا نہیں پڑتا بلکہ اکثر ایک ہی کاؤنٹر پر بیشتر مراحل طے ہو جاتے ہیں اور خاص طور سے یہ سہولت یہاں پہلی بار دیکھنے میں آئی کہ جو امیگریشن اور کسٹم کی کارروائی امریکہ پہنچ کر ہونی چاہیئے تھی وہ ٹورنٹو ہی کے ایئرپورٹ پر ہو گئی اور جب ہم جہاز میں سوار ہوئے تو تمام معاملات سے ایسے فارغ تھے جیسے کسی ملکی پرواز پر سفر کر رہے ہوں۔

ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز شکاگو کے ہوائی اڈے پر اترا جو دنیا کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ہے، اور جہاں رن وے کے افق پر اکثر آٹھ آٹھ دس دس طیارے چیلوں کی قطار کی طرح زمین پر اترنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔

ایئرپورٹ پر مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب استقبال کے لیے موجود تھے۔ کراچی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے مولانا یعقوب باوا اور مولانا منظور حسین صاحب بھی ان دنوں

شکاگو میں تھے اور وہ بھی ایئر پورٹ پر تشریف لائے تھے۔ قیام مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کے مکان پر ہوا۔ مولانا حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہم کے قریبی عزیز ہیں اور احقر کے برادرِ عم زاد مولانا خورشید عالم صاحب (دیوبند) کے برادرِ نسبتی۔ کئی سال سے شکاگو میں مقیم ہیں اور ماشاء اللہ یہاں انہوں نے تعلیم و تبلیغ کا نہایت مفید سلسلہ جاری کیا ہوا ہے ان علاقوں میں کسی مستند عالم دین کا وجود بہت بڑی نعمت ہے اور ماشاء اللہ مولانا یہاں بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

انہوں نے مغرب کے بعد اپنے مکان پر شکاگو کے اسلامی مراکز کے چیدہ چیدہ ذمہ دار حضرات کو مدعو کیا ہوا تھا جن میں سے مندرجہ ذیل حضرات خاص طور پر یاد رہ گئے ہیں۔

سوڈان کے ایک جلیل القدر عالم شیخ محمد نور مالکی یہاں ایک مسجد فاؤنڈیشن کے صدر ہیں اور ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ماشاء اللہ وہ صاحبِ استعداد عالم ہیں اور اس علاقے میں گرانقدر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر احمد صقر اصلاً ایک سائنس دان ہیں، لیکن دین سے اپنے گہرے لگاؤ کے باعث مطالعے کے ذریعے بقدرِ ضرورت دینی معلومات کے حامل ہیں۔ مغرب میں جو غذائیں اور دوائیں عام طور پر استعمال ہوتی ہیں ان کے اجزائے ترکیبی پر انہوں نے بڑی محنت ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان اجزاء کی حلت و حرمت سے بحث کی ہے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ کون سی غذاؤں سے پرہیز رکھیں۔ یہ کتاب امریکہ کے مسلمانوں میں کافی مقبول ہے۔

ایم سی سی (مسلم کمیونٹی سنٹر) یہاں مسلمانوں کا ایک ممتاز ادارہ ہے جس کے تحت مسجد مدرسہ اور متعدد سماجی خدمات کا انتظام ہے۔ زیادہ تر برصغیر کے مسلمان اس ادارے کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن بہت سے عرب حضرات بھی اس میں شریک ہیں۔ اس ادارے کے صدر فخر الدین صاحب سے بھی اس اجتماع میں ملاقات رہی۔

جناب عابد اللہ انصاری صاحب حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ عرصۂ دراز سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں اور انہوں نے "اقرأ فاؤنڈیشن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے جس کے تحت انہوں نے بچوں کی دینی تعلیم کیلئے آسان انگریزی میں نصابی

کتب تیار کی ہیں جو بڑی سہل، سادہ اور عصرِ حاضر کے تعلیمی اسلوب کے مطابق ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ انگریزی میں علمی اور تحقیقی کتب کی تالیف اور اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کچھ عرصے وہ جدّہ میں بھی رہے ہیں اور ان سے جدّہ میں بھی اس منصوبے کی کچھ تفصیلات سننے میں آئی تھیں۔

جناب عبدالنوی صاحب ایم سی سی کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور امریکی مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی شکاگو اور اس کی مضافات کے با اثر مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد سے اس عشائیے میں ملاقات ہوئی، اور یہاں کے مسائل کی تفصیلات معلوم ہوئیں اور رات گئے تک مختلف مسائل کے لیے باہمی تعاون کے طریقوں پر گفتگو ہوتی رہی۔

اگلا دن جمعرات تھا، اور عشاء کے بعد مسلم کمیونٹی سنٹر کے ہال میں ایک عشائیہ اور خطاب کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن دن کا وقت فارغ تھا۔ مجھے واپسی میں پیرس اترنے کے لیے فرانس کا ویزا لینا تھا۔ چنانچہ جناب مولانا عبداللہ سلیم صاحب مجھے فرانس کے قونصل خانے لے گئے جو شکاگو شہر کے وسط میں واقع ہے، یہاں سے فرانس کا ویزا حاصل کیا۔ یہیں کچھ فاصلے پر شکاگو کی شہرۂ آفاق عمارت سیئرز بلڈنگ Sears Building واقع ہے چنانچہ مولانا احقر کو وہاں بھی لے گئے۔ سیئرز بلڈنگ اس وقت دنیا کی سب سے بلند عمارت ہے۔ پہلے نیویارک کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ جو ۱۰۲ منزلہ ہے، دنیا کی بلندترین عمارت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد نیویارک ہی میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر تعمیر ہوا جو ۱۱۰ منزلہ ہے لیکن اب شکاگو کی یہ سیئرز بلڈنگ جو ۱۱۵ منزلوں پر مشتمل ہے، ان دونوں عمارتوں پر بھی سبقت لے گئی ہے یہ عمارت سطح زمین سے ۱۴۵۴ فیٹ بلند ہے اور اگرچہ ٹورنٹو کا سی این ٹاور اس سے زیادہ اونچا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ سی این ٹاور محض ایک ٹاور ہے اور اس کے برخلاف شکاگو کی سیئرز بلڈنگ ایک باقاعدہ عمارت ہے جس کی ہر منزل مختلف دفاتر وغیرہ میں مشغول ہے۔ لہٰذا اگر سی این ٹاور دنیا کا بلندترین مینار ہے تو یہ دنیا کی بلندترین عمارت ہے۔

گراؤنڈ فلور سے اوپر لے جانے کے لیے ایک انتہائی تیز رفتار لفٹ استعمال ہوتی ہے جو ۵۰ سیکنڈ میں ۱۰۳ منزل تک پہنچا دیتی ہے یہاں ایک تماشا گاہ بنی ہوئی ہے جس کے

چاروں طرف شیشے کی دیواریں ہیں اور ان کے ساتھ دوربینیں نصب ہیں، یہاں سے شکاگو کا پورا شہر اور اس کے پس منظر میں مشی گن جھیل حدِ نظر تک پھیلی نظر آتی ہے۔

اسی روز عشاء کی نماز مسلم کمیونٹی سنٹر کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد ایم سی سی کی طرف سے ایک استقبالی عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شہر کے مختلف حصوں اور مختلف جماعتوں کے تقریباً سو کے قریب مسلمان مدعو تھے۔ عشائیہ کے بعد ایم سی سی کے چیئرمین جناب فخر الدین صاحب کی طرف سے خیر مقدمی تقریر ہوئی اور اس کے بعد احقر کا خطاب۔ آخر میں سوال و جواب کی نشست دیر تک جاری رہی۔

اگلا دن جمعہ تھا اور جمعہ کی نماز بھی اسی کمیونٹی سنٹر کی مسجد میں ادا کرنی تھی۔ نماز سے پہلے احقر نے چند منٹ خطاب کیا، اس کے بعد عربی خطبے میں اسی کا خلاصہ پیش کیا، کیونکہ یہاں حاضرین میں عربوں کی تعداد کافی تھی۔

شکاگو میں اُردن کے ایک عالم شیخ علاؤ الدین خرّوفہ بھی قیام پذیر ہیں۔ گذشتہ رات کے عشائیہ ان سے ملاقات ہوئی تھی، اور انہوں نے جمعہ کے بعد اپنے مکان پر کھانے کی دعوت دی تھی وہ بھی نمازِ جمعہ میں تشریف فرما تھے۔ چنانچہ نماز کے بعد ان کے ساتھ ان کے مکان پر جانا ہوا۔ شیخ خرّوفہ بڑے خوش اخلاق، ذہین و زیرک اور ملنسار عالم ہیں ان کے ساتھ یہاں پیش آنے والے فقہی مسائل پر دیر تک گفتگو رہی۔ نمازِ عصر بھی انہی کے ساتھ پڑھی اور یہاں سے شہر کی بالکل مخالف سمت میں جانا تھا جہاں مغرب کے بعد سیرتِ طیبہ کے موضوع پر احقر کی تقریر کا اعلان تھا۔ یہ اجتماع شہر کے ایک دوسرے ادارے "مسلم فاؤنڈیشن" کے زیرِ انتظام تھا۔ اس ادارے کے تحت بھی ایک مسجد، ایک مدرسے اور مسلمانوں کی دوسری سماجی اور دعوتی خدمات کا انتظام ہے۔ اور مولانا عبداللہ سلیم صاحب اسی ادارے میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں جو ماشاء اللہ یہاں بہت مقبول ہے۔

یہاں بھی مردوں عورتوں دونوں کے علیحدہ اجتماع کا انتظام تھا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی بعد میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی رہا۔ عشاء کی نماز بھی یہیں ادا کی، اور اس کے بعد قیام گاہ پر واپسی ہوئی۔

اگلے روز صبح ۵ بجے ہی ٹورنٹو واپسی کے لیے ایئرپورٹ پہنچنا تھا، مولانا عبداللہ سلیم صاحب نے ایئرپورٹ پر بڑی محبت سے رخصت کیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ٹورنٹو پہنچا آج ہی شام کو واپس کراچی کے لیے روانگی تھی۔ برادرِ محترم جناب محمد ولی رازی صاحب کے ایک رفیق جناب فرید صاحب نے پہلے ہی سے یہ وعدہ لے رکھا تھا کہ اس دن ان کے یہاں قیام رہے گا۔ وہ ایئرپورٹ پر آگئے تھے اور اپنے مکان پر لے گئے۔ ٹورنٹو کے دوسرے احباب بھی وہیں تشریف لے آئے۔

۴ بجے شام کو ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کے لئے بہت سے احباب موجود تھے جن میں حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب مسجد المدینہ کے مولانا خلیل صاحب، مفتی محمد یوسف صاحب ہمارے میزبان جناب عبدالحیٔ پٹیل صاحب، مجلس تحفظ ختم نبوت کے حافظ سعید صاحب اور ٹورنٹو کے اور بھی متعدد احباب موجود تھے۔

ٹورنٹو کے دوستوں کا اصرار تھا کہ ابھی کم از کم ایک ہفتہ مزید کنیڈا میں قیام رہے۔ اِدھر ویسٹ انڈیز اور امریکہ کی بعض دوسری ریاستوں سے بھی فون آئے تھے کہ چند روز وہاں بھی حاضری ہو، لیکن احقر نے اس سفر کے لئے جو تین ہفتے مختص کئے تھے وہ پورے ہو چکے تھے اور کراچی میں بعض ضروری مصروفیات کا تقاضا تھا کہ اب جلد واپسی ہو۔ اس لئے معذرت کے سوا چارہ نہ تھا۔ اور یہاں کے احباب نے جس محبت اور خلوص کا معاملہ فرمایا۔ اس کا نقش دل پہ لئے میں سات بجے شام پیرس کے لیے روانہ ہو گیا۔

آخری دن پیرس میں

ٹورنٹو سے پیرس تک تقریباً آٹھ گھنٹے کی پرواز تھی، اور دونوں ملکوں کے اوقات میں پانچ گھنٹے کا فرق ہے اس طرح مقامی وقت کے مطابق میں ½۹ بجے صبح پیرس پہنچا۔ یہاں ایک دوست سعید صاحب جو پیرس میں تجارت کرتے ہیں، ایئرپورٹ پر موجود تھے، وہ اپنے مکان پر لے گئے۔ دورانِ سفر کی بے خوابی کے بعد چند گھنٹے آرام سے سونے کے لیے ملے تو بڑی نعمت معلوم ہوئے۔ ظہر تک آرام کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا، اس کے بعد سعید صاحب نے شہر کے بعض قابلِ دید مقامات سے ہوتے ہوئے ایئرپورٹ لے جانے کا پروگرام بنایا۔

پیرس اپنے حُسن اور رعنائی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا سرسبز و شاداب اور قدرتی اور تمدنی حُسن سے مالامال شہر ہے۔ اس کی عمارتوں میں قدامت اور جدت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نہایت مہنگا شہر ہونے کے باوجود اب بھی یہ سیاحت کا بڑا مرکز ہے۔ یہاں کا مرکزی علاقہ شانز الیزے دنیا کے حسین ترین بازاروں میں شمار ہوتا ہے جو اپنی وسعت، صفائی ستھرائی، عمارتوں کی روایتی خوبصورتی اور دلکش درختوں کی دورویہ قطاروں کے لحاظ سے واقعۃً ایک منفرد علاقہ ہے، جسے چہل قدمی کے لیے بھی بہت موزوں سمجھا جاتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ایسے مقامات فسق و فجور کے بھی سب سے بڑے مراکز ہوتے ہیں۔ اور اُن کی ظُلمت ہم جیسے کوردل بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شانزالیزے کی سڑک اُس چوک پر ختم ہوئی ہے جس کے سامنے فرانس کی پارلیمنٹ کی شاندار عمارت واقع ہے، اسی چوک میں انقلابِ فرانس کے وقت بادشاہ کو پھانسی دی گئی تھی۔

چوک کے دائیں جانب مشہورِ زمانہ ایفل ٹاور واقع ہے جو ۱۹۳۰ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت سمجھی جاتی تھی، بعد میں جب نیویارک میں اس سے بھی اونچی عمارتیں بنیں تو اس کی یہ حیثیت تو ختم ہوگئی۔ لیکن اپنی خوبصورتی اور تکنیک کے اعتبار سے اب بھی اس کا شمار دنیا کی حسین ترین تعمیرات میں ہوتا ہے، اور آج بھی یہ سیاحت کا بہت بڑا مرکز ہے ۹۸۴ فیٹ بلند یہ ٹاور تمام تر لوہے سے بنا ہوا ہے۔

یہ ٹاور انقلاب فرانس کی یادگار کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جب فرانس کی حکومت نے ۱۸۸۹ء میں انقلاب کی یادگار تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو ملک بھر کے انجینیروں سے یادگار کے نمونے طلب کر کے ان کا ایک کھلا مقابلہ منعقد کیا گیا۔ تقریباً سو مختلف نقشے سامنے آئے۔ لیکن بالآخر متعلقہ کمیٹی نے مشہور سول انجینیر الیگزینڈر گستاف ایفل (Gustav Eiffel) کا نقشہ منظور کیا۔ اور اسی کے نام پر اس کا نام ایفل ٹاور رکھا گیا۔

یہ پورا ٹاور لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اس کے پائے جس پر ٹاور کھڑا ہے بڑے وسیع و عریض اور بلند ہیں۔ اور ان کو چار محرابوں کی شکل میں ایک دوسرے سے مربوط رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ٹاور لوہے کے ایک مخروطی ڈھانچے کی شکل میں بلند چلا گیا ہے۔ اب اس میں ایک لفٹ بھی لگ گئی ہے جو ہر وقت اس ٹاور کے درمیان کہیں نہ کہیں حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ لوہے کا یہ حسین ڈھانچہ چند ماہ میں تیار ہو گیا تھا، اس میں انسانی محنت اور روپیہ دونوں کا خرچ دنیا کی دوسری مشہور یادگاروں کے مقابلے میں بہت کم ہوا تھا۔

ایفل ٹاور کے نیچے اور گردوپیش میں خوبصورت پارک بنے ہوئے ہیں قریب ہی دریائے سین بہہ رہا ہے جو پیرس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، اور دونوں حصوں کو ملانے کے لئے جگہ جگہ خوبصورت پل بنے ہوتے ہیں۔

سعید صاحب نے ان سارے علاقوں کا نظارہ ایئرپورٹ جاتے ہوئے راستے میں کار کے ذریعے ہی کرا دیا۔ ایفل ٹاور کے نیچے ایک پارک میں ہم نے نماز عصر ادا کی، اور ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔

نماز مغرب میں نے ایئرپورٹ پر ادا کی۔ رات ۹ بجے ایئر فرانس کا طیارہ کراچی کے لیے روانہ ہوا، اور ۷ گھنٹے کی پرواز کے بعد جب کراچی اترا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ وطن کی مٹھاس کا صحیح اندازہ کچھ عرصے وطن سے باہر رہ کر ہی ہوتا ہے زرق برق مغربی ملکوں کے طویل سفر کے بعد اپنا یہ سادہ اور بظاہر بے رنگ ماحول اتنا دلکش اور اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ترقی یافتہ ملکوں کی آب و تاب ہیچ نظر آتی ہے۔ اور جب بحیرۂ عرب کی سمت سے مشرق میں خشکی کے آثار اور اس پر کراچی کی بے ترتیب آبادی بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے تو قلب و نظر میں محبت اور سرور کی عجیب پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں، اور بےساختہ دل سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے۔ اللّٰھم أعط أرضنا زینتها وسکنها وبرکتها ولا تحرمنا برکة ما أعطیتنا یا ارحم الراحمین

مجموعی تأثرات

اب تک میں نے مغربی ملکوں کے چار سفر کئے ہیں، جن میں سے دو براعظم امریکہ کے تھے۔ مغربی ممالک کی زندگی اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں کے بارے میں اپنے تأثرات میں اپنے امریکہ کے پہلے سفرنامے میں لکھ چکا ہوں۔

اشاریہ

(انڈکس)

ترتیب :

محمد عمران اشرف عثمانی

محمد یحییٰ عاصم

اشاریہ (انڈکس)

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

"الف"

"پ"

"ت"

"ٹ"

"ث"

"ج"

"ح"

"ڈ"

"ش"

"ص"

"غ"

"ک"

"م"

ختم شد